مارشل لا سے مارشل لا تک

(اپریل ۱۹۱۹ئہ تا اکتوبر ۱۹۵۸ئہ)

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کے ایک
اہم اور ہنگامہ خیز دور کے حقیقی حالات راجہ غضنفر علیخاں
کے ذاتی مشاہدات اور دوسرے ذرائع سے اخذ کئے
ہوئے واقعات کے آئینے میں

مرتبہ

سیّد نور احمد

ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل بل روڈ لاہور

مارشل لاء سے مارشل لاء تک

مرتبہ:- سید نور احمد

ناشران:- ملک دین محمد اینڈ سنز، اشاعت منزل، بل روڈ لاہور

طابع ملک محمد عارف

مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور

تیسرا ایڈیشن

۱۹۶۷ء

قیمت مجلد بارہ روپے -/12

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
۱ - پس منظر	۱
۲ - ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کا آنکھوں دیکھا حال	۱۲
۳ - ۱۹۱۹ء کا ایکٹ اور تحریک عدم تعاون	۲۳
۴ - پنجاب کے دیہات میں انتخاب کے مناظر	۳۶
۵ - مسلم لیگ کا اجلاس لاہور (۱۹۲۴ء)	۴۰
۶ - شدھی اور تبلیغ کی ٹکر	۴۸
۷ - مسٹر جناح کی پارٹی کا نیا رنگروٹ	۵۰
۸ - مہاتما گاندھی کا اکیس روزہ برت	۵۴
۹ - پنجاب کی سیاست ۔ فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی	۵۷
۱۰ - پہلی آل پارٹیز کانفرنس	۶۵
۱۱ - مالکم ہیلی اور فضل حسین کے درمیان رسہ کشی	۶۹
۱۲ - ۱۹۲۶ء - اسمبلی کا ایک ڈرامائی سیشن	۷۵
۱۳ - "تجاویز دہلی" ۔ نہرو رپورٹ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس	۷۷
۱۴ - مسلم کیمپ پھر متحد ہو گیا	۸۹
۱۵ - سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قرارداد	۹۳
۱۶ - سائمن کمشن کا ہنگامہ خیز دورہ	۹۷
۱۷ - حکومت پنجاب کی رپورٹ اور سر فضل حسین کا اختلافی نوٹ	۱۰۱
۱۸ - بھگت سنگھ کا بم اور علم الدین کا خنجر	۱۰۷
۱۹ - انقلاب پسندوں کی پہلی کھیپ پکڑی گئی	۱۱۶
۲۰ - گول میز کانفرنس اور مہاتما گاندھی کا "ڈانڈی مارچ"	۱۲۰
۲۱ - علامہ اقبال کا خطبۂ الہ آباد	۱۲۴
۲۲ - گول میز کانفرنسیں اور ہندو مسلم مسئلہ	۱۲۷
۲۳ - صوبۂ سرحد کو کانگریس کی آغوش میں کس طرح دھکیلا گیا	۱۳۷
۲۴ - مسلم لیگ کی تنظیم میں ابتری	۱۴۱
۲۵ - سول نافرمانی اور کمیونل ایوارڈ	۱۴۵
۲۶ - پھر وہی منزل وہی راستہ	۱۵۱
۲۷ - یونینسٹ پارٹی میں فضل حسین کے خلاف سازشیں	۱۵۸
۲۸ - شہید گنج کا ہنگامہ اور مجلس احرار	۱۶۳
۲۹ - مسٹر جناح اور فضل حسین کی آخری ملاقات	۱۷۲
۳۰ - مسلم قومیت پر بھرپور حملہ ۔ "جناح سکندر پیکٹ" مسلمانوں کا نیا سیاسی محاذ	۱۸۱
۳۱ - عالمی جنگ ۔ قرارداد لاہور کا پس منظر	۱۹۷
۳۲ - زمانۂ جنگ میں سیاسی کشمکش اور "کرپس تجاویز"	۲۰۶
۳۳ - صوبائی سیاست کی جھلکیاں	۲۱۵

عنوان — صفحہ

۳۴۔ راجہ فارمولا۔ گاندھی جناح گفتگو اور
لارڈ ویول کی شملہ کانفرنس ۲۲۵
۳۵۔ نئے انتخاب نے قائداعظم کا دعویٰ ثابت
کر دیا۔ ۲۳۵
۳۶۔ کابینہ مشن پلان ۲۴۱
۳۷۔ ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ ۲۵۰
۳۸۔ عبوری حکومت کے مورچے کے لئے
سیاسی داؤ پیچ ۲۶۱
۳۹۔ بس میں بلا ٹکٹ مسافر کون تھا؟ ۲۷۳
۴۰۔ صوبائی محاذوں پہ ہنگامے ۲۸۰
۴۱۔ تقسیم کا اصول منظور کرنے کی جانب
کانگریس کا پہلا قدم ۲۸۵
۴۲۔ ماونٹ بیٹن کی آمد اور منصوبۂ پاکستان
کی منظوری ۲۸۹
۴۳۔ گورنر جنرل کے عہدے کے لئے
ماؤنٹ بیٹن کی تگ و دو ۳۰۷
۴۴۔ تقسیم کے مسائل ۳۱۱
۴۵۔ ریڈ کلف کے قلم سے ماونٹ بیٹن
کا ایوارڈ ۳۱۴
۴۶۔ آزادی کے راستے میں خون کی
ندیاں ۳۲۴
۴۷۔ دو انسانوں کا "باؤنڈری فورس" ۳۳۴
۴۸۔ کشمیر کا الحاق ۳۴۴
۴۹۔ پاکستان میں مسلم لیگ کی تنظیم نو ۳۵۲

عنوان — صفحہ

۵۰۔ ۱۹۴۸ء کی جھلکیاں۔ صوبوں میں خلفشار ۳۵۷
۵۱۔ زیارت میں آخری زیارت ۳۶۸
۵۲۔ لیاقت علی کا زمانہ۔ مضبوط مرکز لیکن صوبوں میں ابتری ۳۷۲
۵۳۔ لیاقت علی کی خارجہ پالیسی۔ انکے قتل کے
اسباب کیا تھے؟ ۳۸۸
۵۴۔ وزیراعظم ناظم الدین اور گورنر جنرل
غلام محمد۔ محلاتی سازشوں کا دور ۳۹۸
۵۵۔ مشرقی پاکستان میں انتخاب اور خونیں واقعات ۴۱۴
۵۶۔ پنڈت نہرو سراپا مصالحت بن گئے ۴۱۸
۵۷۔ دستور ساز اور گورنر جنرل۔ حملہ اور جوابی حملہ ۴۲۱
۵۸۔ نئی دستور ساز اسمبلی اور محلاتی جوڑ توڑ ۴۳۱
۵۹۔ آئین کی تکمیل میں تیز رفتاری ۴۳۷
۶۰۔ ری پبلکن پارٹی ۴۴۴
۶۱۔ مشرقی پاکستان میں نئے بحران ۴۵۲
۶۲۔ چوہدری محمد علی کا استعفا۔ ان کی جگہ سہروردی ۴۵۶
۶۳۔ مغربی پاکستان اسمبلی کے جوڑ توڑ سیشن ۴۵۹
۶۴۔ خارجہ پالیسی کے سات سال ۴۶۸
۶۵۔ سہروردی کے استعفے کا پس منظر
چندریگر آئے اور گئے ۴۸۰
۶۶۔ پارلیمانی دور کی آخری وزارت ۴۸۹
۶۷۔ ۱۹۵۸ء مشرقی پاکستان میں جنگ اقتدار ۴۹۷
۶۸۔ ۱۹۵۸ء۔ مسلم لیگ کا آخری صدر ۵۱۱
۶۹۔ ما در چہ خیالیم ۵۱۷
۷۰۔ فوجی انقلاب ۵۱۹



پاکستان کے بانی اور پہلے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح
وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے ساتھ



وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح
کے ساتھ

۱- پس منظر

یہ تاریخ کا بہت عجیب واقعہ ہے کہ تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کی مہم ایک ایسے فرد کے ہاتھوں سر ہوئی جو اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں "مسلم قومیت" اور "ہندو قومیت" کی حقیقت کا قائل ہی نہ تھا۔ سیاسی مقاصد اور سیاسی سرگرمیوں کے دائرے میں اس وقت اس کا ذہن صرف "ہندوستانی قومیت" کے تصوّر کو قبول کرتا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح اسی نظریہ اور یہی نقطۂ نگاہ کو لے کر ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ انڈین نیشنل کانگریس کے سرگرم ممبر بنے۔ انھیں اس بات کا احساس و اعتراف تھا اور اس پر افسوس بھی تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے اپنے آپ کو نمایاں طور پر ہندوستان کی سیاسی ترقی کی اس تحریک سے الگ تھلگ کر رکھا تھا جس کی قیادت کانگریس کر رہی تھی۔ جسے وہ مسلمانوں کے اندر سیاسی شعور کی کمی اور غلط اثرات کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ انھیں بار بار خیال آتا تھا۔ کاش مسلمان صحیح سیاسی شعور اور حبِ وطن کا ثبوت دیں اور یہ محسوس کر لیں کہ اس ملک کی ترقی تمام ہندوستانیوں کا مشترک مقصد ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لئے تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم واحدہ کی طرح سوچنا اور عمل کرنا اور کانگریس کے پلیٹ فارم کو اپنانا چاہیے۔ پھر مسٹر جناح کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان شبہات اور خدشات کو سمجھنے کا موقعہ ملا جو مسلمانوں کو کانگریس کی ہم نوائی سے روکتے تھے۔ انھیں یہ امید بندھی کہ مسلمان کانگریس کے مقصد کے ساتھ اشتراکِ عمل کے لئے تیار ہو سکتے ہیں بلکہ تیار ہیں۔ بشرطیکہ ان خدشات کا ازالہ کیا جا سکے جو حقیقی طور پر انھیں اپنی عددی اقلیت اور تعلیمی کمی وغیرہ کی وجہ سے لاحق ہوتے ہیں۔ لہٰذا انھیں صحیح عملی تدبیر یہی نظر آئی کہ کانگریس کی جانب سے مناسب یقین دہانی کے ذریعے ان خدشات کو رفع کیا جائے اور اگر مسلمانوں کو کانگریس میں مدغم نہ کیا جا سکے تو کم از کم انھیں کانگریس کے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا جائے تاکہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کے راستے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ حائل تھی دُور ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے کوشش انھیں ملک کی سب سے

بڑی خدمت نظر آئی۔ یہ سمجھ کر نوجوان اور حب وطن کے دلدادہ مسٹر جناح نے کانگریس اور مسلم لیگ (اس وقت مسلمانوں کی یہی سیاسی تنظیم تھی) کے درمیان سمجھوتے کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آزادیٔ ملک کے مقصد پر متحد کرنا اور ایک دوسرے کا معاون بنانا اپنا خاص مشن بنالیا۔ اس کے بعد ان کی بھرپور سیاسی زندگی کا بیشتر حصہ (۱۹۳۷ء تک) اسی مشن کے لئے وقف رہا۔ یہ مشن شروع میں کامیاب ہوتا نظر آیا لیکن بالآخر قطعی طور پر ناکام ثابت ہوا۔ مسٹر جناح کی عظیم اور تاریخی کامیابی اسی ناکامی سے شروع ہوئی۔

جہاں تک من حیث الجماعت مسلمانوں کے ذہن کا تعلق تھا۔ ان کے اندر ایک شعوری یا لاشعوری۔ لیکن بہت گہرا احساس بہت دیر سے موجود تھا جو روزمرہ کے مشاہدے اور تجربے کا لازمی نتیجہ تھا۔ وہ شاید اس احساس کا اظہار یا تجزیہ سیاسی مصطلحات کی زبان میں نہ کرسکتے تھے لیکن اپنے دلوں اور دماغوں میں محسوس ضرور کرتے تھے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان (مذہبی عقائد کے اختلاف کے علاوہ) ان تمام جذبات کے اعتبار سے جو کسی انسانی گروہ کو سیاسی اور معاشرتی اغراض کے لئے ایک "قوم" بناتے ہیں۔ دو الگ الگ اور ایک دوسرے کی مدمقابل قومیں تھیں۔ یہ احساس ایک چنگاری کی مانند تھا جس پر گردوپیش کے حالات اور ان کے تقاضے کبھی خاکستر کی تہ جمادیتے تھے اور کبھی اسے پھر ہوا دیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کے لئے ان سے بھی زیادہ ہولناک حالات پیدا ہوئے جنھوں نے ان کے اندر اس خوابیدہ احساس کو ایک مرتبہ پھر جھنجوڑ کر جگایا۔ ان حالات کا ایک پہلو یہ تھا کہ مسلمان انگریزی حکومت کی بدگمانی اور معاندانہ پالیسی کا بُری طرح شکار ہو رہے تھے اور دوسرا پہلو یہ تھا کہ جب مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا تو ہندوؤں کے اندر اپنی جداگانہ قومیت کا جذبہ انتقامی شدت کے ساتھ اُبھر رہا تھا۔ اس کا بہت نمایاں مظاہرہ ہندوؤں کے اس مطالبے کی صورت میں ہوا جو ۱۸۶۰ء کے بعد پہلے بہار میں اور پھر یو۔پی اور دہلی میں زور پکڑتا رہا کہ سرکاری دفتروں سے اردو کو خارج کیا جائے اور اس کی جگہ ہندی اور دیوناگری رسم الخط کو دی جائے۔ حالانکہ انگریزی حکومت نے ان علاقوں میں اردو کو عام مستعمل زبان ہی کی حیثیت سے نچلے درجے پر سرکاری زبان کی جگہ دی تھی۔ یہ مطالبہ عین اس وقت شروع ہوا جب مسلمان دفتروں کی نوکریوں سے۔ زمینداری کی ملکیتوں سے اور دوسرے

ذرائع معاش سے تیزی کے ساتھ خارج ہو رہے تھے۔

انتہائی مایوسی۔ ذہنی تعطل اور پراگندگی کے ایک تاریک دور کے بعد مسلمانوں کے اندر آخر ایک باعزم حرکت پیدا ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف قوموں کے اس ملک میں انھیں اپنے قومی وجود اور اپنے مفاد اور مستقبل کو محفوظ کرنا چاہیئے۔ اس حرکت کے محرک سر سید احمد تھے جنھوں نے بہت جدّوجہد کرکے مسلمانوں کو نئے حالات کا مقابلہ کرنے کی عملی راہ دکھائی۔

سرسید کی "تحریک علی گڑھ" اور اس کی کامیابی کی بنیاد یہی "دو قوموں" کا احساس تھا۔ یہی احساس نے مسلمانوں کو من حیث الجماعت کانگریس سے علیحدہ رکھا۔ اسی احساس نے انھیں ہمیشہ اپنی الگ سیاسی تنظیمیں قائم کرنے پر اُبھارا۔ سرسید کی قائم کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (جو ایک تعلیمی ادارہ تھی لیکن ایک سیاسی پلیٹ فارم کا کام بھی دیتی تھی) سید امیر علی کی سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور پھر آل انڈیا مسلم لیگ۔ یہ سب اسی احساس کی پیداوار تھیں۔

انڈین نیشنل کانگریس نے جو ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی۔ اپنی سرگرمیوں کا آغاز چند محتاط مطالبوں کے ساتھ کیا۔ (۱) لیجسلیٹو کونسلوں میں (جن کا آغاز ۱۸۶۱ء ہی میں ہو گیا تھا) ہندوستانی نمائندوں کے تناسب میں اضافہ کرو (۲) ہندوستانیوں کی نمائندگی کا بندوبست انتخاب کے جمہوری طریقے کے ذریعے کرو (۳) ان کونسلوں کو بہ تدریج حکومت کے کاروبار پر کنٹرول کرنے کا موقعہ دو (۴) اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں قابل ہندوستانیوں کو حصّہ دو اور (۵) اس ارتقائی عمل کا یہ مقصد پیشِ نظر رکھو کہ بالآخر ہندوستان میں تاجِ برطانیہ کے ماتحت وہی جمہوری خود مختار نظامِ حکومت رائج کیا جائے گا۔ جو دوسری برطانوی نوآبادیات میں رائج ہے۔ لیکن اس پروگرام میں مسلمانوں کی جگہ کہاں تھی جو عددی اقلیت میں تھے۔ تعلیم میں پسماندہ تھے اور ان کے خلاف ہندوؤں کی جانب سے محسوس اور غیر محسوس طریقوں پر ایسی اقتصادی اور کلچرل جنگ جاری تھی جو انھیں دو الگ الگ اور باہم متحارب قومیں قرار دیتی تھی؟ یہیں سے سرسید کی تحریک کا کانگریس سے بنیادی اختلاف شروع ہوا۔ سرسید کا نقطۂ نگاہ ان کے ایک مشہور قول سے بہ خوبی واضح ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ[1] فرمایا تھا کہ انگریزوں سے تختِ حکومت خالی کرانے کے بعد دو قومیں ایک ہی تخت پر

---

[1] ۱۸۸۸ء کی ایک تقریر میں

بیٹھ کر مساوی اختیارات کی مالک کس طرح بن سکیں گی؟ لازماً ایک قوم حاکم بنے گی اور دوسری کو محکوم بننا پڑے گا۔ لہٰذا ان کے نزدیک جمہوری نظام حکومت کا مقصد ہی غلط تھا اور اس مقصد کی جانب ہر قدم غلط تھا۔

سرسیدؒ کی "تحریک علی گڑھ" کا سیاسی پہلو محض ضمنی تھا۔ اس کا اصل مقصد مسلمانوں کو جہد للبقاءؑ کے لیے سب سے ضروری ہتھیار یعنی تعلیم جدید سے مسلح کرنا تھا۔ ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اور سیاسی مسائل کے متعلق ان کے نقطہ نگاہ کی ترجمانی اور وکالت کے فرائض ایک اور جماعت سر انجام دینے لگی تھی۔ یہ سید امیر علی کی قائم کی ہوئی نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن تھی۔ سید امیر علی نے بہت بھاگ دوڑ کر کے اس جماعت کی شاخیں مختلف صوبوں میں پھیلائیں اور وہ اس جماعت کی طرف سے بار بار وائسرائے اور صوبائی گورنروں کے پاس وفد لے گئے اور اہم زمانے کے تفصیلی مسائل کے متعلق حکومت کے ساتھ اور جب انڈین نیشنل کانگریس معرض وجود میں آئی تو اس کے ساتھ گفت و شنید کرتے رہے۔ لیکن سید امیر علی کا سیاسی فکر بھی اسی نقطے سے شروع ہوتا تھا کہ مختلف قوموں کے اس ملک میں مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں جسے زیادہ وسائل رکھنے والی ہندو اکثریت کے مقابلے میں اپنے مفاد اور مستقبل کی حفاظت کرنی چاہیے۔ انھوں نے کانگریس کے ساتھ تعاون کا راستہ نکالنے کی کوشش کی لیکن دو تین سال کے اندر انھیں بھی اپنی جماعت کی مجلس عاملہ کی زبان سے یہ وضاحتی اعلان کرنا پڑا کہ "ہمیں کانگریس کے بعض مقاصد سے ہمدردی ہے اور اس تحریک کے قائدین کا احترام ہے لیکن ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ کانگریس کے پورے پروگرام کو اپنانے کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کی سیاسی موت ہے"[1]۔ سید امیر علی ۱۸۹۰ء میں ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے اور میدان سیاست سے ہٹ گئے۔ ان کی غیر حاضری میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن آہستہ آہستہ بے عملی کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ سر سید احمد ۱۸۹۸ء میں وفات پا گئے لیکن ان کے قائم کردہ ادارے علی گڑھ کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس زندہ رہے اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی

---

[1] مرکزی نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی کمیٹی کی رپورٹ بابت ۸۸-۱۸۸۵ء۔ اس ایسوسی ایشن کا ریکارڈ نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے

تحریک کی قیادت کرتے رہے۔ سید امیر علی ۱۹۰۴ء میں ججی کے عہدے سے ریٹائر ہو کر پھر مسلمانوں کی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ وہ اس تاریخی وفد میں بھی شریک تھے جس نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے لارڈ منٹو کے سامنے پیش ہو کر پہلی مرتبہ لیجسلیٹو کونسلوں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ مطالبہ بیّن طور پر دو قوموں کی حقیقت کے احساس پر مبنی تھا۔

اس وفد کے متعلق ایک روایت یہ مشہور ہوئی کہ جداگانہ انتخاب کے مطالبے کا خیال خود لارڈ منٹو نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کی معرفت جو علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچ بولڈ کا ذاتی دوست تھا۔ نواب محسن الملک کے ذہن میں ڈالا تھا۔ اصل واقعہ غالباً یہ تھا کہ نواب محسن الملک نے آرچ بولڈ کی معرفت ان آئینی اصلاحات کے بارے میں سرکاری حلقوں سے صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جن کی آمد آمد کی خبریں اس زمانے میں مشہور ہو رہی تھیں۔ آرچ بولڈ اور وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کی ذاتی ملاقات کی بنا پر بعض لوگوں نے ایک افسانہ گھڑ لیا۔ بہرحال اہم نکتہ یہ نہیں کہ ان دو انگریزوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ جو اصلاحات آنے والی تھیں ان کے پیش نظر ستر (۷۰) سرکردہ مسلمانوں کا اجتماع۔ جس میں اس زمانے کے مسلمانوں کے بہترین دماغ شامل تھے۔ اس نکتے پر متفق تھا کہ لیجسلیٹو کونسلوں کی مجوزہ ساخت میں اگر مسلمانوں کے علیحدہ ووٹ سے منتخب ہونے والے نمائندوں کے لئے نشستیں مخصوص نہ کی گئیں تو ان کی صحیح نمائندگی کا انتظام نہ ہو سکے گا۔ پھر جداگانہ نیابت کا مطالبہ بہ آسانی منظور بھی نہ ہوا۔ وائسرائے کی سفارش اس کے حق میں تھی۔ لیکن وزیر ہند لارڈ مارلے بہت دیر تک اس بات پر ضد کرتے رہے کہ مسلمانوں کے لئے چند نشستیں (مخلوط نشستوں کے علاوہ) بے شک مخصوص کر دی جائیں۔ لیکن ان نشستوں کو بھی غیر مخصوص نشستوں کی طرح مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے ووٹ سے پُر کیا جائے۔ پھر سید امیر علی، ۲۷ جنوری ۱۹۰۹ء کو مسلم لیگ کی جانب سے ایک وفد لندن میں لارڈ مارلے کے پاس لے گئے۔ اس وفد نے نہ صرف اس نکتے پر زور دیا کہ مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کا بندوبست ان کے علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب کے بغیر نہیں ہو سکتا بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کی گئی تو ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک میں بھی اس کا ناخوشگوار ردِ عمل ہو گا۔ وفد نے ایک مطالبہ یہ بھی کیا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ایک ہندوستانی کو جگہ دی گئی ہے

جو ہندو ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور نشست کا اضافہ کر کے ایک مسلمان کے لئے بھی جگہ نکالنی چاہیئے۔

۱۰-۱۹۰۹ء تک مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ یہی رہا کہ ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے نام پر کانگریس جو مطالبے کر رہی ہے ان سے صرف ہندو اکثریت کو فائدہ پہنچتا ہے اور مسلمانوں کے مفاد اور قومی وجود کے لئے خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو اس خطرے سے اپنی حفاظت کی فکر کرنی چاہیئے اور اپنی حفاظت کے لئے حکومت کی مدد اور دست گیری پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی نگرانی اور وکالت کے لئے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے ختم ہونے کے بعد کوئی مستقل سیاسی پلیٹ فارم نہ رہا تھا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے مسلمان اکابر نے جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں ڈھاکہ میں جمع تھے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو اسی کانفرنس کے پنڈال میں ایک علیحدہ اجلاس منعقد کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ جب اس نئی جماعت کا آئین مرتب کیا گیا تو اس کے مقاصد اسی مذکورہ بالا نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان مقاصد میں تین امور درج کئے گئے۔ (۱) حکومت کی وفاداری (۲) مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ اور (۳) اس مقصد کو کوئی گزند پہنچائے بغیر اس ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان صلح اور آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش۔

پھر واقعات کا ایک ایسا سیلاب آیا جس نے مسلمانوں کی ذہنی کیفیت میں تیز رفتار تبدیلیاں پیدا کیں۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کے کانگریس سیشن منعقدہ الٰہ آباد کا صدر ایک انگریز ریٹائرڈ افسر سر ولیم ویڈربرن[1] تھا۔ اس نے صدارت کا اعزاز قبول کرتے ہی ہندوستان کی سیاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی خاص کوشش کی اور ممتاز ہندو اور مسلمان لیڈروں کو باہمی مذاکرات کے لئے ایک کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ کانفرنس جنوری ۱۹۱۱ء میں الٰہ آباد ہی میں منعقد ہوئی۔ اس میں کانگریس کے ہندو لیڈروں کے علاوہ مسٹر جناح بھی موجود تھے جو اس وقت تک مسلم لیگ سے الگ تھلگ رہے تھے اور اس جماعت کے رویہ پر صرف دور سے

---

[1] Sir William Wedderburn

افسوس کرتے رہے تھے۔ بلکہ کانگریس کے اسی دسمبر ۱۹۱۶ء والے سیشن میں انھوں نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو مزید وسعت دینے کے خلاف ایک قرارداد پیش کی تھی[1]۔ اس زمانے کی مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرنے والے جو مسلمان الٰہ آباد کی اتحاد کانفرنس میں شریک ہوئے ان میں مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خاں قابلِ ذکر ہیں۔

ہندو مسلم مفاہمت کے نقطۂ نگاہ سے یہ کانفرنس چنداں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ کم از کم اس کا کوئی فوری نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ لیکن اس میں جو مسلمان شریک ہوئے ان کے باہمی رابطے اور گفتگو سے مسٹر جناح اور مسلم لیگی لیڈروں کے درمیان آئندہ تعاون کی بنیاد قائم ہو گئی۔ یہیں سے مسٹر جناح کے ذہن میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تعاون کی راہ نکالنے کا منصوبہ قائم ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک قومی معاہدے اور سمجھوتے کے تصوّر کا ایک لازمی عملی جزو یہ بھی تھا کہ سمجھوتہ دو منظم جماعتوں کے درمیان ہو۔ اس لحاظ سے مسلم لیگ کا علیحدہ وجود قائم رکھنا بھی ضروری اور مفید قرار پاتا تھا۔

آئندہ چند برسوں میں مسٹر جناح کے اس مشن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی ایک وجہ ان کی اپنی لگن اور مستقل کوشش تھی۔ دوسری وجہ بعض ایسے حالات تھے جو ان کے مشن کی مدد کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر عالمِ اسلام میں پے در پے ایسے واقعات رونما ہوئے (تقسیم بنگال کی تنسیخ۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے سلسلے میں برطانیہ کا رویہ۔ مغربی طاقتوں کا ایران پر تسلّط۔ مسجد کانپور کے ہنگامے میں مسلمانوں پر فائرنگ وغیرہ) جو مسلمانوں کے ذہن پر اثرانداز ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ اسی زمانے میں ادب و صحافت کے چند درخشاں ستارے مسلمانوں کی قومی زندگی کے افق پر جگمگائے (مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خاں اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال) جن کی ادبی اور صحافتی سرگرمیوں نے ان واقعات کے حوالے سے مسلمانوں کے ذہن میں تلاطم پیدا کر دیا۔ ان صاحبان کی سرگرمیوں کا اصل محرک مسلم قومیت بلکہ پان اسلامزم کا جذبہ تھا۔ ان کی تحریروں

---

[1] "محمد علی جناح۔ ایک سیاسی جائزہ" (انگریزی زبان میں) مصنفہ ایم ایچ سید ص ۳۷

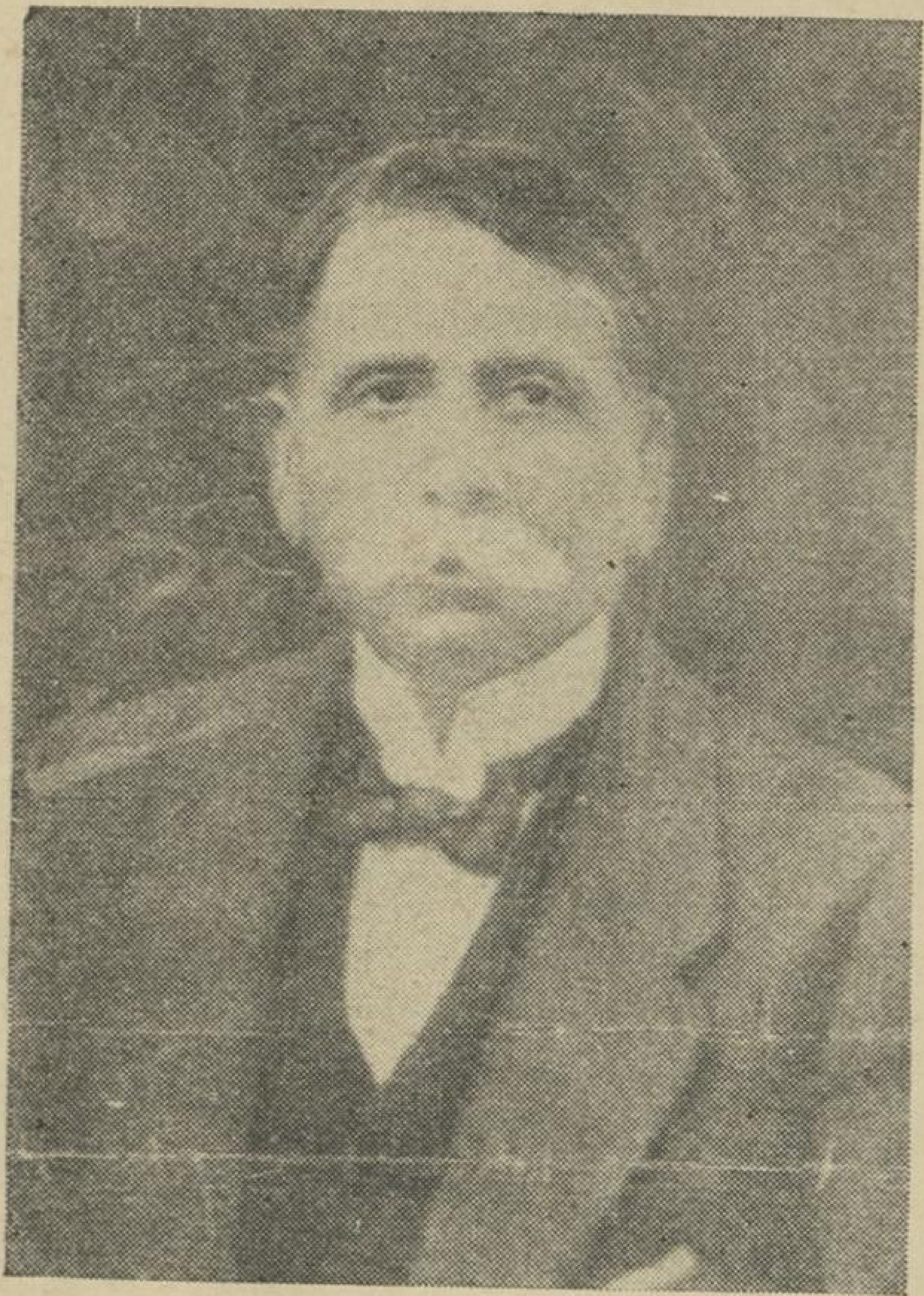
اور تقریروں نے مسلمانوں کے اندر اسی جذبے کو بیدار تر اور مضبوط تر کیا لیکن ساتھ ہی اس کا رُخ مستقل طور پر برطانوی سامراج کے خلاف موڑ دیا۔ نظریاتی بنیاد کے اعتبار سے ان کا پیغام ہندو اور مسلمان کے درمیان امتیاز کو زیادہ گہرا کرنے والا تھا۔ لیکن عملی سیاست میں برطانوی سامراج کی مخالفت کے جذبے نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے قریب تر لانے اور ملک کی آزادی کے مقصد پر ان کے ساتھ متفق کرنے میں (جو مسٹر جناح کا اصل مشن تھا) مدد دی۔

مسٹر جناح کے مشورے اور کوشش سے مسلم لیگ کے لیڈر بہت تامل اور طویل غور و خوض کے بعد اپنے آئین میں ترمیم کرنے پر راضی ہو گئے۔ مارچ ۱۹۱۳ء کے اجلاس میں جو سر محمد شفیع کے زیر صدارت لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ لیگ کے مقاصد میں رد و بدل کر کے ان میں "ہندوستان کے لئے خود مختار نظام حکومت" کا مطالبہ شامل کر لیا گیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ خود مختار نظام حکومت "اس ملک کے مخصوص حالات کے مطابق" ہونا چاہیے۔ یہ فارمولا ایسا تھا جس پر کسی کانگریسی لیڈر کو بھی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ مسٹر جناح نے لیگ کی رسمی ممبری چند مہینوں کے بعد ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۳ء میں قبول کی۔ یہ رسم لندن میں ادا ہوئی۔ مسز سروجنی نائیڈو نے اپنے ایک مضمون میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن مسلم لیگ کے ایک مشن پر لندن گئے تھے۔ مسٹر جناح ایک اور سلسلے میں وہاں مقیم تھے۔ وہیں مسلم لیگ کے دونوں نمائندوں کے زور دینے پر مسٹر جناح نے لیگ کی ممبری کے فارم پر دستخط کر دیئے۔ لیکن آپ نے یہ واضح کر دیا کہ میں مسلم لیگ کے کسی ایسے اقدام کی حمایت نہ کر سکوں گا۔ جو پورے ملک کے مجموعی مفاد کیلئے نقصان دہ ہو۔ اس طرح مسٹر جناح بہ یک وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے ممبر بن گئے اور دونوں جماعتوں کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ آپ اپنے مقصد کی جانب قدم بڑھاتے رہے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی اور ٹرکی برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو گیا۔ ٹرکی کو ہندوستان کے مسلمان عالمی ملتِ اسلامیہ کا آخری سیاسی قلعہ سمجھتے تھے اور طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے زمانے میں اس کے ساتھ والہانہ ہمدردی کا اظہار کر چکے تھے۔ ٹرکی کا سلطان رسمی طور پر خلافتِ اسلامیہ کا روائتی منصب رکھتا تھا۔ اس منصب کے ساتھ جو رہی سہی سیاسی طاقت موجود تھی۔ اس کے لئے خطرہ پیدا ہوا تو مسلمانوں کے دلوں میں



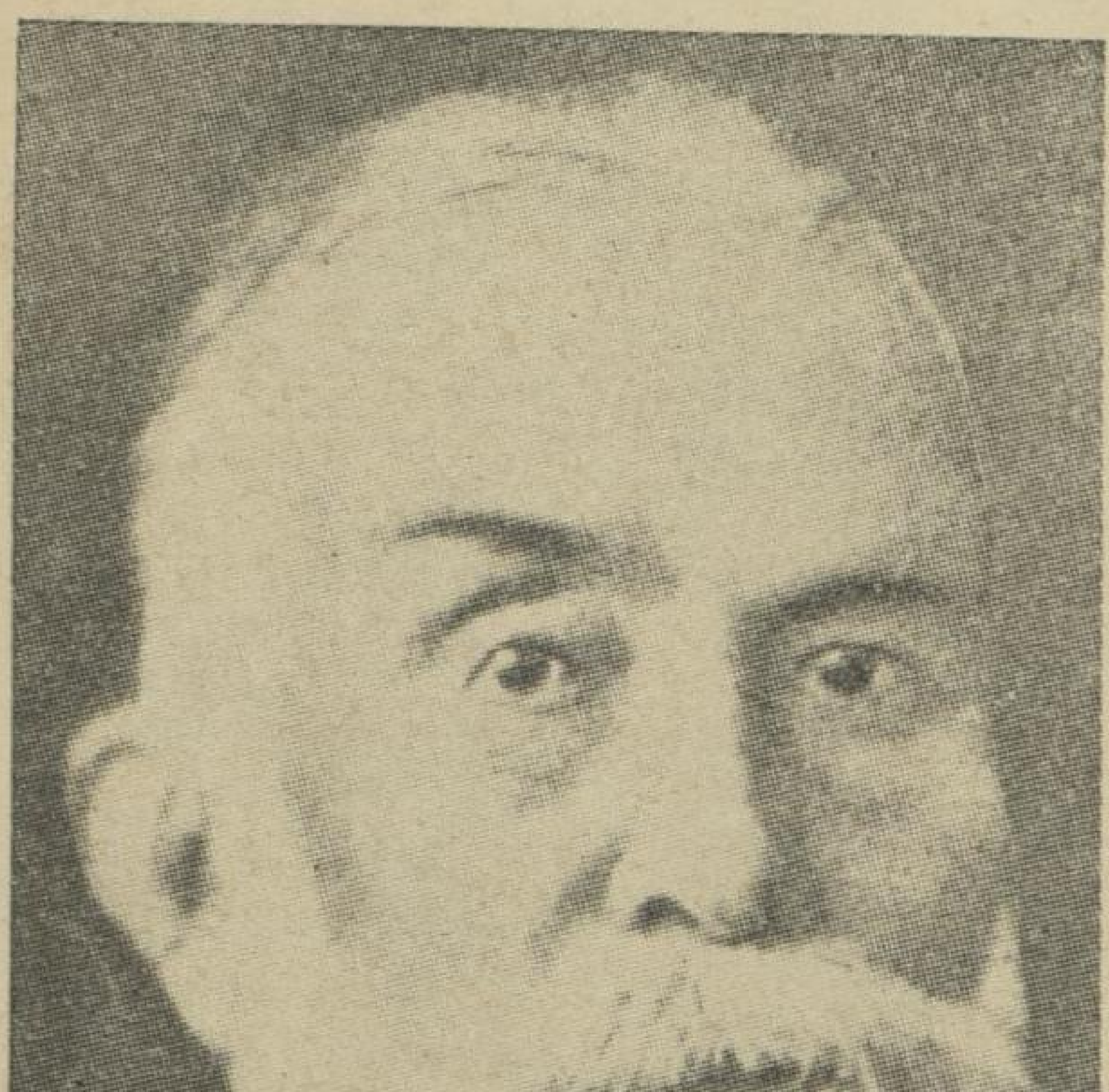
سر سید احمد



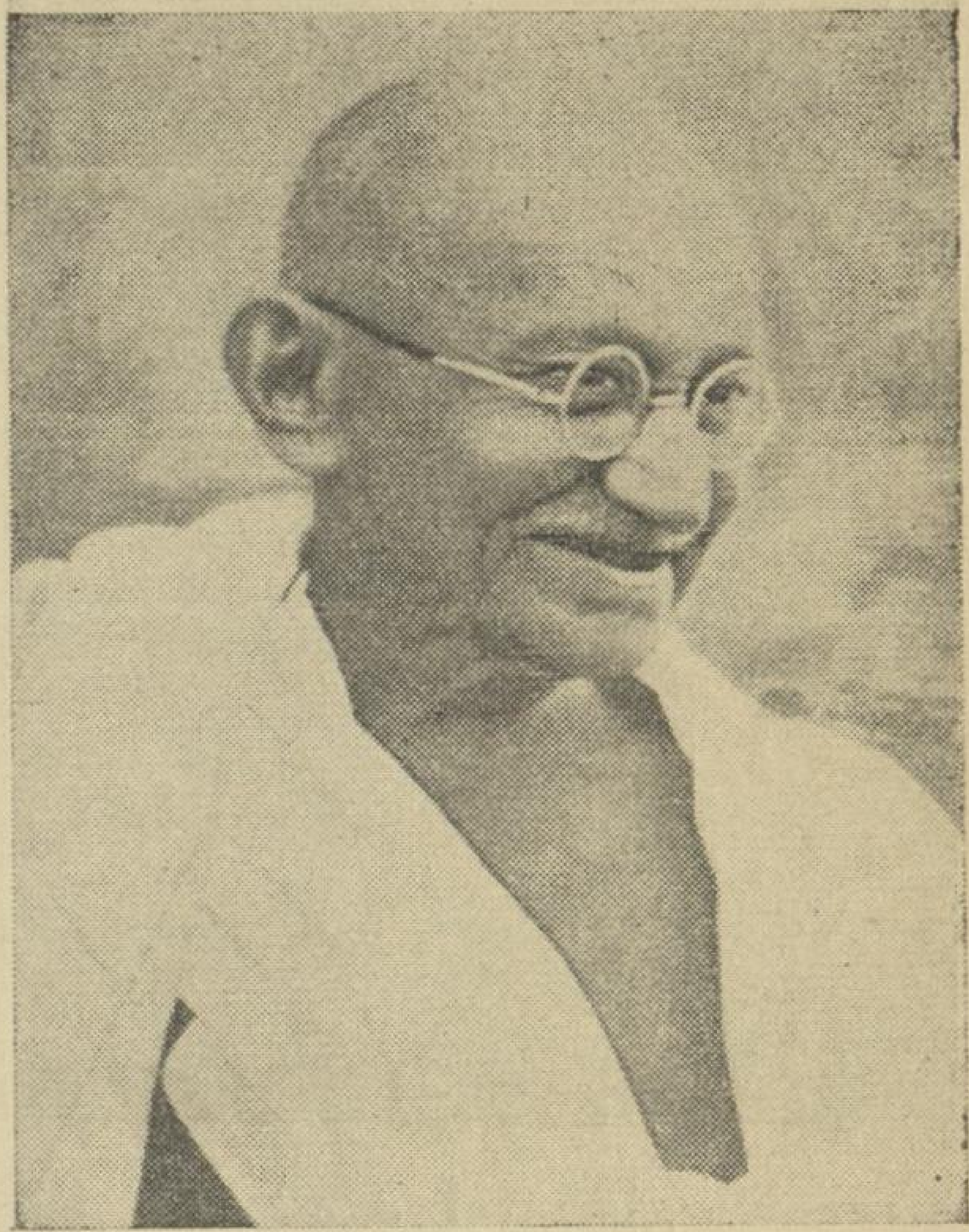
سید امیر علی



نواب محسن الملک



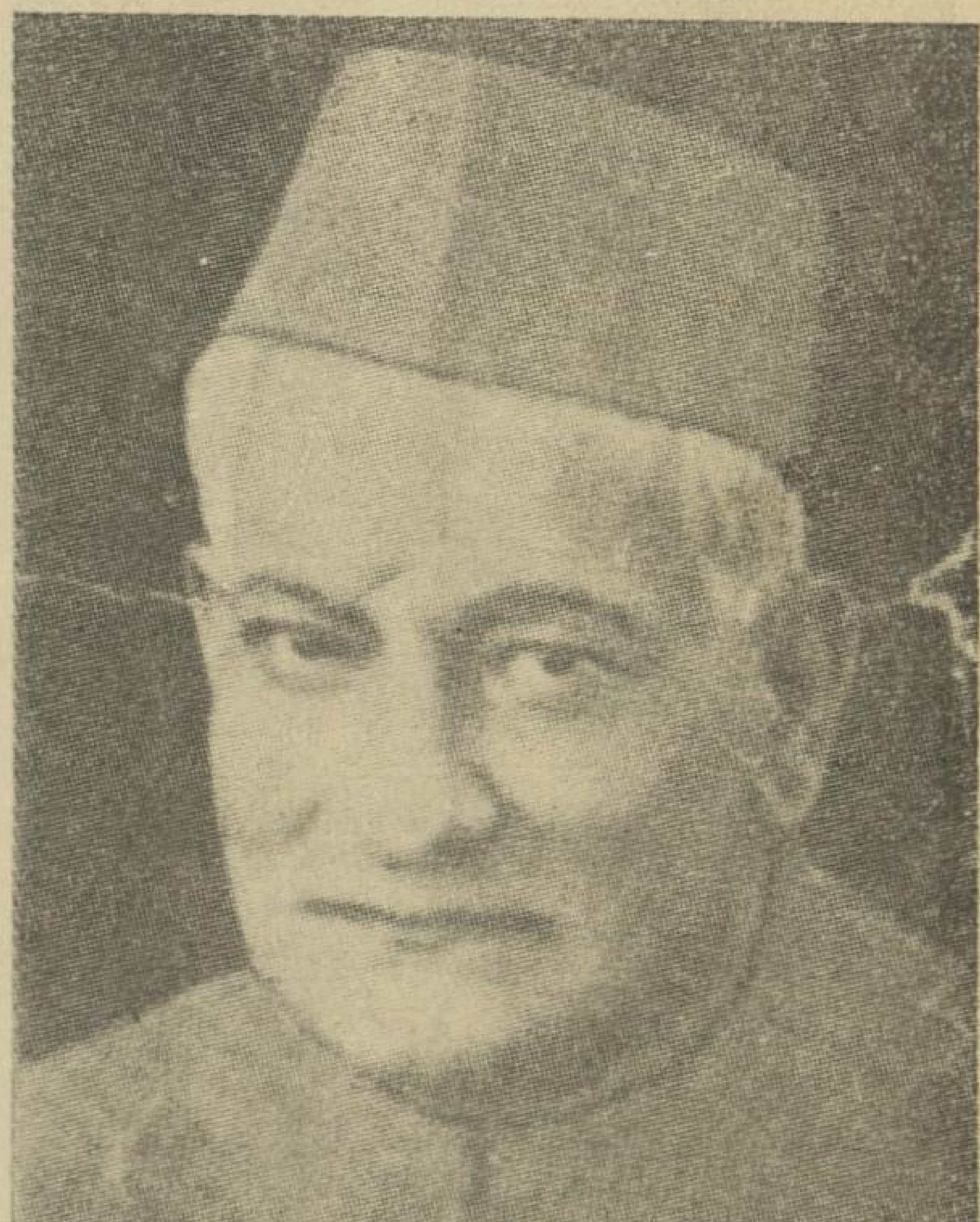
سید حسین بلگرامی



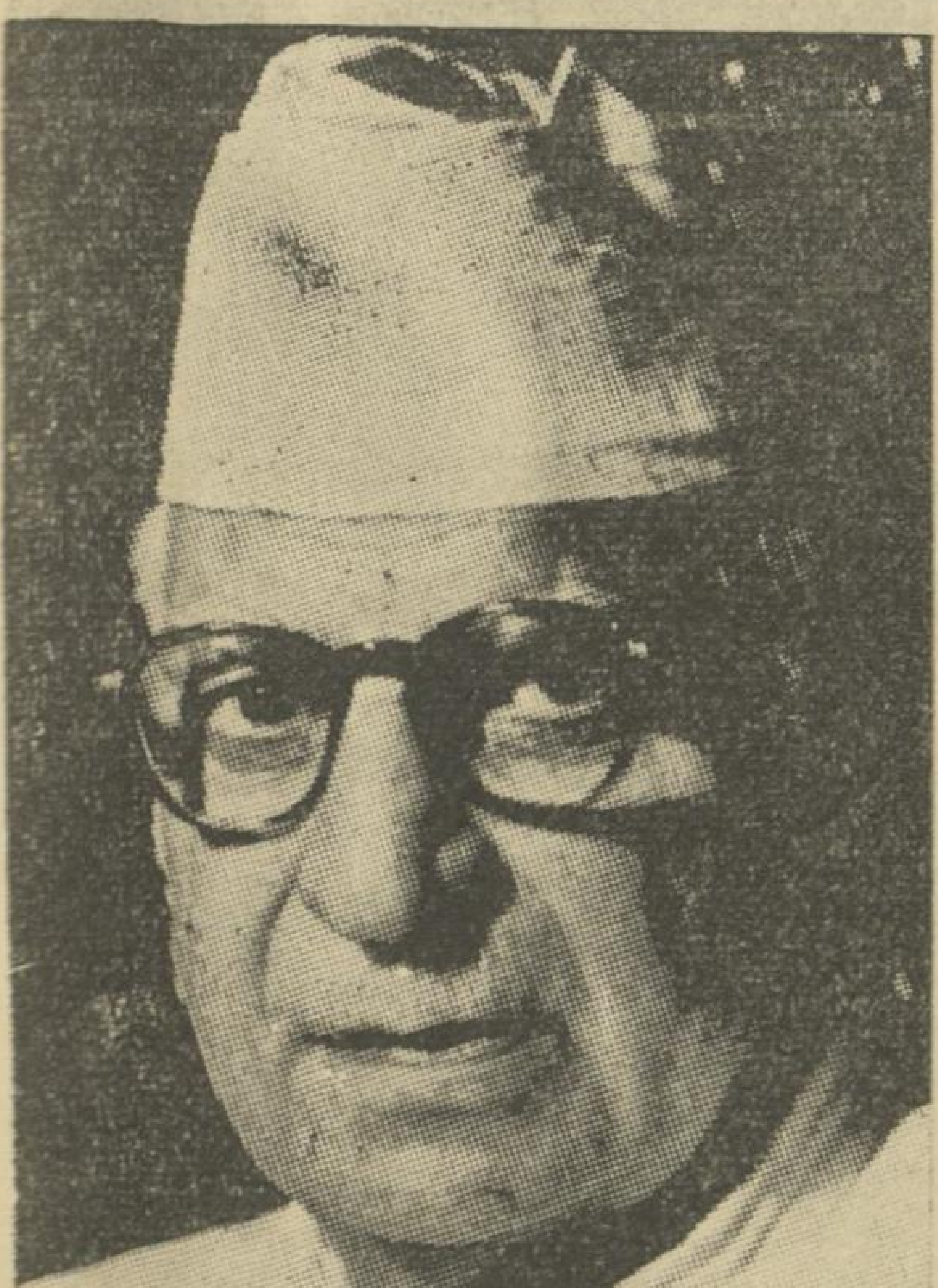
مہاتما گاندھی



مولانا محمد علی جوہر



پنڈت موتی لال نہرو



ڈاکٹر سیف الدین کچلو

اضطراب بڑھ گیا۔ ان میں بعض حساس افراد ایسے بھی تھے جن پر اس صورتِ حال کا ردِ عمل بہت عجیب ہوا۔ وہ اس جنگ کو عالمی سطح پر اسلام اور برطانوی سامراج کے درمیان ٹکر سمجھتے تھے اور یہ سمجھ کر برطانیہ کو شکست دینے کی غرض سے ہندوستان پر باہر سے حملہ کرانے اور اندر سے مسلح بغاوت کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد اور مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ شامل تھے۔ اس سلسلے میں کچھ ادھورے منصوبے بنائے گئے۔ لیکن حکومت نے شبہات کی بنا پر ابتدائی مراحل ہی میں ان صاحبان کو ہندوستان کے اندر یا ہندوستان سے باہر مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔

مسلمانوں کے دلوں میں حکومت برطانیہ کی مخالفت کا جذبہ ترقی کرتا رہا۔ اور یہ چیز مسٹر جناح کے مشن میں مدد دیتی رہی۔ آپ نے مسلم لیگ کو دسمبر ۱۹۱۵ء میں اپنا سالانہ اجلاس کانگریس کے ساتھ ایک ہی شہر (بمبئی) میں ملی جُلی تاریخوں میں منعقد کرنے پر راضی کر لیا۔ یہاں مسٹر جناح نے دونوں جماعتوں کی کمیٹیاں اس غرض سے مقرر کرائیں کہ وہ باہم مشورے اور گفت و شنید کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی سمجھوتے کا راستہ نکالیں۔ آئندہ سال کے دوران میں ان کمیٹیوں نے ہندوستان کے آئندہ سیاسی مطالبات کے متعلق ایک سکیم پر اتفاق کر لیا۔ اور اس سکیم کو دونوں جماعتوں کے اگلے سالانہ جلسوں میں جو دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ رسمی منظوری دے دی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر ۱۹۱۵ء کے اجلاس سے پہلے ہی نظر بند کر دئیے گئے تھے۔ لکھنؤ میں جو سمجھوتہ ہوا اس کے متعلق یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اس میں آئندہ آئینی اصلاحات کے سلسلے میں صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کی انتخاب کے ذریعے پُر کی جانے والی نشستوں میں مسلمانوں کا تناسب مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن اس سمجھوتے میں مسلمانوں کے تحفظ کے نقطۂ نگاہ سے اصل اہمیت رکھنے والی ایک اور شق بھی شامل تھی جو بہت کم لوگوں کو یاد ہے۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر کسی مجلس قانون ساز کا کوئی غیر سرکاری ممبر ایسی قرارداد یا مسودۂ قانون پیش کرے جسے کسی فرقے کے ممبروں کی تین چوتھائی اپنے فرقے کیلئے نقصان دہ یا ناقابلِ قبول قرار دے دے تو ایسا بل یا ایسی قرارداد زیرِ بحث نہ لائی جا سکے گی۔ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کا مسودہ مرتب کرتے وقت کانگریس۔ لیگ سمجھوتے کی

اس شق کو ایکٹ میں شامل کرنا منظور نہ کیا۔ حکومت کی دلیل یہ تھی کہ کسی فرقے کے ہاتھ میں اس قسم کے "ویٹو" کا حق غیر سرکاری قانون سازی کے کام میں مکمل تعطل پیدا کر سکتا ہے۔ البتہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ میں کونسلوں کی نشستوں کی تقسیم کا وہ فارمولا من وعن شامل کر لیا گیا جس پر کانگریس اور لیگ نے اتفاق کیا تھا۔ اس فارمولے کے تحت مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں میں انھیں بلحاظ آبادی کے تناسب سے کافی زیادہ نمائندگی دی گئی تھی۔ لیکن اس کے بالعوض پنجاب اور بنگال میں ان کی نمائندگی کے تناسب میں اتنی تخفیف کر دی گئی تھی کہ ان صوبوں میں بھی مسلمان نمائندے منتخب شدہ ممبروں میں اقلیت بن کر رہ گئے۔

۱۹۱۶ء کے سمجھوتے نے وقتی طور پر مسٹر جناح کا خواب پورا کر دیا۔ مسلم لیگ نے عملی طور پر کانگریس کی چھوٹی بہن کی حیثیت قبول کر لی اور بڑی بہن کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگی۔ دونوں جماعتیں ایک ہی شہر میں ملی جلی تاریخوں میں اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرتی تھیں اور دونوں کے پلیٹ فارموں سے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے متعلق یکساں نقطۂ نگاہ پیش کیا جاتا تھا۔ ہندو نیشنلزم اور مسلم نیشنلزم کے دھارے وقتی طور پر ایک ہی سمت میں بہنے لگے تھے۔ پھر ہندوستان کی سیاست کا وہ دور آیا جب باہم اتحاد و تعاون کا یہ رجحان اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گیا۔ اور اس نے مہاتما گاندھی کی زیر قیادت ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف اور پھر خلافت اور سوراج کے سوال پر طوفانی تحریکوں کی صورت اختیار کر لی۔ مسٹر جناح ان تحریکوں کے طریق کار سے اتفاق نہ کرتے تھے۔ وہ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے اور کچھ عرصے کیلئے پس منظر میں چلے گئے۔ مسلم لیگ معطل ہو گئی اس کی جگہ مسلمانوں کی قیادت عارضی طور پر خلافت کمیٹی کے ہاتھ میں آگئی۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کا یہ مختصر دور دو قوموں کے درمیان نئی اور طویل کش مکش کا پیش خیمہ بن گیا۔ اور یہ کش مکش بالآخر ہندوستان کی تقسیم پر منتج ہوئی۔

"مارشل لا سے مارشل لا تک" کے مضامین کا سلسلہ ۱۹۱۹ء کے ہنگامہ خیز واقعات سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک متحدہ ہندوستان میں اور اس کے بعد اکتوبر ۱۹۵۸ء تک پاکستان میں جو سیاسی حالات کارفرما رہے۔ ان کی جھلکیاں، فقط جھلکیاں، ان مضامین میں پیش کی گئی ہیں۔ جن لوگوں کو اتفاقات زمانہ سے اس چالیس سالہ زمانے کے

اہم واقعات کا بہت قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کا اور اس زمانے کی سیاست کے پیچ وخم کو سمجھنے کا خاص موقعہ ملتا رہا۔ ان میں راجہ غضنفر علی خاں مرحوم ومغفور نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک مجوزہ کتاب کے لئے کارآمد مواد کے طور پر اپنی یادداشت اور معلومات پر مبنی نوٹ اپنی زندگی کے آخری دور میں راقم الحروف کے حوالے کئے تھے ان مضامین کا بنیادی ماخذ یہی مواد ہے۔ گو ان مضامین کو صرف اس مواد تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ راجہ صاحب مرحوم کے ذاتی مشاہدات اور تاثرات کو معلوم اور مستند تاریخی واقعات کے سیاق و سباق میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاید ان لوگوں کے لئے جو "تقسیم سے پہلے ہندوستان" اور "تقسیم کے بعد پاکستان" کے سیاسی حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ مواد کسی کام آسکے۔

۲۔ ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کا آنکھوں دیکھا حال

پنجاب میں ۱۹۱۹ء کا مارشل لا اس ملک گیر ایجی ٹیشن کا ایک شاخسانہ تھا۔ جو اسی سال فروری اور مارچ میں "رولٹ ایکٹ" کے خلاف شروع ہوا تھا۔ رولٹ ایکٹ بھی دراصل ایک بہانہ بن گیا تھا۔ یہ ایک چنگاری کی طرح بارود کے اس ذخیرے پر آگرا جو دیر سے آہستہ آہستہ جمع ہو رہا تھا۔

یورپ کی پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے زمانے میں ہندوستان میں سیاسی بے چینی کی ایک زبردست لہر آئی۔ اس کے لئے زمانۂ گذشتہ کی تاریخ آہستہ آہستہ راستہ تیار کرتی رہی تھی۔ مختلف عوامل کے زیر اثر اس ملک کی دونوں قوموں کے اندر انگریزی حکومت کیخلاف متحدہ سیاسی محاذ قائم کرنے کا رجحان زور پکڑ رہا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سیاسی مطالبات کے متعلق مکمل سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ ہندو نیشنلزم اور مسلم نیشنلزم کا رُخ ایک ہی مقصد کی جانب معلوم ہوتا تھا۔ ۲۰ر اگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی حکومت کی طرف سے وزیر ہند مسٹر ای۔ ایس مانٹیگیو نے ایک تاریخی اعلان کیا۔ جس میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے ساتھ یہ حتمی وعدہ کیا گیا کہ اس ملک میں برطانوی پالیسی کا مقصد بہ تدریج ایسی خود مختار حکومت قائم کرنا ہے جو مکمل طور پر ہندوستان کے نمائندوں کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ البتہ اس منزل کی جانب رفتار کا تعین حکومت برطانیہ اپنی صوابدید کے مطابق کرتی رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا کہ ذمہ دار حکومت کی پہلی قسط کے طور پر ایک نیا آئین جنگ کے فوراً بعد نافذ کر دیا جائے گا اور اس کی تیاری فوراً شروع کرنے کی غرض سے وزیر ہند عنقریب ہندوستان کا دورہ کریں گے۔ ایک طرف یہ وعدہ تھا اور برطانوی مدبّروں اور ان کے اتحادیوں کے یہ عام اعلان تھے کہ جنگ تمام دنیا کی قوموں کی آزادی کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ دوسری طرف ہندوستان میں جنگی ضروریات کے قوانین کے تحت برطانوی حکام کی عملی پالیسی میں

سخت گیری کا رجحان نمایاں تھا اور حکومت کے ایسے اقدامات جو سیاسی اور شہری آزادی کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ سیاسی لیڈروں کی جانب سے آئے دن لے دے ہوتی رہتی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ مسئلہ خلافت بیچ میں آگیا تھا۔ جو مسلمانوں کے دلوں میں خاص اضطراب پیدا کر رہا تھا۔ چار برس تک ہندوستان کے طول و عرض میں ہزاروں مسجدوں کے منبروں سے تحفظ خلافت کا مطالبہ دہرایا جاتا رہا۔ ۱۹۱۸ء کے شروع میں (ابھی جنگ ختم نہ ہوئی تھی) مہاتما گاندھی نے بھی اس مطالبے کی مکمل اور دوٹوک حمایت شروع کر دی تھی۔

جنگ کے زمانے میں سیاسی آزادی اور تحفظِ خلافت کے مطالبے ہوتے رہے اور حکومت کی جانب سے خاتمۂ جنگ پر مناسب کارروائی کے مبہم وعدے ہوتے رہے لیکن جب نومبر ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی اور وعدوں کے ایفا کا وقت آیا تو ایسے قرائن نظر آنے لگے کہ برطانوی حکومت بہت معمولی سیاسی اصلاحات دینے کے علاوہ کچھ اور کرنے پر آمادہ نہیں اور ترکی کے ساتھ بھی نرمی کا سلوک نہ کیا جائے گا۔ کشیدگی کی اس فضا میں "رولٹ ایکٹ" ایک بم کی طرح آگرا ـــــ یہ "رولٹ ایکٹ" کیا تھا؟ یہ اسی طرح کا ایک قانون تھا۔ جیسے ہمارے موجودہ پبلک سیفٹی قوانین ہیں۔ اس کے ذریعے حکومت کے افسروں کو یہ اختیارات دیئے گئے تھے کہ وہ وجہ بتلائے بغیر افراد کو نظر بند اور اخباروں کی زبان بند کر سکیں۔ "رولٹ ایکٹ" کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اس کا مسودہ ایک سرکاری کمیٹی کی سفارشات پر مبنی تھا۔ جس کے صدر کا نام سر سڈنی رولٹ تھا۔ اس کمیٹی کی سفارش کے مطابق دو متوازی قوانین کے مسودے تیار کئے گئے اور دونوں بل الگ الگ پاس ہو کر ایکٹ بنے۔ لیکن عوام نے دونوں قوانین کو اکٹھا کر کے اسے "رولٹ ایکٹ" کا جامع نام دے دیا۔

جب رولٹ ایکٹ کے مسودے سامنے آئے تو عام تاثر یہ ہوا کہ حکومت اپنے وعدوں کے متعلق بدنیت ہے اور آئندہ ایجی ٹیشن کو دبانے کے لئے یہ قوانین نافذ کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا "رولٹ ایکٹ" حکومت کی بدعہدی کا ایک نشان اور ایجی ٹیشن کا فوری نشانہ بن گیا۔ اس زمانے کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں سرکاری ممبروں کی اکثریت تھی۔ کونسل میں غیر سرکاری ممبروں نے جن میں مسٹر جناح پیش پیش تھے۔ ان قوانین کی سخت مخالفت کی۔ ابھی یہ قوانین زیر بحث تھے کہ

گاندھی جی نے ملک کے سامنے ایجی ٹیشن کا ایک نیا طریقہ پیش کر دیا۔ اگر یہ قانون پاس کر دئے گئے تو ان کے خلاف "ستیہ گرہ" کیا جائے۔ اس نئے اور اچھوتے نعرے نے فوراً دلوں اور دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ۲۴ر فروری کو گاندھی جی نے ۲۵ لیڈروں کی ایک کانفرنس بلائی۔ جنھوں نے متفقہ طور پر ان کے ساتھ "ستیہ گرہ" کے حلف نامے پر دستخط کر دیئے اور چند ہفتوں کے اندر ہزاروں پبلک جلسوں میں اس حلف نامے کو دہرایا گیا۔

مارچ ۱۹۱۹ء کے آخری ہفتے میں حکومت نے سرکاری ممبروں کے ووٹ سے رولٹ ایکٹ پاس کرالیا۔ ۲۸ر مارچ کو مسٹر جناح نے ایک زوردار خط کے ساتھ اپنا استعفا گورنر جنرل کو بھیج دیا۔ ساتھ ہی گاندھی جی نے اعلان کر دیا کہ ۳۰ر مارچ کو (جو اتوار تھا) ملک بھر میں ہڑتال کی جائے اور احتجاجی جلسے منعقد کئے جائیں۔ پھر اس خیال سے کہ وقت بہت کم تھا۔ ہڑتال اور احتجاج کا پروگرام اس سے اگلے اتوار (۶ر اپریل) تک ملتوی کر دیا گیا۔ لیکن تقریباً تمام بڑے شہروں میں دونوں اتواروں کو ہڑتال بھی ہوئی۔ جلسے بھی منعقد ہوئے اور جلوس بھی نکالے گئے۔ دہلی میں ۳۰ر مارچ کے جلوس کا پولیس کے ساتھ تصادم ہو گیا۔ پولیس نے گولیاں چلائیں۔ کئی زخمی ہوئے۔ لیکن پروگرام کے مطابق ۶ر اپریل کو وہاں پھر جلوس نکالا گیا۔

لاہور میں بھی دونوں اتواروں کو ہڑتال ہوئی۔ جلسے ہوئے اور جلوس نکلے اور پُرامن طریق پر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد ۹ر اپریل کو ہندوؤں کا رام نومی کا تہوار تھا۔ اس دن پھر دکانیں بند رہیں یعنی عملاً ہڑتال ہو گئی۔ رام نومی کا مذہبی جلوس مذہبی کم اور سیاسی زیادہ تھا۔ اس میں مسلمان بھی شریک تھے۔ اور "شری رامچندر جی کی جے" کے ساتھ "گاندھی جی کی جے" اور "ہندو مسلم کی جے" کے نعرے بھی لگائے جا رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے جذبات دلوں سے اُبل رہے تھے۔ اس جلوس میں (لاہور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ) ہندو اور مسلم عوام ایک ہی برتن میں پانی پی کر اور ایک ہی برتن سے پوریاں اور مٹھائی کھا کر "ہندو مسلم ایک ہیں" کے مظاہرے کر رہے تھے۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح پنجاب میں بھی یہ مظاہرے امن و امان سے گزرتے رہتے۔ لیکن پنجاب میں ایک سرپھرے اور جابر گورنر (مائیکل اڈوائر) کی حکومت تھی۔ جس کے اندر سامراجیت کا جذبہ تقریباً جنون کی حد تک موجود تھا۔ اس کا چیف سیکریٹری (طامسن) بھی تقریباً

اسی ذہنیت کا انگریز تھا۔ اڈوائر اور ٹامسن اس روایتی "وفاداروں" کے صوبے میں اس قسم کی ایجی ٹیشن کو برداشت نہ کر سکے۔ اور غیر ضروری سخت گیری پر تُل گئے۔ لاہور اور امرتسر میں جگہ جگہ فوجی دستے پیش بندی کے طور پر متعین کر دئے گئے۔ پولیس والوں کو لاٹھیاں اور بندوقیں تیار رکھنے کے حکم مل گئے۔ خطرناک لیڈروں کی نظر بندی کے پروگرام بن گئے۔

ادھر لاہور میں رام نومی کا جلوس ختم ہو رہا تھا۔ ادھر پنجاب کی مشرقی سرحد کے آخری ریلوے سٹیشن (پلول۔ ضلع گوڑگاؤں) پر ایک کپتان پولیس، گاندھی جی کا پنجاب میں داخلہ روکنے کے لئے پولیس کے ایک دستے کے ساتھ کھڑا تھا۔ گاندھی جی کی ٹرین سٹیشن پر پہنچی تو ان پر آرڈر کی تعمیل کرائی گئی۔ انھوں نے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا جس پر انھیں پولیس کی حراست میں واپس بمبئی روانہ کر دیا گیا۔

اگلی صبح کو پہلا وار امرتسر میں ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال پر ہوا۔ ڈپٹی کمشنر نے ان دونوں کو علی الصباح اپنے بنگلے پر بلایا۔ بنگلے کے عقبی دروازے پر ایک موٹر کار کھڑی تھی۔ چند لمحوں کے اندر پولیس کے سپاہی دونوں لیڈروں کو ساتھ لے کر اس کار کے اندر بیٹھ گئے۔ کھڑکیاں بند کر لی گئیں اور کار دھرمسالہ کے لئے روانہ ہو گئی۔ جب کئی گھنٹے تک کچلو اور ستیہ پال اپنے گھروں میں واپس نہ آئے تو ان کی گرفتاری کی افواہ شہر میں پھیل گئی۔ ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ اور "ہمارے لیڈروں کو رہا کر دو یا ہمیں بھی گرفتار کر لو"۔ اور اسی قسم کے نعرے لگاتا ہوا ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی جانب چل پڑا۔

ریلوے کے پُل پر جو شہر اور سول لائنز کے درمیان حدّ فاصل تھا۔ پولیس کے ایک مسلّح دستے نے ان کا راستہ روک لیا۔ پولیس کے ساتھ جو افسر تھے وہ مجمع کو منتشر کرنے کے لئے افہام و تفہیم کی کوشش کرنے لگے۔ مجمع کے چند جوشیلے افراد افسروں سے بحث کر رہے تھے اور گفتگو جاری تھی کہ مجمع کا عقبی حصّہ پُل کے نیچے ریلوے لائن پر پھیل گیا۔ وہاں سٹیشن کے قریب ایک فوجی دستے کا کیمپ تھا۔ اور سنتری پہرے پر تھے۔ ایک سنتری نے لوگوں کو اسٹیشن کی طرف بڑھتے دیکھا تو گولی چلا دی۔ گولی کی آواز سُن کر مجمع کا وہ حصّہ جو افسروں سے بات چیت کر رہا تھا مشتعل ہو گیا اس کے بعض افراد نے پولیس پر خشت باری کی۔ جواب میں پولیس نے فائرنگ کر دی اور مجمع شہر

کی طرف بھاگا۔ چند غنڈوں نے فوراً اس مشتعل انبوہ کی لیڈری سنبھال لی۔ سامنے انگریزوں کے دو بنک آ گئے۔ غنڈوں نے فوراً نعرہ لگایا۔ "انھیں لوٹ لو۔ آگ لگا دو"۔ مجمع کے لوگ بنکوں کے اندر گھس گئے۔ دو انگریز ملازم جان سے مار دیئے گئے۔ فرنیچر کو آگ لگا دی گئی۔ چند گھنٹے شہر میں بدامنی اور تشدد کے واقعات ہوتے رہے۔ سب سے افسوسناک واقعہ یہ تھا کہ ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر مس شرووڈ کو۔ جو ایک نیک دل اور انسانی ہمدردی رکھنے والی عورت مشہور تھی اور بائیسکل پر جا رہی تھی۔ کسی نے ڈنڈا دے مارا۔ وہ گر پڑی اور سائیکل چھوڑ کر ایک گلی میں بھاگی۔ غنڈوں نے اس کا تعاقب کیا اور گلی کے اندر اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ جب غنڈے چلے گئے۔ تو گلی میں رہنے والوں نے اپنے مکانوں کے دروازے کھولے۔ بے ہوش لیڈی ڈاکٹر کو اٹھا کر ایک مکان میں لے گئے۔ وہاں اسے ہوش میں لائے اور موقعہ پا کر اسے ہسپتال چھوڑ آئے۔ چند دنوں کے بعد وہ انگلستان واپس چلی گئی۔

قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو جب دو دن کے بعد امرتسر شہر فوج کے حوالے کیا گیا تو فوج کے کمانڈر جنرل ڈائر نے دوسری انتقامی کارروائیوں کے علاوہ ایک حکم یہ بھی دیا کہ جس گلی میں مس شرووڈ کو پیٹا گیا تھا اس سے لوگ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گذریں۔ گلی کے دونوں سروں پر فوجی سپاہی متعین تھے۔ جو اس حکم کی تعمیل کراتے تھے۔ اس حکم کا تختہ مشق وہی لوگ بنے جنھوں نے مس شرووڈ کی جان بچائی تھی اور تھوڑی بہت تیمارداری کی تھی۔ دوسرے لوگوں کے لئے یہ ممکن تھا کہ اس گلی کے قریب ہی نہ جائیں۔ لیکن اس گلی کے رہنے والوں کے لئے گلی کا استعمال ناگزیر تھا۔

بہرحال چند گھنٹوں کی متشددانہ کارروائیوں کے بعد فسادی منتشر ہو گئے۔ اس دن امرتسر میں پانچ انگریز مارے گئے۔ دو بنکوں اور چار سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچا۔ لیکن چند گھنٹوں کا یہ فساد آئندہ سلسلۂ واقعات کا نقطۂ آغاز بن گیا۔

لاہور میں گاندھی جی کی گرفتاری کی افواہ اور امرتسر کے واقعات کے متعلق جھوٹی سچی افواہیں بیک وقت پھیل گئیں۔ شام کے پانچ بجے تک (یہ ۱۰ را پریل کا واقعہ ہے) بھر دکانیں بند ہو گئیں اور لوگ بازاروں میں جمع ہو گئے۔ انار کلی میں ایک مجمع اکٹھا ہونا شروع ہوا۔ کچھ کالجوں کے لڑکے اور باقی تماشائی اس میں شامل ہو گئے اور یہ مجمع جلوس کی صورت میں مال روڈ کی طرف

چل پڑا۔ پولیس اور فوج نے اس جلوس کو ہائی کورٹ کے قریب روک دیا۔ اس مرتبہ نرمی اور گفت و شنید کو بالائے طاق رکھا گیا۔ مجمع کو پندرہ منٹ کے اندر منتشر ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور پندرہ منٹ کے بعد اس پر گولی چلادی گئی۔

راجہ غضنفر علی خاں جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کے آخری سال میں تھے اور یونیورسٹی ٹریننگ کور میں شامل تھے اپنے ساتھیوں سمیت یونیورسٹی گراؤنڈ میں پریڈ کر رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ وہاں انھوں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ پریڈ چھوڑ کر لڑکے ہوسٹل کی طرف بھاگے۔ وہاں وردیاں اتار اور سادہ کپڑے پہن کر یہ بھی "موقعہ واردات" کی طرف چل پڑے۔ فائرنگ کا اثر الٹا ہوا تھا۔ مجمع کی اگلی صفوں پر بار بار لاٹھی چارج ہو رہا تھا۔ لیکن اتنا بڑا مجمع خود اپنی تعداد کی وجہ سے جلد منتشر ہونے کے ناقابل تھا۔

بہت کش مکش کے بعد یہ مجمع منتشر ہوا تو اس کے بکھرے ہوئے اجزا اور کچھ نئے تماشائی لوہاری دروازے کے قریب جمع ہو گئے۔ یہاں پھر گولی چلی۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ بادشاہی مسجد جمعہ کی نماز کے وقت انسانوں سے بھر گئی۔ نماز کے بعد حاضرین سے خطاب کرنے والوں میں ہندو لیڈر بھی شامل تھے۔ مسجد سے نکلنے والوں نے پھر جلوس کی صورت اختیار کرلی۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت چند نوجوانوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ یہ جلوس مختلف ٹولیوں میں تقسیم ہوتا ہوا۔ آخر پُرامن طریق پر ختم ہو گیا۔ لیکن شام کو گورنمنٹ ہاؤس میں انتظامیہ افسروں کا جو جلسہ ہوا۔ اس میں علاقے کے کوتوال نے رپورٹ پیش کی کہ بلوائیوں نے "ڈنڈا فوج" قائم کرلی ہے اور حالات سخت خطرناک ہیں۔ چنانچہ اگلے دن شہر کے بعض حصوں میں مسلح فوج کی نمائشی پریڈ کرائی گئی۔ اور سول لائنز کی فوجی چوکیوں کے علاوہ ایک چوکی بادشاہی مسجد کے قریب قائم کردی گئی۔ یہاں تماشائیوں کا ایک ہجوم پھر جمع ہو گیا۔ اسے منتشر ہونے کا حکم دیا گیا اور جب وہ منتشر نہ ہوا تو گولی چلادی گئی۔ یہ ۱۲ اپریل کو ہوا۔ اس کے بعد لاہور میں عوام اور پولیس کے درمیان کوئی واقعہ نہ ہوا۔ لیکن ہڑتال اور عوام کی ذہنی کشیدگی جاری رہی۔

ادھر امرتسر میں ۱۰ اپریل کے فساد کے بعد اگلے دن جالندھر چھاؤنی سے مزید فوج بلائی گئی۔ اس کا کمانڈر بریگیڈیئر ڈائر (بعد میں جنرل ڈائر) تھا۔ اس کے ساتھ آئندہ انتظامات کے متعلق مشورہ

کرنے کے لئے لاہور کا کمشنر امرتسر پہنچا۔ وہاں ریلوے سٹیشن پر مقامی افسروں کا مشاورتی جلسہ ہوا۔ امرتسر کا کوتوال بھی موجود تھا۔ یہ ۱۲ اپریل کی شام کو ہوا۔ کوتوال کی رپورٹ یہ تھی کہ شہر پر بلوائیوں کا قبضہ ہے۔ پولیس تھانوں میں محصور بیٹھی ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ تھانوں سے باہر گشت کر سکے۔ اس رپورٹ کی بنا پر کمشنر نے بریگیڈیئر ڈائر کو اختیار دے دیا کہ وہ امرتسر کا چارج سنبھال لے اور امن و قانون کی بحالی کے لئے جو کچھ چاہے کرے یعنی قانون اور آئین معطل ہو گئے۔ اور ڈائر کی مطلق العنان حکومت قائم ہو گئی۔

بعد میں جب فسادات کی تحقیقات کے لئے حکومت برطانیہ نے لارڈ ہنٹر کے زیر صدارت ایک تحقیقاتی کمشن قائم کیا تو اس کے سامنے شہادت اور جرح کے ذریعے اس وقت کے حالات کے چند بہت ہی دلچسپ پہلو منظر عام پر آئے۔

(۱) پولیس کوتوالوں کی ہر جگہ یہ خاص کوشش تھی کہ حالات کی سنگینی کے متعلق زیادہ سے زیادہ مبالغہ آرائی کی جائے۔ بظاہر محض اس لئے کہ پولیس کو ہنگامی اختیارات حاصل ہو جائیں وہ فوج کی سنگینوں کے سائے میں جسے چاہے پکڑے جسے چاہے بخش دے۔ چنانچہ مارشل لا کے تحت پولیس کی رشوت اور لوٹ کھسوٹ کی بہت زیادہ شکایت پیدا ہوئی۔

(۲) امرتسر کے کوتوال کی یہ رپورٹ بھی کمیشن کے سامنے آئی کہ پولیس تھانوں میں محصور بیٹھی ہے اور شہر فسادیوں کے قبضے میں ہے لیکن جرح میں یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ جب ڈائر نے مطلق العنان حکومت کا چارج لینے کے فوراً بعد اپنے احکام کی اشاعت کا بندوبست کرنا چاہا تو یہی کوتوال صاحب آدھی رات کو شہر کے اندر کسی چھاپہ خانہ کو کھلوا کر اور عملے کو جمع کر کے پوسٹر چھپوا لائے اور صاحب بہادر کی تحسین و آفرین کے مستحق قرار پائے۔

(۳) یہ عجیب سوال بھی زیر بحث آیا کہ کمشنر اور ڈائر کو باہمی سمجھوتے کے ذریعے عام قانون اور آئین کو معطل قرار دینے اور ڈائر کو مطلق العنان اختیارات سنبھال لینے کا حق کیسے حاصل ہو گیا تھا؟ مارشل لا ایک خاص ضابطے اور مرکزی حکومت کی منظوری کے بغیر نافذ نہ ہو سکتا تھا۔ ڈائر کسی مارشل لا یا کسی جائز قانون کے تحت ہدایات جاری نہ کر رہا تھا بلکہ محض "ڈائر لا" سے کام لے رہا تھا۔ لیکن بعد میں خاص قوانین کے ذریعے سرکاری ملازموں کی ہر ناجائز حرکت کو پرسش سے

بالاتر قرار دے دیا گیا۔

(۴) جب ڈائر نے امرتسر کا چارج سنبھالا تو اس نے کوتوالِ شہر کو حکم دے دیا کہ فوج کی مدد لو اور فساد کے سلسلے میں جس مجرم کی شناخت ہو سکے اسے پکڑ لو اور فوجی عدالت کے سامنے پیش کرو۔

(۵) "باغیوں" کا مورال ختم کرنے کی خاطر چوبیس گھنٹے کے لئے شہر میں پانی اور بجلی کی سپلائی بند کر دی۔

(۶) ایک پُراسرار شخص "ہنسراج سابق ٹکٹ کلکٹر" کا امرتسر کے ہنگامے میں بہت عجیب حصہ تھا۔ یہ شخص اس ہجوم میں بھی موجود تھا۔ جس نے بینکوں کو لوٹا تھا۔ اور ان کے انگریز ملازموں کو قتل کیا تھا۔ ۱۲/ اپریل کو ایک جلسے کا صدر بھی یہی تھا جو ایک پرائیویٹ سکول کے اندر رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کی مزید تدابیر سوچنے کے لئے منعقد ہوا۔ وہاں (پولیس کی رپورٹ کے مطابق) اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ کل جلیانوالہ باغ میں وہ پبلک کے سامنے ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی جانب سے موصول شدہ پیغامات پیش کرے گا۔ لیکن اسے گرفتار نہ کیا گیا۔ ۱۳/ اپریل کو جلیانوالہ باغ کے جس جلسے پر ڈائر نے گولیاں چلائیں۔ اس کا منتظمِ اعلیٰ بھی یہی ہنسراج تھا اور جن لوگوں کو مس شروڈ پر حملے کی پاداش میں کوڑے لگائے گئے۔ ان کی شناخت بھی پولیس کے گواہ کی حیثیت سے اسی نے کی۔ بعد میں اسے دوسرے لیڈروں کے ہمراہ گرفتار بھی کیا گیا۔ لیکن مارشل لاٹریبونل کے سامنے جب ان لیڈروں کے مقدمات کی سماعت شروع ہوئی تو ہنسراج سابق ٹکٹ کلکٹر کو سلطانی گواہ بنا کر استغاثے کی کہانی کی تائید میں پیش کر دیا گیا۔

۱۳/ اپریل کو بیساکھی کا دن تھا۔ قرب و جوار کے دیہات سے ہزاروں لوگ امرتسر میں بیساکھی منانے آئے تھے۔ اگر شہر میں ڈائر کے احکام کی ضروری اشاعت ہو چکی تھی تب بھی باہر کے دیہاتیوں کو کیا معلوم تھا کہ شہر میں پبلک جلسے کرنا اور ان میں شریک ہونا "ڈائر لا" کے تحت ممنوع ہے۔ لوگ یہ سن کر جلیانوالہ باغ میں جلسہ ہو گا وہاں جمع ہو گئے۔ جلیانوالہ باغ دراصل کوئی باغ نہ تھا۔ بلکہ اونچی نیچی دیواروں سے گھری ہوئی ایک نشیبی اور خالی جگہ تھی۔ ڈائر کو رپورٹ ملی کہ اس کے سخت احکام کے علی الرغم ایک پبلک جلسہ ہو رہا ہے۔ وہ فوج کے ایک دستے کو لے کر وہاں پہنچا۔ دستے کو ایک طرف جہاں ذرا اونچی جگہ تھی کھڑا کیا اور کسی تنبیہ اور نوٹس کے بغیر جلسے

پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اس نے اپنی شہادت میں تسلیم کیا کہ وہ فائرنگ کا رُخ مجمع کے گنجان حصوں کی طرف کرتا رہا اور فائرنگ اس وقت بند کی جب گولیاں ختم ہو گئیں۔

مرنے والوں کی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ کسی نے پیش نہیں کیا۔ سرکاری بیان کے مطابق یہ تعداد سینکڑوں میں تھی۔ اور دوسرے لوگوں کے اندازے کے مطابق ہزاروں میں مرنے والوں کے علاوہ سینکڑوں زخمی رات بھر وہیں پڑے کراہتے رہے۔ کرفیو کا وقت ہو چکا تھا اور اس قیامت صغریٰ کے بعد کس کی جرأت تھی کہ زخمیوں کی امداد کی خاطر کرفیو کی خلاف ورزی کرتا؟ جب کمیشن کے سامنے ڈائر سے سوال کیا گیا کہ زخمیوں کی طبی امداد کے لئے کیا انتظام کیا گیا تھا تو اس نے جواب دیا "یہ میرا کام نہ تھا۔"

امرتسر پر موت کی خاموشی چھا گئی۔ لاہور میں بھی مظاہروں کا زور ختم ہو چکا تھا تاہم ۱۵ اپریل کو لاہور۔ امرتسر اور پنجاب کے کئی شہروں میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

اپریل اور مئی میں لاہور مارشل لاء کے مقدمات کا مرکز بنا رہا۔ ایک طرف لیڈروں پر بغاوت اور سازش کے مقدمات کی سماعت ہو رہی تھی۔ ملزمین میں جنھیں بالآخر پھانسی کی سزا سنائی گئی (گو بعد میں انھیں معافی مل گئی) پنجاب کی کئی تاریخی شخصیتیں شامل تھیں۔ دوسری طرف مارشل لاء کی خلاف ورزیوں کے الزام میں ہر روز درجنوں کو کوڑوں اور قید کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔ مقامی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کرنل فرینک جانسن کی جانب سے ہر روز نت نئے نادرشاہی احکام جاری ہوتے تھے۔ ان احکام کی نقلیں پبلک جگہوں کے علاوہ مشتبہ قسم کے لوگوں کے مکانوں پر بھی چسپاں کر دی جاتی تھیں۔ مکان والوں کو حکم تھا کہ وہ ان کی حفاظت کریں۔ ورنہ مارشل لاء میں دھر لئے جائیں گے۔ راجہ غضنفر علی چند دنوں کے اندر بی اے کے امتحان میں شریک ہونے والے تھے۔ ان کے مستقبل کے متعلق افسرانِ بالا یہ وعدہ کر چکے تھے کہ بی اے پاس کرنے کے فوراً بعد انھیں ای اے سی نامزد کر دیا جائے گا۔ ایک دن راجہ نے مارشل لاء کا ایک حکم پڑھا۔ اور ایک لمحے کے لئے ان کے ہوش و حواس معطل ہو گئے۔ اعلان میں تقریباً ۵۰ طالب علموں کے نام درج تھے۔ جنھیں مارشل لا کے تحت یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اور خود ان کا نام سرِفہرست تھا۔ اس دن ان کی زندگی کا راستہ بدل گیا۔

راجہ صاحب بھاگے بھاگے پرنسپل کے پاس گئے۔ وہاں سے مایوس ہو کر اپنے انگریزی کے پروفیسر کے پاس پہنچے۔ اس نے کہا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ البتہ تمھیں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ رول نمبر تمھیں مل چکا ہے۔ خاموشی کے ساتھ امتحان کے کمرے میں جا کر امتحان دینا شروع کر دو۔ اور جب تک کوئی تمہیں اٹھا کر ہال سے باہر نہ پھینک دے پرچے کرتے رہو۔

نوجوان غضنفر علی نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہر روز دل میں ڈرتے بھی رہے اور امتحان کے پرچے بھی کرتے رہے۔ کسی نے انھیں نہ ٹوکا۔ امتحان سے فارغ ہو کر وہ لاہور سے نکلنے کی سبیل سوچتے رہے۔ اس زمانے میں لاہور میں داخلہ اور لاہور سے نکلنا پاس کے بغیر ممکن نہ تھا۔ پھر انھیں لاہور سے نکلنے کا پاس کالج کی طرف سے مل گیا۔ اور وہ پنڈ دادن خاں جانے کے لئے ریل میں سوار ہو گئے۔ ریلوں کی آمد و رفت بہت بے قاعدہ تھی۔ راستے کے سٹیشنوں پر ہر جگہ فوجی سپاہی کسی کو ٹرین سے اُتار دیتے تھے۔ کسی کو بٹھا دیتے تھے۔ چھابڑی فروش غائب تھے۔ کھانے پینے کو کچھ نہ ملتا تھا۔ دو دن کی بھوک پیاس کے بعد وہ خدا خدا کر کے اپنے وطن پہنچے اور اطمینان کا سانس لینے کے قابل ہوئے۔ امتحان کا نتیجہ اخباروں میں چھپا تو راجہ غضنفر علی پاس ہونے والوں میں تھے۔ وہ آگے پڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے دل میں چور تھا۔ لہٰذا انھوں نے کالج میں داخلہ لینے کی کوشش نہ کی۔ اِن کی چوری ظاہر نہ ہوتی اور انھیں معمول کے مطابق ڈگری مل جاتی۔ لیکن انھوں نے از خود اپنے معاملے کو طشت از بام کر دیا۔ یعنی جب پنجاب کے واقعات کی تحقیقات کے لئے "ہنٹر کمیشن" نے لاہور میں کام شروع کیا تو راجہ نے اس کے سامنے اپنا معاملہ بھی پیش کرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ڈگری ملتے ملتے رک گئی۔ لیکن بالآخر جب مارشل لاء کے سزا یافتگان کے لئے عام معافی کا اعلان ہوا تو یونیورسٹی نے راجہ صاحب کو بھی ڈگری دے دی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہنٹر کمیشن کے عجیب ضابطۂ کار کے مطابق شہادت پیش کرنے کا حق صرف حکومت کو تھا۔ سرکاری افسر پہلے اپنا تحریری بیان بھیج دیتے تھے اور بعد میں جرح کے لئے پیش ہوتے تھے۔ سیاسی پارٹیوں، وکلاء کی انجمنوں اور اخباروں کے شور مچانے پر پنجاب کے شہریوں کو صرف ایک نمائندہ کے ذریعے اپنی شہادت قلمبند کرانے کا موقعہ دیا گیا۔ یہ نمائندہ میاں فضل حسین تھے لیکن سرکاری افسروں پر جرح کی غرض سے وکیلوں کی ایک مرکزی کمیٹی نے بہت محنت کر کے مختلف

ضلعوں سے مواد جمع کیا۔ اس کمیٹی کا دفتر اس زمانے کے "صنعت کاری کے بادشاہ" لالہ ہرکشن لال کی کوٹھی میں قائم تھا۔ یہ کوٹھی اب فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی صورت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہیں جرح کا وہ گولہ بارود تیار ہوتا تھا جس سے مسلح ہو کر کمیشن کے ہندوستانی ممبر (بالخصوص پنڈت جگت نرائن) سرکاری گواہوں پر تابڑ توڑ جرح کرتے تھے۔ اس سلسلے میں پنجاب کے شہریوں کا مقدمہ لڑنے کے لئے تمام خرچ لالہ ہرکشن لال نے ادا کیا۔ وہ خود مارشل لا کے قیدی رہے اور مارشل لا ٹریبونل سے پھانسی کی سزا پانے کے بعد عام معافی کے تحت رہا ہوئے۔ پھر وہ نئے آئین کے تحت پنجاب کی پہلی وزارت میں شامل ہوئے۔ لیکن اپنے عہدۂ وزارت کی میعاد پوری کرنے سے پہلے ہی مستعفی ہو کر اپنے بنکوں اور کارخانوں کے وسیع جال کی نگرانی میں مصروف رہے۔ لالہ ہرکشن لال کی عمر کا آخری حصّہ بہت عبرت انگیز تھا۔ اپنی وفات کے وقت وہ لاہور کے ایک فلیٹ میں ایک مفلس اور بے گھر انسان کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔

۳۔ سنہ ۱۹۱۹ء کا ایکٹ اور تحریک عدم تعاون

جب ہندوستان میں "رولٹ ایکٹ" کے خلاف ہنگامے شروع ہوئے تو لندن میں وزیر ہند اپنا وعدہ پورا کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کے سامنے ہندوستان کے نئے آئین کا مسودہ پیش کر رہے تھے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں ایک طرف ہندوستان میں ہنگاموں کا سلسلہ جاری رہا۔ دوسری طرف لندن میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا مسودہ قانون سازی کے مختلف مراحل طے کرتا رہا۔ اس سال کے موسم گرما میں ہندوستان کے نمائندوں کو بھی پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ کے سامنے اس مسودے کے مندرجات پر اظہار رائے کا موقعہ دیا گیا۔ یہاں سے جو صاحبان اس سلسلے میں لندن گئے۔ ان میں مسٹر جناح بھی شامل تھے۔ اس مجوزہ آئین کے چند نمایاں پہلو یہ تھے

(۱) مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں ہر جگہ سرکاری اور نامزد ممبروں کے لئے بھی نشستیں مخصوص کی گئی تھیں۔ لیکن پہلی مرتبہ ہر اسمبلی میں سرکاری بلاک کے مقابلے میں منتخب شدہ ممبروں کی واضح اکثریت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

(۲) جہاں تک مرکزی اسمبلی کا تعلق تھا منتخب شدہ اکثریت کے لئے بحث کرنے، شور مچانے اور ہنگامے کرنے کے لئے خاصا وسیع میدان مہیا کیا جا رہا تھا۔ لیکن اسے حکومت پر کوئی کنٹرول نہ دیا گیا تھا۔ حکومت کے تمام اختیارات گورنر جنرل اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے لئے محفوظ کر دئے گئے تھے۔ حکومت اسمبلی کے فیصلوں کو ماننے کی پابند نہ تھی اور اسے اسمبلی کے ووٹ کے ذریعے عہدے سے برطرف نہ کیا جا سکتا تھا۔

(۳) صوبوں میں "ذمہ دار حکومت" قائم کرنے کی جانب ایک ادھورا قدم اٹھایا گیا تھا۔ صوبائی کابینہ کی یہ عجیب ساخت تجویز کی گئی تھی کہ اس میں منتخب شدہ اور اسمبلی کے سامنے جواب دہ "وزیر" بھی شامل ہوں اور ایسے "ایگزیکٹو کونسلر" بھی شامل ہوں جو حسب سابق صرف گورنر کو اور اس کے ذریعے گورنر جنرل اور وزیر ہند کو جواب دہ ہوں۔ کچھ محکمے "محکمہ جات منتقلہ"

وزیروں کے سپرد کر دیئے جائیں اور کچھ محکمے (محکمہ جات غیر منتقلہ) ایگزیکٹو کونسلروں کی تحویل میں رہیں۔

(۴) دس سال کے بعد اس تجربے کے نتائج کا جائزہ لینے اور آئندہ ضروری ترامیم پر غور کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے۔

یہ آئین کانگریس اور مسلم لیگ کے متفقہ مطالبات کے مطابق نہ تھا۔ ہندوستان میں جو واقعات پیش آ رہے تھے (بالخصوص پنجاب پر مارشل لا کے ظلم اور ان فوجی اور سول افسروں کو جو اس ظلم کے ذمہ دار تھے بازپرس سے محفوظ رکھنے کی کوشش) ان کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں عام تلخی بھی موجود تھی۔ تاہم ہندوستان کے سیاست دانوں میں اکثریت اسی خیال کی حامی تھی کہ نئے آئین میں جو مواقع مہیا کئے جا رہے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اور انھیں آئندہ حسب مطلب آئین حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ "یکے را بگیر و دیگرے را دعوے بکن"۔ کانگریسی لیڈروں میں اکثریت کا ذہن اسی ضرب المثل کے مطابق کام کر رہا تھا اور مسٹر جناح اور دوسرے مسلم لیگی لیڈر بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ لیکن ان صاحبان کے علاوہ جن کی توجہ ملک کے آئینی مسئلے پر مرکوز تھی۔ مسلمانوں کی من حیث الجماعت اصل توجہ خلافت کے مسئلے کی جانب تھی۔ برطانیہ اور دوسری اتحادی طاقتیں اب شکست خوردہ ٹرکی کے ساتھ کیا سلوک کریں گی؟ کیا اسلام کے مقاماتِ مقدسہ اور جزیرۃ العرب پر خلیفۃ المسلمین کا سیاسی اقتدار قائم رکھنے کا کوئی بندوبست کیا جائے گا؟ مسلمان اس بارے میں برطانوی حکومت پر اپنا نقطۂ نگاہ پورے زور کے ساتھ واضح کرنے کے لئے بےتاب تھے اور ہندو لیڈروں کی صفوں میں ایک شخص جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک سیاسی انقلاب لانا چاہتا تھا مسلمانوں کے ان جذبات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ مہاتما گاندھی تھے۔ ان کی اس زمانے کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں یہ نظر آ رہا تھا کہ تاریخ نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دلی اتحاد پیدا کرنے کا ایک عجیب موقعہ مہیا کر دیا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی تاریخ میں ایک کارنامہ عظیم سر انجام دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے مطالبے کی حمایت یہ کہہ کر شروع کر دی کہ یہ میرے مسلمان بھائیوں پر آزمائش کا وقت ہے۔ میں ان کے مطالبے کے حسن و قبح پر غور کر کے اس نتیجے پر پہنچا

ہوں کہ یہ مطالبہ ناجائز نہیں ہے۔ لہٰذا میرا فرض ہے کہ مَیں ان کا پورا ساتھ دوں۔ یہی راستہ انھوں نے ہندوؤں کو دکھانے کی کوشش کی۔

مسلمانوں نے اپنے مطالبے کو منوانے کے لئے اجتماعی اقدام کی ضرورت محسوس کی۔ اس سے پیشتر علماء حضرات نے جمعیت علمائے ہند کے نام سے اپنی ایک تنظیم قائم کر لی تھی۔ تحفظ خلافت اس تنظیم کے مقاصد میں بھی بطورِ خاص شامل تھا۔ لیکن اس تنظیم کی رکنیت محدود تھی۔ چنانچہ مسلمان لیڈروں کے ایک اجتماع نے جو ستمبر ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ میں سر ابراہیم ہارون جعفر کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ (اس میں جمعیت علمائے ہند کے نمائندے بھی شامل تھے) ایک مرکزی خلافت کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس میں علماء اور غیر علماء ہر مکتبۂ خیال کے مسلمان شرکت کر سکتے تھے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے پہلے صدر بمبئی کے سیٹھ چھوٹانی اور سکرٹری بمبئی کے حاجی محمد صدیق کھتری مقرر ہوئے (چند ماہ بعد جب مولانا شوکت علی نظر بندی سے رہا ہوئے تو سکرٹری کا عہدہ انھوں نے سنبھال لیا)۔ اس نئی خلافت کمیٹی نے عملی اقدامات پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک کانفرنس ۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقد کی۔ اس سلسلے میں ایک پبلک جلسہ بھی منعقد کیا گیا۔ لیکن اصل کانفرنس لیڈروں کی ایک علیٰحدہ نشست کی صورت میں ہوئی۔ مجلسِ استقبالیہ کے صدر مسٹر آصف علی تھے۔ انھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مہاتما گاندھی اور دو چار دوسرے ہندو لیڈروں کو بھی دعوت بھیجدی۔ اور دعوت نامے میں کانفرنس کا جو ایجنڈا درج کیا اس میں مسئلہ تحفظ خلافت کے ساتھ گئو رکھشا کا مسئلہ بھی شامل کر دیا۔ غالباً اس خیال سے کہ جب مسلمان ایک مذہبی مطالبے کے لئے ہندوؤں کی حمایت کے طلبگار ہیں تو ہندوؤں کے ایک مذہبی مسئلے کے متعلق ہمدردی کا اظہار اس مقصد کے لئے مفید ہوگا۔ لیکن جب کانفرنس کا اجلاس مہاتما گاندھی کے زیر صدارت شروع ہوا۔ تو مہاتما جی نے شروع ہی میں دعوت نامے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مَیں مسلمانوں کے مطالبے کی غیر مشروط اور مکمل حمایت کرتا ہوں اور اس کے عوض کوئی جوابی رعایت مانگنا کم ظرفی کا نشان سمجھتا ہوں۔ مَیں امید کرتا ہوں کہ تمام ہندو اپنے مسلمان بھائیوں کے اس آڑے وقت میں یہی رویّہ اختیار کریں گے۔ لہٰذا ایجنڈے سے گئو رکھشا کا مسئلہ حذف سمجھا جائے۔ مہاتما جی کے ان چند فقروں نے مسلمان لیڈروں کے

دل موہ لیئے اور مسلمان قوم بہ حیثیت مجموعی گاندھی جی کی عالی ظرفی سے بہت متاثر ہوئی۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی نے عملی تجاویز کی ذمہ داری بھی مسلمان لیڈروں پر رکھی اور کہا "آپ لوگ جو فیصلہ کریں۔ ہم اس کا پورا ساتھ دیں گے"۔ کچھ تجاویز زیر بحث آئیں اور فیصلہ کیا گیا کہ ان پر مزید غور امرتسر میں کیا جائے جہاں کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ایک ماہ بعد ہونے والے تھے۔

ہندوستان کے نئے آئین کے مسودے نے دسمبر ۱۹۱۹ء کے وسط تک پارلیمنٹ کے تمام مرحلے طے کر لیئے۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو اس پر شاہی دستخط ثبت ہو گئے۔ اس سے تقریباً ایک ہفتے کے بعد امرتسر میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی مرکزی خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی ہوا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے ایجنڈے پر مرکزی مسئلہ نئے آئین کے سلسلے میں اپنا اپنا رویہ متعین کرنے کے متعلق تھا۔ دونوں جماعتوں نے بحث مباحثہ کے بعد نئے آئین کو چلانے اور اس سے قومی مقاصد کی خاطر پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

خلافت کانفرنس کے سامنے نئے آئین کے ساتھ تعاون یا عدم تعاون کا مسئلہ نہ تھا۔ اس کی توجہ خلافت کے مسئلے پر مرکوز تھی۔ چنانچہ اس جماعت نے حکومت برطانیہ پر مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ واضح کرنے کے لئے ایک وفد وائسرائے کے پاس اور ایک وفد لندن میں برطانوی وزیر اعظم کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی تقریباً چار سال کی نظربندی سے رہا ہو کر امرتسر کی تقریبات میں حصہ لینے کے لئے سیدھے وہاں پہونچے تھے۔ لندن جانے والے وفد کی قیادت کی ذمہ داری مولانا جوہر کو سونپ دی گئی۔ مہاتما گاندھی خلافت کانفرنس کی کارروائی اور حالات کا جائزہ لیتے رہے تھے۔

امرتسر میں جو فیصلے ہوئے ان کے مطابق عملی اقدامات شروع کرنے کے لئے خلافت کمیٹی نے پھر ۲۰ر جنوری ۱۹۲۰ء کو لیڈروں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس میں مہاتما گاندھی بھی موجود تھے۔ یہاں گاندھی جی نے حاضرین سے کہا کہ جس عملی پروگرام پر آپ صاحبان اتفاق کرتے ہوں۔ اسے میری پوری حمایت حاصل ہوگی۔ لیکن اگر آپ صاحبان میری بات مانیں تو ایک

خود سر حکومت پر موثر اخلاقی دباؤ ڈالنے کا صحیح طریق میرے اپنے "ستیہ گرہ" کے فلسفے کے مطابق یہ ہے کہ اس کے ساتھ عدم تعاون کیا جائے۔ عدم تعاون کے عملی پروگرام کے آپ نے چار مرحلے تجویز کئے۔

(۱) ترک خطابات اور حکومت کے تعلیمی اداروں اور عدالتوں کا مقاطعہ

(۲) اس کے بعد پولیس اور فوج کے علاوہ حکومت کے باقی تمام محکموں سے استعفے

(۳) پھر پولیس اور فوج سے علیٰحدگی اور

(۴) سب سے آخر میں ٹیکس دینے سے انکار۔ اور ان تمام مرحلوں میں پورا ضبط اور قومی اتحاد اور عدم تشدد کے اصول کی پابندی۔ پروگرام بہت انوکھا اور جرأت مندانہ تھا۔ سننے والوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔

سابقہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک وفد وائسرائے کے پاس بھی گیا اور ایک وفد مولانا جوہر کے زیر قیادت لندن بھی گیا۔ لیکن یہ سب بے نتیجہ ثابت ہوا۔ ابھی مولانا جوہر اور ان کے ساتھی لندن ہی میں تھے کہ ۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو اتحادی طاقتوں نے ٹرکی کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ سلطان ٹرکی کا اقتدار مقامات مقدسہ اور جزیرۃ العرب پر بحال کرنے کے بجائے ٹرکی کے خالص ترکی آبادی والے علاقوں کو بھی حصے بخرے کر کے دوسروں میں بانٹ دینے کے مترادف تھا۔ لیکن اس فیصلے کے اعلان سے پہلے ہی مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار میں تحفظِ خلافت کی خاطر عدم تعاون کے پروگرام کے حق میں مسلسل پراپیگنڈہ شروع کر دیا تھا۔ اور جگہ جگہ خلافت کانفرنسیں مقامی طور پر اس پروگرام کے حق میں قراردادیں پاس کرنے لگ گئی تھیں۔ مہاتما گاندھی اپنے پراپیگنڈہ میں اس نکتے پر زور دیتے رہے کہ عدم تعاون کے مجوزہ پروگرام کا اصل مقصد تحفظ خلافت ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ سودے بازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر عدم تعاون کے ذریعے حکومت کی مشینری کو مفلوج کر دیا جائے تو سوراج کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں دلی اتحاد ہو جائے تو گئو رکھشا کا مسئلہ بھی باقی نہ رہے گا۔ مہاتما جی نے اپنی تجاویز صوبائی کانگریسیوں کو بھجوائیں اور ان کا عندیہ معلوم کیا۔ بعض صوبوں نے ان پر صاد کیا۔ بعض نے اختلاف کیا۔ پھر ان تجاویز پر

غور کرنے کے لئے کانگریس کا ایک خاص اجلاس ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں طلب کیا گیا۔ مرکزی خلافت کمیٹی نے اس کا انتظار نہ کیا تھا بلکہ پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ایک خاص تاریخ تک اتحادی طاقتوں کے فیصلے کو نہ بدلا گیا تو عدم تعاون کے پروگرام پر پورے زور کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔

کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو روایت کے مطابق مسلم لیگ کا اجلاس بھی وہاں بلایا گیا۔ ۱۹۱۵ء سے کانگریس اور مسلم لیگ کے کھلے اجلاس ساتھ ساتھ منعقد کرنے کی جو روایت چلی آرہی تھی۔ لیگ کا یہ اجلاس اس کی آخری مثال ثابت ہوا۔ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ کلکتہ میں خلافت کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت مسٹر جناح نے کی (وہ ابھی تک کانگریس کے بھی باضابطہ ممبر تھے)۔ مہاتما گاندھی کی تجاویز کے متعلق ان کا رویہ اس مرحلے پر بہت محتاط تھا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے ان تجاویز کی جانب مسلم لیگ کے ہندو بین کو توجہ دلائی۔ لیکن نہ ان کی تائید کی نہ مخالفت۔ صرف اس بات پر زور دیا کہ یہ تجاویز ایسی ہیں جن کے متعلق ہر شخص کو اچھی طرح غور کر لینا چاہیے۔

ادھر کانگریس کے اجلاس میں جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے فیصلہ عجیب ڈرامائی انداز میں ہوا۔ بنگال کے مسٹر بپن چندر پال نے ہندو لیڈروں کے ایک گروپ کی نمائندگی کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کی تجویز میں ایک ترمیم پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ عدم تعاون کے پروگرام کے مقاصد میں سوراج کو بھی شامل کیا جائے۔ مہاتما جی اس کے جواب میں پھر سودے بازی کے رجحان کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن اجلاس میں موجود مسلمان نمائندوں نے متفقہ طور پر ان سے درخواست کی کہ ترمیم ضرور مان لی جائے۔ ہم اپنے ہندو بھائیوں سے بڑھ کر سوراج کے حامی ہیں۔ اس طرح خلافت کمیٹی اور کانگریس کے مقاصد اور پروگرام مشترک ہو گئے اور یہ دونوں جماعتیں بظاہر "من تو شدم تو من شدی" بن گئیں۔ کلکتہ کا فیصلہ کانگریس کے سالانہ اجلاس کی توثیق کا محتاج تھا۔ اس کی توثیق دسمبر ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتے میں ناگپور میں ہوئی۔ جہاں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان ڈیلیگیٹ بھی بھاری تعداد میں موجود تھے۔ اس اجلاس میں برطانوی پارلیمنٹ کی لیبر پارٹی کے دو ممبر بھی اپنی پارٹی کی جانب سے ہمدردی کا پیغام لے کر شریک ہوئے۔ یہاں

عدم تعاون کی تجاویز کے خلاف تقریر کرنے والے اور ووٹ دینے والے اکیلے مسٹر جناح تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عدم تعاون کا مجوزہ پروگرام افراتفری اور فسادات کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد آپ کانگریس کی ممبری سے مستعفی ہو گئے اور کانگریس سے آپ کا ساتھ کم ازکم رسمی طور پر ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔

جب ناگپور میں کانگریس کا سیشن ہو رہا تھا تو نئے آئین کے تحت مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب ہونے والے تھے اور امیدوار کاغذات نامزدگی داخل کر چکے تھے۔ ناگپور کے فیصلوں کے بعد بہت سے امیدواروں نے اپنے کاغذات واپس لے لئے۔ بہت ایسے تھے جن کے لئے اس طرح انتخاب میں سہولت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۲۱ء کے آغاز میں ایک طرف مہاتما گاندھی نے اپنے مجوزہ پروگرام کے لئے زمین ہموار کرنے کی غرض سے مسلمان لیڈروں (بالخصوص علی برادران) کو ساتھ لے کر مختلف صوبوں کا دورہ شروع کیا اور دوسری طرف نئی اسمبلیوں نے خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں جمعیت علمائے ہند نے چار پانچ سو علما کے دستخطوں سے ایک فتوے شائع کر دیا کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے انگریز حکومت کے ساتھ عدم تعاون ایک مذہبی فریضہ بن گیا ہے۔ بعض علماء کانگریس کے ناگپور سیشن سے پہلے ہی ہندوستان کو 'دار الحرب' قرار دے چکے تھے۔ اس فتوے کے تحت ہندوستان سے ہجرت کی ایک تحریک شروع ہو گئی۔ جس میں ہزاروں مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنا سب کچھ کوڑیوں کے مول بیچ کر افغانستان کا رخ اختیار کیا۔ لیکن یہ بھولے بھالے مذہب کے دلدادہ مسلمان اور ہجرت کی تحریک کی اعانت کرنے والے علماء بین الاقوامی حالات اور پابندیوں سے ناواقف تھے۔ مہاجرین کے ریلے افغانستان کی سرحد پر روک دیے گئے۔ مہاجرین کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ چند افراد کسی نہ کسی طرح بیرونی ممالک میں نکل گئے۔ اکثریت کو واپس لوٹنا پڑا اور اس افراتفری میں سینکڑوں قیمتی زندگیاں تباہ ہو گئیں۔

۱۹۲۱ء کے شروع میں جب مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی اور شوکت علی نے کہیں اکٹھے اور کہیں الگ الگ دورے اور تقریریں کرنا شروع کیا تو ملک میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ تحریک عدم تعاون کانگریس اور خلافت کمیٹی کی مشترکہ تحریک تھی۔ خلافت کمیٹی کی تحریک

کے کمانڈر مولانا محمد علی جوہر تھے اور مشترکہ پروگرام کے سپریم کمانڈر کی حیثیت مہاتما گاندھی کو حاصل تھی۔ لیکن خلافتی کمانڈر اور کانگریسی سپریم کمانڈر کے نظریات فی الحقیقت ایک نہ تھے گو دونوں اپنے مقاصد اور پروگرام میں ہم آہنگی قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے کانگریس کی تحریک عدم تعاون اصولی طور پر ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ مہاتما جی کے دوروں کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو تیار اور منظم ہونے کی تلقین کریں تاکہ حکم ملنے پر وہ منظم طریق پر ہائی کمان کی ہدایات کے مطابق عدم تعاون کے مختلف مراحل کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ عوام کی تنظیم کیلئے رضا کاروں کی خدمات کی ضرورت تھی۔ لہٰذا رضا کاروں کی بھرتی پر زور دیا گیا۔ لیکن مولانا محمد علی کے نزدیک عدم تعاون یکمل عدم تعاون یمسلمانوں پر پہلے ہی فرض ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ سپریم کمانڈر سے دو قدم آگے چلنے اور حکومت کے ساتھ جلد از جلد پوری ٹکر لینے کا رجحان ظاہر کرتے رہتے تھے۔ دونوں کی پالیسی میں اس فرق کی پردہ پوشی خود حکومت کے اقدامات نے کی۔ حکومت نے ایک نیا قانون (کرمنل لا امینڈمنٹ ایکٹ) پاس کر کے کانگریس اور خلافت کا رضا کار بننا خلاف قانون قرار دے دیا۔ اور رضا کاروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ کچھ گرفتاریاں لوگوں کی تقاریر کی بنا پر اور کچھ انسدادی قوانین کے تحت بھی ہو رہی تھیں۔ لیکن رضا کاروں کی بھرتی روکنے کے لئے کرمنل لا امینڈمنٹ ایکٹ کے تحت وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہونے لگیں۔

یہ گرفتاریاں شروع ہوئیں تو عوام دھڑا دھڑ رضا کاروں میں نام لکھا کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے لگے۔ عدم تعاون کی تحریک باضابطہ شروع ہونے سے پہلے ہی سول نافرمانی کی مہم وسیع پیمانے پر شروع ہو گئی۔ اس صورتِ حال نے خلافت اور کانگریس کی تحریک کو ایک ہی چیز بنائے رکھا۔ تاہم مولانا محمد علی کی تقریروں میں ان کی اپنی آئیڈیولاجی کا رنگ الگ ظاہر ہوتا تھا۔ وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ اسلام کی عالمی سیاست کے نقطۂ نگاہ سے یہ ضروری ہے کہ برطانوی سامراج کا ہندوستان پر قبضہ ختم کیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں پر ہندوستان کو آزاد کرانے کا دہرا فرض عائد ہوتا ہے۔ مولانا کے اس طرزِ استدلال سے اور اسلام کی "عالمی برادری اور عالمی سیاست" کی مصطلحات سے کئی ہندو سیاست دانوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہوتے تھے اور وہ آپس میں کھسر پھسر کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی کو ہندو مسلم اتحاد کی خاطر اس بات کا نوٹس

لینا پڑا۔ آپ نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" مورخہ ۴؍ مئی ۱۹۲۱ء میں لکھا۔ "ابھی تک مسلمانوں اور ہندوؤں کے دل باہمی بدگمانی سے پورے طور پر پاک نہیں ہوئے۔ بعض ہندو اس بات سے خائف ہیں کہ انگریزوں کے ہندوستان سے نکلنے کے بعد مسلمان بیرونی مسلم طاقتوں کی مدد سے ہندوستان میں مسلم راج قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ بعض مسلمان ڈرتے ہیں کہ ہندوؤں کی بھاری اکثریت میں ان کی آواز دب جائے گی۔" پھر انھوں نے مولانا محمد علی کی بعض تقریروں کے ساتھ خود اپنی ذہنی ہم آہنگی ظاہر کی اور فرمایا۔ "بالفرض اگر امیر افغانستان ہندوستان پر حملہ کرے۔ تو ایک لحاظ سے میں خود بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ جو حکومت ہمارا اعتماد اور ہم پر حکمرانی کا حق کھو چکی ہے۔ اس کی مدد نہ کرو بلکہ عدم تشدد پر کاربند رہتے ہوئے غیر جانبدار رہو۔" لیکن مہاتما گاندھی مولانا جوہر کے ایک موقف کو اپنا لیتے تھے تو مولانا ایک قدم اور آگے بڑھا لیتے تھے۔

۸؍ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں ایک خلافت کانفرنس مولانا جوہر کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ یہاں آپ نے ایک قرارداد پاس کرا دی جس میں عدم تعاون کے عملی نقشۂ جنگ اور درجہ بدرجہ تعمیل کی احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک دم مسلمانوں کے لئے بہ حالات موجودہ برطانیہ کی فوج میں شمولیت کو مذہباً ناجائز قرار دے دیا گیا اور علماء سے درخواست کی گئی کہ وہ اس شرعی پوزیشن کو مسلمانوں کے عام علم میں لانے کا بندوبست کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ "اگر برطانیہ نے ٹرکی کے خلاف فوجی کارروائی کی تو یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس ملک کی آزادی کا اعلان کر دیں گے اور کانگریس کے آئندہ سیشن میں ہندوستانی ری پبلک کا جھنڈا بلند کر دیں گے" اس وقت یہ خطرہ تھا کہ برطانیہ ٹرکی کے علاقوں پر یونان کو (معاہدۂ سیورے کی شرائط کے مطابق) قبضہ دلانے کے لئے اس کی فوجی مدد کرے گا۔ اس قرارداد اور اس کے متعلق تقریروں کی بنا پر مولانا محمد علی کو چھ دوسرے لیڈروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے خلاف مقدمہ چلا تو مولانا محمد علی نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے اپنے نقطۂ نگاہ کو زیادہ مضبوطی اور اعتماد کے ساتھ دہرایا۔ آپ کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ اگر کوئی بیرونی مسلم طاقت ہوسِ ملک گیری کی خاطر ہندوستان پر حملہ آور ہو تو میں اس کی مزاحمت کروں گا۔ لیکن اگر وہ تحفظِ خلافت کے مقصد کی خاطر برطانیہ کے خلاف جہاد کرے

اور اس سلسلے میں برطانیہ کے مقبوضہ علاقہ ہندوستان پر حملہ کرے تو میرے لئے نہ صرف اس کے خلاف لڑنا حرام ہے بلکہ پوری قوت کے ساتھ اس کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔

مولانا کی تقریر پر ان کے اور گاندھی جی کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کے لئے بعض اینگلو انڈین اخباروں نے پراپیگنڈا شروع کیا۔ لیکن مہاتما جی نے یہ وار خالی دیا اور مولانا کے موقف کو اپناتے ہوئے یہ حکم دے دیا کہ کراچی کی قرارداد اور مولانا کی تقریر کو کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہر جگہ دہرایا جائے چنانچہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ہزاروں پبلک جلسوں میں ان چیزوں کو دہرایا گیا۔

سول نافرمانی کی تحریک پورے زور سے چلتی رہی۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز کی آمد پر بمبئی میں سخت فساد ہوگیا اور پولیس اور فوج کی گولیوں سے ۵۳ افراد ہلاک ہوگئے۔ پھر مدراس میں بھی فساد ہوا۔ اسی زمانے میں مالابار کے ساحلی علاقے کی دشوار گذار پہاڑیوں میں موپلوں اور حکومتِ ہند کی فوج کے درمیان زور کی جنگ شروع ہوگئی۔ لیکن حکومت نے اس کے متعلق خبریں دیر کے بعد شائع کیں اور انھیں پراپیگنڈہ کا ایک خاص رنگ دیا۔

۱۹۲۱ء کے آخر تک پورے ہندوستان میں گاندھی جی کے سوا کانگریس اور خلافت کمیٹی کے صفِ اوّل، صفِ دوم اور صفِ سوم کے تمام لیڈر ہزاروں رضاکاروں کے علاوہ گرفتار ہو چکے تھے۔ حکومت کے جیل بھر گئے تھے لیکن گرفتاریوں کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اس سال حکومت نے مہاتما جی پر ہاتھ نہ ڈالا۔ پھر ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو چوراچوری (ضلع گورکھپور) میں ایک واقعہ ہوگیا۔ وہاں عوام کے ایک جلوس کا پولیس کے ساتھ تصادم ہوا۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے فائرنگ کی۔ پولیس کے پاس گولیاں کم تھیں۔ یہ ختم ہوگئیں تو پولیس نے پسپا ہو کر تھانے میں پناہ لی۔ مشتعل جلوس نے تھانہ دار اور اس کے ۲۱ کانسٹیبلوں کو تھانے میں بند کر کے عمارت کو آگ لگا دی اور پولیس کی یہ پوری نفری جل کر خاکستر ہوگئی۔ اس واقعہ کا مہاتما گاندھی نے اتنا سنگین نوٹس لیا کہ سول نافرمانی کی تحریک کو ایک دم بند کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کانگریس کی مجلسِ عاملہ سے اس فیصلے کا اعلان کرا دیا۔ حکومت نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک مہینے کے بعد (۱۳ مارچ ۱۹۲۲ء) کو گاندھی جی کو بھی گرفتار کر لیا۔

مہاتما گاندھی کے ذہن پر صرف چوراچوری کے واقعہ کا اثر ہوا تھا؟ یا انھیں سوراج کو

خلافت کے ساتھ سختی کرنے کا تجربہ بنیادی طور پر غلط معلوم ہونے لگا تھا اور وہ حالات پر از سر نو غور کرنا چاہتے تھے؟ ان سوالوں کے متعلق مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔ بہر صورت یہ تحریک ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر ہند میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی پہلی اور آخری مشترکہ انقلابی تحریک تھی جسے اس کے قائدین نے خود ہی ختم کر دیا۔ اس کے خاتمے کے ساتھ ہی ملک میں ہندو مسلم اتحاد کا جوش و خروش بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور دونوں قوموں کے درمیان اختلافات پہلے کی نسبت زیادہ شدت کے ساتھ شروع ہو گئے۔

پنجاب میں ایک فرقہ دارانہ بحث اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۱ء ہی میں شروع ہو گئی تھی جب ملک میں سول نافرمانی کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ یہ بحث پنجاب کے مسلم وزیر میاں فضل حسین کے بعض احکام کے متعلق تھی۔ جن سے بعض شعبوں میں ہندوؤں کے ایک خاص طبقے کی اجارہ داری پہ زد پڑتی تھی اور مسلمانوں کے لئے کچھ مواقع پیدا ہوتے تھے۔ اس بحث نے آئندہ چند مہینوں کے اندر بہت تند و تیز صورت اختیار کر لی۔ پھر جنوبی ہند کے ایک گوشے سے موپلوں کے فساد کی خبریں عجیب رنگ آمیزی کے ساتھ اخباروں میں چھپیں اور ہندو مسلم تعلقات میں مزید کشیدگی کا باعث بن گئیں۔ جنوبی ہند میں مالابار کے ساحل کے ساتھ پہاڑی علاقوں میں کسی زمانے میں عرب ملاح اور مزدور آباد ہو گئے تھے۔ انھوں نے مقامی دراوڑ عورتوں سے شادیاں کر لیں۔ موپلوں کا وسیع قبیلہ اسی نسلی اختلاط کی پیداوار تھا۔ یہ مفلس۔ سخت جان۔ ان پڑھ لیکن مذہبی نعرے سے بہت جلد متاثر ہونے والے لوگ دیر سے ہندو زمینداروں اور ہندو سیٹھوں کی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ خلافت ایجی ٹیشن کی خبریں ان تک پہنچیں تو انھوں نے خلافت کے نام پر حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور ایک شخص محمد حاجی کے زیر قیادت "خلافت کی حکومت" قائم کر لی۔ پولیس ان کی تعداد کا مقابلہ نہ کر سکی۔ پھر فوج کے ساتھ یہ کئی مہینے گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ فوجی افسروں نے ان کے ساتھ انتہائی بربریت کا سلوک کیا۔ جس کی ایک مثال یہ تھی کہ جب بغاوت ختم ہو گئی (جس میں دو ہزار سے زیادہ موپلے مارے جا چکے تھے) اور بغاوت کے ملزموں پہ ہزاروں کی تعداد میں مقدمے چل رہے تھے تو ایک موقعہ پر افسروں نے ایک سَو کے قریب ملزموں کو جانوروں کی طرح مال گاڑی کے ایک بند ڈبے میں مقفل کر کے ایک مقام سے

دوسرے مقام کو روانہ کر دیا۔ مدراس کی انتہائی گرمی کے زمانے میں یہ مجمع تمام دن ہوا اور دانہ پانی کے بغیر اسی ڈبے میں مقفل رہا۔ شام کو جب قفل کھولا گیا تو ۶۶ ملزم دم گھٹ کر مر چکے تھے اور باقی موت کے قریب تھے۔ سرکاری ذرائع نے کئی مہینے تک اس بغاوت کی خبروں کو دبائے رکھا اور پھر بغاوت فرو ہونے کے بعد افسروں کی حرکات سے توجہ ہٹانے کے لئے یا کسی اور وجہ سے ان واقعات کو یہ رنگ دینے کی کوشش کیا کہ موپلوں کا اصل حملہ ہندو سیٹھوں اور زمینداروں پر تھا اور مذہبی جنون و تعصب کی بنا پر تھا۔ فوج اور پولیس صرف ہندوؤں کی حفاظت کے لئے گئی حالانکہ فی الحقیقت ہندو زمیندار اور سیٹھ پولیس اور فوج کے معاونوں کی حیثیت سے گوریلا جنگ کی لپیٹ میں آگئے تھے۔

یہ خبریں اخباروں کی اپنی حاشیہ آرائی کے ساتھ چھپیں تو ملک کی فضائیں کشیدگی اس حد تک مکدر ہوگئی کہ جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سول نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کے بعد پہلا فساد اسی صوبے (پنجاب) میں ہوا جہاں مارشل لانے ہندو مسلم اتحاد کا سب سے زیادہ جوش پیدا کیا تھا۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کے صف اول کے لیڈر جیلوں سے نکلے تو انھوں نے اس صورت حال کی روک تھام کی کوشش کی لیکن حالات میں کوئی بہتری پیدا نہ ہو سکی۔

عدم تعاون کی تحریک کے خاتمے کے بعد کانگریس اور خلافت کمیٹی کے سامنے کوئی عملی پروگرام نہ تھا۔ سوائے مہاتما گاندھی کے اس پروگرام کے کہ کھدر پہنو۔ چرخہ چلاؤ اور اپنے دلوں کو تشدد اور تعصب سے پاک کرو۔ ۱۹۲۲ء کے موسم گرما کے بعد کانگریس کے چند بااثر لیڈروں نے (جن میں پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سی آر داس شامل تھے) کونسلوں کے بائیکاٹ کی پالیسی کو بدلوانے کا منصوبہ بنایا۔ انھیں یہ بات غلط نظر آتی تھی کہ اسمبلیوں کے اندر آزادی کی سیاسی جنگ لڑنے کے جو مواقع موجود تھے۔ انھیں اپنے اوپر حرام کر لیا جائے اور یہ میدان دوسروں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ انھوں نے اس غرض کے لئے کانگریس کے اندر ایک گروپ بنالیا۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے سالانہ سیشن میں اس گروپ کو شکست ہوئی۔ لیکن وہ اپنے نقطۂ نگاہ پر اڑا رہا۔ پھر ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا ایک خاص سیشن دہلی میں اسی سوال پر غور کرنے کے لئے منعقد کیا گیا۔ یہاں کانگریس

نے اسمبلیوں میں جانے کے خواہشمند گروپ کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے نئے پروگرام کی آزمائش کر لیں ۔ چند مہینوں کے اندر مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے نئے انتخابات ہونے والے تھے ۔ کانگریس کے ایک بازو نے مسٹر سی آر داس اور پنڈت موتی لال کے زیر قیادت ان انتخابات میں حصہ لینے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں ۔

کانگریس کے لئے عدم تعاون اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ بہر حال ایک سیاسی پروگرام تھا ۔ جسے حسب ضرورت بدلا بھی جا سکتا تھا ۔ لیکن خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء کو یہ مشکل پیش آئی کہ وہ فتاویٰ کی رو سے عدم تعاون کو ایک مذہبی فریضہ قرار دے چکی تھیں یا تسلیم کر چکی تھیں ۔ جو چیز کل حرام تھی ۔ آج حلال کیسے ہو سکتی تھی ؟ لہٰذا ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اسمبلیوں سے قطع تعلق جاری رکھیں ۔ خلافت کمیٹی کے لئے اب کوئی حقیقی کام بھی باقی نہ رہا تھا ۔ کیونکہ خلافت کے مسئلے کو ٹرکی کی انقلابی پارٹی کمال اتاترک کے زیر قیادت خود اپنے طور پر حل کر رہی تھی اس پارٹی نے اپنے ملک کو معاہدۂ سیورے کے علی الرغم دوسروں کی دست برد سے بچا لیا ۔ پھر سلطان کو معزول کر کے اپنے ملک کو ایک ری پبلک کی صورت دے دی اور منصب خلافت کے ظاہری نشان کو ختم کر دیا ۔ ہندوستان میں خلافت کمیٹی اس کے بعد بھی کئی سال موجود رہی ۔ لیکن عملاً ایک بے مقصد اور بے عمل جماعت کی حیثیت سے ۔

۴- پنجاب کے دیہات میں انتخاب کے مناظر

۱۹۲۳ء کے انتخابات کی آمد آمد ہوئی تو راجہ غضنفر علی کو ان کے دوستوں نے صلاح دی کہ آپ کے لئے انتخاب میں کامیابی کے خاصے امکانات موجود ہیں۔ آپ کو قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ ۱۹۱۹ء کے بعد راجہ صاحب نے اپنی زندگی کے تین چار سال عجیب طرح گذارے تھے۔ مارشل لاء کے سزا یافتگان کی عام معافی کے بعد انھیں ۱۹۲۰ء میں بی اے کی ڈگری ملی تھی۔ لیکن مارشل لا کے کچوکے نے ان کے لئے سیاست میں دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ وہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ سیشن اور خلافت کانفرنس میں بطور تماشائی شریک ہوئے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں وہ اپنے صوبے کے ڈیلیگیٹوں میں شامل ہو کر کلکتہ کی خلافت کانفرنس میں شریک ہوئے اور کانگریس کے اجلاس اور مسلم لیگ کے تماشائی بھی بنے رہے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج کی ایم۔ اے (انگلش) کلاس میں داخلہ لے لیا۔ اور لاہور کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہیمی[۱] نے انھیں تنبیہ کی۔ وہ باز نہ آئے لہذا پرنسپل نے انھیں کالج کی فیس بر وقت ادا نہ کرنے کے جرم میں کالج سے نکال دیا۔ اور پھر داخل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ راجہ صاحب نے بھاگ دوڑ کر کے فارمن کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں ایف۔ سی کالج کی ایم اے کلاس کو ایک خاص انتظام کے تحت کچھ لکچر سننے کے لئے گورنمنٹ کالج میں جانا پڑتا تھا۔ پرنسپل ہیمی نے راجہ غضنفر علی کو اپنے کالج میں دیکھا تو ایف۔ سی کالج کے ڈاکٹر لوکس کو لکھ بھیجا کہ اگر یہ طالب علم آپ کی کلاس میں شامل رہا تو میں اس کلاس کو اپنے کالج میں نہ آنے دوں گا۔ راجہ کو یہ کالج بھی چھوڑنا پڑا۔ پھر انھوں نے اسلامیہ کالج میں ایم۔ اے (فارسی) میں داخلہ لیا۔ لیکن چند دنوں کے اندر ان کے والد صاحب

۱؎ Hemmy

کی کوشش سے انھیں ضلع جہلم کے ڈسٹرکٹ بورڈ میں قائم مقام سکرٹری کی جگہ مل گئی۔ یہاں ڈیڑھ سال گذارنے کے بعد آپ نے وکیل بننے کا فیصلہ کیا اور لا کالج میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے پہلے سال کا امتحان دیا اور رومن لا کے پرچے میں فیل ہو گئے۔ پھر کچھ انھیں دوستوں نے اکسایا۔ کچھ انھوں نے خود حالات پر غور کیا اور قانون کی کتابوں کو بالائے طاق رکھ کر مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے لنگر لنگوٹ کس لیا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے قائم مقام سکرٹری کی حیثیت سے انھیں اپنے ضلع کے زمینداروں سے روابط قائم کرنے کا اچھا موقعہ ملا تھا۔ ان کے خاندان کے تعلقات راولپنڈی ڈویژن کے علاقوں میں پہلے ہی خاصے وسیع تھے۔ یہ سب کچھ انتخاب کے سلسلے میں ان کے لئے مفید ثابت ہوا۔ ان کا حلقۂ انتخاب جہلم، راولپنڈی اور گجرات کے ضلعوں پر مشتمل تھا حق رائے دہندگی بہت محدود تھا۔ پورے حلقے میں صرف اڑھائی ہزار کے قریب ووٹر تھے۔ جن میں اکثریت جاٹوں کی تھی۔ راجہ صاحب راجپوت تھے۔ ان کے مقابلے میں تین اور امیدوار تھے جن میں گجرات کے چوہدری بہاول بخش جاٹ برادری کے بہت بااثر رکن تھے۔ باقی دو امیدواروں میں ایک پیر تاج الدین بیرسٹر (جو لاہور کے مسلم سوشل حلقوں میں معروف ہستی گذرے ہیں) اور دوسرے کوئی سردار محمد اشرف خاں تھے۔

ووٹ طلبی کی مہم کے سلسلہ میں راجہ صاحب اور ان کے حامیوں کو معلوم ہوا کہ چوہدری بہاول بخش صاحب جاٹوں کے ووٹ اپنے لئے ایک عجیب طریقے سے محفوظ کر رہے تھے وہ جاٹوں کے کسی گاؤں میں جاتے تو دو تین زنانہ دوپٹے اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور گاؤں کی دو تین نو عمر لڑکیوں کو یہ دوپٹے پہنا دیتے تھے۔ ایک پرانی قبائلی رسم کے مطابق یہ اس بات کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ دوپٹہ پہنانے والے نے ان لڑکیوں کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ اور ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ پنجاب کے دیہات میں ویسے بھی گاؤں کی ہر بیٹی سارے گاؤں کی بیٹی ہوتی ہے۔ چوہدری بہاول بخش جاٹ کی حیثیت سے جاٹوں کے ہم قبیلہ تو تھے ہی۔ گاؤں کی لڑکیوں کو اپنی بیٹی بنا کر وہ گاؤں والوں کے ساتھ ایک تازہ اور مضبوط رشتہ بھی قائم کر لیتے تھے۔

راجہ غضنفر علی خاں راجپوت تھے۔ لیکن ان کی نزدیکی قرابت داری جاٹوں سے بھی تھی اور ضلع جہلم کے کئی سرکردہ جاٹ ان کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ یہ حالات ان کے علم میں آئے تو

انھوں نے بھی اپنے ساتھ زنانہ دوپٹے لے لئے اور گاؤں کی لڑکیوں کو اپنی بیٹی بنانا شروع کر دیا اور انتخابی جنگ نے کسی حد تک "چنیوں کی جنگ" کی صورت اختیار کر لی۔

لاہور کے بیرسٹر پیر تاج الدین کو کیا معلوم کہ امیدواروں کے ساتھ ووٹروں کے قول قرار کس بنا پر ہو رہے تھے۔ راجہ غضنفر علی کے قول کے مطابق اس انتخابی جنگ میں انہیں یہ تجربہ ہوا کہ پنجاب کے دیہات میں ووٹ صرف دو وجوہات کی بنا پر ملتے تھے۔ ایک ذاتی اور خاندانی تعلقات کے ذریعے جو برادریوں کی لائن کو بھی کاٹ دیتے تھے۔ دوسرے برادری کے ناطے سے۔ اس لحاظ سے پنجاب کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی شعور کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہندو ووٹروں کے اندر اتنی سمجھ پیدا ہو چکی تھی کہ وہ بہت حد تک کسی نہ کسی نیم سیاسی، نیم مذہبی یا اقتصادی اور سیاسی تنظیم کے زیر اثر ووٹ دیتے تھے۔

راجہ صاحب کے حلقے میں جو امیدوار تھے۔ ان میں پیر تاج الدین تعلیم اور سیاسی شعور کے لحاظ سے سب سے آگے تھے۔ لیکن ووٹ حاصل کرنے کے معاملے میں سب سے پیچھے۔ ان کی نہ کوئی برادری تھی نہ بہت زیادہ مقامی تعلقات تھے۔ وہ ووٹروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ ایک امیدوار کالج کا ناتجربہ کار لڑکا ہے۔ دو امیدوار تقریباً ان پڑھ ہیں۔ ان کے بالمقابل میں بیرسٹر ہوں مجھے پریکٹس کرتے اور سیاست میں عملی حصہ لیتے مدت بیت گئی ہے۔ میں آپ لوگوں کی نمائندگی کا حق بہتر طریق پر ادا کروں گا۔ لیکن وہاں یہ بات کون سنتا تھا؟

انتخاب کا اصل مقابلہ چودھری بہاول بخش اور راجہ غضنفر علی کے درمیان ہوا۔ برادری کا زور چودھری کی طرف زیادہ تھا اور "تعلقات" کا زور راجہ کی طرف۔ جب پرچیاں شمار کی گئیں۔ تو چودھری بہاول بخش راجہ صاحب کے مقابلے میں چار ووٹوں سے جیت گئے۔ دوستوں نے راجہ صاحب کو اکسایا کہ عذرداری کرو۔ چنانچہ وہ لاہور پہنچے۔ اس وقت انتخابی عذرداریوں کی پیروی کے ماہر وکیلوں میں کنور دلیپ سنگھ (جو بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج بنے) اول نمبر پر خیال کئے جاتے تھے۔ راجہ صاحب کالج کے زمانے میں مارشل لا کے شہید بن چکے تھے (اگرچہ ان کی انگلی صرف برائے نام کٹی تھی) اور اس حیثیت سے یونیورسٹی سینٹ کے کئی ممبروں سے ملتے رہے تھے۔ جن میں کنور دلیپ سنگھ بھی شامل تھے۔ وہ سیدھے کنور صاحب کے پاس پہنچے۔ اپنی

داستان سنائی اور کہا کہ مشکل یہ ہے کہ میں آپ کی فیس ادا نہیں کر سکتا۔ کنور دلیپ سنگھ نے کہا۔ فیس تو میں ضرور لوں گا۔ فیس کے بغیر مقدمہ لڑنا پیشہ ورانہ اصولوں کے خلاف ہے لیکن میری فیس برائے نام اور خانہ پری کی غرض سے ہوگی۔ یعنی صرف ایک سو روپیہ۔

اس طرح راجہ صاحب کی عذرداری کا انتظام تقریباً مفت ہوگیا۔ عذرداری کی سماعت کئی مہینے ہوتی رہی۔ استعمال شدہ پرچیاں عدالت میں منگائی گئیں۔ ان کا دوبارہ شمار ہوا۔ بعض پرچیاں جنھیں پولنگ افسر غلط اور ناقابلِ قبول قرار دے چکا تھا۔ صحیح قرار دی گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چودھری بہاول بخش کے مقابلہ میں راجہ صاحب کی چار پرچیاں بڑھ گئیں اور راجہ کو اسمبلی کا منتخب شدہ ممبر قرار دے دیا گیا۔

۵- مسلم لیگ کا اجلاسِ لاہور اور نئے دور کا آغاز

خلافت کمیٹی اور کانگریس کی مشترکہ تحریکِ عدم تعاون کے زمانے میں مسلمانوں نے وقتی طور پر اس سوال کو پسِ پشت ڈال دیا تھا جو سر سید اور سید امیر علی کے وقت سے ان کے سیاسی فکر کا جزو بنا رہا تھا۔ ہندوستان کی جمہوری آزادی کے نظام میں مسلم اقلیت کی پوزیشن کیا ہوگی؟ جو تحریک علماء کے اس فتوے کے تابع تھی کہ مسلمانوں کے لئے انگریزی حکومت کے ساتھ عدم تعاون ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تحریک کے لئے سیاسی نفع و نقصان اور عواقب و نتائج کے متعلق سوچ بچار کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا، جہاں تک مولانا محمد علی جوہر کے اندازِ فکر کا تعلق تھا اس کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم قوم کے مستقبل کا سوال کسی مرحلے پر بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھا۔ لیکن وہ دو باتوں میں امتیاز کرتے تھے۔ اگر کسی انقلابی تحریک کے ذریعے ہندوستان میں انگریزی حکومت کو ختم کیا جاسکے تو مولانا اس کے مابعد کا خطرہ مسلم قوم کے نقطۂ نگاہ سے قبول کرنے کو تیار تھے۔ لیکن اگر بہ ظاہر انقلابی تحریک کا مقصد صرف یہ ہو کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈال کر اسی کے ہاتھ سے آزادی کا آئین حاصل کیا جائے اور نافذ کرایا جائے تو پھر مولانا کے خیال کے مطابق اس آئین میں مسلمانوں کی جگہ پہلے سے متعین کرانے کا مطالبہ لامحالہ درست اور ضروری تھا۔

حالات جس مقام تک پہونچ چکے تھے اس سے آگے مسلمانوں کے لئے صحیح عملی راستہ کیا تھا؟ یہ سوال آہستہ آہستہ مسلمان لیڈروں کے دلوں میں ابھرا اور انھیں پھر کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر آئندہ پروگرام طے کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس غرض کے لئے مسلم لیگ کا پلیٹ فارم ہی موزوں خیال کیا گیا۔ یہ جماعت ستمبر ۱۹۲۰ء کے سیشن کے بعد عملاً معطل ہو گئی تھی۔ تقریباً چار سال کے تعطل کے بعد کئی حلقوں کی جانب سے درخواست اور مشورے کی بنا پر مسٹر جناح نے مسلم لیگ

کا ایک خاص اجلاس لاہور میں ۲۴ مئی ۱۹۲۴ء کو منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ اجلاس مسلمانوں کی سیاست کے نئے دور کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

اس وقت تک مسلمانوں کے سیاسی کیمپ میں بھی کچھ ردوبدل ہو چکا تھا جو اپنی جگہ بہت دلچسپ تھا۔ گذشتہ دس بارہ برسوں میں کئی مسلمان لیڈر مذہب، مسلم قومیت اور مسلمانوں کی عالمی سیاست کے پیغام لے کر مسلمانوں کی سیاست میں ابھرے تھے۔ تحریکِ عدم تعاون کی صفِ اوّل میں مسلمانوں کی نمائندگی یہی صاحبان کر رہے تھے۔ لیکن اس تحریک کے خاتمے پر یہ صاحبان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ مسلم قومیت اور پین اسلام ازم کے نعروں کو بھلا کر کانگریس کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور کانگریس کی "ہندوستانی" (عملاً ہندو) قومیت کے تصور پر مبنی سیاست میں مدغم اور مسلمانوں کی سیاست سے بے تعلق ہوتا چلا گیا۔ اس کی سب سے نمایاں مثال مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ دوسرا گروہ ایسا تھا جس کے ذہنی شعور پر مسلم قومیت کا جذبہ غالب رہا۔ یہ گروہ کانگریس کے ساتھ بھی رہا پھر اس سے الگ بھی ہوا لیکن مسلمانوں کی سیاست سے کبھی بے تعلق نہ ہوا۔ اس کی سب سے نمایاں مثال مولانا محمد علی جوہر تھے۔ آپ کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۲۳ء (کوکناڈا) کے صدر منتخب کیے گئے۔ آئندہ ایک سال کے لئے وہ اس عہدے کے حامل رہے۔ لیکن کانگریس کے کیمپ میں یہ اعزاز حاصل کرنے کے باوجود وہ مسلم لیگ کے اجلاسِ لاہور میں پہنچے اور اس کے بعد اپنی عمر کے آخری لمحے تک مسلمانوں کی سیاست میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ اس دوران میں ایک اور شخصیت بھی جسے اس سے پہلے اس صوبے سے باہر کم لوگ جانتے تھے مسلمانوں کی قومی سیاست کی سطح پر ابھر آئی تھی۔ یہ پنجاب کے میاں فضل حسین تھے۔ جنہوں نے آئندہ دس بارہ برسوں میں مسلمانوں کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلم لیگ کو اس مرحلے پر لاہور میں اجلاس منعقد کرنے کی دعوت انہی کی پیش قدمی کا نتیجہ تھی۔ اس اجلاس میں مسلم مطالبات کا جو نیا فارمولا منظور کیا گیا وہ بھی انہی کا مرتب کردہ تھا۔

۱۹۱۶ء کے کانگریس مسلم لیگ سمجھوتے کے بعد ۱۹۲۴ء تک ملک کے سیاسی حالات بالکل بدل چکے تھے۔ اب مسلمانوں کے مطالبات کو مکمل آزادی (کم از کم ڈومی نین کے درجے کی آزادی) کے تصور کے ساتھ ہم آہنگ کرلے کی ضرورت تھی۔ لیکن جمہوری آزادی کے ساتھ مسلمانوں کے لئے

تحفظات کا مطالبہ اپنے اندر عجیب تضاد رکھتا تھا۔ تحفظات کس کے خلاف؟ کیا اسی اکثریت کی امکانی زیادتیوں کے خلاف جسے خود مسلمان مطالبہ آزادی کے ذریعے مکمل اختیار و اقتدار کی مالک بنانا چاہتے تھے؟ پھر اس اکثریت کی دست برد سے "تحفظات" کا تحفظ کون کرے گا؟ اس عجیب الجھن سے بچنے کی گنجائش صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی تھی کہ مسلمان جو پورے ملک میں صرف ۲۵ فیصد اقلیت تھے۔ ملک کے ہر حصے میں اقلیت نہ تھے۔ لہذا صوبائی خودمختاری کے ذریعے اس بات کا بندوبست ہو سکتا تھا کہ انگریز سے ہندوستانیوں کو منتقل ہونیوالے اختیارات کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس طرح تقسیم کیا جائے کہ کسی حد تک دونوں کے درمیان توازن قائم رہے۔ "فضل حسین فارمولا" میں اسی نکتے سے فائدہ اٹھانے کے لئے مسلم مطالبات کو نئی شکل دی گئی۔

یہ عجیب اتفاق ہوا کہ جس دن لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا۔ اسی دن (یعنی ۲۴ مئی ۱۹۲۴ء کو) انتخابی ٹریبونل نے راجہ غضنفر علی کی عذرداری پر اپنا فیصلہ سنایا۔ راجہ صاحب کے فریق مخالف کے وکیل ملک برکت علی تھے۔ وہ بھی فیصلہ سننے کے لئے عدالت میں موجود تھے۔ فیصلہ سن لیا تو ملک صاحب اور راجہ صاحب دونوں عدالت سے نکل کر ایک تانگے میں بیٹھے، اور سیدھے جلسہ گاہ میں پہنچے۔ جلسہ میکلوڈ روڈ پر ایک سینما ہال میں تھا جس کا نام اب صنوبر سینما ہے مسٹر جناح صدر جلسہ تھے۔ حاضری کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جلسہ کیلئے ایک سینما ہال کو کافی سمجھا گیا تھا لیکن ڈائس پر ممتاز لیڈروں کا شاندار اجتماع تھا۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر بھی تھے۔ جن کے ساتھ کانگریسی اور خلافتی مسلمان لیڈروں کی ایک مضبوط ٹیم تھی۔ جن میں چودھری خلیق الزماں اور مسٹر آصف علی شامل تھے اور سر فضل حسین اور پنجاب اور یو۔پی کے "اعتدال پسند" لیڈر بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔

مسٹر جناح نے اپنے خطبہ صدارت کا کچھ حصہ ایک ٹائپ شدہ کاغذ سے پڑھا اور کچھ زبانی بیان کیا۔ آپ کی تقریر کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد ناگزیر ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائیدار اور تسلی بخش سمجھوتہ بہتر طریق پر اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر سمجھوتے کی شرائط کے متعلق وحدت خیال اور اتفاق رائے موجود ہو۔ اس

اجلاس کے سامنے سب سے اہم کام یہی ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے متعلق ایک فارمولا مرتب کیا جائے جس کی بنا پر ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں بالخصوص کانگریس کے ساتھ گفت وشنید کی جا سکے۔ بہ الفاظ دیگر مسٹر جناح نئے حالات میں پھر اپنے پرانے مشن کا آغاز کر رہے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے وقت اجلاس برخاست ہوا تو راجہ غضنفر علی نے آگے بڑھ کر مسٹر جناح سے اپنا تعارف کرایا۔ "جناب میں آپ کی اسمبلی کا تازہ ترین ممبر ہوں۔ آج ہی منتخب ہوا ہوں"۔ آج ہی؟ وہ کیسے؟ راجہ صاحب نے کیفیت بیان کی۔ جناح صاحب نے انھیں مبارکباد دی اور کہا کہ امید ہے آپ میری پارٹی میں شرکت کے سوال پر غور کریں گے۔

راجہ صاحب بولے۔ "جناب اپنی پارٹی کا ممبر آپ مجھے ابھی سے سمجھ لیں۔ غور میں اس کے بعد کروں گا"۔ یہاں سے قائد اعظم کے ساتھ راجہ صاحب کی نیازمندی شروع ہوئی جو تمام عمر قائم رہی۔

مجوزہ قراردادیں سب جیکٹس کمیٹی میں بہ آسانی خفیف ردوبدل کے ساتھ منظور ہو گئیں۔ بحیثیت مجموعی ان کا رُخ مسٹر جناح نے اپنے منشاء کے مطابق رکھا۔ یعنی ان میں ایک مطالبہ ملک کے لئے جلد از جلد ڈومی نین کے درجے کی آزادی کے لئے تھا۔ دوسرا مطالبہ مسلمانوں کیلئے مطلوبہ تحفظات کا تھا۔ تیسرا مطالبہ صوبہ سرحد کو آئینی لحاظ سے دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دینے کے لئے تھا اور ایک قرارداد میں ایک کمیٹی نامزد کی گئی تھی جسے مسلم مطالبات کے متعلق دوسری جماعتوں کے ساتھ گفت وشنید کا اختیار دیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد کے متعلق مطالبے کو ملا کر مسلم مطالبات کے بنیادی نکات یہ تھے (۱) مرکز کی ساخت فیڈرل طرز کی ہو جس میں اختیارات مابقی صوبوں کو حاصل ہوں (۲) طرز انتخاب ہر جگہ جداگانہ ہو (۳) جو فرقہ کسی صوبے میں آبادی کے لحاظ سے اکثریت رکھتا ہو اس کی اکثریت کو اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ کیا جائے۔ (۴) بہت چھوٹی اقلیتوں کو جو خاص رعایت کے بغیر نمائندگی حاصل نہ کر سکتی ہوں نمائندگی کے معاملے میں خاص رعایت دی جائے اور (۵) صوبہ سرحد سمیت مسلمان اکثریت کے خود مختار صوبوں کی تعداد متعین کر دی جائے۔ "بہت چھوٹی اقلیتوں" کو مراعات دینے کے متعلق جو الفاظ قرارداد کے متن میں استعمال کئے گئے تھے ان میں پنجاب اور بنگال کے حالات کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ ان صوبوں میں ہندو "بہت چھوٹی اقلیت" کی ذیل میں نہ آتے تھے۔ لہٰذا قرارداد کا منشاء یہ تھا کہ ان

صوبوں میں ہندو اقلیت کو خاص مراعات دینے اور اس غرض کے لئے مسلم اکثریت کو کم کرنیکی ضرورت نہ تھی۔ لیکن "بہت چھوٹی اقلیت" کے متعلق قرارداد کے الفاظ کی زد یو۔پی کی مسلم اقلیت پر بھی پڑتی تھی۔ یو۔پی کے نمائندے ڈاکٹر ضیاء الدین اور سر محمد یعقوب سب جیکٹس کمیٹی کے اجلاس میں خاموش رہے۔ لیکن اس کے بعد وہ سر فضل حسین سے ملے۔ ان کی خواہش تھی کہ قرارداد کے الفاظ میں اس طرح ادو بدل کر دیا جائے کہ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کا مطالبہ بھی قائم رہے اور باقی صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو جو مراعات ۱۹۱۶ء کے سمجھوتے کے تحت حاصل تھیں انھیں بحال رکھنے کی گنجائش بھی موجود رہے۔ سر فضل حسین نے ان کی بات مان لی۔ قرارداد کی متعلقہ شق کو نئے الفاظ میں لکھا گیا۔ اور یہ طے ہو گیا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین اس کے مطابق کھلے اجلاس میں قرارداد پر بحث کے وقت ایک ترمیم پیش کر دیں۔ یہ ترمیم اس سیشن کے ہنگامے کا موضوع بن گئی۔

اگلے دن کھلے اجلاس میں سب جیکٹس کمیٹی کی منظور شدہ قرارداد سر عبدالقادر نے پیش کی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے ترمیم پیش کی کہ قرارداد کی اس شق کو (جو تناسب نمائندگی سے متعلق تھی) اس طرح تبدیل کیا جائے "مجالس قانون ساز اور تمام منتخب شدہ اداروں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا ایسا طریق اختیار کیا جائے کہ ہر صوبے میں اقلیتوں کو موثر نمائندگی حاصل ہو سکے بشرطیکہ اس لازمی اصول کو قائم رکھا جائے کہ کسی فرقہ کی اکثریت کو اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ ہونے دیا جائے۔"

مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ہمخیال لوگوں نے اس ترمیم کی سخت مخالفت کی۔ ان کی رائے تھی کہ قرین انصاف مطالبہ یہ ہے کہ ہر صوبے میں ہر فرقہ کو اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق نمائندگی حاصل ہو۔ رعایت صرف ایسی بہت چھوٹی اقلیتوں کو دی جائے۔ جو خاص رعایت کے بغیر نمائندگی حاصل کرنے کے قابل نہ ہوں۔ ایک دو تقریروں کے بعد مولانا جوہر خود اس ترمیم کے خلاف تقریر کرنے لگے۔ آپ نے کہا کہ میں کسی ایسے مطالبے کی حمایت نہیں کر سکتا جس کا مطلب یہ ہو کہ چت بھی میری اور پٹ بھی میری۔ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہماری اکثریت بہر حال قائم رکھی جائے اور جہاں ہم اقلیت میں ہوں وہاں ہمیں تناسب آبادی سے زیادہ نمائندگی دی جائے۔ مسلمانوں کو اس قسم کا مطالبہ نہ کرنا چاہیے۔

ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگرس کے صدر کی حیثیت سے مولانا کا وقار اور ان کی بارعب شخصیت اور ہر مجمع پر چھا جانے والا خطیبانہ انداز۔ یہ باتیں حاضرین کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں۔ مولانا کا جواب دینے کے لئے سرفضل حسین سامنے آئے۔ آپ نے ایک منطقی اور سلجھی ہوئی تقریر کی اور مولانا محمد علی کے ساتھ نوک جھونک بھی خوب کی۔ آپ کی دلیل یہ تھی کہ اس مطالبے میں بے انصافی کی کیا بات ہے؟ جو فرقہ کسی صوبے کی آبادی میں اکثریت رکھتا ہو۔ اس کی اکثریت کو اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ کیا جائے۔ یہ اصول صرف مسلمان اکثریت کے لئے نہیں بلکہ مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت دونوں کے لئے ہے۔ اس اصول کو قائم رکھتے ہوئے اگر اقلیت کے فرقوں کو مراعات دینے کی گنجائش ہو تو کیوں نہ دی جائے، ظاہر ہے کہ مراعات کی مقدار گنجائش کے مطابق ہر صوبے میں وہاں کے خاص حالات کی روشنی میں طے ہونی چاہئے۔ پنجاب اور بنگال میں ہماری اکثریت صرف پچپن یا چھپن فیصد ہے اس اکثریت کو اقلیت یا مساوات میں تبدیل کئے بغیر جو رعایت اقلیتوں کو دی جا سکتی ہو۔ ہمیں اس سے انکار نہیں۔ یو۔پی میں ہندو اکثریت چھیاسی فیصد ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں اقلیت کو مراعات دینے کی گنجائش زیادہ ہے۔ مدراس میں ہندو اکثریت ترانوے فیصد ہے وہاں گنجائش اس سے بھی زیادہ ہے۔ ہم تمام ملک میں یکساں اصول کا اطلاق چاہتے ہیں۔ البتہ یہ چاہتے ہیں کہ مراعات کی مقدار معین کرتے وقت ہر صوبے کے حالات اور عملی گنجائش کو مدنظر رکھا جائے۔

دونوں لیڈروں کے درمیان نوک جھونک اور فقرہ بازی اس وقت شروع ہوئی۔ جب سرفضل حسین نے اپنی تقریر میں کہا کہ مولانا محمد علی کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ اس وقت اس بحث سے الگ اور بالاتر رہتے۔ وہ کانگرس کے صدر ہیں۔ مسلم لیگ کے مطالبات بالآخر کانگرس کے زیرغور آئیں گے۔ مولانا کے لئے مطالبات کے حسن و قبح کے متعلق فیصلہ کرنے کا مناسب وقت وہ ہوگا۔

مولانا محمد علی نے لقمہ دیا کہ میں نے یہاں مسلم لیگ کے ممبر کی حیثیت سے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ سرفضل حسین بھی حاضر جواب وکیل تھے۔ بولے کہ ایک ہی فرد کی دو حیثیتوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کی یہ بات بہت دلچسپ ہے۔ میرے ایک دوست منشی محبوب عالم (جو اس وقت پیسہ اخبار کے ایڈیٹر تھے) ایک کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ایک تجویز کے حامی تھے۔ اگلے دن اپنے اخبار میں خود

نے اس کی مخالفت کی۔ جب ان سے شکوہ کیا گیا تو کہنے لگے کہ جناب کمیٹی میں میری حیثیت الگ تھی اخبار کے ایڈیٹر کے لحاظ سے میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہوں"۔

ایک اور موقعہ پر مولانا محمد علی نے سر فضل حسین کو لقمہ دیتے ہوئے کہا کہ :

"آنریبل وزیر کی یہ دلیل میری فہم سے بالاتر ہے"۔

سر فضل حسین : "جناب یہ میری قوتِ بیان کا قصور ہے۔ میں اپنے بھائی محمد علی صاحب کی طرح اردو کا زبان دان نہیں۔ ایک پنجابی ڈھگا ہوں لیکن میں پھر اپنی بات کی وضاحت کی کوشش کرتا ہوں"۔

کافی گرما گرم بحث کے بعد صدر جلسہ نے رائے شماری کی تو ترمیم کثرتِ رائے سے پاس ہو گئی۔ مسٹر جناح نے پوچھا کہ اب ایوان ترمیم شدہ قرارداد پر مزید بحث کی ضرورت سمجھتا ہے؟ مزید بحث کے بغیر ترمیم شدہ قرارداد بہ اتفاق رائے پاس ہو گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اجلاس کے خاتمے کے بعد مولانا محمد علی جوہر سر فضل حسین کے ساتھ بہت گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے اور جو دوست قریب کھڑے تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر بولے آپ کو شاید معلوم نہیں کہ فضل حسین طالب علمی کے زمانے سے میرا دوست ہے۔ ہم انگلستان میں اکٹھے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب یہ اس حکومت کا رکن ہے جس سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی تدابیر ہم دونوں اور ایک تیسرا نوجوان باجپائی (جو بعد میں حکومتِ ہند کا سیکرٹری رہا) اکٹھے بیٹھ کر سوچتے تھے۔ مولانا نے پھر ایک فارسی کا شعر پڑھا ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

اس اجلاس میں ایک فارسی کا شعر سر عبد القادر نے بھی پڑھا۔ اجلاس کی کارروائی کے خاتمے پر انھوں نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور صدر جلسہ کی بہت تعریف کی کہ انھوں نے ایک مشکل بحث پر بہت دانائی کے ساتھ قابو رکھا اور ایوان کی رہبری بہت قابلیت کے ساتھ کی۔ خاتمہ کلام کے طور پر آپ نے جناح صاحب کو مخاطب کر کے یہ شعر (اپنی ترمیم کے ساتھ) پڑھا ؎

بہ یک آمدن ربودی دل و جانِ اہلِ لاہور — چہ شود اگر بدیں ساں دو سہ بار خواہی آمد

راجہ غضنفر علی نے مولانا محمد علی جوہر اور سر فضل حسین کا مناظرہ بھی سُنا۔ اور اجلاس کے بعد انہیں بغل گیر ہوتے بھی دیکھا۔ ان کا تاثر تھا کہ یہ بحث اب ختم ہو گئی ہے اور جو فیصلہ کثرت رائے سے ہو گیا ہے۔ دونوں فریق اسے تسلیم کر لیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ دہلی واپس جا کر مولانا نے اخبارات کو ایک بیان دے دیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ لاہور کے اجلاس نے مسلمانوں کے مطالبات کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔ صحیح مطالبہ وہ تھا جو سب جیکٹس کی منظور شدہ قرارداد میں پیش کیا گیا تھا۔ اگلے دن اس میں ترمیم صرف اس وجہ سے ہوئی کہ پنجاب کے وزیر نے ایوان میں اپنے آدمی جمع کر دیئے تھے۔

دو دن کے بعد مسٹر جناح نے ایک جوابی بیان میں کہا کہ مولانا محمد علی کی رائے ایک فرد کی رائے ہے۔ جماعتی فیصلہ وہی ہے جو لیگ کے کھلے اجلاس میں منظور ہوا۔ ہندوؤں کو مولانا کے بیان سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ مولانا محمد علی نے جواب الجواب دیا۔ لیکن مسٹر جناح نے خاموشی اختیار کر کے اس اخباری بحث کو ختم کر دیا۔

۶۔ شدھی اور تبلیغ کی ٹکر

مئی ۱۹۲۳ء میں جب راجہ غضنفر علی خاں لاہور کی مصروفیات سے فارغ ہو کر اپنے وطن کو لوٹے تو اسمبلی کا گرمائی اجلاس شروع ہونے سے پہلے ابھی چند ہفتوں کا وقفہ تھا۔ اس وقفے میں انھیں یو۔پی کے بعض دیہات کا دورہ کرنا پڑا جہاں اس زمانے میں شدھی اور تبلیغ کے درمیان زور شور کی جنگ جاری تھی۔ یہ جنگ سوامی شردھانند نے شروع کی تھی۔ اس شخص نے ہندوستان کی تاریخ میں خاصا دلچسپ کردار ادا کیا ہے۔ یہ ایک زمانے میں پنجاب پولیس میں تھانیدار تھا۔ اور اس کا نام منشی رام تھا۔ پھر اس نے وکالت شروع کی اور اس کے بعد ترکِ دنیا کر کے گیان دھیان کی زندگی بسر کرنے لگا اور گوروکل ہردوار میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گیا۔ یہاں اسے سوامی شردھانند کا خطاب ملا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر دہلی میں منتقل کر لیا۔ جب رولٹ ایکٹ کیخلاف ایجی ٹیشن شروع ہوا تو اس نے ایک نیم مذہبی۔ نیم سیاسی لیڈر کی حیثیت سے اس میں نمایاں حصّہ لیا۔ اسی زمانے میں ایک دن دہلی کے مسلمان اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر جامع مسجد میں لے گئے اور اس نے جامع مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ پھر تحریکِ عدم تعاون کے سلسلہ میں اس نے جیل یاترا کی۔ ابھی قید کی میعاد پوری نہ ہوئی تھی کہ اسے رہائی مل گئی۔ لیکن یہ شخص جیل سے نکلا تو اس نے اپنے ایک عظیم منصوبے کا اعلان کر دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو جن کے باپ دادا ہندو تھے۔ شدھ کر کے دوبارہ ہندو بنا لیا جائے۔ اس مہم کا آغاز اس نے بیس یا تیس ہزار راجپوتوں کے ایک قبیلے سے کیا جو بیشتر ضلع آگرہ کے دیہات میں آباد تھے۔ یہ مردم شماری کے اعتبار سے مسلمان تھے۔ لیکن اکثر ہندوانہ رسوم کے پابند تھے۔ ان کا قبیلہ ملکانہ راجپوتوں کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

۔ سوامی شردھانند نے ملکانہ راجپوتوں میں شدھی کی مہم شروع کی۔ تو مسلمانوں میں شور مچا اور جوابی کارروائی کے لئے کئی تبلیغی جماعتیں میدان میں آئیں۔ یہ جماعتیں اپنے طور پر الگ الگ مسلم عوام سے چندوں کی اپیل کرتی تھیں۔ ضلع جہلم کی ایک مسلمان جماعت نے اس مقصد کے لئے دس ہزار روپیہ

جمع کئے تھے۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ یہ چندہ کونسی جماعت کو دیا جائے۔ انھوں نے راجہ غضنفر علی سے کہا کہ وہ موقع پر جا کر ہر جماعت کے کام کا اندازہ کریں اور بتائیں کہ چندہ کس کو دینا بہتر ہوگا۔

راجہ صاحب نے ملکانہ راجپوتوں کے دیہات میں جا کر عجیب کیفیت دیکھی۔ مسلمان مبلغ ان کے ایمان کو اور ہندو پرچارک ان کے دھرم کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور ملکانے دونوں کو بیوقوف بنا کر ان سے روپیہ بٹورنے میں مصروف تھے۔ کوئی مسلمان مبلغ ان کے گاؤں میں پہنچتا تو گاؤں کا مکھیا اسے الگ لے جا کر کہتا کہ ہم سب دل سے مسلمان ہیں اور اپنے دین کا اعلان کرنا چاہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم فلاں لالہ کے قرض میں دبے ہوئے ہیں وہ ہم پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اگر اس کا کچھ علاج ہو جائے تو ہمیں اسلام سے منحرف کون کر سکتا ہے؟ جب شدھی کا پرچارک اس گاؤں میں آتا تو اس کی آؤ بھگت دوسرا مکھیا کرتا اور مسلمان زمیندار کے دباؤ کا رونا روتا۔ جس کے لگان کی بقایا کا بوجھ انہیں ہندوؤں کا ساتھ دینے سے روکتا تھا۔

ان لوگوں کو اپنا فائدہ اسی بات میں نظر آتا تھا کہ نیم ہندو نیم مسلمان بنے رہیں اور شدھی اور تبلیغ کی مہم طول پکڑتی رہے۔ راجہ غضنفر علی نے تین چار دن مختلف جماعتوں کے مبلغوں کے ہمراہ دیہات میں دورے کئے اور ملکانوں کے ساتھ کچھ سنجیدہ اور کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کیں۔ واپس آکر انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو اپنے تاثرات بتلائے اور کہا کہ بہرحال چندہ جمعیت علمائے ہند کو بھیج دیا جائے۔

۷۔ مسٹر جناح کی پارٹی کا نیا رنگروٹ

مرکزی اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے سے تین چار دن پہلے راجہ صاحب شملہ پہنچ گئے۔ یہاں مختلف لوگوں سے رسمی ملاقاتوں کے سلسلے میں وہ مسٹر کیلورٹ کی کوٹھی پر بھی حاضر ہوئے۔ مسٹر کیلورٹ پنجاب کے فنانشل کمشنر تھے اور اپنے زمانے کے قابل افسروں میں شمار ہوتے تھے۔ پنجاب کی اقتصادیات پر ان کی کتابیں مشہور تھیں۔ مرکزی اسمبلی کے سرکاری ممبروں میں مختلف صوبوں کے جن اعلےٰ افسروں کو شامل کیا گیا تھا۔ ان میں مسٹر کیلورٹ بھی تھے۔ انھوں نے راجہ صاحب کو مشورہ دیا کہ ایک ناتجربہ کار نوجوان کے لئے جس نے سیاست میں پہلا قدم رکھا ہے ضروری ہے کہ وہ کسی تجربہ کار شخص کے ساتھ رابطہ قائم کرلے اور اس سے ہدایات حاصل کرتا رہے۔ راجہ صاحب ایک دن پہلے انڈی پنڈنٹ پارٹی کی ممبری کے فارم پر دستخط کرچکے تھے۔ انھوں نے کیلورٹ صاحب سے یہ ذکر نہ کیا اور بھولے پن سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں میرے لئے کوئی موزوں رہنما ہے؟ وہ بولے "بے شک۔ چودھری بہادل بخش۔ وہ ہے بھی پنجابی"۔

راجہ صاحب: "لیکن جناب میں عذرداری کے ذریعے چودھری بہادل بخش ہی کی جگہ منتخب ہوا ہوں وہ اب ممبر نہیں رہے"۔

صاحب بہادر کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ پھر انھوں نے کچھ سوچ کر اسمبلی کے ایک اور ممبر کو راجہ صاحب کے رہنما کے طور پر منتخب کیا۔ راجہ صاحب کے لئے اس کا نام غیر مانوس تھا۔ صاحب نے جو نام بتایا وہ راجہ صاحب کے کانوں کو مکھن خاں معلوم ہوا۔ راجہ صاحب نے ازراہ شرارت پوچھا کہ جناح صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"؟ کیلورٹ صاحب بولے "ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جناح ایک بے مغز ایجی ٹیٹر ہے۔ وہ سیاست کو نہیں سمجھتا اور پنجاب کے حالات سے نابلد ہے"۔

راجہ صاحب نے اس ملاقات کے بعد "مکھن خاں" کی جستجو کی۔ آخر انھیں معلوم ہوا کہ اسمبلی کا ایک رکن خان صاحب ایم۔ ای میکن ہے جو عجیب حالات میں منتخب ہوا ہے۔ جب اسمبلی کا انتخاب ہوا تھا تو

شروع میں سوراج پارٹی نے بمبئی کے مسلم حلقے میں بھی (جہاں مسٹر جناح امیدوار تھے) اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس پر سورت کے چند مسلمان سیٹھ جو جناح صاحب سے بے حد عقیدت رکھتے تھے ان کے پاس آئے اور انھیں سورت کے مسلم حلقے سے بلا مقابلہ منتخب کرانے کی ضمانت دی۔ مسٹر جناح نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بمبئی کے حلقے میں نامزدگی کے کاغذات داخل کر دیے۔ پھر سوراج پارٹی نے اپنے امیدوار کی درخواست واپس کرا دی اور مسٹر جناح بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ اس اثنا میں سورت کے سیٹھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم اپنے حلقے کی سیٹ بہر حال مسٹر جناح کے لئے خالی رکھیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ بمبئی میں ان کا مقابلہ ہو اور وہ ہار جائیں۔ اپنے حلقے کی سیٹ خالی رکھنے کی صورت یہی تھی کہ اس سیٹ پر ایک ڈمی کو بٹھا دیا جائے جو ضرورت کے وقت مستعفی ہو کر جناح صاحب کے لئے ضمنی انتخاب کا راستہ کھول دے۔ یہ ڈمی خاں صاحب ایم ای میکن تھے۔ جناح صاحب کو ان کی سیٹ کی ضرورت پیش نہ آئی۔ لہٰذا وہ اس سیٹ پر ڈٹے رہے وہ انگریزی زبان سے نابلد تھے۔ اردو ٹوٹی پھوٹی بولتے تھے۔ اسمبلی میں خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن ووٹ ہمیشہ گورنمنٹ کے ساتھ دیتے تھے اور اس بات کو ایک مذہبی فریضہ کی طرح نبھاتے تھے۔

اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو راجہ غضنفر علی خاں حلفِ وفاداری اٹھا کر انڈی پنڈنٹ پارٹی کے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت اسمبلی کی کیفیت یہ تھی کہ سوراج پارٹی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ جس کے قائد پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ اس سے کچھ کم تعداد سرکاری بلاک کی تھی۔ سرکاری بلاک سے مراد صرف سرکاری افسر نہ تھے۔ ان کے علاوہ نامزد غیر سرکاری ممبر۔ غیر سرکاری یورپین ممبر اور چند منتخب شدہ ممبر بھی حکومت کی منشا کے مطابق ووٹ دیتے تھے اور ان سب کی تعداد مل ملا کر سوراج پارٹی کی طاقت کے لگ بھگ پہنچ جاتی تھی۔ انڈی پنڈنٹ پارٹی کی تعداد ایک سو چالیس ممبروں کے پورے ایوان میں صرف اٹھارہ تھی۔ لیکن طاقت کا توازن اسی ننھی منی پارٹی کے ہاتھ میں تھا۔ پارٹی کے ممبروں میں ہندوستان کے کئی چوٹی کے آدمی شامل تھے۔ مثلاً پنڈت مدن موہن مالویہ۔ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس، سر چمن لال سیتلواد۔ اور ان ہاتھیوں کے فیل بان یعنی پارٹی کے لیڈر مسٹر جناح تھے لیکن یہ ہاتھی فیل بان کے انکس سے بہت حد تک آزاد تھے۔

انڈی پنڈنٹ پارٹی کا آئین جو اس کے ممبروں نے وضع کیا تھا۔ بہت عجیب تھا۔ ہر ممبر تقریر

کرنے اور ووٹ دینے کے معاملہ میں اپنی مرضی کا مالک تھا۔ سوائے اس صورت کے کہ پارٹی یا اس کی مجلسِ عاملہ کسی مسئلے کو جماعتی مسئلہ قرار دے دے۔ ایسے مسائل پر پارٹی کے ممبر پارٹی کی ہدایات کیمطابق ووٹ دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ بھی یہ شرط تھی کہ اگر کسی ممبر کا ضمیر پارٹی کی ہدایت کو قبول نہ کرتا ہو تو وہ پارٹی کے سیکرٹری کو اطلاع دے کر ووٹنگ کے وقت غیر جانبدار رہ سکتا تھا۔ البتہ پارٹی کی مقرر کردہ لائن کی ایوان میں مخالفت نہ کر سکتا تھا۔ تعجب تھا کہ اس قسم کے آئین کے باوجود انڈی پنڈنٹ پارٹی عام طور پر ایک پارٹی کی طرح کام کرتی تھی۔ ہندوستان کو سیاسی آزادی کی جانب لے جانے والے ہر ترقی پسندانہ اقدام کی انڈی پنڈنٹ پارٹی حمایت کرتی تھی۔ عام طور پر وہ سوراج پارٹی کا ساتھ دیتی تھی۔ دونوں پارٹیوں میں فرق صرف یہ تھا کہ سوراج پارٹی مخالفت برائے مخالفت کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ انڈی پنڈنٹ پارٹی اس بات کی قائل نہ تھی اور محض حکومت کو زچ کرنے کے لئے نظم و نسق میں رکاوٹ پیدا کرنا درست خیال نہ کرتی تھی۔

راجہ غضنفر علی چھوٹے چھوٹے دیہاتی جلسوں میں تقریریں کرتے رہے تھے لیکن اسمبلی میں انھیں ایسے ممبر نظر آئے جن کے سامنے انھیں لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے نہ کوئی سوال پوچھا۔ نہ کوئی تقریر کی۔ دوسروں کی تقریریں سنتے رہے اور ووٹنگ کے معاملے میں پارٹی کے قائد کے نقشِ قدم پر چلتے رہے اور پورا سیشن گزار دیا۔ البتہ پارٹی کی خدمت گزاری میں چستی اور مستعدی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ کیونکہ اس پارٹی میں باقی سب لوگ مخدوم تھے۔ خادم کوئی نہ تھا۔

راجہ صاحب نے پارٹی کے سیکرٹری کو اس کے کام میں مدد دینا شروع کیا اور جلد ہی نوٹس جاری کرنے ایجنڈا تیار کرنے اور پارٹی کے جلسوں کا انتظام کرنے کا کام اور اس قسم کے کئی دوسرے کام عملاً اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ مسٹر جناح کے ساتھ ان کے ذاتی روابط بڑھے اور پارٹی کے کاموں کے متعلق ہدایات انھیں براہِ راست ملنے لگیں تو انھوں نے غیر رسمی طور پر مسٹر جناح کے پرسنل سیکرٹری کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس سے بھی زیادہ وہ بیگم جناح کے پرسنل سیکرٹری بن گئے۔ بیگم جناح اس زمانے میں اپنے نامور شوہر کی سرگرمیوں میں بہت فخر کے ساتھ دلچسپی لیتی تھی اور اسمبلی کے سیشن کے وقت اکثر ان کے ہمراہ شملہ اور دہلی میں قیام کرتی تھیں۔ یہ بمبئی کے ایک کروڑپتی پارسی سیٹھ کی صاحبزادی تھیں۔ جنھوں نے اپنی پسند کے مطابق مسٹر جناح سے شادی کی تھی۔ وہ پہلے مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ پھر ان کا نکاح ہوا۔ نکاح نامے پر بطور گواہ

دستخط کرنے والوں میں مسٹر جناح کے خاص دوست راجہ محمود آباد (موجودہ راجہ محمود آباد کے والد مرحوم) بھی تھے جو عمر بھر قائدِ اعظم کے ذاتی دوست اور سیاسی رفیق رہے۔ راجہ محمود آباد مدّتوں مسلم لیگ کے دفتر کا پورا خرچ اور عملے کی تنخواہیں وغیرہ اپنی جیب سے دیتے رہے۔

بیگم جناح نے دیکھا کہ راجہ غضنفر علی خاصا بامذاق اور دلچسپ باتیں کرنے والا نوجوان ہے اور ایوان کے اندر اس کی حاضری اور غیر حاضری سے اس کی پارٹی کے کام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو وہ بسا اوقات اسمبلی کی لابی میں آ کر پہلے انہیں باہر بلوا بھیجتی تھیں پھر ان سے پوچھتی تھیں کہ مسٹر جناح اپنے پروگرام میں خلل ڈالے بغیر کب باہر آسکیں گے اور کبھی کبھی چائے وغیرہ کے لئے اپنے شوہر کا انتظار کرنے کے لئے لابی میں بیٹھ جاتی تھیں اور راجہ غضنفر علی سے ایوان کے اندر کی کیفیت معلوم کرتی تھیں۔

ایک دن مسٹر جناح فارغ ہوئے تو انھیں پیغام ملا کہ مسز جناح لابی میں چائے کے لئے ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ تشریف لائے۔ دونوں میاں بیوی اور راجہ غضنفر علی چائے پی رہے تھے کہ سر چمن لال سیتلواڈ بھی وہاں آگئے۔ وہ جناح صاحب کے خاصے بے تکلف دوست تھے۔ آتے ہی بیگم جناح سے کہنے لگے "مسز جناح اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی محفل میں مخل ہو جاؤں"۔ یہ کہہ کر وہ بھی چائے میں شریک ہو گئے۔ اور پھر مسٹر جناح سے کہنے لگے: "جناح! میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس بات پر ایک جگہ بحث ہو رہی تھی اور میں کہہ رہا تھا کہ تم اسماعیلیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہو۔ کیا میرا خیال درست ہے؟"

"بالکل غلط" جناح صاحب نے فرمایا "میں اثنا عشری شیعہ ہوں۔ جس کا مطلب ہے بارہ اماموں کو ماننے والا۔ اسماعیلیہ فرقہ اس سے بالکل الگ شے ہے"۔

بیگم جناح مسکرا کر کہنے لگیں۔ "چمن۔ میرے بارے میں بھی کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ میں بھی وہی ہوں جو جناح نے ابھی تمہیں بتایا ہے"۔

۸- مہاتما گاندھی کا اکیس روزہ برت

اسمبلی کا اجلاس ختم ہوا یا ختم ہونے والا تھا۔ راجہ غضنفر علی ابھی شملہ میں ہی تھے کہ کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد کی خبر آئی۔ ہندو مسلم فساد اس زمانے میں آئے دن کا معمول تھا لیکن اس موقعہ پر دو تین دن پے درپے اخباروں میں جو خبریں چھپیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوہاٹ کا فساد غیر معمولی شدت کا تھا۔ اخباروں کے بیان کے مطابق ۹ ستمبر اور ۱۰ ستمبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی شب کو شہر میں قتل و غارت اور لوٹ مار ہوتی رہی۔ کئی ہندو مارے گئے۔ ڈیڑھ سو کے قریب زخمیوں کو ہسپتال میں داخل کیا گیا مکان لوٹے گئے اور جلا دیئے گئے اور تمام ہندو آبادی نے اگلے ہی دن کوہاٹ کو خالی کر کے راولپنڈی اور بعض دوسرے شہروں میں پناہ لی۔ ان خبروں میں مبالغہ آمیزی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ خبر رسانی کے ذرائع پر ہندوؤں کا تقریباً مکمل قبضہ تھا تاہم یہ فساد واقعی شدید تھا۔

چند دنوں کے بعد یہ ڈرامائی خبر اخباروں میں چھپی کہ ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر مہاتما گاندھی نے ۲۱ دن کا برت رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں یہ اقدام بہت انوکھا تھا جس نے تمام ملک کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ مہاتما جی اس وقت دہلی میں مولانا محمد علی جوہر کے مکان پر بطور مہمان مقیم تھے۔ مولانا کی کانگریس کی صدارت کا سال ابھی جاری تھا۔ آپ نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے فی الفور ایک اتحاد کانفرنس کا انتظام کیا۔ اور مختلف لیڈروں کو تاریں بھیجیں کانفرنس کے مقصد سے ہمدردی رکھنے والے اور نمائندہ حیثیت کے لوگوں کو اس میں شرکت کی عام دعوت بھی اخباروں کے ذریعے دی گئی۔

گاندھی جی کے اقدام سے ملک بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ انگریز افسر انھیں حکومت کا دشمن سمجھتے تھے تاہم مذہبی میلان رکھنے والے بعض انگریز کبھی یہ بھی سوچتے تھے کہ اس شخص کے کردار اور مسیح کی تعلیمات کے درمیان کتنی عجیب مماثلت ہے۔ مہاتما جی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو جسمانی تکلیف دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی تمام دنیا کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے صلیب پر اپنا خون دیا تھا۔ مہاتما گاندھی کے اقدام میں انہیں مسیح کے کردار کی جھلک نظر آئی اور جو لوگ مولانا محمد علی کی عام دعوت کے جواب میں مہاتما کے مشن کی کامیابی کی خاطر اتحاد کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان میں ہندوستان کے سرکاری عیسائی چرچ کا لاٹ پادری بھی موجود تھا۔ راجہ غضنفر علی بھی شملہ سے دہلی پہونچے اور کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مہاتما کا برت ۱۸ ستمبر کو شروع ہوا۔

اتحاد کانفرنس نے ۲۶ ستمبر سے کام شروع کیا۔ اس نے مختلف نکات پر تفصیلی بحث کے لئے سب کمیٹیاں بنائیں۔ شدھی۔ تبلیغ۔ گئو کشی۔ نماز اور آرتی کے وقت مسجدوں اور مندروں کے سامنے باجے بجانا اور اسی قسم کے مذہبی اسباب اختلاف و فساد زیر بحث آئے۔ یہ سب مسائل ایسے تھے کہ ان کے متعلق رواداری کے اصول اور کاغذی فارمولے بہ آسانی مرتب کئے جاسکتے تھے۔ تمام لوگوں کی خواہش بھی یہی تھی کہ کسی طرح مہاتما جی کو اتحاد کانفرنس کی کامیابی کی خوشخبری سنائی جائے۔ چنانچہ ان جھگڑوں کو نبٹانے کے کچھ اصول اتفاق رائے سے منظور کر لئے گئے اور کانفرنس کا آخری کھلا اجلاس متفقہ فیصلوں پر اظہار خوشنودی کے لئے اور عوام سے اتحاد کی اپیل کرنے کی غرض سے منعقد ہوا۔

اس اجلاس میں راجہ غضنفر علی خاں تقریر کرنے پر عجیب طرح مجبور ہوئے۔ لیڈر قسم کے لوگوں کے سامنے تقریر کرنے کی انھیں ابھی تک جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ کانفرنس میں مولانا احمد سعید کے قریب بیٹھے تھے اور مولانا کے استفسار پر انھیں بتا رہے تھے کہ انگریزی زبان میں تقریر کرنے والا مقرر کیا کہہ رہا تھا۔ اتنے میں انھیں مسز سروجنی نائڈو کا رقعہ ملا۔ "ڈائس کے پیچھے آکر میری بات سنو"۔ وہ مسز نائڈو کے پاس پہنچے۔ تو انھیں بتایا گیا کہ انھیں بھی ایک تقریر کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ راجہ غضنفر علی نے گھبرا کر کہا "میں تقریر نہیں کرسکتا۔ میں نے آج تک کوئی تقریر نہیں کی"۔ مسز نائڈو بولیں لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ پنجاب کے مسلمانوں کی جانب سے زیر بحث قرارداد کی تائید ضرور ہونی چاہیے۔ اور یہاں پنجاب کے مسلمانوں کا نمائندہ آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ مسز نائڈو یہ کہہ کر جلدی سے ڈائس پر چلی گئیں۔ راجہ صاحب پریشانی کے عالم میں اپنی نشست پر واپس آئے۔

وہ اپنے ذہن میں چند فقرے گھڑ رہے تھے۔ مولانا احمد سعید کے سوال: "اب اس نے کیا کہا تھا جس پر تالیاں بجیں؟" "اس نے تبلیغ کے متعلق کچھ کہا ہے"؟ راجہ صاحب کے ذہن کو منتشر کر رہے تھے

تھے۔ اتنے میں مائیکروفون سے آواز آئی۔ "راجہ غضنفر علی خاں ایم۔ ایل۔ اے پنجاب"۔ راجہ صاحب بادلِ ناخواستہ ڈائس پر پہونچے۔

"محترم خواتین و حضرات" کے بعد ان کے اپنے قول کے مطابق ان کی زبان ہکلانے لگی۔ بہرحال وہ آنکھیں نیچی کرکے کچھ نہ کچھ کہتے رہے۔ اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے چل کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھے۔ راجہ صاحب کا بیان ہے کہ انھیں قطعاً معلوم نہ تھا کہ انھوں نے تقریر میں کیا کہا سوائے اس ایک بات کے کہ انھوں نے آخر میں مہاتما جی کی درازیٔ عمر کے لیئے دعا ضرور مانگی تھی۔ اگلی صبح آپ نے جلدی جلدی اخبار کے صفحے پلٹے اور اتحاد کانفرنس کی روداد میں اپنی تقریر کی رپورٹ تلاش کی۔ دوسری تقریروں کے ساتھ ان کی رپورٹ بھی موجود تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ تقریر ایسی بے سنگم نہ تھی بلکہ خاصی برمحل تھی۔

راجہ نے رپورٹ لکھنے والے کا شکریہ ادا کیا اور اخبار اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ اس واقعہ کے بعد راجہ صاحب اور بھی ڈر گئے اور دو سال تک وہ تقریر کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتے رہے۔

مہاتما گاندھی کو اتحاد کانفرنس کی کامیابی کا مژدہ سنایا گیا۔ لیکن انھوں نے اپنا برت پورے ۲۱ دن کے بعد ۸ راکتوبر کو ختم کیا۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس کے بعد ایک ہفتے کے اندر دو تین جگہ فساد ہوگئے۔ اتحاد کانفرنس میں ایک "مرکزی پنچایت" قائم کی گئی تھی جو مقامی لوگوں کو باہمی جھگڑے اور اختلافات طے کرنے میں مدد دینے کے لیئے تھی۔ اس کے صدر مہاتما گاندھی تھے اور حکیم اجمل خاں لالہ لاجپت رائے، مسٹر کے ایف نریمان، مسٹر ایس کے دتہ اور ماسٹر سندر سنگھ اس کے ممبر تھے۔ لیکن یہ کمیٹی محض کاغذی شئے ثابت ہوئی۔

۹- پنجاب کی سیاست فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی

اس صدی کے ربعِ اوّل میں مسلمانوں کے اندر ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے کئی دیو قامت ہستیاں موجود تھیں جنھوں نے اپنے اپنے دائرۂ عمل میں نمایاں کارنامے سر انجام دیئے۔ ان میں پنجاب کے میاں فضل حسین بھی تھے۔ ۱۹۱۹ء کی آئینی اصلاحات کے تحت پنجاب کی پہلی لیجسلیٹو کونسل ۱۹۲۱ء کے شروع میں قائم ہوئی تو گورنر نے اس کے دو منتخب شدہ ممبروں کو محکمہ جات منتقلہ کا چارج سنبھالنے کے لیئے وزیر چُن لیا۔ ان میں ایک میاں فضل حسین تھے اور دوسرے لالہ ہرکشن لال۔ ان کے علاوہ دو انگریز ایگزیکٹو کونسلر تھے۔ ایک آئی سی ایس کا سب سے سینئر انگریز افسر اور دوسرے سر سندر سنگھ مجیٹھیہ جنھیں کابینہ میں سکھوں کو نمائندگی دینے کی غرض سے چُنا گیا تھا۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت وزیروں کو بہت محدود اور ادھورے اختیارات منتقل کیئے گئے تھے۔ میاں فضل حسین نے انہی اختیارات سے کام لیا اور چند مثبت مقاصد کی جانب بہت تیزی اور مضبوطی کے ساتھ قدم بڑھایا۔ ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ تعلیمی سہولتوں کو دیہاتی اور پسماندہ علاقوں کی آبادی کے دروازوں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیئے انھوں نے ایک خاص منصوبہ بنایا۔ کسی نہ کسی طرح محکمہ خزانہ سے اس کے لئے زائد رقوم حاصل کیں۔ کچھ کفائت شعاری کے راستے نکالے اور پرائمری اور مڈل سکولوں کا ایک وسیع جال دیہات میں پھیلانا شروع کر دیا۔ پھر یہ منصوبہ خود بخود پھیلتا رہا اور ہائی سکول اور انٹرمیڈیٹ کالج اس میں شامل ہوتے رہے۔ میاں صاحب کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ سرکاری ملازمتوں اور تعلیم و ترقی کے مواقع میں مسلمانوں کی محرومی کا ازالہ کریں۔ پنجاب کے مسلمانوں کو میاں فضل حسین کی ان دوگونہ مساعی سے جو ٹھوس فائدہ پہونچا۔ اس کے پورے نتائج آہستہ آہستہ کئی برسوں میں ظاہر ہوئے۔ لیکن ان کے اقدامات کا نفسیاتی اور سیاسی ردِّ عمل فوراً شروع ہو گیا۔

سرکاری ملازمتوں اور ترقی کے مواقع میں "فرقہ وارانہ عدم توازن کو رفع کرنے کی کوشش" کوئی

نیا اصول نہ تھا۔ انگریز حاکم اس فارمولے کو گذشتہ چالیس برس سے دہراتے آرہے تھے۔ سب سے پہلے سید امیر علی کے ایک میموریل پر طویل تحقیقات اور غور وخوض کے بعد حکومتِ ہند نے ۱۸۸۵ء میں ایک سرکلر جاری کیا تھا جس میں صوبائی گورنروں، ہائی کورٹوں اور ماتحت افسروں کو یہ ہدائت کی گئی تھی کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کی کمی کو دور کرنے کی خاص کوشش کریں اور محکمانہ کارگذاریوں کی رپورٹوں میں یہ بھی بتلاتے رہیں کہ اس مقصد میں کس حد تک کامیابی ہو رہی ہے۔ اس کے بعد اس سرکلر کی ہدایات وقتاً فوقتاً مختلف الفاظ میں دہرائی جاتی رہیں اور حکومت کی پالیسی کا ایک مستقل جزو بنی رہیں۔ لیکن صرف کاغذ پر۔ سرکاری دفتروں میں ہندوؤں کی عملی اجارہ داری تھی۔ دفتروں کے بابو مختلف بہانوں سے ٹال مٹول کرتے رہے اور انگریز افسروں نے اس مسئلے کو اپنا دردِ سر بنانے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ کی۔ میاں فضل حسین نے اس پالیسی کا سہارا لے کر اپنے محکموں میں اس کی تعمیل کرانے کی کوشش کی اور بھرتی کرنے والے افسروں کو سختی کے ساتھ فرقہ وارانہ تناسب کے ایک معین فارمولے کا پابند کرنا شروع کیا (چالیس فی صد مسلمان بیس فی صد سکھ اور چالیس فی صد باقی سب) تو ہندو پریس اور ہندو لیڈروں نے اس کے خلاف شور مچا دیا۔ فضل حسین اس موقف پر قائم رہے کہ میں صرف یہ کر رہا ہوں کہ حکومت کی ایک پرانی اور درست پالیسی کو عملی شکل دے رہا ہوں۔ وہ بھی بہت اعتدال پسندی کے ساتھ۔ پھر آپ نے میڈیکل کالج کے داخلوں پر بھی فرقہ وارانہ تناسب کا یہی اصول عائد کر دیا۔ ان داخلوں کے متعلق عملی صورتِ حال انھیں یہ نظر آئی کہ کچھ امیدوار امتحانی نمبروں کی بنا پر لیے جاتے تھے۔ کچھ پروفیسروں کی سفارش پر اور کچھ اس لحاظ سے کہ ان کے والد یا قریبی بزرگ ڈاکٹر تھے۔ اس طرح بعض صورتوں میں ایف۔ ایس۔ سی کی سیکنڈ ڈویژن تک کے امیدوار داخلہ حاصل کر لیتے تھے۔ میاں صاحب نے حکم دیا کہ سیکنڈ ڈویژن تک کے تمام امیدواروں کو مقابلے میں شریک کر کے فرقہ وارانہ تناسب کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔ میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سدرلینڈ نے اس پر احتجاج کیا اور لکھا کہ اچھے ڈاکٹر پیدا کرنا میری ذمہ داری ہے۔ امیدواروں کے انتخاب کے متعلق مجھے مکمل آزادی حاصل رہنی چاہیے۔ میں اس ذمہ داری میں دخل اندازی قبول نہیں کر سکتا۔ اس احتجاج پر میاں فضل حسین نے جو حکم لکھا وہ نرم الفاظ میں تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہی تھا کہ فیصلہ سوچ سمجھ کر

کیا گیا ہے۔ اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس کی تعمیل کرو یا مستعفی ہو جاؤ۔ پرنسپل کو مستعفی ہونا پڑا تو اس واقعہ سے صوبے میں خاصی سنسنی پھیل گئی۔ اس مسئلے پر میاں فضل حسین کی گورنر کے ساتھ بھی گفتگو ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میڈیکل کالج کے علاوہ مغلپورہ انجینئرنگ کالج میں بھی (جو ہرکشن لال کے محکمے سے متعلق تھا) داخلوں پر فرقہ وارانہ تناسب کا یہی اصول عائد کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ ایک اور موقعہ پر لاہور کے انگریز کمشنر نے میاں صاحب کے ایک حکم کو ٹالنے کی کوشش کی۔ بعض انگریز افسروں کا ذہن ہندوستانی وزیروں کی بالادست حیثیت کو قبول نہ کرتا تھا۔ میاں صاحب اپنے حکم پر اڑ گئے۔ کمشنر نے بھی اسے اپنے وقار کا سوال بنا لیا۔ آخر اسے مستعفی ہونا پڑا۔ ان مثالوں کے بعد فضل حسین کو انگریز یا ہندوستانی افسروں سے اپنی پالیسی کی تعمیل کرانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

میونسپل کمیٹیوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے لحاظ سے میاں فضل حسین کو عجیب دھاندلی نظر آئی۔ جن کمیٹیوں میں فرقہ وارانہ انتخاب کا اصول رائج تھا۔ وہاں بھی مسلمانوں کی نشستیں ان کے حق سے کم تھیں۔ جہاں مخلوط انتخاب کا طریق رائج تھا۔ وہاں بھی انتخابی حلقوں کی حد بندیاں اس طرح تھیں کہ مسلمان گھاٹے میں رہتے تھے۔ آپ نے اس میں بھی فوراً دخل دیا اور پورے صوبے کے لئے ایک تفصیلی فارمولا مرتب کیا جس میں نشستوں کی تقسیم اور انتخابی حلقوں کی حد بندی کے اصول قائم کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر جگہ جہاں مسلمان صرف دفتری بابوؤں کی سینہ زوریوں اور دھاندلیوں کی وجہ سے اقلیت میں تھے۔ آبادی اور ووٹروں کے تناسب کے مطابق اکثریت بن گئے۔

پھر سکولوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی گرانٹوں میں، نئے سکول کھولنے کے لئے مقامات کے انتخاب میں اور تعلیم و ترقی کے باقی مواقع کے سلسلے میں دوسرے اصولوں کے ساتھ "پسماندہ طبقوں اور علاقوں کی امداد" کا اصول بھی بطور خاص ملحوظ رکھا جانے لگا۔ اپنے محکموں میں میاں فضل حسین نے اس سوال پر بھی تفصیلی توجہ کی کہ نئے یا پرانے مسلمان سرکاری ملازموں کو دفتری محاورے کے مطابق "کھڈے لائن" پر ڈال کر آئندہ ترقی اور تربیت کے جائز مواقع سے محروم نہ کیا جائے۔

صوبائی کونسل میں میاں صاحب کے ان اقدامات کا فوری ردعمل یہ ہوا کہ مسلمان ممبران کی حمایت پر جمع ہو گئے اور ہندو ممبروں کا ایک بلاک جو زیادہ تر شہری، تجارت پیشہ طبقے کے افراد پر

مشتمل تھا ان کی مخالفت پر تُل گیا۔ اس بلاک کی قیادت راجہ نریندر ناتھ کر رہے تھے جو سرکاری ملازمت میں کمشنر کے عہدے تک پہونچنے کے بعد ریٹائر ہوئے تھے اور ریٹائر ہونے کے بعد ہندو مہا سبھا کے اہم لیڈر بن گئے تھے لیکن اس بلاک سے باہر چار پانچ ہندو ممبر (جو انبالہ ڈویژن کی ہندو جاٹ آبادی کی نمائندگی کرتے تھے) ایسے بھی تھے جو اکثر مسائل کے متعلق مسلمان ممبروں کے ساتھ مسلم وزیر کی حمایت کرتے تھے۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ ہندوؤں کی زراعت پیشہ اور پسماندہ آبادی کے مفاد کے ساتھ مسلم وزیر کی پالیسی کا کوئی تصادم نہیں ہے۔ ہندوؤں کی زراعت پیشہ آبادی بھی مسلمانوں کی طرح محرومی کا شکار ہے اور دونوں کی محرومی یکساں طور پر ہندوؤں کے ایک مخصوص شہری تجارت پیشہ طبقے کی چالاکیوں اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے ہے۔ اسی مختصر طبقے نے ان تمام مواقع پر قبضہ کر رکھا ہے جن میں سب کو حصّہ ملنا چاہیئے۔ اسی طبقے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی زراعت پیشہ آبادی کو سودی قرضوں کی بھاری زنجیر میں جکڑ رکھا ہے۔ لہٰذا جہاں تک اس طبقے کی اجارہ داری توڑنے کا تعلق تھا۔ ہندو جاٹوں کا یہ گروپ اس کی حمایت کرتا تھا۔ لیکن اس کا مطالبہ یہ تھا کہ سرکاری ملازمتوں میں صرف فرقہ وارانہ کوٹے مقرر کرنے سے تمام پسماندہ طبقوں کے ساتھ انصاف نہ ہوتا تھا۔ ہر فرقے کے کوٹے میں اس کی شہری یا غیر زراعت پیشہ اور دیہاتی یا زراعت پیشہ آبادی کا حصہ الگ الگ مقرر ہونا چاہیئے۔

دو اڑھائی سال تک میاں فضل حسین نے کونسل کے اندر کوئی رسمی پارٹی نہ بنائی مسلمان ممبروں کا بلاک ہی ان کی غیر رسمی پارٹی بنا رہا۔ ان ممبروں میں لامحالہ بھاری اکثریت دیہاتی حلقوں سے منتخب شدہ بڑے زمینداروں کی تھی۔ جن میں دو جتھے نمایاں تھے۔ ایک چودھری شہاب الدین اور میاں احمد یار دولتانہ (میاں ممتاز محمد دولتانہ کے والد مرحوم) اور ان کے دوستوں اور عزیزوں کا گروہ اور دوسرا نون۔ ٹوانہ گروپ اور ان کے ساتھیوں کا دھڑا۔ یہ دھڑے بندی کونسل کے باہر بھی موجود تھی اور کونسل کے اندر بھی۔ دونوں دھڑوں میں پیش پیش چند تعلیم یافتہ (بیشتر چیفس کالج کے تعلیم یافتہ) نوجوان تھے (خود میاں احمد یار دولتانہ۔ نواب عاشق حسین۔ ملک فیروز خاں نون۔ سید مبارک علی وغیرہ) جو نئے نئے پبلک زندگی میں داخل ہوئے تھے۔ یہ صاحبان خاندانی وضعداریوں کی روایت کے ساتھ نوجوانی کے جذبات بھی رکھتے تھے۔ کونسل کی فضا میں مسلمان

وزیر ان نوجوانوں کا ہیرو بن گیا۔ اور ان کے ذریعے میاں صاحب کے ساتھ دونوں دھڑوں کی یکساں وفاداری کی روائت قائم ہوگئی۔ لیکن مسلمان ممبروں میں دو ایک ایسے بھی تھے جو ذاتی تعلقات کی سطح پر فضل حسین کے سخت مخالف تھے۔ اور اس مخالفت کے اظہار کا موقعہ نکالتے رہتے تھے۔ مثلاً لاہور کے شہری حلقے سے منتخب شدہ مولوی محرم علی چشتی اور ضلع منٹگمری کے پیر محمد حسین شاہ جو پیر بھی تھے۔ بڑے زمیندار بھی تھے اور خاصی ضدی طبیعت کے بزرگ تھے۔ ان کے اور میاں فضل حسین کے سیاسی مریدوں کے درمیان ایک مرتبہ بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

میاں صاحب کے محکمے کی ایک رقم بجٹ میں منظوری کے لئے پیش ہونے والی تھی۔ اس میں تخفیف کی ترامیم پیش کرنے والوں میں سید محمد حسین شاہ کا نام بھی تھا۔ باقی ترامیم کا نوٹس ہندو ممبروں نے دیا تھا۔ میاں صاحب کو خیال گذرا کہ ہندو ممبر اپنی ترامیم پیش نہ کریں گے اور سید محمد حسین کو ان کے ساتھ لڑوانے کی کوشش کریں گے۔ انھیں کسی مسلمان ممبر کی جانب سے مخالفت بہت چبھتی تھی۔ انھوں نے اپنے نوجوان سیاسی چیلوں کو اشارہ کیا کہ اگر سید محمد حسین کو ترمیم پیش کرنے اور بجٹ کی تجویز کی مخالفت کرنے سے باز رکھا جا سکے تو بہت اچھا ہو۔ چند نوجوانوں نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ میاں احمد یار دولتانہ سیدھے پیر محمد حسین کے کمرے میں پہنچے اور مطلب بیان کرنے کے بعد اپنی پگڑی اُتار کر پیر صاحب کے پاؤں پر رکھ دی اور بولے: "چاچا۔ اس پگڑی کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔" یہ ان وضعدار بزرگوں کی نگاہ میں ایک انتہائی اقدام تھا۔ لیکن پیر صاحب بھی ایسے ضدی انسان تھے کہ انھوں نے پگڑی اٹھا کر میاں احمد یار کے سر پر رکھ دی اور کہا: "بھتیجڑے! اس بات پر مجبور نہ کر۔ یہ ترمیم میں ضرور پیش کروں گا اور اس وزیر کے بچے کو ایسی سناؤں گا کہ وہ یاد رکھے گا۔" آخر سب لوگ مجبور ہو گئے۔

اگلے دن پیر صاحب اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور شلوار پہنے اپنی بھاری بھر کم پگڑی کو سنبھالتے ہوئے اپنی نشست پر آئے اور جب ان کی ترمیم کی باری آئی تو اسے پیش کرنے اور تقریر کرنے کیلئے کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک ہی نشست پر ملتان کے نواب عاشق حسین (یہ بھی ان دنوں جوان تھے) بیٹھے تھے۔ نواب صاحب نے دیکھا کہ پیر صاحب کا ازار بند لٹک رہا ہے۔ آپ نے احتیاط کے ساتھ ذرا جھک کر اور ڈیسک کی آڑ میں ہاتھ نیچا کر کے پیر صاحب کا ازار بند زور سے کھینچ لیا۔ ادھر

پیر صاحب کی زبان سے پہلا لفظ نکلا "جناب والا"۔ ادھر ان کی شلوار کھل گئی اور وہ شلوار کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر غڑاپ سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ لوگ حیران تھے کہ انھیں کیا ہوا۔ بہر حال سپیکر نے چند لمحے تک ان کی طرف دیکھا اور پھر اگلے ممبر کا نام پکار دیا۔ پیر صاحب نے جلدی جلدی ازار بند کو قابو میں لاکر باندھا اور جب دوسرا ممبر اپنی تقریر ختم کر چکا تو پیر صاحب پھر کھڑے ہوئے۔

میاں فضل حسین اس صورتِ حال کے لئے تیار تھے۔ انھوں نے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک سرکاری ممبر کے کان میں پہلے ہی پھونک مار دی تھی۔ اس نے فوراً پوائنٹ آف آرڈر کا سہارا لیتے ہوئے اعتراض کیا کہ آنریبل ممبر کو اپنی پہلی تقریر (جو صرف "جناب والا" تک محدود رہی تھی) کے بعد اسی مہیم پر دوسری تقریر کرنے کا حق نہیں ہے۔ سپیکر نے اعتراض کو صحیح تسلیم کیا۔ پیر صاحب کچھ احتجاج کرتے رہے۔ لیکن سپیکر نے آرڈر آرڈر کہہ کر انھیں بٹھا دیا۔ نواب عاشق حسین ایوان سے کھسک گئے تھے۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد پیر صاحب نے خاصا شور وغل مچایا۔ اور عاشق حسین کو گالیاں دیں تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ پیر صاحب کو ان کے ازار بند کے ذریعے "زبان بند" کیا گیا تھا۔

جب میاں فضل حسین نے کونسل کے اندر اپنی پارٹی کو رسمی شکل دینے کے لئے قدم اٹھایا تو پنجاب کی پہلی کونسل کی میعاد پوری ہونے والی تھی۔ وہ اڑھائی سال کے تجربے اور سوچ بچار کے بعد ان کے ذہن میں یہ خیال مستحکم ہو گیا تھا کہ موجودہ حالات میں اور آئندہ پارلیمانی طرزِ حکومت کے تحت مسلمانوں کے لئے پنجاب میں اپنے مقاصد حاصل کرنے اور اپنی سیاسی بالادستی قائم رکھنے کی صحیح عملی تدبیر یہ نہ تھی کہ وہ کونسل کے اندر صرف اپنی فرقہ دارانہ پارٹی قائم کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ یہ تھی کہ وہ اپنا اتحاد بھی قائم رکھیں اور اپنی صفوں میں ہندو جاٹوں اور ان کے ہم خیال متفرق غیر مسلم عناصر کو بھی شامل کرلیں۔ اس کے لئے کوئی نیا پروگرام ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ مسلم بلاک کو ایک غیر فرقہ دارانہ پارٹی کا نام دے کر ہندو جاٹوں کو اس میں شمولیت کی دعوت دے دی جائے۔ اس طرح پنجاب کونسل میں یونینسٹ پارٹی معرضِ وجود میں آئی۔ جس کی قیادت میاں فضل حسین نے سنبھالی۔ اس پارٹی کا پروگرام وہی رہا جس پر میاں صاحب پہلے ہی عمل کر رہے تھے اور جس کی حمایت پر مسلمان ممبر جمع تھے۔ البتہ سرکاری ملازمتوں میں فرقہ دارانہ کوٹے کے سوال پر ہندو جاٹوں کے نقطۂ نگاہ اور خود مسلم ممبروں کی اکثریت کی خواہش کے مطابق

میاں فضل حسین نے اپنے فارمولے میں اس طرح ترمیم کر دی کہ مسلمانوں کا کوٹہ چالیس سے بڑھا کر پچاس فیصد اور ہندوؤں کا کوٹا چالیس سے گھٹا کر تیس فیصد کر دیا۔ اس شرط کیساتھ کہ ہر فرقے کے کوٹے میں ساٹھ فیصد اس کی زراعت پیشہ آبادی کے لئے مخصوص ہوگا۔ واضح رہے کہ یہ فارمولا یونینسٹ پارٹی کا تھا۔ حکومت پنجاب کی سرکاری پالیسی کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ لہٰذا یہ تماشا ہوتا رہا کہ یونینسٹ وزیر اپنے محکموں میں اس کی پابندی کرتے تھے۔ غیر یونینسٹ وزیروں کو جب موقعہ ملتا تھا یا گورنر کی شہ ملتی تھی وہ من مانی کر لیتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اسی فارمولے کو صوبائی محکموں کے عام دستور العمل کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

پنجاب کونسل کی سیاست میں یونینسٹ پارٹی کی اہمیت کا احساس نئے انتخابات کے بعد کیا گیا۔ جو ۱۹۲۳ء کے آخر میں منعقد ہوئے۔ ان انتخابات کے بعد جو کونسل بنی اس میں میاں فضل حسین یہ دعوےٰ کرنے کے قابل ہو گئے (گزشتہ کونسل میں یہ صورت نہ تھی) کہ ان کی پارٹی منتخب شدہ ممبروں میں قطعی اکثریت رکھتی ہے۔ انھوں نے گورنر سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کی پارٹی اپنی عددی اکثریت کے علاوہ ایک غیر فرقہ دارانہ پارٹی ہے جس میں ہندوؤں کے ایک طبقے کے نمائندے بھی شامل ہیں لہٰذا وزیروں کی مشترکہ ذمہ داری کے اصول کو بروئے کار لانے کے لئے انھیں اپنی ہی پارٹی سے اپنا ساتھی ہندو وزیر چننے کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ لبرل ذہنیت کا گورنر میکلیگن یہ بات مان گیا۔ میاں فضل حسین نے اپنی پارٹی کے ایک ہندو جاٹ ممبر راؤ بہادر کیپٹن لال چند کو اپنا ساتھی وزیر چنا۔ اور جب راؤ بہادر کو ایک انتخابی عذرداری کی وجہ سے کونسل میں اپنی نشست خالی کرنی پڑی تو میاں صاحب نے ان کی جگہ ایک اور ہندو جاٹ چودھری چھوٹو رام کو وزیر چن لیا۔

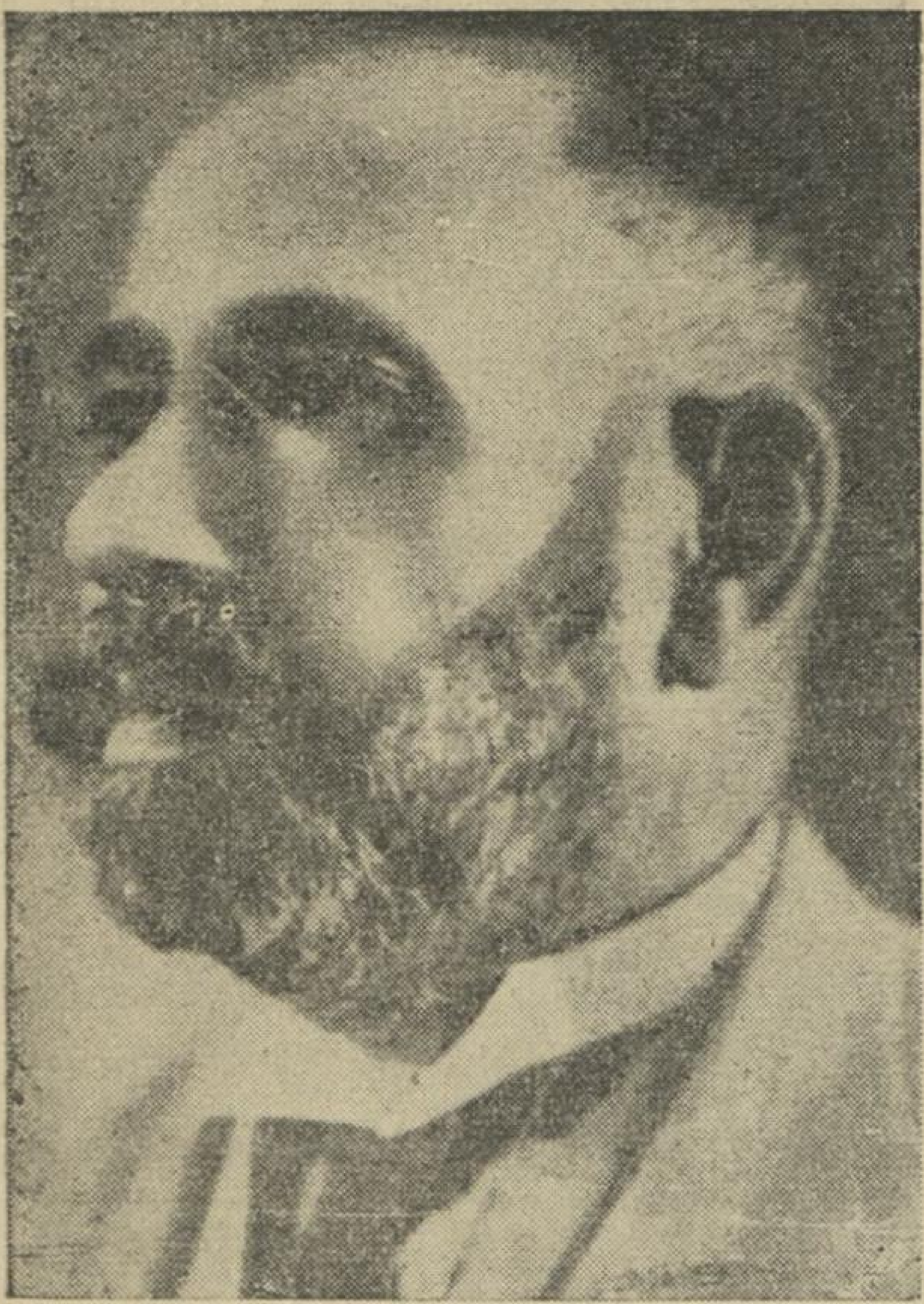
اس کونسل میں یونینسٹ پارٹی کی کیفیت یہ تھی کہ تین مسلمان ممبروں کے سوا جو نئی سوراج پارٹی میں شامل تھے باقی تمام شہری (ان میں سر عبدالقادر اور میر مقبول محمود بھی شامل تھے) اور دیہاتی مسلمان ممبر اس میں جمع تھے۔ ان کی کل تعداد ۳۲ تھی۔ ان کے ساتھ پانچ ہندو زمیندار تھے۔ جنھیں ساتھ ملا کر اس پارٹی کو باقی تمام غیر سرکاری پارٹیوں کے مقابلے میں صرف دو یا تین ووٹوں کی اکثریت حاصل ہو جاتی تھی۔ بعد میں کچھ سکھ ممبر بھی اس میں شامل ہوگئے۔ پانچ ہندو زمیندار ممبروں کے علاوہ جو یونینسٹ پارٹی میں تھے۔ باقی ہندو ممبر دو پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک تہائی

گروپ تھا جس کی قیادت گذشتہ کونسل میں راجہ نریندر ناتھ کرتے تھے۔ اس کے قائد اب بھی وہی تھے لیکن اس نے اپنا نام "نیشنل پروگریسو پارٹی" رکھ لیا تھا۔ عملاً یہ ہندو مہاسبھا پارٹی تھی۔ دوسرا گروپ "سوراج پارٹی" کہلاتا تھا جس میں تین مسلمان اور نو ہندو ممبر (ان میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ بھی تھے) شامل تھے۔ یونینسٹ وزیروں کی مخالفت میں یہ دونوں پارٹیاں اکٹھی تھیں۔ ایوان میں بیس بائیس ممبروں کا سرکاری بلاک بھی تھا۔ اس زمانے کی آئینی پابندیاں جیسی کچھ بھی تھیں ان کے باوجود یونینسٹ پارٹی کی اکثریت کے بل پر میاں فضل حسین نے عملاً ۱۹۲۴ء کی پنجاب کونسل میں ایک وزیر اعظم کی حیثیت حاصل کرلی۔ یہ زمانہ وہی تھا جب انھوں نے مسلم لیگ کو اپنا اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کی دعوت دی۔ پھر حالات میں ایک دلچسپ تبدیلی آئی۔

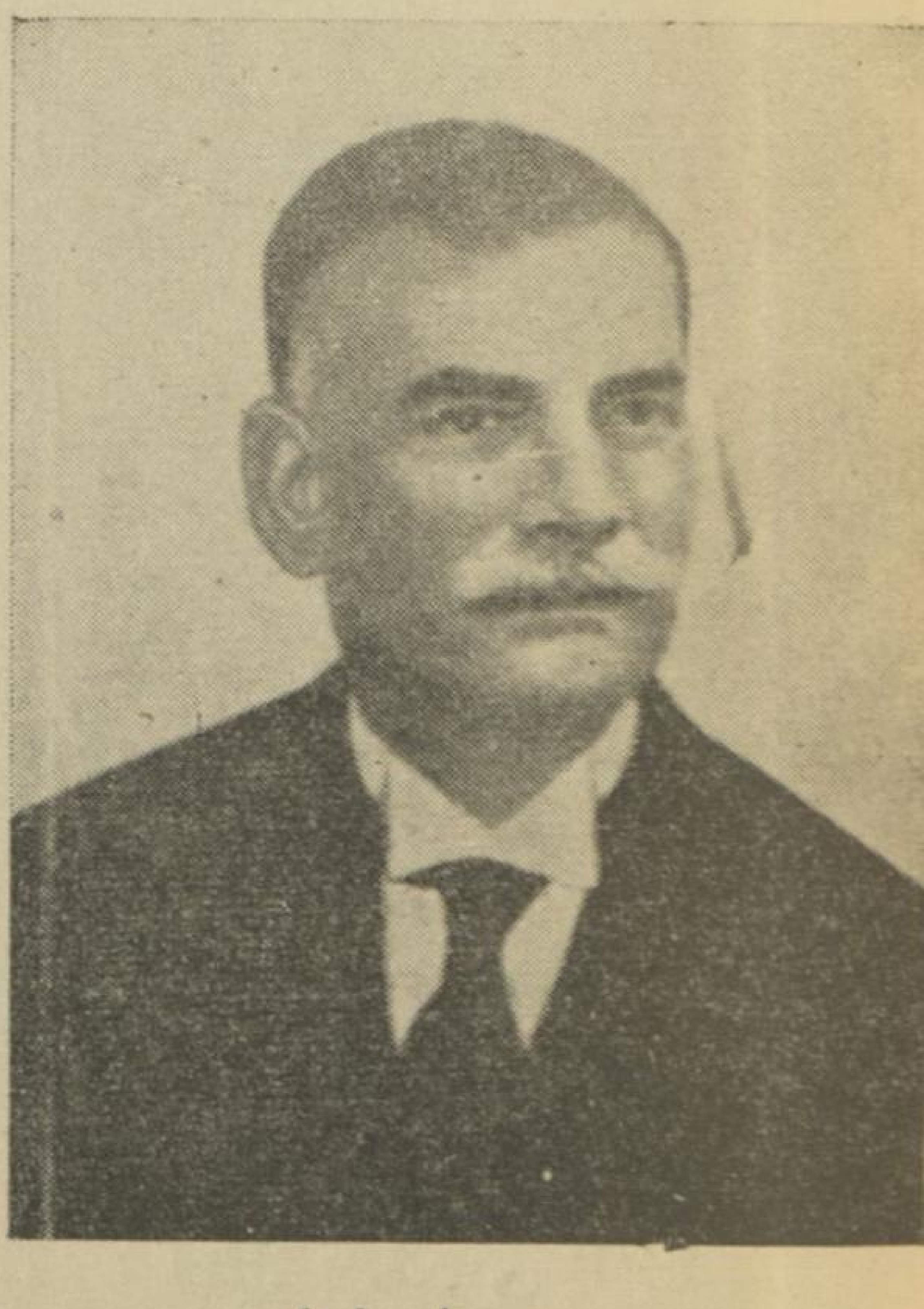
جون ۱۹۲۴ء میں پنجاب کا گورنر تبدیل ہوگیا۔ نیا گورنر سر مالکم ہیلی اپنے پیشرو سے بالکل مختلف ذہنیت کا افسر تھا۔ اسے یہ بات بالکل پسند نہ آئی کہ ایک وزیر جسے چند محکموں کی گاڑی چلانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ایک فرمانبردار کوچبان کی طرح کام کرنے کے بجائے گاڑی کے مالک کی حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ مالکم ہیلی نے اپنی ملازمت کی طویل میعاد اسی صوبے میں گزاری تھی اور پرانے انگریز حاکموں کے اس مقصد میں بھرپور حصّہ لیا تھا کہ پنجاب کے وفادار زمینداروں اور دیہاتی آبادی کو شہری وکیلوں اور سیاسی مطالبے کرنے والوں کے اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اسے یہ دیکھ کر اور بھی صدمہ ہوا کہ اس کی غیر حاضری میں (وہ گذشتہ چار پانچ سال تک گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر رہا تھا) ان زمینداروں نے ہی خطرناک طبقے کے ایک فرد کو اپنا لیڈر بنا لیا تھا اور یہ لیڈر انھیں کونسل کی اجتماعی نفسیات کے ذریعے سرکاری بلاک کو آنکھیں دکھانے کا سبق سکھا رہا تھا۔ کچھ عرصے تک سر مالکم ہیلی خاموشی کے ساتھ حالات دیکھتا رہا۔ پھر اس نے میاں فضل حسین کے سیاسی اثر و رسوخ کو ختم کرنے اور کونسل کے اندر سرکاری بلاک کی حاکمانہ حیثیت کو بحال کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ آئندہ پانچ سال تک گورنر اور میاں فضل حسین کے درمیان رسہ کشی پنجاب کی سیاست کا ایک دلچسپ پہلو بنی رہی۔



سر فضل حسین



سر عبدالقادر



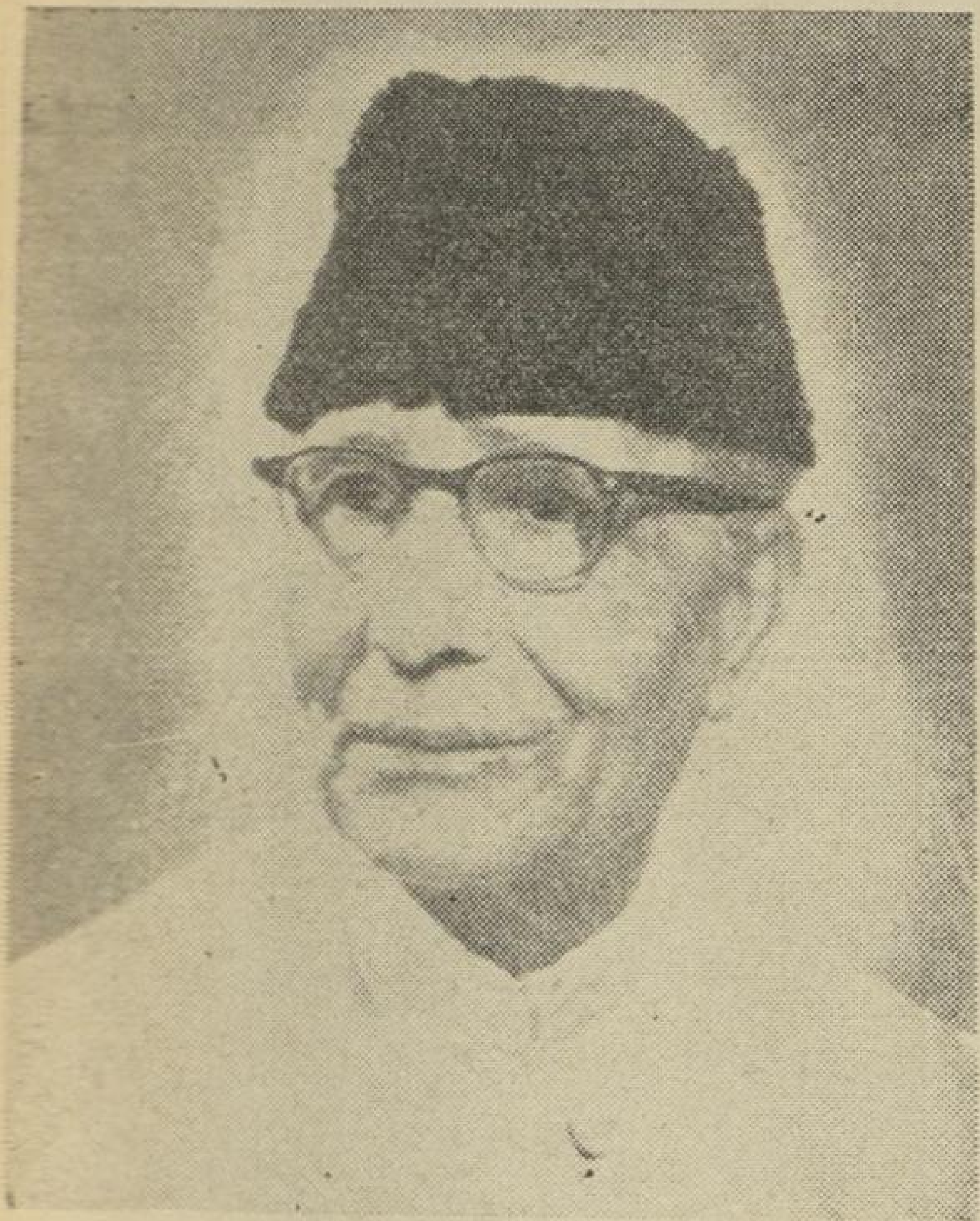
سر علی امام



سر عبدالرحیم



لالہ لاجپت رائے



چودھری خلیق الزماں



پنڈت مدن موہن مالویہ



مسز سروجنی نائڈو

۱۰- پہلی آل پارٹیز کانفرنس

مسلم لیگ کے اجلاس خاص کے بعد جو مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اس کا سالانہ اجلاس پھر اسی سال دسمبر کے آخری ہفتے میں بمبئی میں منعقد ہوا[1]۔ اس کی صدارت سر رضا علی نے کی۔ اس وقت مسٹر جناح کی خاص توجہ ایک منصوبے کی جانب تھی جس کے تحت تقریباً ایک مہینے کے بعد یعنی جنوری ۱۹۲۵ء کے آخری ہفتے میں ایک آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہونیوالی تھی۔

اس منصوبے کا پس منظر یہ تھا کہ مہاتما گاندھی کے اکیس روزہ برت اور اس سلسلے میں اتحاد کانفرنس کے باوجود ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ رک نہ سکا تھا۔ دہلی کی اتحاد کانفرنس میں فرقہ وارانہ سیاسی اختلافات کو زیر بحث نہ لایا گیا تھا۔ صرف ایسے مذہبی تنازعات (نماز اور آرتی کے اوقات کا تصادم مسجدوں اور مندروں کے آگے باجے بجانا وغیرہ) کی جانب توجہ کی گئی تھی۔ جو عوام کیلئے فوری اشتعال کا باعث بنتے تھے۔ لیکن کئی لیڈر (جن میں مسٹر جناح پیش پیش تھے) یہ محسوس کر رہے تھے کہ فرقہ وارانہ تلخی کی فضا دراصل ان بحثوں اور اخباری مناظروں سے پیدا ہوتی تھی۔ جو سیاسی مطالبات اور حقوق کے موضوع پر جاری تھے۔ ان لیڈروں نے مہاتما گاندھی پر زور دیا کہ سیاسی اختلاف کے مسائل پر غور کرنا ضروری ہے تاکہ ان کے تصفیہ کی کوئی صورت نکالی جائے۔ اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی نے لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس نومبر ۱۹۲۴ء میں بمبئی میں منعقد کی۔ جہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مختلف پارٹیوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس دو مہینے کے بعد دہلی میں منعقد کی جائے۔ لیکن اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا کہ سوراج کی ایک متفقہ سکیم مرتب کی جائے اور اس ضمن میں فرقہ وارانہ اختلافات کو حل کیا جائے۔ اس دوران میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو مسٹر جناح نے اس اجلاس میں اس فارمولے کو دہرانا مناسب نہ سمجھا جو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں منظور کیا گیا تھا۔ آپ نے بمبئی میں مسلم مطالبات

---

[1] مولانا محمد علی جوہر اس اجلاس میں بھی موجود تھے۔

کے متعلق ایک نئی قرارداد پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ مجالس قانون ساز اور دوسرے انتخابی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے مناسب حصے کے متعلق مطالبات مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ اس قرارداد کے الفاظ ایسے تھے جن سے "لاہور فارمولا" کی نفی بھی نہ ہوتی تھی۔ اور متوقع آل پارٹیز کانفرنس کی گفت و شنید پر اس فارمولا کی بطور خاص پابندی بھی عائد نہ ہوتی تھی۔ مسٹر جناح گفت و شنید کے لئے تمام راستے کھلے رکھنا چاہتے تھے۔

اپنی قرارداد پیش کرتے ہوئے آپ نے جو تقریر کی وہ آپ کے مخصوص اندازِ فکر کی آئینہ دار تھی۔ آپ نے فرمایا کہ "نظریاتی اعتبار سے مثالی طریق کار یہی ہے کہ کسی ادارے میں فرقہ دارانہ نمائندگی نہ ہو اور ملک کی خدمت کا کام بہترین افراد کے سپرد کیا جائے۔ مسلمانوں میں اور ہندوؤں میں کئی نیشنلسٹ دل سے یہی چاہتے ہیں۔ میں خود بھی اپنے آپ کو انہی میں شمار کرتا ہوں۔ لیکن صرف چند نیشنلسٹوں کے ذہنی تخیل سے بائیس کروڑ ہندوؤں اور سات کروڑ مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ مسلمانوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ملک کی ترقی اور آزادی کا اتنا ہی خواہشمند نہ ہو جتنے ان کے ہندو بھائی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی بھاری اکثریت اس بات پر مصر ہے کہ مجالس قانون ساز میں اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے لئے مناسب حصے کا انتظام ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ہندو اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ مسلمانوں کو ان کا مناسب حصہ ملنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی صورت کیا ہو۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک میز کے گرد بیٹھ کر دونوں فریق سمجھوتے کی کوئی قابلِ عمل بنیاد ڈھونڈ لیں۔ ایک کمیٹی مقرر کرنے کی تجویز اسی غرض سے پیش کی گئی ہے۔"

کمیٹی نامزد ہو گئی۔ لیکن اس کا کوئی اجلاس منعقد کرنے یا کوئی نئے مطالبات مرتب کرنے کی نوبت نہ آئی۔ جب آل پارٹیز کانفرنس ۲۳ جنوری ۱۹۲۵ء کو مہاتما گاندھی کے زیرِ صدارت دہلی میں منعقد ہوئی تو اس میں مسلم لیگ کی نمائندگی اکیلے مسٹر جناح نے کی۔ مسلم لیگ کے اجلاسِ لاہور میں مرتب شدہ مطالبات ان کے پیشِ نظر تھے جن کا پہلا اور بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اکثریت کی آئینی ضمانت ملنی چاہیے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے جو لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند کے ساتھ ہندو مہاسبھا کی نمائندگی کر رہے تھے۔ کانفرنس کے پہلے ہی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے باقی ہر مطالبے پر غور کرنے کو تیار ہیں لیکن مسلم اکثریت

کے صوبوں میں آئینی "مسلم اکثریت" کے اصول کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ آپ نے فرمایا: "ہم فرقہ دارانہ نمائندگی کے اصول کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اگر مسلمان اس پر اصرار کریں تو بدرجہ آخر ہم اسے بھی منظور کر لیں گے۔ لیکن اس صورت میں ہم پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے تناسب نمائندگی کے سوال پر لکھنؤ پیکیٹ سے آگے جانے کو ہرگز تیار نہیں۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان پورے ملک میں مخلوط انتخاب کے اصول کو اور اس کے نتائج کو قبول کریں یا اگر وہ اپنے علیحدہ قومی وجود پر اصرار کرنا چاہیں تو ہر جگہ اقلیت کی حیثیت قبول کریں۔ مسٹر جناح اس بات پر زور دیتے رہے کہ دونوں فرقوں میں ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ دو طرفہ عمل ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر ہندو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی برائے نام اکثریت پر بھی بھروسہ کرنے کو تیار نہ ہوں تو وہ اپنی اکثریت پر مسلمانوں کے دلوں میں اعتماد کس طرح پیدا کریں گے؟ لیکن ان دلائل کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور اسی سوال پر ڈیڈلاک پیدا ہو گیا۔ مسلم مطالبات کے کسی اور پہلو پر بحث کی نوبت ہی نہ آئی۔ آل پارٹیز کانفرنس نے فرقہ دارانہ مسئلہ ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ اس نے اسے ایک سب کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ سب کمیٹی نے اپنے چند ممبروں کو غیر رسمی گفتگو کا اختیار دیا۔ لیکن یہ سب ناکامی کے اعلان کو ملتوی کرنے کی کوششیں تھیں۔ جو ڈیڈلاک پیدا ہو گیا تھا اسے دور نہ کیا جا سکا اور ۵ مارچ کو مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو (یہ دونوں اس کانفرنس کے کنوینر تھے) کے دستخطوں سے کانفرنس کو غیر معینہ عرصے کے لئے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

اس تمام عرصے میں مسٹر جناح کی مصروفیت اسمبلی کے اندر بھی تھی اور آل پارٹیز کانفرنس کے سلسلے میں بھی تھی۔ راجہ غضنفر علی نے دونوں جگہ اپنے آپ کو ان کا غیر رسمی سکرٹری مقرر کر رکھا تھا۔ راجہ صاحب کا بیان ہے کہ جب غیر رسمی گفتگو کا مرحلہ آیا جو حکیم اجمل خاں کے مکان پر ہو رہی تھی تو ہندو مہاسبھا کے نمائندوں نے ایک دو دن کے بعد الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ہمارے نقطۂ نگاہ کو گفتگو کی بنیاد تسلیم نہیں کیا جاتا تو اس گفتگو میں ہمارا حصہ لینا بیکار ہے اور پھر اس گفتگو کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس کے بعد کانفرنس کے التوا (عملاً ناکامی) کا اعلان کرنا پڑا۔

اس کانفرنس میں مسٹر جناح جو کردار ادا کر رہے تھے۔ اس پر اظہار تعجب کرتے ہوئے مسٹر سرینواس شاستری نے چند دنوں کے بعد اپنی ایک تقریر میں کہا کہ مسٹر جناح جیسا "نیشنلسٹ" اور ہندو

مسلم اتحاد کا سفیر" بھی اب فرقہ وارانہ نقطۂ نگاہ کا وکیل بن گیا ہے۔ اس کے جواب میں مسٹر جناح نے ۱۱ر اپریل ۱۹۲۴ء کو ایک اخباری انٹرویو میں فرمایا کہ میرے خلاف یہ حملے غلط فہمی پر مبنی ہیں میں نے کانفرنس میں اپنے ذاتی خیالات کی ترجمانی نہیں کی۔ بلکہ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت کیا چاہتے ہیں۔ انھیں کس بات پر راضی کیا جاسکتا ہے۔ کس بات پر راضی نہیں کیا جاسکتا۔ بے شک حقوق کی فرقہ وارانہ تقسیم اور تخصیص مثالی قسم کی جمہوریت نہیں ہے۔ لیکن سوال بائیس کروڑ ہندوؤں اور سات کروڑ مسلمانوں کے درمیان سمجھوتے کی بنا پر سیاسی اتحاد عمل کا راستہ نکالنے کا ہے۔ اگر فی الحال ہندوستان میں مثالی جمہوریت قائم نہیں کی جاسکتی تو ریکا وٹ کے سامنے بے بس ہونے کے بجائے ایسی حکومت قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں جو دو الگ الگ فرقوں کی نمائندہ کہلاسکے۔ یہ جمہوریت کی جانب پہلا قدم ثابت ہوسکتا ہے"۔ لیکن تاریخ کا دھارا مسٹر جناح کے اس مقصد کی برعکس سمت میں بہ رہا تھا۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس کی مشترکہ تحریک عدم تعاون کا کوئی اور نتیجہ برآمد ہوا تھا یا نہ ہوا تھا۔ لیکن یہ تحریک ہندوستان کی سیاسی زندگی پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئی تھی۔ اس نے مسلمانوں کے اندر مسلم قومیت اور ہندوؤں کے اندر ہندو قومیت کو ایک نئی توانائی بخش دی تھی۔ دونوں قوموں کو ملک کی آزادی کی منزل سامنے نظر آنے لگی تھی۔ اور آزادی اپنے ساتھ جو مسائل لاتی تھی ان کے متعلق دونوں قومیں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ پر نئی شدت کے ساتھ اصرار کرنے لگی تھیں۔ ایک طرف مسلمان آزادی کے مواقع اور ثمرات میں مثبت حصے کے طلبگار تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں انھیں بلاشک و شبہ اکثریت کے مواقع حاصل ہو جائیں۔ لہٰذا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور (مئی ۱۹۲۴ء) میں مرتب کیا ہوا فارمولا ہی ان کے سیاسی فکر کا محور بنا رہا۔ دوسری طرف ہندو اپنے آپ کو اس ملک کا قدرتی وارث سمجھتے تھے کسی ایسے خطرے کے روادار بننے کو تیار نہ تھے جو اس وراثت پر ان کے مکمل اور غیر مشروط قبضے کے راستے میں حائل ہوتا نظر آتا تھا۔ پنجاب میں مسلم اکثریت کا سوال اس کشمکش کا بنیادی نقطہ بن گیا اور آئندہ دس برس تک سمجھوتے کی ہر کوشش اسی سوال پر ناکام ہوتی رہی۔

۱۱۔ مالکم ہیلی اور فضل حسین کے درمیان رسہ کشی

پنجاب کی سیاست میں ۱۹۲۵ء کا آغاز ایک دلچسپ واقعہ سے ہوا۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت قائم شدہ مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کے لئے شروع میں حکومت نے ایک خاص میعاد کے لئے سرکاری صدر نامزد کئے تھے۔ ان کی میعاد پوری ہونے پر اسمبلی اور کونسلوں کو انتخاب کے ذریعے اپنا اپنا صدر منتخب کرنا تھا۔ پنجاب کونسل کے لئے اس اختیار کو استعمال کرنے کا وقت ۱۹۲۵ء کے شروع میں آیا۔ کونسل کے اجلاس کے لئے ۱۵ر جنوری کی تاریخ مقرر تھی اور کئی ممبر اپنے اپنے لئے کنویسنگ کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی گورنر مالکم ہیلی نے اس انتخاب میں کھلم کھلا دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ صدارت سے ریٹائر ہونے والے انگریز افسر کو (اس کا نام Casson تھا) دوبارہ کونسل کے ووٹ سے منتخب کرا دے۔ گورنر نے راجہ نریندر ناتھ کی ہندو "پروگریسو" پارٹی کو ٹٹولا۔ یہ پارٹی بخوشی اس بات کے لئے تیار تھی کہ فضل حسین کی پارٹی کے کسی مسلمان کو موقعہ ملنے کے بجائے ایک انگریز کرسی صدارت پر بیٹھا رہے۔ سرکاری بلاک اور پروگریسو پارٹی کے علاوہ سکھوں کے ایک گروپ اور چند متفرق ممبروں کے ووٹ حاصل کرنا مشکل نظر نہ آتا تھا۔ ان حالات میں گورنر نے ان ممبروں کو جو اپنے لئے کنویسنگ کر رہے تھے۔ فرداً فرداً بلا کر مشورہ دیا کہ صوبے کی فرقہ وارانہ فضا کے پیش نظر وہ باہمی کشمکش کو طول دینے کے بجائے ایک تجربہ کار اور غیر جانبدار انگریز افسر کو کونسل کا صدر بنائے رکھنے میں مدد دیں۔ سر فضل حسین یہ صورت حال دیکھتے رہے۔ جب کونسل کے اجلاس کا وقت قریب آیا اور ممبر لاہور میں جمع ہونے لگے تو آپ نے بہت صاف اور سیدھا قدم اٹھایا۔ آپ نے یونینسٹ پارٹی کا اجلاس بلایا۔ اور پارٹی کے ممبروں کو سمجھایا کہ اس موقعہ کے لئے اور آئندہ مواقع کے لئے انہیں اپنے حق پر اڑنا چاہیے۔ اس سوال پر گورنر سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ساتھ ہی آپ نے اپنی پارٹی کے امیدواروں کو سمجھا بجھا کر سر عبدالقادر کی متفقہ تائید پر راضی کر لیا اور اس بارے میں پارٹی کی قرارداد جیب میں رکھ کر گورنر سے ملاقات کی۔ گورنر سے آپ نے کہا کہ دونوں وزیر لامحالہ اپنی پارٹی کے فیصلے کے پابند ہیں۔ اس سوال پر

انھیں کونسل میں شکست ہو گی یا کامیابی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بہ ہر صورت ان کی شکست سرکاری بلاک کے ووٹوں سے نہ ہونی چاہیے۔ بہترین صورت یہ ہو گی کہ سرکاری ممبر اس انتخاب میں غیر جانبدار رہیں اور فیصلہ غیر سرکاری ممبروں پر چھوڑ دیں۔ گورنر کے پاس اس بات کا اور اس صورت حال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ یہ بات ماننے پر مجبور ہو گیا کہ سرکاری ممبر غیر جانبدار رہیں گے۔

ان حالات میں مقابلہ یونینسٹ پارٹی کے سر عبدالقادر اور سوراج پارٹی کے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کے درمیان ہوا۔ سر عبدالقادر ۳۲ کے مقابلے میں ۴۱ ووٹوں سے جیت گئے۔ لیکن معاملہ یہاں ختم نہ ہوا۔ چند مہینوں کے بعد صدر کے انتخاب کا سوال پھر پیدا ہو گیا۔ یہ اس طرح ہوا کہ اسی سال کے موسم گرما میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے مسلمان ممبر سر حبیب اللہ دو تین ماہ کی رخصت پر چلے گئے۔ اس عارضی وقفے کے لیے ان کی جگہ سر فضل حسین کو پیش کی گئی۔ جسے انھوں نے اس شرط پر منظور کر لیا کہ اس میعاد کے بعد وہ پنجاب میں اپنا وزارتی عہدہ پھر سنبھال لیں گے۔ اس طرح پنجاب میں جو عارضی وزارتی عہدہ خالی ہوا، اس کے لیے ان کی پارٹی کے دونوں بڑے دھڑے (شہاب الدین۔ دولتانہ گروپ اور نون ٹوانہ گروپ) خواہشمند تھے۔ وزیر کا انتخاب گورنر کے ہاتھ میں تھا۔ سر فضل حسین نے اپنی پارٹی کے اندر اتحاد قائم رکھنے کے لیے اتنا کیا کہ دونوں دھڑوں میں مفاہمت کرا دی کہ وہ ایک دوسرے کے بالمقابل بھاگ دوڑ کرنے کے بجائے متفقہ طور پر یہ موقعہ چودھری شہاب الدین کو دلانے کی کوشش کریں۔ فضل حسین کا خیال تھا کہ گورنر کو پارٹی کے اندر اتحاد نظر آئے گا تو وزیر کے انتخاب کے معاملے میں اس کے ہاتھ بندھ جائیں گے۔ لیکن گورنر نے یہ عہدہ سر عبدالقادر کو پیش کر کے سر فضل حسین کے منصوبے کو درہم برہم کر دیا۔ سر عبدالقادر نے یہ پیشکش قبول کر لی اور فضل حسین اور چودھری شہاب الدین منہ دیکھتے رہ گئے۔

سر عبدالقادر کو صدارت کا عہدہ چھوڑ کر جس کی میعاد تین سال تھی صرف تین مہینے کی عارضی وزارت قبول کرنے میں کیا مصلحت نظر آئی؟ یہ قصہ دلچسپ تھا۔ سر عبدالقادر کا خیال تھا (اس وقت کئی لوگوں کا یہ خیال تھا) کہ شاید سر حبیب اللہ رخصت سے واپس ہی نہ آئیں اور سر فضل حسین ان کی جگہ ٹکے رہیں اور خود سر عبدالقادر پوری میعاد تک پنجاب میں وزیر بنے رہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور پنجاب کی وزارت فضل حسین کو واپس کرنی پڑی۔ تو اس صورت میں بھی سر عبدالقادر کے لیے ایک راستہ موجود تھا۔ اس عارضی وقفے میں کونسل کا کوئی اجلاس ہونے والا نہ تھا۔ کونسل کے اجلاس کا وقت سر فضل حسین

کی واپسی کے بعد (اگر وہ واپس آئے) آتا تھا۔ لہٰذا سر عبد القادر کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ پھر وزارت چھوڑ کر صدارت کے انتخاب کے لئے امیدوار بن جائیں اور اگر (جیسا کہ گورنر نے انھیں امید دلائی تھی) سرکاری ووٹوں کی مدد انھیں ملے تو دوبارہ صدر منتخب ہونا مشکل نظر نہ آتا تھا۔ دونوں صورتوں میں ان کیلئے ایک نہ ایک عہدہ موجود تھا۔

سر حبیب اللہ اپنی رخصت کے بعد واپس آگئے تو سر فضل حسین بھی پنجاب میں واپس آ گئے۔ سر عبد القادر کو ان کے لئے کرسیٔ وزارت خالی کرنی پڑی۔ لیکن ان کے دوبارہ صدر منتخب ہو جانے کی تدبیر کامیاب نہ ہو سکی۔ فضل حسین نے انھیں جتا دیا کہ میں آپ کی مدد نہ کر سکوں گا۔ سر عبد القادر کونسل میں یا یونینسٹ پارٹی میں اپنا کوئی حصّہ نہ رکھتے تھے۔ ان کی حیثیت صرف انفرادی تھی۔ جب سر فضل حسین نے گورنر کو پھر یونینسٹ پارٹی اور منتخب شدہ ممبروں میں اس کی "قطعی اکثریت" کا نقشہ دکھا کر اس بات کا قائل کر لیا کہ سرکاری ممبروں کی صدارتی انتخاب میں دخل اندازی ایک غلط اور خلافِ مصلحت اقدام ہو گا۔ تو سر عبد القادر انتخاب کے لئے امیدوار ہی نہ بنے۔ لیکن اس مرتبہ یونینسٹ پارٹی کسی ایک امیدوار پر متفق نہ ہو سکی۔ اس پارٹی کے تین امیدواروں (چوہدری شہاب الدین۔ ملک فیروز خاں نون اور بیگم شاہنواز کے مرحوم شوہر میاں محمد شاہنواز) نے کاغذاتِ نامزدگی داخل کئے۔ سوراج پارٹی یا پروگریسو پارٹی نے (یہ دونوں پارٹیاں ہندوؤں کے مفاد میں اکٹھا کام کرتی تھیں) اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا بلکہ اپنے تمام ووٹ "شہری اور دیہاتی" کے سوال پر میاں محمد شاہنواز کو دینے کا وعدہ کر لیا۔ میاں محمد شاہنواز کے زور دینے پر سر فضل حسین مان گئے کہ اس مرتبہ جب کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مقابلہ نہ تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے ممبروں کو ووٹنگ کی آزادی دے دی جائے اور کوئی "وہپ" جاری نہ کیا جائے۔ یہ دیکھ کر شہاب الدین گروپ کے میاں احمد یار دولتانہ نے بھاگ دوڑ کی اور نون۔ ٹوانہ گروپ کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا کہ دونوں گروپ اس موقعہ پر چوہدری شہاب الدین کی اور آئندہ جو پہلا عہدہ خالی ہو گا اس کے لئے ملک فیروز خاں نون کی امداد کریں گے۔ لہٰذا ملک فیروز خاں نون صدارتی انتخاب کی امیدواری سے ہٹ گئے اور چوہدری شہاب الدین میاں شاہنواز کے مقابلے میں چھ ووٹوں (۳۹ : ۳۳) سے جیت گئے۔

گورنر مالکم ہیلی سر فضل حسین کی سیاسی طاقت کو اور یونینسٹ پارٹی اور اس کی "قطعی اکثریت"

کے گھروندے کو توڑنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ اس کے لئے ایک راستہ یہ تھا کہ ایک سال کے بعد جب کونسل کا نیا انتخاب ہو، تو فضل حسین کی جگہ کسی اور کو وزیر چن لے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ نئی کونسل میں یونینسٹ پارٹی کی تعداد کتنی ہوگی؟ اس کی قیادت پھر فضل حسین کے ہاتھ میں رہے گی یا نہیں؟ اور فضل حسین نئی وزارت کے راستے میں کتنی مشکلات پیدا کر سکے گا؟ ان سوالوں کے جواب غیر یقینی تھے بنگال کونسل کی تازہ مثال گورنر کے سامنے تھی جہاں سوراج پارٹی کے ہاتھوں وزارتی پارٹی کو (سرکاری بلاک سمیت) شکست ہو گئی تھی۔ گورنر کو فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی کے پر قینچ کرنے کی ایک آسان صورت نظر آئی۔ ۱۹۲۶ء کے شروع میں اس کی ایگزیکٹو کونسل کے سکھ ممبر سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کی پنجسالہ میعاد پوری ہونے والی تھی۔ گورنر نے سر فضل حسین کو میدانِ سیاست سے ہٹانے کے لئے یہ قیمت ادا کرنا مناسب سمجھا کہ آئندہ پانچ سال کے لئے یہ عہدہ انھیں پیش کر دیا اور انھوں نے یہ قیمت قبول کر لی۔ وہ بھی رسہ کشی کی حدود پہچانتے تھے اور ان سے تجاوز کرنا نہ چاہتے تھے۔ ایگزیکٹو کونسل میں سکھ کی جگہ مسلمان کو دے کر گورنر مالکم ہیلی نے وزیروں میں مسلمان کی جگہ ایک سکھ کو دی۔ اس عہدے کے لئے اس نے مرکزی کونسل آف سٹیٹ کے ممبر سر جوگندر سنگھ کو چنا۔ جن کے ذریعے یونینسٹ پارٹی کے سکھ ممبروں کو اس سے الگ کر کے کونسل کے تمام سکھ ممبروں کا ایک علیحدہ گروپ بنانے کا مقصد پورا ہو گیا۔ تقریباً ایک سال تک پنجاب میں صرف دو وزیر رہے۔ چودھری چھوٹو رام اور سر جوگندر سنگھ جن کے درمیان اشتراکِ عمل کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ اس دوران میں کونسل کے اندر اور اس کے باہر یہ شور مچتا رہا (اور سر فضل حسین شور مچوانے کا خاص اہتمام کرتے رہے) کہ وزارتی عہدوں میں جن کے ذریعے کابینہ میں عوام کو نمائندگی ملتی ہے۔ مسلم اکثریت کو نمائندگی سے قطعاً محروم کر دینا اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ آخر کونسل کے نئے انتخاب کے بعد گورنر کو تین وزیر مقرر کرنے پڑے۔ لیکن اس نے "غیر فرقہ وارانہ" یونینسٹ پارٹی کو نظر انداز کر کے وزیروں کے انتخاب کے لئے یہ اصول قائم کر دیا کہ ہر وزیر کونسل میں اپنے اپنے فرقے کی اکثریت کا نمائندہ ہونا چاہیئے۔ اس مرحلے پر دو تازہ گروپ کے ساتھ نون۔ ٹوانہ گروپ کا سمجھوتہ ملک فیروز خاں نون کے کام آیا اور نئی کونسل میں ملک صاحب مسلمان وزیر بن گئے۔ علامہ اقبال اور شیخ دین محمد اسی کونسل میں ممبر منتخب ہو کر آئے تھے۔ ملک فیروز خاں نون کے ساتھ ہندو وزیر راجہ نریندر ناتھ کی پارٹی کے مسٹر منوہر لال کو بنایا گیا۔ سکھ وزیر جوگندر سنگھ تھے۔ فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق

ہندو اور سکھ وزیر اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن تینوں وزیر فی الحقیقت مکمل طور پر گورنر کے دست نگر تھے۔ یونینسٹ پارٹی نے رسمی طور پر اپنا غیر فرقہ وارانہ نام قائم رکھا۔ کانگریسی رجحانات رکھنے والے تین چار ممبروں کے سوا باقی تمام مسلمان ممبر (علامہ اقبال اور شیخ دین محمد سمیت) رسمی طور پر اسی پارٹی کے ممبر بنے رہے۔ لیکن اس کے کئی ہندو اور سکھ ممبر اپنے اپنے فرقے کے کیمپوں میں چلے گئے۔ صرف چودھری چھوٹو رام اور ان کے دو ایک ساتھی مضبوطی کے ساتھ مسلم اکثریت کے ساتھ حزب مخالف کے بنچوں پر بیٹھے رہے۔ تاہم اس پارٹی کا "قطعی اکثریت" کا دعوےٰ ختم ہو گیا تھا۔ اور کونسل کے اندر توازن اقتدار نمایاں طور پر سرکاری بلاک کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

اس رد و بدل کے بعد سر فضل حسین کی حیثیت کیا تھی؟ آئینی لحاظ سے وہ صرف گورنر کے ایگزیکٹو کونسلر تھے۔ لیکن وہ اب بھی عملاً پنجاب کی سیاست کی مرکزی شخصیت بنے رہے۔ کونسل کے اندر وہ سرکاری بلاک کے لیڈر تھے۔ لیکن ساتھ ہی حزب مخالف (یونینسٹ پارٹی) کے غیر رسمی لیڈر اور مشیر بھی تھے۔ مسلمانوں کے مفاد کے لئے اپنی سمجھ کے مطابق غور و فکر اور اپنے مواقع اور اپنی پابندیوں کے مطابق ان کے مفاد کو ایک ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش ان کی دلچسپی کا مرکز بنا رہا۔ اب وہ پبلک طور پر کسی سیاسی پلیٹ فارم پر نہ آ سکتے تھے۔ لیکن اپنی وزارت کے زمانے میں بھی وہ کسی سیاسی پلیٹ فارم پر صرف ایک مرتبہ (مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں) نظر آئے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور ہم خیال لوگوں کے ساتھ تقسیم عمل کی یہ صورت پیدا کر لی تھی کہ سوچ بچار اور پالیسی متعین کرنے میں وہ بھرپور حصہ لیتے رہے۔ سیاسی پلیٹ فارم پر اور اخباروں میں اس پالیسی کی حمایت دوسروں کی ذمہ داری تھی۔ ۱۹۲۵ء میں اس مکتبۂ خیال کو جو مسلمانوں کی سیاست میں سر فضل حسین کا مکتبۂ خیال سمجھا جاتا تھا سر محمد شفیع کی وجہ سے بہت تقویت ملی۔ وہ ۱۹۲۴ء کے آخر میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل سے ریٹائر ہو کر لاہور واپس آ گئے تھے اور عہدوں کی کشش سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کا آخری دور اپنی سمجھ کے مطابق مسلمانوں کی خدمت میں گزارنا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۶ء سے پہلے لاہور میں سر محمد شفیع اور میاں فضل حسین میں سخت ان بن تھی۔ ایک کانگریس کا مخالف تھا۔ دوسرا کانگریس کیمپ میں تھا لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ دونوں نے دانائی سے کام لیا اور باہمی اتفاق کے ساتھ مشترکہ مقصد کیلئے دو الگ الگ مورچے سنبھال لئے۔ دونوں کی شخصیتیں ایسی تھیں کہ یہ دونوں ضرب المثل کے مطابق

ایک اور ایک مل کر گیارہ بن گئے۔

گورنر مالکم ہیلی کے ساتھ سر فضل حسین کی زیر سطح رسہ کشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ مثلاً یونینسٹ پارٹی کے ایک غیر سرکاری بل کو جو دیہاتی ساہوکاروں پر چند پابندیاں لگانے کے متعلق تھا (یہ بل میر مقبول محمود نے پیش کیا تھا) ہندو ممبروں کے شور و غوغا کے باوجود سر فضل حسین نے سرکاری بلاک کے لیڈر کی حیثیت سے خاص سہارا دے کر کونسل میں پاس کرا دیا۔ لیکن گورنر نے اس پر دستخط ثبت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس رسہ کشی کی سب سے نمایاں مثال اس وقت پیش آئی جب گورنر مالکم ہیلی نے سائمن کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لئے حکومت پنجاب کی ایک سخت رجعت پسندانہ رپورٹ کو کابینہ کی اکثریت سے منظور کرا لیا اور سر فضل حسین نے اس کے ساتھ اپنا اختلافی نوٹ شامل کرنے پر اصرار کیا۔ لیکن اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

۱۲- سنہ ۱۹۲۶ء : اسمبلی کا ایک ڈرامائی سیشن

مرکزی اسمبلی کا سنہ ۱۹۲۶ء کا بجٹ سیشن اپنے ساتھ چند ڈرامائی واقعات لایا۔ ایک ڈراما سوراج پارٹی کی واک آؤٹ کی صورت میں اسمبلی کی سٹیج پر ہوا اور دو ڈرامے تماشائیوں کی نگاہ سے اوجھل پس منظر میں ہوئے ۔ اس سیشن میں سید مرتضیٰ بہادر کی ایک غیر سرکاری قرارداد زیر بحث آئی جس کا مفہوم یہ تھا کہ آئینی اصلاحات کے لحاظ سے صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے اور وہاں سنہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات بلاتوقف نافذ کی جائیں۔ سید مرتضیٰ بہادر کئی دوسرے لوگوں کی طرح مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتوں کے ممبر تھے اور اسمبلی کے اندر سوراج پارٹی کے رکن تھے۔ انھوں نے یہ قرارداد پیش کر کے اپنی پارٹی کے ہندو ممبروں کو مشکل امتحان میں ڈال دیا۔ سوراج پارٹی کے بعض ممبروں نے اس قرارداد کی مخالفت کا یہ جواز پیدا کیا کہ ہم صوبہ سرحد کے عوام کو سیاسی آزادی سے بہرہ ور کرنے کے مخالف نہیں۔ لیکن ہم ہندوستان کے لئے سوراج مانگتے ہیں۔ تو صوبہ سرحد میں سنہ ۱۹۱۹ء کا ایکٹ نافذ کرنے کی حمایت کیونکر کر سکتے ہیں؟ انڈی پنڈنٹ پارٹی کے اندر بھی اس سوال پر کھلا اختلاف موجود تھا۔ مسٹر جناح نے قرارداد کی حمایت کی اور پنڈت مالویہ نے اس کی پُرزور مخالفت کی۔ پنڈت مالویہ اس سوال پر عام ہندوؤں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ان فرقہ وارانہ فسادات کی فہرست پیش کی جو گذشتہ بیس برس میں صوبہ سرحد میں ہوئے تھے۔ پھر کوہاٹ کے فساد (سنہ ۱۹۲۴ء) کا رونا رویا۔ جس کے بعد مہاتما گاندھی نے اکیس روزہ برت رکھا تھا اور کہا کہ جس صوبے میں یہ حالات ہوں وہاں اقلیت پر ظلم توڑنے والی اکثریت کے ہاتھ میں آئینی اصلاحات کے ذریعے اختیارات دینا ہرگز مناسب نہیں ۔

اس دن قرارداد پر بحث ختم نہ ہو سکی۔ اور اگلے غیر سرکاری دن کے لئے ملتوی ہو گئی۔ راجہ غضنفر علی نے اس سے پہلے اسمبلی میں کبھی زبان نہ کھولی تھی۔ انھوں نے اس قرارداد پر آئندہ بحث کے وقت تقریر کرنے کا تہیہ کر لیا اور سپیکر سے مل کر ایک نوآموز کی حیثیت سے یہ رعایت بھی مانگ لی کہ جب بحث

شروع ہو تو سب سے پہلا موقعہ انھیں دیا جائے۔ اس وقفے میں سوراج پارٹی (کانگریس کے اجلاس کانپور منعقدہ دسمبر ۱۹۲۵ء کی ہدایت کے مطابق) اسمبلی کے سیشن سے واک آؤٹ کر گئی۔

جب ۸ مارچ ۱۹۲۶ء کو سید مرتضیٰ بہادر کی قرارداد پر دوبارہ بحث ہوئی تو سوراج پارٹی کے بینچ خالی پڑے تھے اور صرف سید صاحب وہاں اکیلے بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنی پارٹی سے اتنی اجازت طلب کی تھی کہ وہ اپنی قرارداد پر باقی ماندہ بحث کے وقت اسمبلی میں حاضر رہیں لیکن پنڈت موتی لال نے انھیں یہ اجازت دینا منظور نہ کیا تھا۔ جب پنڈت جی نے انہیں ویسٹرن کورٹ میں اپنے کمرے میں بلا کر یہ حکم سنایا تو اچھا خاصا ڈرامہ ہو گیا۔ سید مرتضیٰ بہادر کمرے سے آنسو بہاتے ہوئے یہ کہہ کر نکلے کہ اچھا آپ کانگرس کے ساتھ میری بے داغ وفاداری کو نظر انداز کر کے مجھے اپنی پارٹی سے خارج کر دیجیے۔ میں اپنی قرارداد کو اسمبلی میں یتیمی کی حالت میں نہیں چھوڑ سکتا۔

بحث شروع ہونے پر راجہ غضنفر علی نے کچھ دیر تک رٹی ہوئی تقریر دہرائی۔ پھر پنڈت مالویہ نے انھیں لقمہ دیا۔ "میں نے جو کہا تھا اس صوبے کے مخصوص حالات کی بنا پر کہا تھا"۔ راجہ صاحب کو کچھ حوصلہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رٹی ہوئی تقریر کے متن کو چھوڑ کر پنڈت مالویہ کے جواب میں کہنے لگے کہ وہ مخصوص حالات آخر اس کے سوا کیا ہیں کہ وہاں بیس سال کے زمانے میں چند ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ فسادات کہاں نہیں ہوئے؟ پنڈت جی کے اپنے صوبے میں نہیں ہوئے؟ کیا اس لئے یو۔پی کو سیاسی آزادی کے نااہل قرار دے دیا جائے؟ فسادات ہر صوبے میں ہوئے ہیں۔ کیا صوبہ سرحد کے فسادات کی محض اس لیے خاص اہمیت ہے کہ وہاں ایک خاص فرقہ اقلیت میں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ راجہ صاحب کچھ دیر اچھے مقرروں کی طرح بے تکلف بولتے رہے اور جب انھوں نے تقریر ختم کی تو وہ با حوصلہ مقرر بن چکے تھے۔

اسمبلی کے اس سیشن سے سوراج پارٹی کے ڈرامائی واک آؤٹ کے بعد ایک مختصر لیکن اہم تاریخی ڈرامہ پس پردہ بھی ہوا۔ سوراج پارٹی کے واک آؤٹ کے بعد مسٹر پٹیل نے کرسی صدارت سے ایک مختصر تقریر کی جس میں سرکاری بنچوں کو تنبیہہ کی کہ وہ نئی صورت حال سے بے جا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں یعنی حزب مخالف کی غیر حاضری میں اہم اور اختلافی تجاویز پاس کرنے سے احتراز کریں۔ اس تقریر میں سپیکر نے ایک فقرہ یہ بھی کہہ دیا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ اب ایوان صرف اس نوعیت کا رہ گیا ہے کہ

یہ حکومت کی ہر بات پر صاد کرتا رہے گا۔" اس فقرے کے الفاظ کھُلے طور پر ایوان کے باقی غیر سرکاری ممبروں کی دیانتداری پر حملے کے مترادف تھے۔ اس بات کو سب نے محسوس کیا۔

مسٹر پٹیل کی اس تقریر کے وقت مسٹر جناح ایوان میں موجود نہ تھے۔ شام کو راجہ غضنفر علی بطور خاص یہ واقعہ ان کے نوٹس میں لانے کے لئے ان کی قیام گاہ پہ گئے۔ وہ ابھی مسٹر جناح سے گفتگو کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور کسی شخص نے مسٹر جناح سے فون پر کچھ کہا۔ آپ نے جواب میں کہا کہ ہاں بے شک ابھی آجائیے۔ فون بند کر کے مسٹر جناح نے راجہ کو بتایا کہ یہ مسٹر کرافورڈ تھے۔ مجھ سے فوری طور پر بات کرنا چاہتے تھے۔ غالباً اسی واقعہ کے متعلق۔ مسٹر کرافورڈ اسمبلی میں غیر سرکاری یورپین گروپ کے سیکرٹری تھے۔

کرافورڈ صاحب آئے تو مسٹر جناح نے ان سے الگ کمرے میں بات چیت کی اور پھر راجہ کو بتایا کہ غیر سرکاری یورپین گروپ سپیکر کے اسی فقرے کی بنا پر اس کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کرنا چاہتا ہے۔ بشرطیکہ میں قرارداد کی حمایت کروں۔ میں نے کرافورڈ سے کہا ہے کہ سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کرنا بہت ہی سنگین اور غیر معمولی اقدام ہے۔ میں سپیکر کی جانب سے اس کے بیان کی وضاحت سُنے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتا۔

اگلی صبح کو مسٹر جناح نے سپیکر پٹیل سے ملاقات کی۔ سپیکر نے کہا کہ میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ حکومت کے نمائندوں کی توجہ اسمبلی میں غیر سرکاری ارکان کی تعداد میں کمی کی جانب دلاؤں اور انھیں متنبہ کروں کہ اصل حزب مخالف کی غیر موجودگی کی وجہ سے غیر سرکاری ارکان کی عددی طاقت بہت ہی کمزور ہوگئی ہے۔ لہٰذا حکومت پر خاص ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسے چاہیئے کہ وہ اختلافی تجاویز ایوان میں اس وقت تک نہ لائے۔ جب تک ایوان کی پوری نشستیں دوبارہ پُر نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی فقرہ اس سے زیادہ میری زبان سے نکل گیا۔ تو وہ محض بے احتیاطی کا نتیجہ اور نادانستہ غلطی تھی۔ اس پر مسٹر جناح نے یورپین گروپ کی تجویز کی حمایت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سپیکر نے اس کے فوراً بعد کھُلے ایوان میں اپنے فقرے کے متعلق مناسب وضاحت اور معذرت بھی کر دی۔ اس طرح اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگیا۔

۱۹۲۶ء کے موسم خزاں میں مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کے انتخابات ایسی فضا میں ہوئے

کہ آئے دن کے ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے فرقہ وارانہ رجحانات مزید زور پکڑ گئے تھے۔ لہٰذا جو نئی مرکزی اسمبلی معرض وجود میں آئی۔ اس میں سوراج پارٹی اور انڈی پنڈنٹ پارٹی کے علاوہ ایک علیحدہ ہندو پارٹی بھی موجود تھی۔ جس کے لیڈر لالہ لاجپت رائے تھے۔ اس کا نام نیشنلسٹ پارٹی رکھا گیا تھا۔ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے پنڈت مالویہ اور دو تین دوسرے ممبر اس نیشنلسٹ پارٹی میں چلے گئے۔ کچھ مسلمان بھی انڈی پنڈنٹ پارٹی کو چھوڑ کر ایک مسلم گروپ میں شامل ہو گئے۔ جس کی قیادت صوبہ سرحد کے سر عبدالقیوم کر رہے تھے گذشتہ اسمبلی میں مسٹر جناح کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد اٹھارہ تھی۔ اب اس سے کم ہو کر صرف دس رہ گئی۔ راجہ غضنفر علی کو جو پھر اسمبلی میں آ گئے تھے۔ اس مختصر پارٹی کا سیکرٹری چن لیا گیا۔

اس زمانے میں اسمبلی کے متعدد مسلمان ممبروں کا ایک وفد مسٹر جناح کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کی قیادت قبول کر کے ایک مسلم پارٹی بنا لیں۔ جس کی تعداد پچیس تیس تک پہنچنے کی توقع تھی۔ لیکن جناح صاحب نے یہ درخواست قبول نہ کی اور دس ممبروں کی غیر فرقہ وارانہ انڈی پنڈنٹ پارٹی پر قناعت کرنا بہتر سمجھا۔

۱۳۔ "تجاویز دہلی" ۔ "نہرو رپورٹ"
اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس

مسلم لیگ نے انہی مطالبات کو جو اس نے مئی ۱۹۲۴ء کے اجلاس لاہور میں منظور کیے تھے۔ اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ علیگڑھ (دسمبر ۱۹۲۵ء) میں دہرایا۔ یہاں بھی اس نے ایک کمیٹی نامزد کی۔ جسے ان مطالبات کی بنا پر دوسری پارٹیوں کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا اختیار دیا۔ مسلم لیگ بار بار اس قسم کی کمیٹیاں نامزد کرتی رہی۔ لیکن کانگریس نے ان قراردادوں کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کے اجلاس دہلی میں مسلم لیگ نے پھر حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ جلد از جلد ہندوستان کو ایک خودمختار نوآبادی کا درجہ دینے کی جانب قدم بڑھائے۔ اس مطالبے کے ضمن میں مسلم لیگ نے اپنے وہی مطالبات دہرائے اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ صلاح مشورہ کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ یہ قرارداد مسٹر جناح نے پیش کی۔ قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے آخر میں فرمایا۔ "ہمیں امید کرنی چاہیے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سمجھدار طبقے یہ بات سمجھ لیں گے کہ ہندوستان کا مسئلہ دوستی۔ اتحاد اور تعاون ہی کے ذریعے حل ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستان ایک قوم بن کر دکھائے گا جس کے لئے ہم سب دست بدعا ہیں۔"

کانگریس نے اس پیش کش کا بھی کوئی عملی جواب نہ دیا۔ یعنی مسلم لیگ کی مقرر کردہ کمیٹی کے ساتھ صلاح مشورہ کے لئے کوئی کمیٹی مقرر نہ کی۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے فرقہ وارانہ اتحاد کیلئے حسب معمول اپیل کر دی گئی۔ اس سے آگے کوئی قدم نہ بڑھایا گیا۔ بالآخر اس تعطل کو ختم کرنے کے لئے مسٹر جناح نے خود اپنی طرف سے ایک بہت جرأت مندانہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

مرکزی اسمبلی کے ۱۹۲۷ء کے بجٹ سیشن کے سلسلے میں مسٹر جناح دہلی میں مقیم تھے۔ وہ اور

پنڈت موتی لال نہرو (سوراج پارٹی کے لیڈر) دونوں ویسٹرن کورٹ نئی دہلی میں قیام پذیر تھے۔ راجہ غضنفر علی کے بیان کے مطابق (جو اس زمانے میں انڈی پنڈنٹ پارٹی کے سکرٹری کی حیثیت سے اور اپنی ذاتی نیازمندی کی وجہ سے مسٹر جناح سے بہت قریب تھے) یہ دونوں لیڈر (مسٹر جناح اور پنڈت نہرو) کبھی کبھی ویسٹرن کورٹ میں اکٹھے بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتے تھے۔ ایک دن گفتگو کا رخ ملک کے سیاسی مسئلے کی جانب پھر گیا۔ پنڈت موتی لال نے کہا کہ اختلافات کی اصل وجہ جداگانہ نیابت کے متعلق مسلمانوں کا اصرار ہے۔ اگر مسلمان کسی طرح اس مطالبے کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تو میں ان کے باقی سب مطالبات کانگریس سے منوا سکتا ہوں۔

مسٹر جناح کا ذاتی خیال ہمیشہ سے یہ تھا کہ مسلمانوں کی حفاظت اور ان کے اطمینان کا بندوبست جداگانہ طرزِ انتخاب کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ پنڈت موتی لال کی اس پیش کش کی اہمیت کے پیشِ نظر مسٹر جناح نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ مختلف الخیال مسلمان لیڈروں کی ایک مختصر کانفرنس اس سوال پر غور کرنے کے لئے طلب کریں۔ انھوں نے پچیس تیس مسلم لیڈروں کو پیغام اور تاریں دے کر بلایا اور مارچ کے وسط میں ایک چھوٹی سی آل پارٹیز مسلم کانفرنس ان کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی۔ جو صاحبان اس میں شریک ہوئے۔ ان میں مولانا محمد علی۔ سر علی امام۔ راجہ محمود آباد۔ ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری۔ مفتی کفایت اللہ اور سر محمد شفیع وغیرہ شامل تھے۔ پنجاب کی نمائندگی کے لئے سر فضل حسین کو بھی دعوت بھیجی گئی تھی لیکن انھوں نے اپنے سرکاری عہدے (صوبائی ایگزیکٹو کونسلری) کی بنا پر معذرت کر دی۔ اس مختصر کانفرنس کے لئے راجہ غضنفر علی نے ایک فرد پر مشتمل استقبالیہ کمیٹی کے فرائض انجام دیئے۔

ان لیڈروں کی کئی نشستیں ہوئیں۔ یہ کبھی اکٹھے بیٹھ کر اور کبھی گروہوں میں تقسیم ہو کر بحثیں کرتے رہے۔ بالآخر ایک فارمولا تیار ہوا۔ جسے کانفرنس کے فیصلے کے طور پر شائع کر دیا گیا۔ فارمولا حسب ذیل تھا۔

(۱) سندھ کو صوبہ بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ (۲) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات نافذ کر کے انھیں دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دیا جائے (۳) اس صورت میں مسلمان تمام صوبوں میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قبول کرنے کو تیار ہوں گے (۴) سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مسلمان ہندو اقلیتوں کو وہی مراعات دینے کو تیار ہوں گے جو ہندو اپنی اکثریت کے

صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو دیں۔ (۵) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے مخلوط طرز انتخاب کی بنا پر ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق نشستیں مخصوص ہوں گی اور مرکزی اسمبلی میں ان کے لئے کم ازکم ایک تہائی نشستیں مخصوص ہوں گی۔

یہ فارمولا ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا۔ اسی صبح کو سر محمد شفیع دہلی سے واپس لاہور پہنچے تھے۔ معلوم نہیں دہلی میں انھوں نے اس فارمولے سے اتفاق کیا تھا یا نہیں۔ لیکن لاہور پہنچنے کے بعد انھوں نے یہ بیان دے دیا کہ انھیں ان تجاویز سے اتفاق نہیں ہے۔

ان تجاویز کے (جنھیں بعد کی بحثوں اور نہرو رپورٹ میں "مسلم لیڈروں کی تجاویز" کا نام دیا جاتا رہا) شائع ہوتے ہی نیم کانگرسی۔ نیم مہاسبھائی پالیسی پر چلنے والے ہندو اخبارات نے ان کے متعلق معاندانہ رویہ اختیار کرلیا۔ البتہ کانگرس کے صدر مسٹر سرنیواس آئنگار نے فراخدلی کے ساتھ ان تجاویز کا خیر مقدم کیا اور ان پر غور کرنے کے لئے کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ لیکن بعض مسلمان حلقوں میں بالخصوص پنجاب میں۔ ان تجاویز کے خلاف سخت ردعمل ہوا۔ سر فضل حسین اس تحریک کی مخالفت پر تُل گئے۔ اس وقت علامہ اقبال بھی عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے۔ اور پہلی (اور آخری) مرتبہ منتخب ہو کر صوبائی کونسل کے ممبر بنے تھے۔ سر محمد شفیع اور علامہ اقبال دونوں اس سوال پر سر فضل حسین کے ہم نوا تھے۔ پنجاب کے ان تین بڑوں کے متحدہ محاذ نے "دہلی تجاویز" کی کامیابی کو خاصا مشتبہ بنادیا۔ لیکن یہ تجاویز دو سال تک میدان میں رہیں اور دو سال تک مسلمان لیڈروں کے درمیان سیاسی خانہ جنگی جاری رہی۔

پنجاب اور بنگال کے متعلق "فضل حسین گروپ" ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتا رہا تھا کہ مسلمانوں کو صوبائی اسمبلی میں اکثریت جداگانہ نیابت کے ذریعے دی جائے۔ جہاں تک اکثریت کا سوال تھا۔ شاید عملی لحاظ سے پچاس فی صد یا اکیاون فیصد (جس سے اکثریت کی شرط پوری ہو جاتی تھی) میں چنداں فرق نہ تھا۔ لیکن جداگانہ نیابت کو یہ گروپ مسلمانوں کے لئے موت وزیست کا سوال سمجھتا تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ انگریزی حکومت سے یہ اُمید نہ کی جاسکتی تھی کہ وہ محدود رائے دہندگی کی سکیم کو بدل کر بالغ رائے دہندگی کا اصول منظور کرلے گی۔ اور محدود رائے دہندگی کی صورت میں ووٹروں کی فہرست میں مسلمان صرف چالیس فی صد تھے۔ اس کے علاوہ اگر بالغ رائے دہندگی کا بندوبست ہو جائے

تب بھی اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ ہندوؤں کی دولت انتخابات پر اثر انداز ہوگی۔ اور مسلمانوں کو آبادی کے تناسب میں جو فوقیت حاصل ہے وہ اتنی زیادہ نہیں کہ اس خطرے کو نظر انداز کر دیا جائے۔

مئی میں لاہور میں مسلمانوں کا ایک پبلک جلسہ ہوا جس کی صدارت سر محمد شفیع نے کی۔ علامہ اقبال نے "تجاویز دہلی" کے خلاف ایک قرارداد پیش کی اور ان تجاویز کے خلاف زور دار تقریریں ہوئیں۔ یہاں سے "تجاویز دہلی" کے خلاف جلسوں اور مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

مسٹر جناح نے اپنی نئی تجاویز کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خدشات کو دور کرنے کے لئے آخر مارچ ۱۹۲۷ء میں ایک اہم اخباری بیان دیا۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ "ان تجاویز کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر جداگانہ طرز انتخاب کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جداگانہ یا مخلوط طرز انتخاب بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ ایک مقصد حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ قومی حکومت کی منزل تک پہنچنے کا جو عبوری دور ہے۔ اس دور میں اکثریتی فرقہ مسلمانوں پر کوئی ظلم یا زیادتی نہ کرسکے گا۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بہ حالاتِ موجودہ دونوں فرقوں کے درمیان کچھ نہ کچھ سیاسی توازن قائم رہنا چاہیئے۔ اسی مقصد کے لئے مسلمانوں کی جانب سے ان تجاویز میں ایک سیدھا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ اگر ہندو ان عام اصولوں کو مان لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ سمجھوتہ بہت قریب ہے"۔

آپ نے فرمایا "ذاتی طور پر میں جداگانہ انتخابات کا حامی نہیں ہوں۔ اگرچہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت دیانتداری کے ساتھ یہ خیال کرتی ہے کہ ان کی حفاظت کا بہترین ذریعہ یہی ہے۔ جداگانہ انتخابات کے سسٹم میں فائدے بھی ہیں اور برائیاں بھی ہیں۔ اصل مقصد بہر حال یہ ہے کہ اقلیتوں کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ محفوظ ہیں اور اگر ان تجاویز کی بنا پر کوئی سمجھوتہ ہوگیا تو اسے آخری منظوری کیلئے مسلمانوں اور ہندوؤں کی جماعتوں کے سامنے پیش کیا جائے گا"۔

ایسا معلوم ہوتا تھا (کم از کم ان کے عمل سے یہی ظاہر ہوتا تھا) کہ سر فضل حسین کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کانگریس دوڑ کر "تجاویز دہلی" کو گلے لگالے گی۔ اور اگر ایسا ہوا تو پھر انگریز شاید اس سمجھوتے کے آگے ہتھیار ڈال دے اور ان لوگوں کے ہاتھ کمزور ہو جائیں جو مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب

کے ذریعے پنجاب اور بنگال میں اکثریت چاہتے تھے۔ اس ڈر کے باعث انھوں نے "تجاویز دہلی" کو غیر نمائندہ اور مسلم لیگ کے سابق فارمولا کو مسلمانوں کا تقریباً متفقہ مطالبہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

یکم مئی ۱۹۲۷ء کو تجاویز دہلی کے خلاف لاہور کے پبلک جلسے کے بعد پنجاب کے "بڑوں" نے دوسروں صوبوں میں اپنے دوستوں کو اشارے کئے۔ کلکتہ۔ پٹنہ مدراس اور ہندوستان کے کئی دوسر مقامات پر اسی قسم کے جلسے ہوئے۔ پھر سر فضل حسین نے چودھری ظفر اللہ خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو جو غالباً اپنے کسی اور کام انگلستان جا رہے تھے۔ اس کام پر مامور کیا کہ وہ انگلستان کے اخباروں میں اور دوسرے طریقوں پر یہ پراپیگنڈہ کریں کہ "تجاویز دہلی" کے حامی چند افراد ہیں۔ عام مسلمان مخلوط طرز انتخاب کو اپنے لئے سخت خطرناک سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین فرانس جا کر آغا خاں سے ملے۔ جن سے سر فضل حسین کے خاص تعلقات تھے اور انھیں فضل حسین کی یہ درخواست پہنچائی کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی بڑا جلسہ اس سلسلے میں کیا گیا تو بشرط ضرورت وہ اس کی صدارت کرنے کی تکلیف اٹھائیں۔

اس سے پہلے ایک تدبیر مسلم لیگ پر قبضہ کرنے کی بھی موجود تھی۔ اتفاق سے ۱۹۲۶ء کے اجلاس دہلی کے موقعہ پر لیگ کو آئندہ سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کی دعوت دی جا چکی تھی۔ جو منظور کر لی گئی تھی۔ اگر لاہور میں اجلاس ہوا تو پنجابی لیڈروں کو لیگ کے پنڈال میں اپنا ہم خیال ہجوم جمع کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ لیگ کی مجلس عاملہ کے بعض ممبروں نے اس خطرے کو بھانپ لیا۔ انھوں نے مجلسِ عاملہ کے ایک جلسے میں اجلاس کی جگہ کلکتہ مقرر کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اجلاس کے انتظامات میں ردوبدل کرنے کا اختیار مجلس عاملہ کو حاصل ہے۔ سر محمد شفیع بھی لیگ کی عاملہ کے ممبر تھے۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ جو فیصلہ ہو چکا ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ کلکتہ میں اجلاس منعقد کرنے کی تجویز کثرت رائے سے پاس ہو گئی۔ سر محمد شفیع کا دعویٰ تھا کہ یہ فیصلہ ناجائز اور کالعدم ہے اور پہلا فیصلہ بدستور قائم ہے۔

اس اختلاف نے آخر یہ صورت اختیار کی کہ بیک وقت لیگ کا ایک اجلاس لاہور میں ہوا۔ اور ایک اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ اجلاس لاہور میں سر محمد شفیع کو لیگ کا صدر اور علامہ اقبال کو سیکرٹری

میں کسی ایک نقطہ نگاہ کو پورے طور پر تسلیم نہیں کر سکتے۔" آئین کے جو اصول کمیٹی نے مرتب کیے۔ ان میں پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے نشستیں مخصوص کرنے کا اصول مسترد کردیا، مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کا تناسب ایک تہائی سے کم کر کے ایک چوتھائی کر دیا۔ ایک اور اہم نکتہ یہ تھا۔ کہ اس رپورٹ میں مرکز کے لئے وحدانی شکل تجویز کی گئی۔

نہرو کمیٹی کی رپورٹ (جو نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی) شائع کر دی گئی لیکن ابھی اس کی حیثیت ایک تجویز کی تھی جسے آخری فیصلے کے لئے آل پارٹیز کنونشن کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا۔ کنونشن کا اجلاس کانگریس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ کلکتہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ مسٹر جناح اکتوبر ۱۹۲۸ء میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔ یہاں پہنچتے ہی آپ نے ایک اخباری بیان میں ہندو اور مسلمان لیڈروں سے رواداری اور اتحاد کے لئے اپیل کی اور فرمایا کہ وہ نہرو رپورٹ میں ترمیم کرانے اور اسے "تجاویز دہلی" کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں گے۔ گذشتہ سال مسلم لیگ ("جناح لیگ") کا اجلاس کلکتہ میں ہو چکا تھا۔ آپ نے اس سال پھر لیگ کا اجلاس وہیں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ لیگ کے نمائندوں کو آل پارٹیز کنونشن میں حصہ لینے کی سہولت حاصل رہے۔ دوسری طرف "شفیع لیگ" کے کرتا دھرتا بھی غافل نہ تھے۔ لیکن اس مرتبہ انھوں نے ایک متوازی لیگ کے نام سے اجلاس منعقد کرنے کے بجائے ایک زیادہ پُرشکوہ اور چمک دمک رکھنے والا جلسہ کرنے کی تیاری کی۔ اس کا نام آل پارٹیز مسلم کانفرنس رکھا گیا۔ اس کی صدارت کے لئے آغا خاں کو بطور خاص یورپ سے آنے کی زحمت دی گئی۔ یو۔ پی کے سب سے زیادہ بااثر مسلمان تعلقہ دار راجہ محمود آباد مسٹر جناح کے ساتھ تھے۔ لیکن ان کے صوبے میں ان کے حریف تعلقہ داروں کا ایک گروہ بھی تھا جس کے دماغ کی حیثیت ڈاکٹر ضیاءالدین کو حاصل تھی۔ سر فضل حسین نے اس گروہ کو آمادہ کیا کہ وہ آل پارٹیز کانفرنس کو کامیاب کرنے کے لئے زور لگائیں اور روپیہ خرچ کریں۔ چنانچہ نواب چھتاری اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے غیر رسمی سربراہ بن گئے اور منصوبہ بندی کے ساتھ کانفرنس کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس کے لئے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔

۲۲ دسمبر کو کنونشن کا اجلاس کلکتہ میں شروع ہوا۔ اس میں تقریباً بارہ سو ڈیلیگیٹ جمع تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کانگریس کے مندوبین میں شامل تھے۔ مسٹر جناح نے اس اجلاس میں نہرو رپورٹ

کی تجاویز میں صرف تین ترامیم پاس کرانے کی انتہائی کوشش کی۔ ایک ترمیم یہ تھی کہ مرکز کی حکومت وحدانی نہ ہو بلکہ فیڈرل طرز کی ہو۔ دوسری یہ کہ پنجاب اور بنگال میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کی جائیں اور تیسری یہ کہ مرکز میں مسلمانوں کے لئے مخصوص نشستیں ایک تہائی سے کم نہ ہوں۔ مسٹر جناح نے ان ترامیم کے حق میں بہت مدلل تقریریں کیں اور اعتراضات کے جواب بہت متانت سے دیئے۔ ان کی تائید لبرل پارٹی کے سر تیج بہادر سپرو نے اور کانگریس پارٹی کے مولانا محمد علی جوہرؔ نے کی۔ سر تیج بہادر نے یہ بھی کہا کہ مسٹر جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جو کچھ کیا ہے میں صرف اس کے صلے کے طور پر کسی دلیل کے بغیر ان کی بات ماننے کو تیار ہوں لیکن ایوان کی اکثریت ان کی بات سننے کو تیار نہ تھی۔ ہندو مہاسبھا کے نمائندہ مسٹر جے کار نے نہ صرف مسٹر جناح کی ترامیم کی مخالفت کی۔ بلکہ کہا کہ "جناح صاحب ایک ضدی بچے کے مانند ہیں جس کا دماغ کانگریس کے لاڈ پیار سے خراب ہو گیا ہے۔" جے کار صاحب نے یہ بھی پوچھا۔ مسٹر جناح کس کی نمائندگی کر رہے ہیں؟ مسلم عوام کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے ساتھ ہیں۔ اور یہ جماعتیں نہرو تجاویز کو من وعن تسلیم کرتی ہیں۔ فرقہ پرست مسلمان لیڈر انھیں اپنا نمائندہ ہی نہیں مانتے۔ لہٰذا محض جناح صاحب کو خوش کرنے کے لئے ان کی ترامیم ماننے سے کیا فائدہ؟ مسٹر جناح کی ترامیم یکے بعد دیگرے مسترد کر دی گئیں۔

ایک اور سوال پر مولانا محمد علی جوہرؔ پر بھی بعض ہندو ہبلن نے آوازے کسے اور مولانا واک آؤٹ کر گئے۔ اور پھر نہ کنونشن میں واپس گئے نہ کانگریس میں۔ مسٹر جناح نے کنونشن میں شکست کھانے کے بعد مسلم لیگ کا اجلاس جو راجہ محمود آباد کے زیر صدارت شروع ہوا تھا۔ ملتوی کرا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اب ہمیں تمام حالات پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ وہاں سے بمبئی تشریف لے گئے۔

ایک ہفتے کے بعد یعنی ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو دہلی میں آغا خاں کے زیر صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ پنڈال کو خوب سجایا گیا تھا۔ اس کے اندر ہجوم بھی بہت تھا۔ اور جلسے میں مسلمانوں کا خطاب یافتہ طبقہ بہ طور خاص بھاری تعداد میں نمایاں تھا۔ لیکن مولانا محمد علی جوہرؔ نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ مولانا حسرت موہانی بھی وہاں موجود تھے۔ جمعیت العلماء سمیت کئی پارٹیوں کے نمائندوں کو گھیر گھار کر جمع کر لیا گیا تھا۔

احمد خاں شیروانی۔ چودھری خلیق الزمان وغیرہ شامل تھے۔

حالات پر غور کرنے کے بعد مسٹر جناح نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے درمیان اختلافات ختم کرنا اور مسلم لیگ کو پھر مسلم اتحاد کی ترجمان بنانا ضروری ہے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر انھوں نے لیگ کا ملتوی شدہ اجلاس مارچ ۱۹۲۹ء کے آخر میں دہلی میں بلایا اور لیگ کے اجلاس سے پہلے ان لیڈروں کے ساتھ جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ گفت و شنید کی۔ اس گفت و شنید میں یہ فیصلہ ہو گیا کہ (۱) وہ صاحبان جنھوں نے لیگ سے علیحدہ ہو کر اپنے آپ کو سر محمد شفیع کے زیر صدارت ایک متوازی لیگ کی صورت میں منظم کر لیا تھا۔ اس علیحدہ تنظیم کو ختم کر دیں اور (۲) متحدہ مسلم لیگ، ان تمام مطالبات کو اپنا لے جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد میں شامل کیے گئے تھے۔

اس گفتگو میں جو حکیم اجمل خاں کے مکان پر ہو رہی تھی۔ کچھ دیر لگ گئی۔ ادھر مسلم لیگ کا کھلا اجلاس شروع ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ لیگ کے پنڈال میں لوگ جمع ہو چکے تھے اور کرسی صدارت مسٹر جناح کی منتظر تھی۔ کچھ نیم مسلم لیگی نیم کانگریسی حضرات لیگ کے پنڈال میں یہ منصوبہ بنا کر آئے تھے کہ جلسے پر قبضہ کر کے اس سے نہرو رپورٹ کے حق میں قرارداد پاس کرالیں۔ مسٹر جناح کی تشریف آوری میں دیر ہوئی تو ان لوگوں نے آپس میں کانا پھوسی کی اور ایک شخص نے تجویز پیش کر دی کہ صدر جلسہ کی آمد تک ڈاکٹر محمد عالم کرسی صدارت سنبھال لیں۔ اور کارروائی شروع کرا دیں۔ یہ تجویز پیش ہوئی تو ایک طرف اس کی رسمی تائید ہوئی اور دوسری طرف پنڈال میں "نہیں نہیں۔ ہر گز نہیں" کا شور بلند ہوا۔ اسی شور میں ڈاکٹر عالم نے کرسی صدارت پر قبضہ جما لیا اور کرسی پر بیٹھتے ہی غازی عبدالرحمٰن کو تقریر کی اجازت دے دی۔ غازی صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور سٹیج کی طرف بڑھے۔ لیکن اور لوگ بھی سٹیج کی جانب بڑھ رہے تھے۔ غازی عبدالرحمٰن صاحب نے ایک منٹ کے اندر اپنی قرارداد پیش کر دی جس کا مطلب تھا کہ یہ جلسہ نہرو رپورٹ میں پیش کردہ اصولوں کی تائید کرتا ہے۔

سٹیج پر اور اس کے گرد لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ جو شور مچا رہا تھا۔ پنڈال میں دھکا پیل ہو رہی تھی۔ کرسیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی صرف اتنا کہہ سکے کہ "میں اس تجویز

کی تائید کرتا ہوں"۔ کچھ لوگوں نے دھکے مار کر انھیں سٹیج سے نیچے گرا دیا۔ کچھ لوگوں نے ڈاکٹر عالم کو پکڑ کر کرسی سے اٹھا لیا۔ اور پنڈال سے باہر نکالنا چاہا۔ جب انھیں "پا بہ دست دگرے دست بہ دست دگرے" پنڈال سے باہر کشاں کشاں لے جایا جا رہا تھا۔ تو وہ بلند آواز سے پکار رہے تھے۔ "قرارداد منظور ہو چکی ہے۔ میں جلسے کو برخاست کرتا ہوں"۔

اتنے میں مسٹر جناح کی کار آ گئی۔ راجہ غضنفر علی خاں اور دو چار اور لوگوں نے جو ان کے انتظار میں باہر کھڑے تھے۔ آگے بڑھ کر ان سے کہا "آپ ابھی اندر نہ جائیں۔ پنڈال میں ہنگامہ برپا ہے اور مکّے چل رہے ہیں"۔ مسٹر جناح نے پروا نہ کی اور پنڈال کے اندر چلے گئے۔ انھیں دیکھتے ہی "مسٹر جناح زندہ باد" کا نعرہ بلند ہوا اور پنڈال میں سکون ہو گیا۔ آپ اطمینان کے ساتھ ڈائس پر پہنچے۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے ایک مختصر تقریر کی اور اگلے دن کے لئے جلسہ ملتوی کر دیا۔

اگلے دن آپ نے خطبۂ صدارت کے طور پر ایک مختصر تقریر کی اور اس کے بعد وہ قرارداد پیش کی جو حکیم اجمل خاں کے مکان پر طے شدہ سمجھوتے پر مبنی تھی۔ اس قرارداد میں ایک طویل تمہید کے بعد مسلمانوں کے وہی مطالبات جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس پاس کر چکی تھی۔ چودہ نکات کی صورت میں اختصار کے ساتھ دہرائے گئے تھے۔ یہ نکات ہندوستان کی تاریخ میں "مسٹر جناح کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہر حال ڈاکٹر محمد عالم اور ان کے ساتھیوں کی یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی کہ مسلم لیگ کے اجلاس کو مسٹر جناح کے قبضے سے "چرا کر" اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اور نہرو رپورٹ کی حمایت کا آلۂ کار بنا لیں۔

دو سال کے اختلافات اور ہنگاموں کے بعد مسلمانوں (یعنی غیر کانگریسی مسلمانوں) کی سیاست میں پھر وہ بنیادی اتحاد پیدا ہو گیا جو اس سے پہلے موجود تھا۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے اپنے آپ کو ایک مستقل ادارے کی شکل دے دی تھی۔ یہ جماعت بھی متحدہ مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ قائم رہی۔ بلکہ کچھ عرصے کے لئے (جب مسٹر جناح انگلستان میں مقیم تھے) مسلم کانفرنس کو مسلم لیگ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ لیکن دونوں کے نصب العین اور مطالبات میں کوئی فرق نہ تھا۔ بہت حد تک وہی لوگ دونوں جماعتوں کے ممبر تھے۔ لیکن یہ دونوں اس زمانے میں محض لیڈروں کی

جماعتیں تھیں۔ ان کی عوامی تنظیم کوئی نہ تھی اور ان کا عملی پروگرام بھی اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کبھی کبھی اپنے اجلاس منعقد کر کے ملکی معاملات کے متعلق مسلمانوں (یعنی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے غیر کانگریسی مسلم لیڈروں) کا نقطۂ نگاہ ظاہر کر دیتی تھیں۔

۱۵۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قرارداد

۱۹۲۸ء کا بجٹ سیشن شروع ہونے والا تھا جس میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قرارداد زیر بحث آنے کی توقع تھی۔ ابھی صرف چند ممبر دہلی پہنچے تھے۔ اس زمانہ میں راجہ غضنفر علی خان کی نواب اسمٰعیل خاں سے ملاقاتیں ہوئیں تو سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون یا عدم تعاون کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ اس زمانے میں یہی مسئلہ ملک میں سیاسی بحثوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مسٹر جناح اس کمیشن کے بائیکاٹ کے حق میں بیان دے چکے تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بائیکاٹ کی تحریک کے بانی وہی تھے کانگریسی لیڈروں نے ان کی تجویز پر لبیک کہا تھا اور اسے اپنا لیا تھا۔ اب یہ تحریک کافی مقبول تھی۔ نواب اسمٰعیل خان کہنے لگے کہ مسٹر جناح نے اس معاملے میں جلد بازی سے کام لیا ہے اور ایسا قدم اٹھایا ہے جو کانگریس کے موقف کو بے شک تقویت پہنچاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے غیر مفید ہے۔

کمیشن کے خلاف مسٹر جناح کا اعتراض یہ تھا کہ اس میں صرف برطانوی پارلیمنٹ کے نمائندوں کو شامل کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے کسی نمائندے کو اس کے ممبروں میں جگہ نہ دی گئی تھی۔ یہ بات ان کے نزدیک ہندوستان کے لئے باعث ہتک تھی۔ نواب صاحب کا خیال تھا کہ اگر ہم اس بات کو باعث ہتک نہیں سمجھتے بلکہ درست تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا آئین بنانے کا اختیار اور حق ہندوستان کے نمائندوں کے بجائے برطانوی پارلیمنٹ کو حاصل ہے تو پھر اس فروعی بات پر جھگڑنا فضول ہے کہ پارلیمنٹ نے ہماری خواہشات اور نقطہ نگاہ معلوم کرنے کے لئے اپنے جو نمائندے بھیجے ہیں۔ ان میں ہمارے نمائندوں کو شامل کیوں نہیں کیا۔

اصل اور اہم نکتہ نواب صاحب کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمانوں کا کانگریس کے نعرۂ آزادی سے الگ ایک خاص نقطہ نگاہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کانگریس کا مطالبہ بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ جس کا دنیا ایک ہی مطلب سمجھتی ہے۔ یعنی ہندوستان میں تمام حکومتی اختیارات ایک ایسی حکومت کو

منتقل کر دیئے جائیں جو عام جمہوری طریقوں کے مطابق عوام کے نمائندوں کے سامنے جواب دہ ہو۔ کانگریس کے لئے اس مطالبے کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف اسے منوانے کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس کے لئے بائیکاٹ بھی اپنے مطالبے کو زیادہ موثر زبان میں پیش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کا مقصد صرف نعرۂ آزادی بلند کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ انھیں آزادی کی ایک مخصوص اور نرالی شکل مطلوب ہے۔ جس میں ایسے مطالبات شامل ہیں۔ جن کی ضرورت اور جواز اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ جب تک انھیں اچھی طرح سمجھایا نہ جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کے مقصد کی ترجمانی بائیکاٹ کی زبان کے ذریعے نہیں کی جا سکتی بلکہ اس سے یہ غلط تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان اس مقصد پر متفق ہے۔ جس کے لئے کانگریس لڑ رہی ہے اور مسلمانوں کے مطالبات ایک غیر اہم اور فروعی چیز ہیں۔

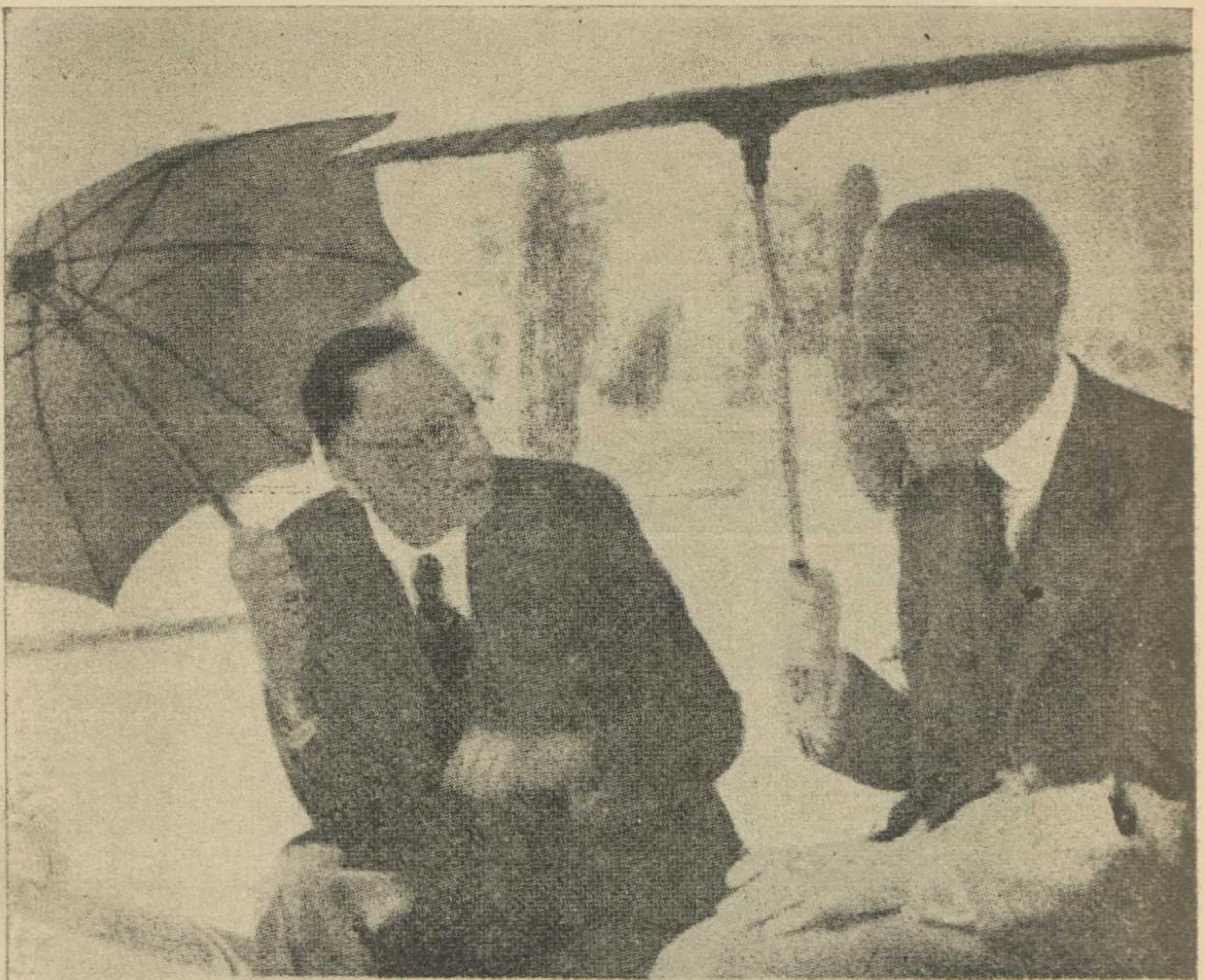
نواب صاحب کے دلائل وزن دار تھے۔ راجہ غضنفر علی خاں قائل ہو گئے۔ پھر ایک اور ممبر مسٹر محمد رفیق سے یہی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد دوسرے ممبروں سے ہوئیں۔ چنانچہ مسٹر جناح کے دہلی پہنچنے تک انڈی پنڈنٹ پارٹی کے اکثر ممبر اس تجویز پر متفق ہو گئے کہ مسٹر جناح سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی پارٹی کے ممبروں کو اپنی اپنی ضمیر کے مطابق ووٹ دینے کی اجازت دے دیں۔ پارٹی کے آئین میں اس درخواست کی منظوری کے لئے کافی گنجائش موجود تھی۔ جس شام کو مسٹر جناح دہلی پہنچے اس سے اگلی صبح کو راجہ غضنفر علی خاں پارٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے انھیں ممبروں کی خواہش سے آگاہ کرنے کے لئے گئے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ راجہ صاحب حرفِ مطلب زبان پر لاتے مسٹر جناح نے ایسی بات کہی کہ راجہ صاحب کی زبان بند ہو گئی۔

رسمی باتوں کے بعد مسٹر جناح نے سنجیدہ ہو کر کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ سائمن کمیشن کے سوال پر اسمبلی میں ہمیں شکست ہو جائے گی کیونکہ کوٹ مین (یہ اس زمانے میں سرکاری پارٹی کے وہپ تھے) ممبروں کو ورغلانے کے لئے ہر قسم کی رشوتیں پیش کر رہا ہے۔ لیکن اگر واضح غیر سرکاری اکثریت کے باوجود یہ اسمبلی جو ہندوستان کے فہمیدہ طبقے کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے۔ اس موقعہ پر حکومت برطانیہ کو دندان شکن جواب نہ دے سکی تو مجھے ذاتی طور پر بہت مایوسی اور سخت صدمہ ہو گا۔ ایسا صدمہ جو میری عمر کے کئی سال کم کر دے گا۔"

یہ مسٹر جناح کی زبان سے نکلے ہوئے فقرے کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔ اب راجہ صاحب کیا بولتے؟ وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے واپس چلے آئے اور دل میں یہ فیصلہ کر کے اٹھے کہ مسلمانوں کے مفاد کا خدا حافظ ہے۔ میں اپنا ووٹ مسٹر جناح کی مرضی کے مطابق ہی دوں گا۔ وہ سیدھے نواب اسمٰعیل خاں کے پاس پہنچے اور ان کے سامنے مسٹر جناح کے فقرے دہرائے۔ وہ بھی بہت گھبرائے۔ آخر ان دونوں کے درمیان طے ہو گیا کہ ہم کوئی تقریر نہ کریں گے۔ لیکن ووٹ مسٹر جناح کے ساتھ دیں گے۔ جہاں تک مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے وہ بہر حال وضاحت کے بغیر نہ رہیگا۔ اس کی وضاحت کے لئے کافی لوگ موجود ہیں۔ مرکزی اسمبلی کے دو چار ووٹ ایک طرف زیادہ ہوئے یا دوسری طرف اس سے کیا فرق پڑے گا؟ اپنے دل کو اس طرح کی تسلیاں دے کر انھوں نے باقی ممبروں کو بھی صورت حال بتائی اور ایک تیسرے ممبر کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

باقی دو ممبروں کے متعلق یہ مصیبت پیش آئی کہ انھوں نے اپنی پارٹی کی کیفیت اور اپنے ساتھیوں کے ارادے دیکھ کر حکومت پر احسان رکھنے کے خیال سے مسٹر کوٹ مین کے ساتھ جنٹ ویز کر لی تھی۔ وہ اس معاہدہ پر قائم رہے۔ مسٹر کوٹ مین محکمہ پولیس کے افسر تھے۔ وہ مرکزی حکومت کے خفیہ اطلاعات کے دفتر کے افسر رہ چکے تھے۔ وہاں سے اٹھا کر انھیں محکمہ اطلاعات کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا تھا۔ اور اسمبلی کا سرکاری ممبر نامزد کر دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی انھیں سرکاری پارٹی کے "وہپ" کے فرائض بھی سونپ دیے گئے تھے۔ حکومت ممبروں میں "کنویسنگ" کے لئے سرکاری اثر کسی نہ کسی حد تک ہمیشہ استعمال کیا کرتی تھی۔ لیکن جب تک سر الیگزینڈر مڈی مین سرکاری پارٹی کے لیڈر رہے۔ حکومت کے کارکن اس معاملے میں احتیاط و تدبر سے کام لیتے رہے۔ ان کے جانشین کے زمانے میں جب سابق پولیس افسر کوٹ مین کو ممبروں کے ورغلانے کے فرائض سپرد کر دیے گئے تو انھوں نے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر ممبروں کو پھانسنے کے لئے بلا تکلف رشوتیں پیش کرنا شروع کر دیا۔ ان کی حرکتوں کے متعلق اسمبلی میں سوال بھی پوچھے گئے۔ یہ غنیمت تھا کہ غیر سرکاری پارٹیوں کے اندر نظم و ضبط کا معیار خاصا بلند تھا۔ پھر بھی وقتاً فوقتاً مسٹر کوٹ مین دو چار ووٹ اِدھر اُدھر کر ہی دیتے تھے۔ اور اگر کسی ممبر کو اپنی پارٹی کے حکم کے خلاف ووٹ دینے پر آمادہ نہ کر سکتے تو اسے غیر حاضر کر دینا بھی غنیمت سمجھتے تھے۔ مسٹر جناح نے راجہ غضنفر علی سے جب وہ فقرے کہے جن کے باعث راجہ اور نواب اسمٰعیل خان

اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو گئے تو انھیں اپنی پارٹی کی اندرونی کیفیت کا کچھ علم نہ تھا۔ اور شاید اسکے بعد بھی انھیں اس پس منظر کے متعلق کسی نے کچھ نہ بتایا لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ انڈی پنڈنٹ پارٹی کے تین مسلم ووٹوں نے رائے شماری کا پانسہ پلٹ دیا۔ سائمن کمیشن کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد جو لالہ لاجپت رائے نے پیش کی۔ چھ ووٹوں سے پاس ہوگئی۔ یعنی اگر تین ووٹ دوسری طرف جاتے تو قرارداد کے حق میں اور اس کے خلاف ووٹوں کی تعداد برابر ہوتی۔



THE VICEROY'S HOUSE
NEW DELHI

23.2.36.

My dear Fazl

Enclosed is a photo which I think will amuse you & which will remind you of an old friend. It was taken by Victor Sassoon after the lunch on the day you came & clearly shows you & me settling Everything for the good of India!

Yrs.

Willingdon

لارڈ ولنگڈن کا خط سر فضل حسین کے نام



سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ

۱۶- سائمن کمیشن کا ہنگامہ خیز دورہ

جب سائمن کمیشن نے ہندوستان میں دورہ شروع کیا تو اس کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے ہوئے اور تقریباً ہر جگہ مظاہرین اور پولیس کے درمیان تصادم ہوئے۔ لکھنؤ میں جن مظاہرین کو پولیس کے ڈنڈوں سے چوٹیں لگیں۔ ان میں جواہر لال نہرو اور پنڈت گووند بلبھ پنت بھی شامل تھے۔ جو آگے چل کر علی الترتیب، آزاد بھارت کے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ بنے۔ لاہور میں ایک انگریز پولیس افسر کے ڈنڈے سے لالہ لاجپت رائے کو ایسی چوٹ لگی کہ وہ اس کی وجہ سے چند دنوں بعد انتقال کر گئے۔ جس کا بدلہ لینے کے لئے دہشت پسندوں کی ایک خفیہ تنظیم کے سرگروہ بھگت سنگھ نے ایک دوسرے انگریز پولیس افسر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اور بہت دنوں تک پولیس کو حیران و سرگردان رکھا۔

یہ کمیشن ۳؍ فروری ۱۹۲۸ء کو ہندوستان پہونچا۔ دہلی پہنچ کر کمیشن کے صدر سر جان سائمن نے یہ اعلان کیا کہ ہم ہندوستان کے منتخب شدہ ممبروں کی ایک مرکزی کمیٹی کو بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کا موقعہ دیں گے۔ لیکن جو ضابطہ کار انہوں نے تجویز کیا۔ اس سے ہندوستانی لیڈر مطمئن نہ ہوئے اور بائیکاٹ کا فیصلہ قائم رہا۔ مرکزی اسمبلی نے کمیشن کے ساتھ بیٹھنے کے لئے اپنے نمائندے منتخب کرنے سے انکار کر دیا۔ کونسل آف سٹیٹ نے اپنی طرف سے تین ممبر اس مقصد کے لئے منتخب کر دیئے۔ اور حکومت نے اسمبلی کے نمائندے نامزد کر دیئے۔

سائمن کمیشن نے صوبوں کے دورے ستمبر میں شروع کئے۔ ۳۰؍ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو یہ کمیشن ریل کے ذریعے لاہور پہنچا۔ ریلوے سٹیشن پر اس کے استقبال کے لئے اعلےٰ سرکاری افسر اور کئی غیر سرکاری نمائندے موجود تھے۔ پلیٹ فارم پر اور سٹیشن کے باہر پولیس کے سخت انتظامات تھے۔ دوپہر کے قریب مظاہرین کا ایک جلوس کالی جھنڈیاں اٹھائے اور "سائمن گو بیک" کے نعرے لگاتا ہوا۔ موچی دروازے کے باغ سے چلا جن راستوں پر

اس دن جلوس نکالنے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں چھوڑ کر یہ جلوس دہلی دروازے کی طرف گیا۔ وہاں سے اس نے لنڈے بازار کا رخ کیا۔

جلوس کی قیادت کرنے والوں میں لالہ لاجپت رائے۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا عبدالقادر قصوری اور کئی ہندو کانگریسی لیڈر شامل تھے۔ لالہ لاجپت رائے نیم کانگریسی نیم مہاسبھائی قسم کے بزرگ تھے۔ اور اسی لئے ہندوؤں میں بے پناہ اثر و رسوخ رکھتے تھے وہ باضابطہ کانگریسی اور کانگریس کے احکام کے پابند نہ تھے۔ لیکن اس موقعہ پر بطور خاص انہوں نے اس جلوس کا (جو کانگریس کے زیر اہتمام نکالا گیا تھا) ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا۔ تقدیر انہیں کشاں کشاں موت کی طرف لے جا رہی تھی۔

لنڈے بازار کے اختتام کے قریب سڑک پر خاردار تاروں کا جنگلہ ریلوے اسٹیشن کی حدود سے دو سو گز کے قریب لگا ہوا تھا۔ جلوس یہاں رُک گیا۔ اور کمیشن کے خلاف نعرے لگاتا رہا۔ خاردار تار کی فصیل کے باوجود تھوڑی دیر کے بعد اس جلوس اور پولیس کے درمیان تصادم ہو گیا۔ ایک پولیس افسر مسٹر سکاٹ غصے میں بھرا ہوا مظاہرین کی جانب لپکا اور اس نے اگلی قطاروں پر تڑاتڑ ڈنڈے برسانا شروع کر دیا۔ ایک ڈنڈا رائے زادہ ہنسراج کو لگا۔ ایک سے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو زخمی ہوئے اور دو تین ضربیں لالہ لاجپت رائے پر پڑیں۔ جن میں ایک ضرب دل کے قریب تھی۔ فوری طور پر اس کا زیادہ اثر محسوس نہ ہوا۔ اسی شام ایک پبلک جلسے میں لالہ لاجپت رائے نے تقریر کی۔ لیکن دو ایک روز کے بعد اس چوٹ کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہو گئے۔ اور پھر بستر سے نہ اُٹھ سکے۔ ۱۷؍ نومبر کو "شیر پنجاب" (وہ ہندوؤں میں اسی خطاب سے مشہور تھے) لاجپت رائے کا انتقال ہو گیا۔

یہ تصادم کس طرح ہوا۔؟ اس کے متعلق حسب معمول دو بیان تھے۔ جلوس والوں کی طرف سے خود لالہ لاجپت رائے نے اسی شام کو ایک احتجاجی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جلوس نے جنگلے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ مظاہرین قطعاً پُرامن تھے اور صرف نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں سے مشتعل ہو کر سکاٹ

نے ان پر حملہ کر دیا۔ اگلی صبح کو جو سرکاری بیان شائع ہوا۔ اس میں یہ کہا گیا کہ خاردار تاروں کی جو رکاوٹ قائم کی گئی تھی۔ وہ سڑک کی پوری چوڑائی کے مطابق نہ تھی۔ تھوڑی سی جگہ خالی رہ گئی تھی۔ مظاہرین نے اس جگہ گھیرا توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔

بعد میں پنجاب کی مجلس قانون ساز میں اور مرکزی اسمبلی اور برطانوی پارلیمنٹ میں اس واقعہ کے متعلق سوالات پوچھے گئے۔ اور مزید تحقیقات کے مطالبے کئے گئے۔ لیکن حکومت نے مزید تحقیقات سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ اس کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں۔ پنجاب میں چند دہشت پسند نوجوانوں کی خفیہ پارٹی نے اس واقعہ کا بدلہ لینے کا تہیہ کیا۔ لیکن تقدیر نے ستم ظریفی سے کام لیا۔ جو حرکت سکاٹ نے کی تھی۔ اس کی پاداشش میں ایک دوسرے بے گناہ انگریز افسر سانڈرس کی جان گئی۔

لالہ لاجپت رائے کی وفات کے ایک ماہ بعد یعنی ۱۶ر دسمبر کو سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کے دفتر میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرس وردی پہنے کھڑا تھا۔ اس کی پیٹھ سڑک کی طرف تھی۔ قدوقامت کے لحاظ سے سانڈرس اور سکاٹ میں کوئی فرق نہ تھا۔ جو لوگ سکاٹ کی تاک میں تھے۔ انہوں نے سانڈرس کو سکاٹ سمجھ لیا۔ دن دہاڑے ایک گولی چلنے کی آواز آئی اور گولی سانڈرس کی پیٹھ میں داخل ہو کر دل میں جا بیٹھی۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اور قاتل مقابل کی عمارت میں جو اس وقت ڈی۔ اے۔ وی کالج کا ہوسٹل تھا۔ گھس گیا اور دوسرے دروازے سے غائب ہو گیا۔ پولیس کی ایک بھاری جمعیت فوراً ہوسٹل کے اندر گئی۔ وہاں پولیس والوں نے اپنے تمام حربوں سے کام لیا۔ طالب علموں پر سختی کی۔ ان سے پوچھ گچھ کی۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

حکومت نے چپ چاپ سکاٹ کو رخصت دے کر انگلستان روانہ کر دیا۔ اور وہ اس طرح گیا کہ اس کے جہاز پر سوار ہونے تک اس کی روانگی کے متعلق چند خاص افسروں کے سوا کسی کے کان میں بھنک تک نہ پڑی۔ ادھر سانڈرس کے قاتلوں کی گرفتاری کے

لئے بھاگ دوڑ ہوتی رہی۔ اور انعام کا اعلان کیا گیا۔ شبہ میں کئی نوجوان زیر حراست آئے اور پولیس کے تختۂ مشق بنے رہے۔ کئی مہینوں کے بعد سانڈرس کے مبینہ قاتل بھگت سنگھ اور اس کے ساتھ بی کے دت نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینک کر پورے ملک میں سنسنی پھیلادی۔ ان دونوں کے خلاف کئی جرائم کی بنا پر مقدمات چلے۔ ان میں سانڈرس کے قتل کا جرم بھی شامل تھا۔ جس کے لئے دونوں کو موت کی سزا دی گئی۔ اسمبلی میں اس بمباری کے واقعہ کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

۱۷۔ حکومتِ پنجاب کی رپورٹ اور فضل حسین کا اختلافی نوٹ

پنجاب میں سائمن کمیشن نے ایک اور صورت حال ایسی دیکھی جو کسی دوسرے صوبے میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ کمیشن نے مرکزی حکومت کے علاوہ صوبائی حکومتوں سے بھی ۱۹۱۹ء کے آئین پر عملدرآمد اور اس کے اچھے یا بُرے نتائج کے متعلق رپورٹیں مانگی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر صوبے میں مختلف غیر سرکاری جماعتوں کی جانب سے بھی کمیشن کو عرضداشتیں پیش کی گئی تھیں۔ ان رپورٹوں اور عرضداشتوں کی بنا پر کمیشن نے زبانی شہادتیں بھی قلم بند کیں۔

جب حکومت پنجاب کی سرکاری رپورٹ تیار ہوئی تو اس کے متعلق عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ چیف سیکرٹری نے گورنر سر مالکم ہیلی کے مشورے کے مطابق جو مسودہ تیار کیا تھا اس میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تحت اس صوبے کے نظم و نسق پر فرقہ وارانہ رجحانات کی وجہ سے خراب اثر پڑا۔ اس رپورٹ کو کابینہ کی اکثریت منظور کرتی تھی۔ لیکن سر فضل حسین کو اس سے بنیادی اختلاف تھا۔ گورنر کا غالباً یہ خیال تھا کہ کابینہ کی کارروائی کے عام اصول کے مطابق جو فیصلہ کثرت رائے سے ہو گا اس سے کسی ممبر کے اختلاف کو ایک ایسے راز کی حیثیت حاصل رہے گی۔ جو کابینہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ سر فضل حسین نے اس خاص رپورٹ پر روزمرہ کے اس ضابطہ کا اطلاق تسلیم نہ کیا۔ اور اصرار کیا کہ اگر یہ رپورٹ سائمن کمیشن کو بھیجی جائے تو ان کا اختلافی نوٹ بھی اس کے ساتھ شامل کیا جائے۔ گورنر اس بات کے خلاف تھا۔ لیکن شاید اس وجہ سے کہ وہ اس موقعہ پر کوئی آئینی بحران پیدا کر کے ایک نئی بحث کا دروازہ کھولنا نہ چاہتا تھا اس نے سر فضل حسین کا مطالبہ مان لیا۔ چنانچہ کابینہ کی منظور شدہ رپورٹ کے علاوہ سر فضل حسین کی رائے ایک علیحدہ نوٹ کی شکل میں سائمن کمیشن کو

بھیج دی گئی۔ سرکاری رپورٹ میں محتاط لیکن خاصے واضح الفاظ میں ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تجربے کے متعلق بعض چبھتی ہوئی باتیں کہی گئیں تھیں۔ مثلاً

۱۔ وزیروں کو اپنے فرقہ کے نمائندوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بعض مرتبہ یہ کرنا پڑا کہ فرقہ وارانہ اور سیاسی وجوہات کی بناء پر امیدواروں کو سرکاری ملازمتیں دی گئیں۔

۲۔ اس وجہ سے محکموں کی کارگزاری کے معیار میں خلل پڑا۔

۳۔ لوکل سلف گورنمنٹ کے اداروں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے نقطہ نگاہ سے کچھ ردوبدل کی گئی۔ اصولاً اس پہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا ایک ناخوشگوار نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ تجارت سے تعلق رکھنے والے اور بہتر صلاحیت رکھنے والے طبقے کی تعداد کسی حد تک کم ہو گئی۔

سر فضل حسین نے اپنے نوٹ میں ان تینوں نکات کا جواب اس سے بھی زیادہ چبھتے ہوئے الفاظ میں دیا۔

سر فضل حسین نے اپنے نوٹ میں کہا :-

۱۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ ملازموں کی بھرتی فرقہ وارانہ بنیاد پر وزیروں کے زمانے میں شروع کی گئی۔ فرقہ وارانہ تناسب کے اصول کو کسی نہ کسی صورت میں اس سے پہلے ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ تمام فرقوں کو مطمئن رکھنے کے لئے یہ اصول درست خیال کیا جاتا تھا۔ آپ نے اعداد و شمار دے کر بتایا کہ پی۔ سی۔ ایس (صوبائی سول سروس) میں جس کی بھرتی خود گورنر کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کا تناسب ہمیشہ اچھا رہا۔ اور آج بھی ان محکموں کی نسبت بہتر ہے جو میرے چارج میں رہے ہے۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے مسلمان تعلیمی لحاظ سے آج کی نسبت بہت پسماندہ تھے۔ اگر اس وقت سے پی۔ سی۔ ایس میں مسلمانوں کا تناسب اچھا رہا ہے۔ تو یہ فرقہ وارانہ اصول کو ملحوظ رکھے بغیر کیسے ہو سکتا تھا؟

جہاں تک سیاسی وجوہات پر امیدواروں کو ملازمت دینے کا سوال ہے یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ پرانے حاکم نوکریاں دیتے وقت نہ صرف امیدوار کے سیاسی

کردار کا لحاظ کرتے تھے۔ بلکہ اس کے باپ اور دادا کے سیاسی کردار کو بھی ملحوظ رکھا کرتے تھے۔ اب صرف یہ فرق پڑا ہے کہ سیاست کا معیار بدل گیا ہے۔

۲۔ جہاں تک ان محکموں کا تعلق ہے۔ جو میری تحویل میں رہے یہ بات درست نہیں ہے کہ ملازمتوں کی بھرتی کے نئے قواعد سے ان کی کارگذاری کے معیار میں کوئی خلل پیدا ہوا ہے۔ بحقیقت یہ ہے کہ تعلیم اور حفظان صحت کے انتظامات کی ترقی کی اوسط رفتار ۱۹۲۰ء کے بعد پہلے کے مقابلے میں بہت نمایاں طور پر بڑھ گئی۔ اعداد و شمار اس کا کافی ثبوت مہیا کرتے ہیں۔

۳۔ میونسپل کمیٹیوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا نیا تناسب ایک منصفانہ اصول کی بنا پر مقرر کیا گیا۔ لیکن جہاں اس اصول کی وجہ سے ردوبدل کرنی پڑی وہاں ممبروں کی مجموعی تعداد بڑھا کر اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کہ ہندو ممبروں کی مجموعی تعداد کم نہ کی جائے بلکہ مسلمانوں کی تعداد بڑھا کر بے انصافی کا ازالہ کر دیا جائے۔ لہذا یہ بات درست نہیں کہ اب لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں میں پبلک کی خدمت گزاری کے لئے تجارت پیشہ یا زیادہ صلاحیت رکھنے والے افراد کی تعداد کم ہو گئی ہے۔

سر فضل حسین نے اپنے نوٹ میں مزید لکھا کہ اصلاحات کے زمانے میں فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت اپنے ہاتھ سے کچھ اختیارات چھوڑ رہی ہے۔ اور آئندہ چھوڑنے والی ہے۔ لہذا ان اختیارات میں حصہ بٹانے کیلئے مختلف طبقے اور فرقے ایک دوسرے کے مقابلے میں دوڑ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اخبارات میں جھوٹ سچ خبریں چھپتی ہیں اور مبالغہ آمیزی کے ساتھ بحثیں ہوتی ہیں۔ یہ بات لوگوں کے سیاسی شعور اور آگے بڑھنے کے شوق پر دلالت کرتی ہے ان کی نااہلی کا ثبوت نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات بے شک بے حد افسوسناک ہیں۔ اور امید ہے کہ سیاسی لیڈر ان کے تدارک کی تدبیریں سوچ لیں گے۔ لیکن ان پر زور دے کہ انہیں مزید اصلاحات کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ جتنے قتل یا جرائم ملک کے اندر دوسری وجوہات سے ہوتے ہیں ان کے مقابلے

میں فرقہ وارانہ جذبات کے تحت جرائم آٹے میں نمک کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

اس نوٹ کے علاوہ سر فضل حسین نے ذاتی طور پر کمیشن کے سامنے پیش ہو کر شہادت بھی دی۔ لیکن یہ شہادت بند کمرے میں ہوئی۔

سیاسی جماعتوں کی جانب سے جو عرضداشتیں پیش ہوئیں۔ ان میں ایک مسلم لیگ کی جانب سے تھی۔ اس کے متعلق شہادت دینے کے لئے جو وفد پیش ہوا۔ اس کی قیادت اور ترجمانی سر محمد شفیع نے کی۔ ہندوؤں کی طرف سے ایک وفد پنڈت نانک چند بیرسٹر کے زیر قیادت پیش ہوا۔ اس کا نقطہ نگاہ بہت دلچسپ تھا۔ پنڈت نانک چند نے کہا کہ یونینسٹ پارٹی کے نام سے جو سیاسی پارٹی پنجاب کونسل میں کام کرتی ہے۔ وہ محض فریب ہے اس سے یہ دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ پنجاب نے اقتصادی بنیادوں پر ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی کی مثال پیش کی ہے۔ یہ ایک مسلم فرقہ وارانہ پارٹی ہے۔ جس نے دنیا کو دھوکا دینے کے لئے غیر فرقہ وارانہ بھیس اختیار کر لیا ہے۔ یہ پارٹی ہر معاملے کو صرف مسلم مفاد کے نقطہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مزید اصلاحات کے سوال پر پنڈت جی نے فرمایا کہ اگر ہر قسم کی فرقہ وارانہ نیابت کو قطعی طور پر آئین سے حذف کر دیا جائے تو ہم درجہ نو آبادیات کے حامی ہیں۔ لیکن اگر فرقہ وارانہ نیابت کو قائم رکھا جائے تو ہم مزید اصلاحات کے مخالف ہیں۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ اصلاحات کو بھی واپس لے لیا جائے اور صوبے پر انگریز گورنر کا مکمل راج قائم کر دیا جائے۔

اس زمانے کی یونینسٹ پارٹی کس حد تک مسلمانوں کے مطالبات کی ترجمان تھی۔ اس کا سب سے دلچسپ ثبوت اس کمیٹی کی رپورٹ کی صورت میں سامنے آیا جو پنجاب کی مجلس قانون ساز نے سائمن کمیشن کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے کے لئے منتخب کی تھی۔ سر فضل حسین نے جو ابھی پنجاب ہی میں ایگزیکٹو کونسلر تھے۔ فیصلہ کیا کہ اس کمیٹی کا انتخاب فرقہ وارانہ خطوط پر نہ کیا جائے۔ کل سات ممبروں کو منتخب کرنا تھا۔ یونینسٹ پارٹی اپنی تعداد کے مطابق چار نشستوں پر قابض ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ چار سے زیادہ امیدوار میدان میں آ کر اپنی پارٹی کے ووٹوں کی تقسیم کے حساب کو غلط نہ کر دیں۔ سر فضل حسین

نے آخری وقت پانچویں امیدوار ملک فیروز خاں نون کو میدان سے ہٹا لیا۔ چار یونینسٹ ممبر جو منتخب ہوئے۔ سردار سکندر حیات۔ چوہدری ظفراللہ۔ چوہدری چھوٹو رام اور مسٹر اوون رابرٹس تھے۔ کمیٹی کی رپورٹ ان چاروں کے دستخطوں سے مرتب ہوئی۔ ہندو پارٹی کے دو ممبروں (راجہ نریندر ناتھ اور ڈاکٹر گوکل چند نارنگ) نے اور ایک سکھ ممبر (سردار اجل سنگھ) نے اپنے اپنے اختلافی نوٹ لکھے۔

اکثریت کی رپورٹ میں جو سفارشات کی گئی تھیں۔ وہ قابل توجہ ہیں۔

۱۔ صوبائی حکومت کے تمام اختیارات وزیروں کو منتقل کیئے جائیں۔ گورنر کی حیثیت محض آئینی سربراہ کی ہو۔

۲۔ مرکز فیڈرل طرز کا ہو اور اس کا دائرہ عمل محدود ہو۔ اختیارات مابقی صوبوں کو حاصل ہوں۔ مرکز کے سپرد صرف وہ محکمے ہوں جو پورے ملک کی حفاظت اور استحکام سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ جداگانہ انتخابات کا طریقہ قائم رکھا جائے۔

۴۔ مسلمانوں کو مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔

۵۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو پوری اصلاحات دی جائیں۔

۶۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

۷۔ صوبائی مجالس قانون ساز میں ہر جگہ اقلیتوں کو زائد نمائندگی دی جائے۔ بشرطیکہ کوئی اکثریت اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ ہونے پائے۔

بہ الفاظ دیگر کمیٹی کی یونینسٹ اکثریت کی رپورٹ مسٹر جناح کے چودہ نکات کا خلاصہ تھی۔ اختلافی نوٹ لکھنے والوں نے شور مچایا۔ کہ اس کمیٹی کا دائرہ عمل صوبائی ہے۔ یہ سندھ صوبۂ سرحد بلوچستان اور مرکز کے متعلق سفارشات کیسے کر سکتی ہے۔ اکثریت کی رپورٹ لکھنے والوں نے یہ موقف اختیار کیئے رکھا کہ پورے ملک کا مسئلہ ایک واحد مسئلہ ہے اور اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لہذا ہمارا ان سب معاملات کے متعلق رائے دینا جائز ہے۔ کوئی خالص مسلم پارٹی بھی اس سے زیادہ اور کیا کرتی؟

سرفضل حسین پر یہ اعتراض ہوئے کہ انہوں نے مسلمان ممبروں کے بجائے یونینسٹ پارٹی کو آگے کر کے پوری کمیٹی میں مسلم نمائندگی کم کرادی (کمیٹی کے سات ممبروں میں مسلمان صرف دو تھے۔) لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تھا۔ کیا مسلمانوں کے موقف کی ترجمانی کا زیادہ موثر طریقہ یہ ہوتا کہ مسلمان ممبرتین ہوتے اور باقی چار غیر مسلم ممبروں کی اکثریت کے ساتھ بیٹھ کر اپنے اختلافی نوٹ میں یہی باتیں کہتے؟

۱۸۔ بھگت سنگھ کا بم اور علم الدین کا خنجر

مرکزی اسمبلی میں بم پھینکنے کا واقعہ ۸ راپریل ۱۹۲۹ء کو ہوا۔ اس واقعہ کے متعلق راجہ غضنفر علی خاں کی عینی شہادت بہت دلچسپ ہے۔ اس واقعہ سے چند دن پہلے حکومت کا پیش کردہ پبلک سیفٹی بل اسمبلی میں زیر بحث آیا تھا۔ حکومت کو اس زمانے میں یہ خاص خطرہ شدت کے ساتھ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ کمیونسٹ تخریب پسندوں کی ایک خفیہ تنظیم ہندوستان کے صنعتی مراکز میں مزدوروں کے اندر بے چینی پیدا کر کے ملک کے امن کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ حکومت کا خیال تھا۔ کہ اس مہم کے لئے روپیہ کی امداد باہر سے آ رہی ہے۔ پبلک سیفٹی بل کا مقصد اسی خاص خطرے کی روک تھام کرنا تھا۔

ایک طرف یہ بل اسمبلی کے سامنے پیش تھا۔ دوسری طرف ۲۰ رمارچ کو پولیس نے بہ یک وقت کلکتہ، مدراس، بمبئی اور بعض دوسرے شہروں میں چھاپے مار کر مزدور لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ یہ گرفتاریاں میرٹھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے جاری کردہ وارنٹوں کی بنا پر کی گئی تھیں۔ گرفتار ہونے والوں میں اکتیس افراد کے خلاف میرٹھ میں سازش کا مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ اور سرکاری وکیل نے ان کے خلاف الزامات کی نوعیت عدالت کے سامنے بیان کی۔ ۲ راپریل کو پبلک سیفٹی بل پر پھر بحث شروع ہونے والی تھی لیکن صدر پٹیل نے اس بحث کو روک دیا اور کہا کہ اگر بل پر بحث ہوئی تو اس سے میرٹھ والا زیر سماعت مقدمہ لازماً متاثر ہو گا۔ کیونکہ وہی نکات جو بل کے سلسلے میں زیر بحث ہیں میرٹھ کی عدالت میں مقدمے کا موضوع ہیں۔ قواعد کی رو سے اسمبلی کسی ایسے مسئلے پر بحث کرنے کی مجاز نہیں جو کسی عدالتی مقدمے میں زیر سماعت اور تصفیہ طلب ہو۔ لہذا میرٹھ کے مقدمے کے فیصلے تک بحث ملتوی رکھی جائے۔ یا میرٹھ کے ملزمان

کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا جائے۔

صدر پٹیل نے کہا کہ میں آخری رولنگ حکومت کا موقف معلوم کرنے کے بعد دوں گا۔ فی الحال عارضی طور پہ اس بل پہ بحث ملتوی کر کے ایجنڈے کی باقی کارروائی جاری رکھی جائے۔ صدر کے اس نقطۂ نگاہ سے حکومت کے نمائندے بہت پریشان ہوئے۔ ہوم ممبر نے ۴؍اپریل کو اپنا جواب پیش کرتے ہوئے کہا کہ حکومت صدر کے نقطۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتی۔ حکومت کی رائے ہے کہ صدر کو اس بل کا راستہ روکنے کا اختیار نہیں۔ صدر پٹیل نے اس پہ غور کر کے اگلے پیر یعنی ۸؍اپریل کو اپنا سوچا سمجھا رولنگ دینے کا وعدہ کیا۔

ان حالات میں ۸؍اپریل کو اسمبلی کا اجلاس ڈرامائی فضا میں شروع ہوا۔ تماشائیوں کی گیلریاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ سائمن کمیشن کے صدر سر جان سائمن بھی اس دن اسمبلی کی کارروائی سننے کی غرض سے صدر کے مہمانوں کے لئے مخصوص گیلری میں تشریف رکھتے تھے۔ پہلے ایک اور بل پہ باقی ماندہ بحث ختم کی گئی۔ پھر صدر وہ رولنگ دینے کے لئے اُٹھے جس کا تمام ملک دلچسپی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایوان کے فرش پہ سرکاری بنچوں کے قریب خالی جگہ پہ ایک بم گرا اور بہت زور کے دھماکے کے ساتھ پھٹا۔ پھر اس کے قریب ایک اور بم گر کر پھٹا۔ اس کے بعد پستول کے دو فائر ہوئے اور گولیاں دونوں مرتبہ اسمبلی کے ایک ستون پر لگیں۔ ایوان کے جس دروازے سے راجہ غضنفر علی خاں نکل کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے، وہاں چند لمحے سخت دھکا پیل رہی۔ راجہ صاحب کے کانوں میں صدر کی آواز آئی "اجلاس میں گڑبڑ کی وجہ سے اجلاس کو آدھ گھنٹے کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے"۔ راجہ نے ایک لمحہ کے لئے اپنے پیچھے نگاہ ڈالی۔ اجلاس صدر کے اعلان سے پہلے ہی اپنے آپ کو برخاست کر چکا تھا اور صدر خالی بنچوں سے خطاب کر رہے تھے۔

پولیس نے ایوان کے تمام راستے روک لئے۔ تماشائیوں کی گیلری کے اندر سادہ لباس میں پولیس کے آدمی موجود تھے۔ انہوں نے بھگت سنگھ اور دت کو دبوچ

لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے مزاحمت کے بغیر ہی اپنے آپ کو پولیس والوں کے حوالے کر دیا تھا۔ جب ذرا سکون ہوا۔ تو راجہ صاحب اور چند دوسرے ممبر پھر ایوان میں گئے۔ وہاں فرش پر خون کے دھبے نظر آئے۔ دو بنچ ٹوٹ گئے تھے اور فرش پر بموں کے اجزا بکھرے پڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ ایک پارسی ممبر سر بومن جی دلال زخمی ہو گئے تھے۔ پولیس اور اسمبلی کے عملے کے آدمی انہیں اٹھا کر باہر لے گئے ہے۔ اس وقت ان کے زخموں سے خون بہ رہا تھا۔ ہسپتال میں ان کی فوری مرہم پٹی کی گئی۔ ڈاکٹروں نے فوری معائنے کے بعد اعلان کر دیا کہ زخم خطرناک نہیں۔ چند دوسرے ممبروں کو معمولی خراشیں آئیں۔ لیکن یہ زیادہ تر ایوان میں دھکا پیلی کا نتیجہ تھیں۔ جو اشتہار ایوان میں بکھرے پڑے تھے۔ ان میں "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن فوج کے سپہ سالار" بلراج کی جانب سے برطانوی حکومت کو ہندوستان سے نکل جانے کا حکم درج تھا۔

جب راجہ صاحب اور ان کے ساتھی ایوان کی پراگندہ حالت دیکھ رہے تھے۔ تو یکایک انہیں ساتھ کی ایک گیلری سے جہاں کتابوں کی الماریاں کھڑی تھیں۔ کچھ شور سنائی دیا۔ یہ ادھر لپکے وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک بنگالی ممبر مسٹر کبیرالدین احمد ایک الماری کے پیچھے گھسے ہوئے ہیں اور وہاں سے نکل نہیں سکتے۔ کبیرالدین صاحب رنگت کے لحاظ سے اسمبلی کے سب سے کالے اور جسم کے لحاظ سے اسمبلی کے سب سے موٹے ممبر تھے۔ لیکن بہت ہنس مکھ اور فقرہ باز بزرگ تھے۔ وہ خود تقریریں بہت کم کرتے تھے لیکن دوسروں کی تقریروں میں آوازے کسنے اور فقرے چست کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ اب دوسرے ممبروں نے ان پر فقرے چست کئے۔ "احمد صاحب جس راستے سے آپ یہاں داخل ہوئے تھے۔ اسی راستے سے نکل آیئے۔" لیکن فی الواقعہ الماری اور دیوار کے درمیان اتنی کم جگہ تھی کہ ایک دبلا پتلا انسان بھی اس میں بہت مشکل سے گھس سکتا تھا۔ کبیرالدین صاحب کہنے لگے میں خود بھی نہیں سمجھ سکتا کہ یہاں کیسے گھس گیا۔ پھر کئی لوگوں نے مل کر زور لگایا اور الماری کو کھسکایا تو کبیرالدین صاحب وہاں سے نکلے۔

اسمبلی کا اجلاس اس دن نہ ہو سکا۔ صدر پٹیل نے بالآخر اپنی رولنگ ۱۱ اپریل کو پڑھ کر سنائی۔ اس کا متن بہت طویل تھا۔ لیکن حاصل کلام یہ تھا کہ جب تک میرٹھ کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔ اسمبلی میں پبلک سیفٹی بل پر بحث نہیں ہو سکتی۔ حکومت کے پاس اس قسم کی رکاوٹوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے کئی ہتھیار تھے۔ اس سے اگلے دن وائسرائے نے پبلک سیفٹی بل کو آرڈی ننس کے ذریعے نافذ کر دیا۔ اسی دن وائسرائے نے مرکزی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوانوں (اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ) کے ایک مشترکہ اجلاس سے خطاب بھی کیا۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ اس خطرناک اور افسوسناک حادثے کے بعد جس میں خود بعض ممبر زخمی ہوئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تخریب پسندوں کی سرگرمیوں پر قابو پانے کے لئے اس قسم کے قانون کی ضرورت نہیں ہے؟

بھگت سنگھ اور دت کو پولیس فی الفور دو مختلف تھانوں میں لے گئی۔ چند دن کے لئے ریمانڈ لے کر انہیں پوچھ گچھ کے لئے اپنی حراست میں رکھا۔ اس کے بعد اسمبلی کے واقعہ کے سلسلے میں ان پر اقدام قتل اور بم اور بغیر لائسنس ریوالور قبضے میں رکھنے کے الزامات لگا کر عدالت میں پیش کر دیا۔ دہلی کے سیشن جج کی عدالت میں ان کے مقدمے کی سماعت ہوئی۔ ملزموں نے ایک طویل بیان دیا۔ جس میں انہوں نے بم مارنے اور ریوالور سے فائر کرنے کے فعل کا اقبال کیا۔ لیکن اس بات سے انکار کیا کہ وہ کسی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ملزموں نے کہا اگر ہم قتل کرنا چاہتے تو پورے سرکاری بلاک کو اور سر جان سائمن کو ہلاک کر سکتے تھے۔ ہم نے احتیاط کے ساتھ بم اس طرح پھینکے اور گولیاں اسطرح چلائیں کہ کسی کی جان کا نقصان نہ ہو۔ ہم نے ایسا صرف اس لئے کیا کہ سامراجی حکومت کے "بہرے کان" اس ملک کی آواز سن لیں اور سمجھ لیں کہ اس ملک میں وہی مواد موجود ہے جس نے فرانس میں انقلاب برپا کیا تھا۔ اور جس کی مدد سے واشنگٹن لینن۔ گیری بالڈی اور کمال اتاترک نے اپنی اپنی قوم کو سامراجیوں اور غریبوں کا خون چوسنے والوں سے آزادی دلائی تھی۔ ہم نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا ہے۔ کیونکہ ہم سامراجیوں کو یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔ کہ وہ افراد کو تباہ و برباد

کر سکتے رہیں۔ لیکن جن خیالات کے ہم ترجمان ہیں۔ انہیں روکنا اور دبانا ممکن نہیں ہے۔

عدالت نے دونوں ملزموں کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزائیں دیں۔ یہ سزائیں صرف اسمبلی کے واقعہ کی بنا پر تھیں۔ اس کے بعد جلد ہی ان دونوں ملزموں کے خلاف ایک اور مقدمہ سانڈرس کے قتل کا قائم ہوگیا۔ جس میں بھگت سنگھ کو سزائے موت دی گئی۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ جس دن بھگت سنگھ اور دت نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکے اور گولیاں چلائیں۔ اس سے اگلے دن ۹ر اپریل ۱۹۲۹ء کو لاہور میں ایک دوسری قسم کا ہنگامہ ہوگیا۔ یعنی ایک مسلمان نے ایک آریہ سماجی ناشر کتب راجپال کو قتل کر دیا جس نے "رنگیلا رسول" کے نام سے ایک سوقیانہ اور مسلمانوں کے لئے عددرجہ دل آزار کتاب چھاپی تھی۔ یہ کتاب کئی سال سے مسلمانوں کے لئے رنج وشکایت کا باعث بنی ہوئی تھی۔

راجپال ایک کتب فروش تھا۔ جس کی دوکان پر بالعموم آریہ سماج کی مذہبی کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔ کسی آریہ سماجی مہاشے نے اس کے لئے ایک کتاب لکھدی جس میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر اور مذہب اسلام پر نہایت سوقیانہ حملے درج تھے۔ جب راجپال نے یہ کتاب "رنگیلا رسول" کے نام سے چھاپی تو اس پر مصنف کا نام درج نہ تھا۔ ناشر نے اس پر صرف اپنا نام دے کر قانون کا تقاضا پورا کر دیا تھا۔ بہت دنوں تک یہ کتاب مسلمانوں کے نوٹس ہی میں نہ آئی۔ تعجب ہے کہ یہ صوبائی حکومت کی پریس برانچ کی نگاہ سے بھی بچی رہی۔ کافی عرصے کے بعد جب اس کتاب پر بالآخر مسلمانوں کی نظر پڑی اور اس کے خلاف احتجاج شروع ہوئے تو حکومت نے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ اے کے تحت دونوں فرقوں کے درمیان منافرت پھیلانے کے الزام میں راجپال کے خلاف کارروائی شروع کی۔ لاہور کے ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمے کی خاصی طویل سماعت کے بعد ملزم کو سزا ہوگئی۔ سیشن

کورٹ میں اپیل ہوئی وہاں بھی ملزم کو مجرم قرار دیا گیا۔ گو اس کی سزا میں کچھ تخفیف کر دی گئی۔

تقریباً تین سال کی اس عدالتی کارروائی کے بعد ۱۹۲۷ء میں ملزم کی جانب سے نگرانی کی درخواست ہائی کورٹ میں پیش ہوئی جس کی سماعت کنور دلیپ سنگھ جج نے کی۔ کنور دلیپ سنگھ نے یہ فیصلہ سنا کر کہ یہ کتاب دفعہ ۱۵۳ الف یا قانون کی کسی اور دفعہ کی زد میں نہیں آتی مسلمانوں کو حیران کر دیا۔ کیا قانون واقعی اتنا ناقص تھا اور اس قسم کی دل آزار کارروائیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکتا تھا؟ لاہور کے سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد سر محمد شفیع کی قیادت میں گورنر سے ملا۔ اور اسے اس صورت حال کی جانب توجہ دلائی۔ گورنر نے وعدہ کیا کہ وہ اس بات کی مزید چھان بین کرائیں گے۔ اور اگر یہ معلوم ہوا کہ قانون میں فی الواقعہ سقم ہے تو اسے دور کرانے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ لاہور کے ہندو لیڈروں نے گورنر کے اس رویہ کے خلاف ایک احتجاجی تار وائسرائے کو بھیجا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کے ایک وفد نے گورنر کے سامنے ہائی کورٹ کے ایک فیصلے پر نکتہ چینی کی اور گورنر نے اس وفد کے نقطہ نگاہ کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔

جج دلیپ سنگھ کے فیصلے کے فوراً بعد لاہور کے ایک ممتاز مسلمان وکیل نے اس پر ایک سخت تنقیدی مقالہ لکھا۔ جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ جج نے قانون کی غلط تشریح کی ہے۔ یہ مقالہ لاہور کے روزنامہ "مسلم آؤٹ لک" میں اداریہ کی حیثیت سے چھپا۔ جس پر اس اخبار کے مالک مولوی نورالحق کے خلاف جن کا نام اخبار پر بطور پرنٹر پبلشر چھپتا تھا اور ان کے ایک عزیز دلاور شاہ بخاری پر جو اخبار کے "ڈمی" ایڈیٹر تھے عدالت عالیہ کی توہین کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ ان دونوں کو بالآخر اس الزام میں قید کی سزا ہو گئی۔ لیکن جج کے فیصلے سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر احتجاج دوسرے مسلم اخباروں میں اور پبلک جلسوں کے ذریعے بھی ہو رہا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار "ہمدرد" دہلی میں لکھا کہ حکومت نے آرڈی نینس کے ذریعے قانون بنانے

کا جو اختیار اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ اس کا ناجائز استعمال تو اکثر ہوتا رہتا ہے حکومت کو چاہیئے کہ کم از کم ایک مرتبہ اس کا جائز استعمال بھی کر دکھائے اور حالات میں مزید خرابی پیدا ہونے سے پہلے فوری طور پر قانونی سقم کو دور کر دے۔ اس سلسلے میں جون کے آخر میں لاہور اور دہلی کے مسلمانوں نے احتجاجی ہڑتال بھی کی۔ لیکن قانونی سقم کا مسئلہ دوسرے طریقے سے حل ہو گیا۔ اسی زمانے میں رسالہ "ورتمان" کے خلاف بھی اسی قسم کے الزامات کی بنا پر دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ چل رہا تھا۔ حکومت کی درخواست پر ہائی کورٹ نے اس مقدمے کو مجسٹریٹ کی عدالت سے منتقل کر کے اپنی فائل پر لینا منظور کر لیا۔ اس مرتبہ مقدمہ کی سماعت ایک واحد جج کے بجائے ڈویژن بنچ کے سپرد کر دی گئی۔ تاکہ قانون کی زیادہ مستند تشریح ہو جائے۔ ڈویژن بنچ کے صدر جسٹس براڈوے تھے۔ اس بنچ نے جسٹس دلیپ سنگھ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قرار دیا کہ دفعہ ۱۵۳ الف اس قسم کی تحریروں پر یقیناً حاوی ہے۔ اس مقدمے کے ملزم کو سزا مل گئی لیکن راجپال بری ہو چکا تھا۔ وہ قانون کی اس متلون مزاجی پر ہنستا رہا۔

لاہور کا ایک نوجوان علم الدین اس بات کو برداشت نہ کر سکا کہ ایک شخص اتنا بڑا جرم اس جسارت اور دیدہ دلیری کے ساتھ کرے اور قانون کی گرفت سے صاف بچ جائے۔ اس نے خود اپنی جان پر کھیل کر راجپال کو سزا دینے کا تہیہ کیا اور ۹ اپریل ۱۹۲۹ء کو دن کے وقت اس کی دوکان پر جا کر وہیں دوکان کے اندر اسے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ اور خود گرفتار ہو گیا۔ "رنگیلا رسول" کے مقدمات کی اتنی شہرت ہو چکی تھی اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے جذبات اتنے شدید ہو چکے تھے کہ جب علم الدین کو سزائے موت کے بعد جیل میں پھانسی دی گئی اور اس کے جسد خاکی کو اس کے وارثوں کے سپرد کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا تو لاہور کے مسلم عوام نے اصرار کیا کہ اس کے جنازے کو کندھا دینے اور اس کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے کی عام اجازت پر کوئی پابندی برداشت نہ کی جائے گی۔ حکومت خائف تھی کہ اگر مسلمانوں کا اس موقعہ پر کوئی بڑا اجتماع ہوا تو شہر میں فساد کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ علم الدین کی لاش اس کے

ورثا کے حوالے کرنے کے لئے صرف اس شرط پر تیار تھی۔ کہ اس کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں چند لوگوں سے زیادہ جمع نہ ہوں۔

مسلم عوام کا مطالبہ پیش کرنے اور ان کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے ایک وفد سر محمد شفیع کی قیادت میں پھر گورنر سے ملا۔ طویل گفتگو کے بعد آخر سر محمد شفیع نے کہا کہ میں اس بات کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں کہ مسلمان جنازے کی مذہبی رسوم میں شرکت کے بعد پر امن طور پر منتشر ہو جائیں گے۔ اور قبرستان سے شہر کی جانب واپس جاتے ہوئے اپنے آپ کو جلوس کی شکل نہ دیں گے۔ آپ نے خاصے واضح الفاظ میں یہ بھی کہا کہ اگر آج آپ میری بات نہیں مانتے تو کل میں کسی معاملے میں مسلمانوں کو حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے نہ کہہ سکوں گا۔ آخر گورنر مان گیا۔ پھر یہ شرائط طے ہوئیں کہ حکام فلاں مقام پر لاش مسلمانوں کے حوالے کریں گے۔ اور وہاں سے قبر تک مسلم عوام کو جنازے کے ساتھ جانے کی اجازت ہوگی۔

لاہور کے اور بیرون لاہور سے آنے والے مسلمانوں کا جتنا ہجوم "شہید علم الدین" کے جنازے کو کندھا دینے اور نماز جنازہ میں شرکت کرنے کی غرض سے جمع ہوا۔ اس کی مثال اس سے پہلے شاید کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس دن پورا شہر ہڑتال کا منظر پیش کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے اور اکثر ہندوؤں اور سکھوں نے فساد کے اندیشے سے اپنی دوکانیں بند کر دی تھیں۔ لیکن فساد نہ ہوا۔ اور یہ دن امن و امان سے گزر گیا۔

"رنگیلا رسول" کتاب کا اصل مصنف کون تھا؟ اس کے متعلق قیاس آرائیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ اس سلسلے میں دو نام لئے جاتے رہے جن میں ایک ڈی اے۔ وی کالج کے پروفیسر چمپاپتی کا تھا۔ اور دوسرا "پرتاپ" اخبار کے مالک و مدیر مہاشہ کرشن کا جن کے راجپال کے ساتھ کاروباری تعلقات بھی تھے اور دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ لیکن غالب قیاس پروفیسر چمپاپتی ہی کے متعلق تھا۔

سائمن کمیشن نے اپنے دورۂ ہندوستان میں کئی قسم کے ہنگامے دیکھے۔ انہوں

نے رپورٹوں اور شہادتوں کا ایک پلندہ بھی جمع کر لیا۔ کالی جھنڈیوں کا سامنا بھی کیا۔ کہیں کہیں پر تکلف دعوتیں بھی اڑائیں۔ بمبئی میں ایک ہولناک ہندو مسلم فساد بھی اسی زمانے میں (فروری ۱۹۲۹ء میں) ہوا۔ وہاں کسی نے یہ افواہ پھیلا دی کہ پٹھانوں کا ایک گروہ بچوں کو اغوا کر رہا ہے۔ کئی سیٹھوں نے اپنی دوکانوں، دفتروں اور کارخانوں میں پٹھان چوکیدار مقرر کر رکھے تھے۔ ان پر اکا دکا حملے شروع ہو گئے۔ پھر پٹھانوں نے جتھہ بنا کر ہندوؤں پر حملے کئے اور ایک درجن سے زیادہ قتل کر دیئے۔ پھر عام ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔ فوج بلائی گئی اور کئی دن کے بعد امن قائم ہوا۔ سر جان سائمن نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسمبلی پر بم گرتے دیکھے۔ پھر لاہور میں راجپال قتل ہو گیا۔ ان واقعات کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن یہ سب ہندوستان کی زندگی کے مختلف گوشوں کے آئینہ دار تھے۔ راجپال کے قتل سے چار دن بعد یعنی ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو سائمن کمیشن ہندوستان میں اپنا کام ختم کر کے عازم انگلستان ہو گیا۔ اور لندن پہنچ کر اپنی رپورٹ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اسی سال جون میں برطانوی پارلیمنٹ کے عام انتخابات کے ذریعے وہاں حکومت بدل گئی۔ اور لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی سیاسی زندگی نے بھی ایک نیا پلٹا کھایا۔ برطانوی وزیر اعظم نے ہندوستانی لیڈروں کو گول میز کانفرنس کی دعوت دی اور مہاتما گاندھی یہ محسوس کرنے لگے کہ اب ہندوستان میں سیاسی ایجی ٹیشن کو تیز کرنا کانگرس کے مقاصد کے لئے مفید ثابت ہو گا۔

۱۹- انقلاب پسندوں کی پہلی کھیپ پکڑی گئی

مرکزی اسمبلی میں بم کے واقعہ کے بعد بھگت سنگھ اور دت کی گرفتاری پنجاب کی پولیس کے لئے بہت بڑی کامیابی کا ذریعہ بن گئی۔ چند دنوں کے اندر پولیس نے لاہور میں انقلابی پارٹی کے ایک اڈے پر چھاپہ مار کر بم سازی کا سامان بھی پکڑ لیا۔ اور تین نوجوانوں کو گرفتار بھی کر لیا۔ اس کے بعد مقدمے کی کارروائی میں اس اڈے کو "بم ساز فیکٹری" کا نام دیا جاتا رہا۔ پھر اس سے پیشتر کہ پارٹی کے تمام ممبروں کو خطرے کا اشارہ ملے پولیس نے کئی جگہ چھاپے مار کر بیس سے زیادہ آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ تاہم پارٹی کے کچھ اور ممبر روپوش ہو گئے اور انہوں نے جرائم کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔

دراصل اس پارٹی کی تنظیم ایسی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ کی گئی تھی کہ کسی ایک ممبر کو پوری تنظیم کا علم ہی نہ تھا۔ ہر ایک ممبر صرف دو چار ساتھیوں کو جانتا تھا۔ یا اس قاصد کو پہچانتا تھا، جس کے ذریعے اسے پارٹی کے احکام ملتے تھے۔ اس پیچ در پیچ تنظیم کی وجہ سے پولیس ایک دم نہ پوری پارٹی پہ ہاتھ ڈال سکی۔ نہ باقی ماندہ ممبروں کے جرائم کا لمبے عرصے تک سدباب کر سکی۔

جب بھگت سنگھ اور دت گرفتار ہوئے اور اخباروں میں یہ خبر چھپی (یا چھپوائی گئی) کہ انہوں نے حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں۔ تو ان لوگوں میں جو شبہ کی بنا پر پولیس کے زیر نگرانی تھے۔ بعض نوجوان گھبرا گئے۔ ان کے والدین نے بھی انہیں سمجھایا کہ تم اپنی جان بچاؤ۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ان کی جانب سے وعدہ معاف۔ گواہ بننے کی پیش کش ہونے لگی۔ بالآخر پولیس نے سات آدمیوں کو سلطانی گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش کیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "بم ساز فیکٹری" کے متعلق کچھ سراغ پولیس کو ان وعدہ معاف

گواہوں نے دیا۔ یا جیسا کہ ظاہر کیا گیا۔ پولیس اس سے پہلے ہی بطور خود وہاں تک
پہنچ گئی۔ پولیس کے بیان کے مطابق کسی شخص نے لاہور میں ایک دوکاندار کو جو لوہا
ڈھالنے کا کام کرتا تھا۔ مخروطی شکل کے خول بنانے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ دوکاندار
کو بتایا گیا تھا کہ یہ خول گیس کے متعلق کسی مشین میں پرزوں کا کام دیں گے۔ دوکاندار
نے اس بات کا ذکر اپنے کسی دوست سے کیا جو پولیس کا کنسٹیبل تھا۔ اس نے
اپنے افسروں سے ذکر کیا۔ پولیس چوکنی ہو گئی۔ لوہے کے جو خول بنائے جا رہے
تھے۔ ان کا بہت رازداری کے ساتھ معائنہ کیا گیا۔ وہ بم بنانے کے کام بھی آ
سکتے تھے۔ اس کے بعد کچھ آدمی سادہ لباس میں اس کام پر مامور کیئے گئے کہ
آرڈر دینے والے شخص کی نگرانی کریں۔ جب وہ خول لینے آیا تو پولیس کے آدمی
اس کے پیچھے لگ گئے اور اس مکان تک پہنچ گئے۔ جہاں وہ داخل ہوا۔ یہ مکان
میکلوڈ روڈ پر کشمیر بلڈنگ میں تھا۔

پھر پولیس نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اس مکان کے مکینوں کے متعلق
اور اس کی اندرونی کیفیت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ اس طرح کہ کسی کو
شبہ نہ ہونے پائے۔ ۱۵ اپریل ۱۹۲۹ء کی صبح کو ابھی اس مکان کے رہنے والے
بستروں سے اٹھے بھی نہ تھے۔ کہ پولیس نے یکایک چھاپہ مار کر انہیں دبوچ لیا۔
مکان میں صرف تین آدمی موجود تھے۔ وہ تینوں گرفتار کر لئے گئے۔ مکان کی
تلاشی لینے پر وہاں سے بم بنانے کا سامان برآمد ہوا۔ اس سے پہلے اور اس
کے بعد پولیس نے کئی دوسرے شہروں میں چھاپے مارے اور کل اکیس آدمیوں
کو زیر حراست لے لیا۔ بھگت سنگھ پہلے ہی جیل میں موجود تھا۔ ۱۲ جون
۱۹۲۹ء کو اسے دہلی کی سیشن کورٹ سے سزا ملی۔ ۱۰ جولائی کو پولیس نے اسے
دوسرے ملزموں کے ساتھ سازش کے ایک نئے مقدمے میں لاہور کے ایک مجسٹریٹ
کے سامنے پیش کر دیا۔

مقدمہ کل تئیس ملزموں کے خلاف قائم کیا گیا۔ ان میں نو کو مفرور قرار دیا گیا۔

سات کو سلطانی گواہ بنا لیا گیا۔ اور باقی سولہ ملزم مقدمے کی سماعت کے سلسلے میں عدالت میں حاضر رہے۔ ملزمان کے خلاف الزامات کی فہرست خاصی طویل تھی۔ استغاثہ کے بیان کے مطابق ان ملزموں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی غرض سے سازش کی تھی۔ اور اس سازش کے سلسلے میں وہ ۱۹۲۴ء سے سرگرم کار تھے۔ اپنی سازش کو کامیاب کرنے کی غرض سے انھوں نے کئی جرائم کئے۔ بم بنائے۔ اور لوگوں میں دہشت پھیلانے کی کوشش کی۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں لاہور کے دسہرے کے اجتماع میں ایک بم پھٹا تھا۔ جس سے متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے تھے۔ وہ بھی انہی کی سازش کا نتیجہ تھا۔ لاہور میں مسٹر سانڈرس کا قتل بھی اسی سازش کی ایک کڑی تھی۔ یو۔ پی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بینرجی پر قاتلانہ حملہ بھی اسی سازش کے تحت کیا گیا تھا۔ اس سازش کی داستان میں بعض ایسے جرائم بھی تھے جن کی تکمیل نہ ہو سکی تھی۔ مثلاً ایک ٹرین کو جس میں سائمن کمیشن کے ممبر سفر کر رہے تھے۔ بم سے اڑانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ لیکن پولیس کی چوکسی کی وجہ سے اس منصوبے کو بروئے کار نہ لایا جا سکا۔ اسی طرح لاہور میں پنجاب نیشنل بنک پر ڈاکہ ڈالنے کی سازش کی گئی تھی۔ لیکن ادھوری رہ گئی۔ بالآخران ملزموں کو مجسٹریٹ کی عدالت میں کارروائی کے بعد (جو جیل کے اندر ہوتی رہی) ایک خاص قانون کے تحت مقرر شدہ ٹربیونل کے سامنے پیش کیا گیا۔ جہاں انہیں موت یا مختلف میعادوں کی قید کی سزائیں ملیں۔

جب انقلابی پارٹی کے ان ممبروں کے خلاف مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی تو ان کے ساتھیوں نے جو ابھی تک پولیس کی گرفت سے آزاد تھے۔ پھر اپنے آپ کو منظم کر کے دہشت انگیز کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۳ ر دسمبر ۱۹۲۹ء کی صبح کو وائسرائے کی سپیشل ٹرین کے نیچے دہلی سے چھ سات میل کے فاصلے پر نظام الدین ریلوے سٹیشن کے قریب ایک بم پھٹا۔ گاڑی کے دو ڈبوں کو نقصان پہنچا۔ لیکن وہ ڈبہ جس میں وائسرائے آرام فرما تھے۔ بال بال بچ گیا۔

بم کی زد میں آنے والے ڈبے لائن سے اچھلے۔ لیکن ان کے پہیے پھر لائن پر ٹک گئے۔ اور مختصر ٹرین سلامتی کے ساتھ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ اس جرم کی تیاری جس طرح کی گئی تھی۔ جب اس کی تفاصیل منظر عام پر آئیں تو ایک افسانے سے کم دلچسپ نہ تھیں۔

معلوم یہ ہوا کہ اس واقعہ سے کچھ دن پہلے نظام الدین ریلوے سٹیشن کے قریب ایک جوگی جنگل میں جھونپڑی ڈال کر دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ آس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ دن میں چرواہے مویشیوں کو لے کر ادھر آجاتے تھے۔ اور کبھی کبھی جوگی کی جھونپڑی کے پاس بیٹھ کر حقے کا دم لگایا کرتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ جوگی کے کئی معتقد وقتاً فوقتاً اس کے لئے ٹوکریوں میں بھوجن لاتے تھے۔ ان میں کوئی اس کا اشیرواد لے کر واپس چلا جاتا۔ اور کوئی اس کی خدمت کے لئے رات کو اس کے پاس ٹھہر جاتا تھا۔ ٹوکریوں میں جو بھوجن آتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ جوگی مہاراج چرواہوں کو بھی بانٹ دیتے تھے۔ لیکن ٹوکریوں میں صرف کھانے کی چیزیں نہ ہوتی تھیں۔ ان کے نیچے بجلی کے تار سوئچ بیٹری وغیرہ بجلی کا سامان بھی ہوتا تھا۔ جسے جوگی ان چرواہوں کی آنکھ بچا کر اپنی جھونپڑی میں چھپا لیتا تھا۔ ایک ٹوکری میں ایک بم بھی آگیا۔

کڑاکے کی سردی کا موسم تھا۔ سرد راتوں کی تنہائی میں جوگی اور اس کے چیلے اپنے اصل کام میں مصروف ہوتے تھے۔ انہوں نے زمین کھود کر ریل کی پٹڑی کے نیچے ایک بم کو گڑھے میں چھپایا اور اس کے اوپر جگہ ہموار کر دی اس بم کے ساتھ بجلی کے تار کا تعلق قائم کیا۔ اور ایک سرنگ کے ذریعے اس تار کو اپنی جھونپڑی تک لے گئے۔ وہاں ایک بیٹری رکھی اور بیٹری کو چالو کرنے کے لئے سوئچ کا انتظام کیا۔ اب ایک بٹن دبانے سے بیٹری کی بجلی کا عمل بم پر ہو سکتا تھا۔ وائسرائے کی سپیشل ٹرین کا پروگرام جوگی اور اس کے ساتھیوں کو معلوم تھا۔ وہ وقت کا انتظار کرتے رہے۔ جب ٹرین کی گڑگڑاہٹ ان کے کانوں میں آئی تو وہ چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹرین اس مقام پر پہنچی جہاں بم دفن تھا۔ تو ادھر سوئچ کا بٹن دبا اور ادھر بم پھٹ گیا۔ لیکن لارڈ اردن اور ان کے ساتھی خوش قسمت تھے۔ ان کی ٹرین تباہ ہوتے ہوتے بچ گئی۔

۲۰۔ گول میز کانفرنس کی دعوت اور گاندھی جی کا "ڈانڈی مارچ"

جون ۱۹۲۹ء میں جب برطانیہ کے عام انتخابات کے بعد لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا تو ہندوستان کے مسئلے کے متعلق انہیں کئی جانب سے یہ مشورہ ملا کہ صرف سائمن کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر آئین سازی کا پروگرام درست نہ ہوگا۔ ہندوستان کی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لئے آئین کا مسودہ تیار کرنے سے پہلے ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ بالمشافہ گفت وشنید اور سمجھوتے کی کوشش بھی کرنی چاہیئے۔ تاکہ آئین کا مسودہ اس سمجھوتے کی بنا پر تیار کیا جائے۔ یہ مشورہ وزیر اعظم کو خود سائمن کمیشن کے صدر نے بھی دیا۔ اسی مقصد کے لئے وزیر اعظم کو ایک طویل خط مورخہ ۱۹ جون ۱۹۲۹ء مسٹر جناح نے بھی بھیجا۔ برطانوی وزیر اعظم نے یہ مشورے مان لئے۔ جون ۱۹۲۹ء میں وائسرائے لارڈ ارون انگلستان گئے اور وہاں سے ایک اہم اعلان اپنے ساتھ لے کر اکتوبر میں ہندوستان واپس آئے۔ ۳۱ اکتوبر کو آپ نے یہ اعلان شائع کیا۔ اس میں دو باتوں کی وضاحت کی گئی تھی۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں برطانوی پالیسی کا مقصد ہندوستان کو درجہ نو آبادیات کی سیاسی آزادی اور خود مختاری دینا ہے۔ دوسری یہ کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ موصول ہونے اور اس پر غور و خوض کے بعد برطانوی حکومت برٹش انڈیا اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کو صلاح و مشورے کے لئے انگلستان آنے کی دعوت دے گی تاکہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے آئندہ آئین کے مسودے کے طور پر "ایسی تجاویز پیش کی جا سکیں جنہیں عام اور وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل ہو"

مسٹر جناح اور کئی لبرل لیڈروں نے اس اعلان کا غیر مشروط خیر مقدم کیا۔ گاندھی جی اور بعض دوسرے کانگریسی لیڈروں نے اس اعلان کو اپنی فتح کا پہلا قدم سمجھ کر فوراً مزید سودے بازی کی کوشش کی۔ دو دن تک اس اعلان پر غور کرنے کے بعد انہوں نے وزیر اعظم کے حسن نیت کا اعتراف کیا اور اس اعلان کا خیر مقدم بھی کیا۔ لیکن حکومت کے ساتھ اپنے تعاون کو "موثر اور

نتیجہ خیز" بنانے کی غرض سے چار شرطیں لگا دیں ۔ (۱) سیاسی قیدیوں کی رہائی (۲) مجوزہ کانفرنس میں کانگریس کی فیصلہ کن نمائندگی (۳) کانفرنس کا کام آئندہ آئین کے اصولوں پہ بحث مباحثہ نہ ہوگا بلکہ درجہ نوآبادیات کا آئین مرتب کرنا ہوگا۔ اور (۴) ہندوستان میں عملی طور پہ اور حتی الوسع فوراً درجہ نوآبادیات کے اصولوں کے مطابق حکومت کا کاروبار چلانا شروع کر دیا جائے۔

ان میں بعض شرائط کے مضمرات بہت دور رس تھے ۔ ڈومی نین کے درجے کی خود مختاری کے معنی بنیادی طور پر یہی تھے کہ ہندوستان کی حکومت کے کل اختیارات ایسی کابینہ کو منتقل کر دیئے جائیں جو مکمل طور پر عوامی نمائندوں کے سامنے جواب دہ ہو اور اس کا نصب و عزل ان کے ووٹ پہ منحصر ہو۔ لیکن انتقال اختیار کے اس تصور کو بروئے کار لانے سے پہلے کئی اور بنیادی سوال فیصلہ طلب تھے۔ کیا سب اختیارات ایک مرکزی اسمبلی کو منتقل کر کے صوبوں کو اس کا محکوم بنا دیا جائے (جیسا کہ نہرو رپورٹ میں تجویز کیا گیا تھا) یا صوبوں اور مرکز کو اپنے اپنے الگ دائرے میں اختیار منتقل کئے جائیں (جیسا کہ مسلمان چاہتے تھے)؟ دونوں صورتوں میں ان مجالس قانون ساز کی ساخت کیا ہوگی جنہیں اختیارات منتقل ہونے والے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ آئین کے ان اصولوں کا تصفیہ کئے بغیر یہ ضمانت کیسے دی جا سکتی تھی کہ گول میز کانفرنس آئین کا مسودہ تیار کرنے بیٹھ جائے گی؟ یہ مطالبہ بھی بہت عجیب تھا کہ آئین بعد میں بنتا رہے گا۔ لیکن حکومت ہند کو فوری طور پہ موجودہ اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں یعنی عملاً کانگریس کی اکثریت کے ماتحت کر دیا جائے۔

مسٹر جناح نے ایک چٹھی پنڈت موتی لال نہرو کو لکھی اور ان سے اپیل کی کہ وزیر اعظم کے اعلان کو بلا شرط قبول کر لیں اور اپنے مطالبات کانفرنس میں پیش کریں۔ پھر مسٹر جناح اور اسمبلی کے صدر پٹیل سابرمتی میں گاندھی جی سے ملنے گئے۔ ہندوستان کے کچھ اور لیڈر بھی جن میں سر تیج بہادر سپرو پیش پیش تھے۔ گاندھی جی کو منانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لارڈ ارون خود بھی اس بات کے بہت خواہش مند تھے کہ حکومت کو کانگریس کا تعاون حاصل ہو جائے۔ آخر مشترک دوستوں کی کوشش سے یہ طے ہوا کہ پانچ لیڈر وائسرائے سے ملیں اور کسی طرح حکومت اور گاندھی جی کے درمیان تعاون کا راستہ نکالیں۔ یہ ملاقات ۲۳ دسمبر کی سہ پہر کو ہوئی۔ وائسرائے بم کے حادثے سے بال بال بچ کر اسی صبح کو دہلی پہنچے تھے۔

وائسرائے مہاتما جی کی چار شرطوں میں ایک (سیاسی قیدیوں کی رہائی) بلا تامل منظور کرنے کو تیار

تھا۔ ممکن تھا کہ ان کا یہ مطالبہ بھی مان لیا جاتا کہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کو باقی تمام پارٹیوں کے مقابلے میں "فیصلہ کن" نمائندگی دی جائے۔ حالانکہ گول میز کانفرنس کا مقصد ووٹوں کے ذریعے کسی بات کا تصفیہ کرانا نہ تھا۔ لیکن مہاتما جی کی باقی شرطیں نہ مانی گئیں تو بات چیت ٹوٹ گئی۔ ایک ہفتے کے بعد کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں نوجوان پنڈت جواہر لال نہرو کے زیر صدارت ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے صدارت کا چارج اپنے والد محترم سے لیا جنھوں نے اس سے پہلے کلکتہ میں سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی۔

لاہور کے اجلاس میں حکومت کے ساتھ ٹکر لینے کی تیاری کے طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ نہرو رپورٹ منظور کرنے کے لئے حکومت کو جو ایک سال کی مہلت دی گئی تھی وہ ختم ہو چکی ہے۔ لہذا نہرو رپورٹ کی تجاویز زائد المیعاد ہو گئی ہیں۔ اور اب کانگریس کا نصب العین درجہ نوآبادیات کے بجائے مکمل آزادی ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ جب مناسب خیال کرے سول نافرمانی کا پروگرام شروع کر دے اور اگر چاہے تو ٹیکس دینے سے انکار کی مہم کو بھی سول نافرمانی کے پروگرام میں شامل کرے۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق تھا فروری ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے مسٹر جناح کے زیر صدارت گول میز کانفرنس کی تجویز کو قبول کر کے اس کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کر لیا۔

اسی مہینے یعنی فروری ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے سول نافرمانی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے پروگرام کی تفصیل مہاتما گاندھی کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی۔ مہاتما جی نے ایک خاص قانون کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا جو نمک بنانے پر پابندیوں سے متعلق تھا اور اس غرض کے لئے آپ نے ڈانڈی کے مقام پر پہنچ کر خلاف قانون نمک بنانے کا پروگرام بنایا۔ مہاتما جی نے تشہیر کے تمام ذرائع کو کام میں لاتے ہوئے وائسرائے کو بطور خاص اپنے پروگرام سے مطلع کیا۔ اور ڈانڈی کی جانب پیدل سفر شروع کیا۔ اخباری بیانوں میں آپ نے یہ بھی کہا کہ یہ "فیصلہ کن جنگ" ہوگی۔ آپ کا سفر جاری رہا۔ راستے میں ہزاروں لوگ عقیدت مندانہ طریق پر آپ کے ساتھ چلتے رہے۔

آپ نے ۱۲ مارچ کو سفر شروع کیا تھا۔ لیکن حکومت نے اس مرتبہ ایک نئی تیکنیک سے کام لیا۔ یعنی ان کی سول نافرمانی کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ گاندھی جی نے قانون کی خلاف ورزی کر

کے نمک بنایا۔ پھر بھی حکومت نے انہیں گرفتار نہ کیا۔ وہ تقریباً ایک مہینہ تک نمک بناتے رہے اور حکومت تماشا دیکھتی رہی۔ مہاتماجی پریشانی محسوس کرنے لگے۔ اگر حکومت نے انہیں گرفتار نہ کیا تو کیا ہوگا؟ وہ کب تک نمک بناتے رہیں گے؟ ان کی "فیصلہ کن جنگ" ایک مذاق بنتی نظر آتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد حکومت نے ان کی الجھن دور کی اور ۵ر مئی کو انہیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سول نافرمانی کے پروگرام کی بنا پر کانگریس کی مجلس عاملہ کو خلاف قانون قرار دے کر حکومت نے اس مجلس کے ارکان کو بھی گرفتار کر لیا۔ کچھ دنوں تحریک سول نافرمانی کے ڈکٹیٹر یکے بعد دیگرے مقرر ہوتے رہے۔ پھر ان کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اور سول نافرمانی کی تحریک مدھم پڑ گئی۔ لیکن خفیہ انقلابی پارٹی کی سرگرمیاں جاری رہیں بلکہ زور پکڑ گئیں۔

مئی میں سائمن کمیشن کی رپورٹ چھپی اس پر حکومت ہند نے اپنی رائے حکومت برطانیہ کو بھیج دی اور سابقہ تجویز کے مطابق ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس کے مندوبین کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا۔ ان میں کانگریس کا کوئی نمائندہ شامل نہ تھا۔ اس گول میز کانفرنس کے اجلاس ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو شروع ہوئے اور ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء تک جاری رہے۔ مسٹر جناح نے اس کانفرنس کے سلسلے میں لندن جانے کے لئے رخت سفر باندھا تو کانفرنس کے بعد انگلستان میں رہائش اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آپ نے اس زمانے میں اپنے دوستوں سے کہا کہ میں ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں سے ریٹائر ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن لندن میں بیٹھ کر اپنے وطن کی ہر ممکن خدمت کرتا رہونگا۔

۲۱۔ علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد

تقریباً نصف صدی تک ہندوستان میں مسلمانوں کی تمام جدوجہد (سیاسی اور غیر سیاسی) اور ان کے آئینی مطالبات "دو قوموں" کے تصور پر مبنی رہے۔ ان کے اجتماعی ذہن میں یہ تصور ایک امر واقعہ اور حقیقت ثابتہ کے طور پر موجود رہا اور ان کے عملی اقدامات کا محرک بنتا رہا۔ لیکن یہ تصور ابھی نظریاتی تجزیہ اور تشریح کا محتاج تھا۔ مسلمان ایک علحدہ قوم کیوں ہیں؟ کیا ایک مشترکہ وطن کا رشتہ اتنا مضبوط نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ ایک واحد ہندوستانی قوم بنا سکے؟ اور اگر مسلمان ایک علحدہ قوم ہیں تو ہندوستان کے ساتھ ان کی وفاداری کی نوعیت کیا ہے؟ یہ سوال ابھی تفصیلی بحث کے محتاج تھے۔ اس کمی کو علامہ اقبال نے پورا کیا۔ علامہ موصوف پہلی گول میز کانفرنس کے مندوبین میں شامل نہ تھے۔ انہیں دوسری کانفرنس میں شرکت کی دعوت ملی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو جب پہلی گول میز کانفرنس اپنے خاتمے کے قریب تھی تو علامہ صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں اپنا مشہور خطبۂ صدارت پڑھ رہے تھے اس خطبے میں آپ نے مسلمانوں کی علحدہ قومیت کے نظریہ پر روشنی ڈالی۔ آپ نے اس سیاسی فلسفے کا جو یورپ کے ذہن اور عیسائیت کی تاریخ کی پیداوار تھا۔ اسلام کے سیاسی تصورات سے مقابلہ کیا اور بتایا کہ اسلام نے مسلمانوں کو صرف چند عقائد ہی نہیں سکھائے۔ بلکہ انہیں ایک خاص قسم کا سیاسی سماج بنا دیا ہے۔ اپنی سماجی یکجہتی اور اجتماعی جذبے کے اعتبار سے ہندوستان میں اگر کوئی گروہ ایک واحد قوم کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ اس ملک کے مسلمان ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ مسلمان مستقل اور مثبت طریق پر ایک علحدہ قوم ہیں اور اپنے اندر اپنے قومی وجود اور اپنی مخصوص ثقافتی روایات کو برقرار رکھنے کا شدید جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی وسیع تر قومی اتحاد میں ضم یا گم کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے۔ یہ جذبہ کسی دوسرے مذہب کے خلاف تعصب کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک فطری شے ہے۔ مسلمانوں کی لازمًا یہ خواہش ہے کہ اس ملک میں انہیں ایک قوم کی حیثیت سے اپنے تصورات کے مطابق ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے اور اپنی ثقافتی اقدار کو فروغ دینے

کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ کش مکش اور تنازعات کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس جذبے کو دبانے اور "ہندوستانی قومیت" کے نعرہ کی آڑ میں مسلمانوں پر ہندو اکثریت کی مطلق اور غیر مشروط حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ملک میں اتحاد اور امن صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی علحدہ قومیت کو تسلیم کر لیا جائے اور ایک فیڈرل نظام کے تحت بعض یونٹوں میں مسلمانوں کو وہی مواقع مہیا کرنے کا بندوبست کر دیا جائے جو دوسرے یونٹوں میں ہندو اکثریت کو حاصل ہوں گے۔ تاکہ دونوں قومیں اپنے اپنے قومی اور ثقافتی تصورات کو بروئے کار لانے کی آزادی محسوس کریں۔ اس سے ہندوستان کے اتحاد یا اس ملک کے دفاع میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ بلکہ اگر مسلمان یہ محسوس کریں کہ ہندوستان کی آزادی میں ان کی اپنی قومی آزادی بھی شامل ہے تو وہ ہندوستان کے دفاع اور آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے کو تیار ہوں گے۔

علامہ اقبال کا یہ خطبہ اس لحاظ سے خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ مسلم مطالبات کا اور مسلمانوں کے جذبۂ قومیت کا جو جواز اور تجزیہ آپ نے پیش کیا۔ اسی نے آگے چل کر پاکستان کی نظریاتی اساس کی صورت اختیار کی۔ اس خطبے میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں مسلم اکثریت کے صوبوں کو یہ شکل دینا پسند کروں گا کہ انبالہ ڈویژن اور دوسرے اضلاع جہاں غیر مسلم اکثریت ہے۔ موجودہ پنجاب سے کاٹ کر باقی ماندہ پنجاب کو صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے ساتھ ملا دیا جائے۔ اس طرح ایک ایسا صوبہ بن جائے گا جو نہ صرف ٹھوس مسلم اکثریت کا صوبہ ہوگا۔ بلکہ اس کے ذریعے مسلمان قوم کا سب سے زیادہ جاندار اور فعال حصہ یکجا ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اس صورت میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا حق مانگنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی۔ لیکن اگر صوبوں کی حدود میں یہ ردو بدل منظور نہ کی جائے تو پھر موجودہ صوبائی حدود کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ان تمام مطالبات (جداگانہ انتخاب کی بار پر پنجاب اور بنگال میں اکثریت وغیرہ) پر اصرار کریں جو مسلم لیگ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرار دادوں میں درج ہیں۔ صوبائی حدود کی ردو بدل کے سلسلے میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہندوستان کی آزادی خواہ دولت مشترکہ کی رکنیت کی صورت اختیار کرے یا اس سے علحدگی کی بہرصورت یہ بات نوشتۂ تقدیر معلوم ہوتی ہے کہ اس ملک کا شمال مغربی حصہ ایک واحد سیاسی نظام کے تحت جمع ہو کر رہے گا۔

جہاں تک مسلمانوں کی علٰحدہ قومیت کی نظریاتی تشریح کا تعلق تھا۔ علامہ اقبال کے خطبے کے مندرجات کو مسلمانوں کے ذہن نے فوراً اپنا لیا۔ یہ اسی جذبے کی وکالت اور تفسیر تھی جو ان کے دلوں میں پہلے ہی موجود تھا۔ لیکن جہاں تک صوبوں کی نئی حد بندی کے متعلق آپ کی تجویز کا تعلق تھا۔ اسے وقتی طور پر کسی حلقے کی جانب سے تائید و حمایت حاصل نہ ہوئی۔ فی الحقیقت اس وقت تک مسلم سیاسی حلقوں کا عام ذہن ایک کل ہند فیڈریشن کے تصور کے ساتھ (علامہ اقبال کی تجویز بھی ایک کل ہند فیڈریشن ہی کے سلسلے میں تھی) پنجاب کی تقسیم کو بھی منظور نہ کرتا تھا۔ اور مسلم اکثریت کے مختلف صوبوں کے باہم ادغام کے بھی خلاف تھا۔ بہ ظاہر اس لئے کہ ایک فیڈرل نظام میں چھوٹے یا بڑے صوبے یکساں حیثیت کا دعوے کر سکتے تھے۔ چند سال پہلے (۱۹۲۵ء میں) لالہ لاجپت رائے نے صوبوں کی نئی حد بندی کا سوال اٹھایا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے مطالبات کے الزامی جواب کے طور پر۔ لالہ جی کی دلیل یہ تھی کہ اگر مسلمان "ہندوستانی قومیت" کی راہِ راست پر چلنے کو تیار نہیں ہوتے اور مسلم صوبوں اور ہندو صوبوں کے ذریعے ہندو۔ مسلم توازنِ اقتدار کا تصور ترک نہیں کرتے تو پھر پورے پنجاب اور پورے بنگال کو مسلم اکثریت کے ماتحت کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اس صورت میں لالہ جی کے نزدیک قرین انصاف بات یہ تھی کہ مسلمان پنجاب اور بنگال کے صرف ان حصوں پر قناعت کریں جہاں ان کی اکثریت ہے۔ اور اپنے چار صوبے اس طرح بنالیں۔ صوبۂ سرحد۔ مغربی پنجاب۔ سندھ اور مشرقی بنگال" لیکن (آپ نے فرمایا) یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ طریقہ ہندوستان کو متحد رکھنے کا نہیں ہے بلکہ اسے مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں تقسیم کرنے کا ہے۔"

دوسری گول میز کانفرنس کے موقعہ پر پنجاب کی حدود میں ردوبدل کا سوال زیر بحث آیا۔ اس موقعہ پر کانفرنس کی سکرٹریٹ کے ایک انگریز افسر جافرے کاربٹ[1] نے پنجاب کے متعلق مفاہمت کے طور پر یہ تجویز پیش کی کہ صرف انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے علٰحدہ کر کے باقی پنجاب کے لئے مسلمان اور غیر مسلم مخلوط انتخاب کا اصول منظور کر لیں۔ لیکن اس تجویز کو مسلم ڈیلی گیشن نے بھی مسترد کر دیا اور ہندو مہاسبھا کے نمائندوں نے بھی۔

SIR GEOFFREY CORBETT [1]

۲۲۔ گول میز کانفرنسیں اور ہندو مسلم مسئلہ

گول میز کانفرنس کی تیاریوں کے زمانے میں مسلم مطالبات کی پشت پر مسلمان لیڈروں کا جو محاذ جمع تھا۔ اس میں سب سے زیادہ فعال اور با اثر حیثیت سر فضل حسین کو حاصل ہو گئی تھی جو مئی سنہ ۱۹۳۰ء کے شروع میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنی ڈپلومیسی کی صلاحیتوں اور اپنے عہدے کی کرسی کے پورے اثر و رسوخ کو ان مطالبات کی کامیابی کے لئے صرف کیا۔ اس سلسلے میں ان کی نجی ڈائری کے اندراجات اور ان کے خطوط جو وہ لگاتار سر محمد شفیع۔ ڈاکٹر شفاعت احمد اور چودھری ظفر اللہ خاں کو لندن میں بھیجتے رہے۔ گول میز کانفرنس کے پس منظر پر دلچسپ روشنی ڈالتے ہیں[1]۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم مطالبات کی آدھی جنگ مسلم مندوبین نے گول میز کانفرنس میں لڑی اور آدھی جنگ سر فضل حسین نے دہلی اور شملہ میں بیٹھ کر لڑی۔

پہلی گول میز کانفرنس (۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۳۰ء) شروع ہوئی تو فوراً ہی اس ہندو۔ مسلم بحث کا اکھاڑہ بن گئی جو ہندوستان میں چھ برس سے جاری تھی۔ مسٹر جناح نے اس بحث میں زیادہ نمایاں اور سرگرم حصہ نہ لیا۔ اور بہ خوشی مسلم مطالبات کی وکالت اور ان مطالبات کے متعلق مختلف پارٹیوں کے ساتھ گفت و شنید کی بیشتر ذمہ داری سر محمد شفیع کے لئے چھوڑ دی۔ مسلم مندوبین نے شروع ہی میں آغا خاں کو اپنا رسمی قائد چن لیا تھا۔ جہاں تک مسلم مطالبات کا تعلق تھا۔ سر محمد شفیع نائب قائد کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

کانگریس پہلی گول میز کانفرنس میں موجود نہ تھی۔ لیکن کانگریس کے خیالات کی جھلک لیبر پارٹی کے وزیروں کے خیالات میں موجود تھی۔ اس پارٹی کے وزیر مسٹر ویجؤ وڈ بین نے کانفرنس سے پہلے ہی ایک تقریر میں کہہ دیا تھا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ انتخاب کا اصول بر طانیہ

---

[1] ان دستاویزوں کے اقتباسات سر فضل حسین کی وفات کے دس برس کے بعد ان کے بیٹے عظیم حسین کی کتاب "فضل حسین ایک سیاسی جائزہ" (انگریزی زبان میں) کے ذریعے منظر عام پر آئے۔

کی جمہوری روایات کے منافی اور نظرثانی کا محتاج ہے۔ وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ محتاط لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ لیکن ان کا ذہن بھی انہی خطوط پہ کام کرتا تھا کہ ہندوستان میں "نیشنلزم" اور مطالبۂ آزادی کی اصل ترجمان کانگریس ہے اور ہندوستان کا اصل مسئلہ برطانوی حکومت اور کانگریس کے درمیان ہے۔ باقی تمام مسائل فروعی ہیں۔ لہٰذا وہ "اقلیتوں کی حفاظت" کی ضرورت سے انکار نہ کرتے تھے۔ لیکن اپنی تقریروں میں بار بار "ہندوستانی نیشنلزم" اور حب وطن کے نام پہ مختلف فرقوں کے نمائندوں سے اپیل کرتے تھے کہ وہ ملک کے مجموعی مفاد کو اور آزادی کے مقصد کو پیش نظر رکھیں اور فرقہ وارانہ مطالبوں کو طول نہ دیں۔ ان اشاروں اور اپیلوں کا عملی مطلب یہی نکلتا تھا کہ مسلمان اپنے مطالبات کو نرم کر کے اپنے مقاصد کو "ہندوستانی نیشنلزم" یعنی کانگریس کے نقطۂ نگاہ کے ساتھ ہم آہنگ کر لیں۔

گول میز کانفرنس نے اپنے کام کو سب کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک سب کمیٹی فیڈرل نظام کے متعلق غور و خوض کرنے کے لئے تھی۔ اس کے ممبروں میں مسٹر جناح اور سر محمد شفیع دونوں شامل تھے۔ ایک اور سب کمیٹی "اقلیتوں" کے مسئلے پہ غور کرنے کے لئے تھی۔ مسٹر جناح اس سب کمیٹی کے ممبر نہ بنے تھے۔ جب فیڈرل نظام کی سب کمیٹی نے کام شروع کیا تو سر محمد شفیع نے مسلم مندوبین کی جانب سے یہ اعلان کر دیا کہ وہ عارضی طور پہ بحث میں شرکت کرتے رہیں گے۔ لیکن سفارشات کو کوئی آخری شکل دینے میں تعاون اس وقت تک نہ کریں گے۔ جب تک "اقلیتوں" کا مسئلہ اطمینان بخش طریق پہ حل نہیں ہوتا۔ یعنی مسلم مطالبات کا مسئلہ پہلے اور نئے آئین کی جانب قدم بڑھانے کا سوال اس کے بعد۔ مسٹر جناح نے بھی یہ کہکر ان کی تائید کی کہ ایسا آئین بنانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں جسے ہندوستان کی سات کروڑ مسلم آبادی قبول نہ کرتی ہو۔ مسلم مندوبین نے مسلم مطالبات کے مسئلے پہ توجہ مرکوز کرانے کے لئے یہ رویہ اختیار کر لیا۔ لیکن وزیر اعظم کی تقریروں کا لب و لہجہ کئی مسلم مندوبین کو لندن میں اور سر فضل حسین کو دہلی میں پریشان کر رہا تھا۔

سر فضل حسین نے ۶ نومبر ۱۹۳۰ء کو یعنی گول میز کانفرنس کے آغاز سے ایک ہفتہ پہلے ڈاکٹر شفاعت احمد کو ایک خط لکھا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ کانفرنس میں مسلم مندوبین کی تقریروں کا لب و لہجہ نرم اور مصالحانہ ہونا چاہیئے۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پہ جھگڑنے کے بجائے اس بنیادی اصول پہ زور دینا چاہیئے کہ ہندوستان کی ثقافتی تعمیر میں دو مختلف کلچروں اور تہذیبوں کا حصہ ہے۔ اور مسلمانوں کا اصل مقصد یہ ہے اور پورے ہندوستان کا فائدہ بھی اسی بات میں ہے کہ ہندوؤں کے کلچر

اور ان کی تہذیب کو اور مسلمانوں کے کلچر اور ان کی تہذیب کو آزاد ہندوستان کی قومی زندگی کی تعمیر میں حصّہ لینے کا یکساں اور مساوی موقعہ ملے۔ اپنے مشترکہ وطن کی تعمیر و ترقی کی ذمہ داری ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر ہے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اور دوسرے صوبوں میں ہندوؤں کو اس ذمہ داری میں ان کا قدرتی حصّہ ملنا چاہیئے تاکہ یہ ملک دونوں کے مخصوص اندازِ فکر۔ کلچر اور تہذیب سے پورا فائدہ اٹھا سکے اور ہندوؤں کا ہندوستان یا مسلمانوں کا ہندوستان بننے کے بجائے دونوں کا مشترکہ ہندوستان بن سکے۔" لیکن چند دنوں تک کانفرنس کی کارروائی کا انداز دیکھ کر سر فضل حسین کے خطوں کا مصالحت آمیز لہجہ بدل گیا۔ انہیں زیادہ پریشانی اس وجہ سے لاحق ہوتی تھی کہ وزیر اعظم کی مبہم اپیلوں کی بعض مسلم نمائندے بھی اس انداز میں حمائت کرتے تھے گویا وہ خود بھی "فرقہ وارانہ" مطالبات کو نرم کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ سر فضل حسین نے ایک خط مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۳۰ء میں جو ڈاکٹر شفاعت احمد کے نام تھا اس بات کی شکائت کی کہ وزیر اعظم ہندوستان کو ترقی اور آزادی کے راستے پر ڈالنے اور ذمہ دار حکومت کے لئے راستہ صاف کرنے کی ضرورت اور اس قسم کے مبہم مقاصد کی جانب اشارے کرتا ہے اور بعض مسلم نمائندے غیر مشروط طور پر اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔" غالباً اپنے آپ کو اس کی نگاہ میں اور برطانوی پریس کے سامنے فرقہ پرستی سے بالاتر اور محب وطن ظاہر کرنے کے لئے"۔ پھر ایک خط مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۰ء میں آپ نے لکھا "وزیر اعظم کی پیش کش یہ ہے کہ اگر ہندوستان کے نمائندے اپنے فرقہ وارانہ اختلافات نبٹا لیں تو صوبوں کے علاوہ مرکز میں بھی ذمہ دار حکومت کی جانب قدم بڑھایا جا سکتا ہے۔ بالکل درست۔ لیکن اس سلسلے میں سیدھا سوال یہ ہے کہ مرکز میں ذمہ دار حکومت زیادہ فائدہ کسے پہنچاتی ہے اور سمجھوتے کے لئے زیادہ بے تاب کسے ہونا چاہیئے؟ ہندوؤں کو یا مسلمانوں کو؟ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کو۔ پھر مسلمانوں کی جانب سے اپنے مفاد اور مقاصد کی قربانی پر آمادگی کا اظہار کیوں؟" سر محمد شفیع کے نام ان کے ایک خط مورخہ ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کے الفاظ یہ تھے "نیشنلزم کا نعرہ فضول ہے۔ جس کا مقصد مسلمانوں کے قومی وجود کو ان کے کلچر اور ان کے مستقبل کو ختم کرنے کے سوا کچھ نہیں۔"

پہلی گول میز کانفرنس کی کارروائی اس فضا میں دو مہینے جاری رہی اور ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو ختم ہو گئی اس دوران میں مسلم مندوبین کی صفوں میں ایک المناک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ یعنی ۴ جنوری ۱۹۳۱ء

کہ مولانا محمد علی جوہر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ چند دن پہلے آپ نے ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ وہ اس کانفرنس سے غلام ہندوستان میں واپس جانا نہیں چاہتے۔ تقدیر نے ان کی یہ خواہش ایسے طریق پر پوری کی جس نے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو غم سے تڑپا دیا۔ مولانا کا جسد خاکی بھی ہندوستان واپس نہ آیا۔ اس کے لئے آخری آرام گاہ کا انتظام یروشلم میں کیا گیا۔

پہلی گول میز کانفرنس کے آخری دن وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ایک اہم اعلان کیا جس میں آپ نے آئندہ آئین کے متعلق ان اصولوں کی نشاندہی کی جن پر آپ کے قول کے مطابق حکومت کے نمائندوں اور کانفرنس کے باقی مندوبین کے درمیان عام اتفاق ہو گیا تھا۔ ان اصولوں میں "اقلیتوں کی حفاظت" کا مبہم اصول بھی شامل تھا۔ لیکن عملی تفصیل کے بغیر یہ الفاظ بے معنی تھے۔ جہاں تک ملک کی سیاسی آزادی کے مسئلے کا تعلق تھا۔ وزیر اعظم کے اعلان میں بیان کردہ اصولوں کا یہ مطلب بالکل واضح تھا کہ آئندہ آئین ہندوستان کو ڈومینین کے درجے کی مکمل خودمختاری تک پہنچانے والا نہ ہوگا۔ بلکہ صرف ایک درمیانی منزل تک پہنچائیگا۔ جہاں صوبائی محکموں پر عوامی نمائندوں کو کنٹرول دے دیا جائے گا۔ لیکن مرکزی محکموں میں دفاع اور امور خارجہ پر گورنر جنرل کا براہِ راست کنٹرول اور باقی نظم ونسق پر اس کی بالواسطہ اور عمومی بالادستی قائم رہے گی۔

مہاتما گاندھی کو گول میز کانفرنس کے کونسے پہلو نے متاثر کیا؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن وہ اپنی جنگی تدابیر کا نقشہ یکسر بدل کر حکومت کے ساتھ مصالحت اور گول میز کانفرنس کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو گئے۔

مہاتما جی کی آمادگی کا اشارہ پاتے ہی لارڈ ارون نے ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو انہیں اور کانگریس کی مجلس عاملہ کو جیل سے رہا کر دیا تاکہ وہ اپنے آئندہ پروگرام کے متعلق مشورہ کر سکیں۔ مہاتما جی نے وائسرائے کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کی خواہش ظاہر کی اور اس گفتگو میں کانگریس اور حکومت کے درمیان ایک صلح نامے "گاندھی ارون پیکٹ" پر دستخط ہو گئے۔ اور دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی شرکت کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ وائسرائے کانگریس کو اس کانفرنس کے لئے برطانوی ہند کے مندوبین کی ایک تہائی سے زیادہ نمائندگی دینے کو تیار نہ تھا۔ مہاتما جی نے کانگریس کے لئے زیادہ باوقار راستہ یہ نکال لیا کہ اپنے آپ کو کانگریس کا واحد نمائندہ چن لیا۔ البتہ آپ نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہندو مہاسبھا کے نمائندوں میں پنڈت مدن موہن مالویہ کو عورتوں کی نمائندوں میں مسز سروجنی نائیڈو کو اور مسلم مندوبین میں نیشنلسٹ مسلمانوں کو نمائندگی دینے کی غرض سے ڈاکٹر ایم

اے انصاری اور سر علی امام کو یا کم از کم صرف ڈاکٹر انصاری کو شامل کر لیا جائے۔ وائسرائے اس تجویز پہ نیم رضامند تھا۔ لیکن جب یہ معاملہ ایگزیکٹو کونسل کے سامنے گیا تو سر فضل حسین نے مسلم مندوبین کی فہرست میں ڈاکٹر انصاری کو جگہ دینے کی سخت مخالفت کی اور یہ تجویز کثرت رائے سے مسترد ہو گئی۔ پنڈت مالویہ اور مسز نائیڈو کی نامزدگی پر کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی نے لندن پہنچنے کے بعد پھر یہ کوشش کی کہ مسلم مندوبین یا وزیر اعظم ڈاکٹر انصاری کو کانفرنس میں بلانے پر رضامند ہو جائیں لیکن یہ تجویز وہاں بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

مہاتما گاندھی دو مکھی لڑائی لڑ رہے تھے۔ ایک لڑائی ہندوستان کی خود مختاری کے لئے اور دوسری ہندو۔مسلم مسئلے کو اپنی مرضی کے مطابق حل کرانے کے لئے۔ گیا انہوں نے ایک محاذ پر برطانوی حکومت کی جانب مصالحت کا ہاتھ اس لئے بڑھایا تھا کہ کم از کم دوسرے محاذ پہ اپنے حسب منشا نتائج حاصل کر سکیں؟ وجہ خواہ کچھ تھی لیکن اس مرحلے پہ آپ نے فرقہ دارانہ مسئلے کو حل کرنے کی کوشش جس انداز میں کی وہ بہت دلچسپ تھا۔ "گاندھی۔ اردن معاہدہ" اور کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے گاندھی جی کی گول میز کانفرنس میں جانے کی تجویز مارچ ۱۹۳۱ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ کراچی میں توثیق کی غرض سے پیش ہوئی۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے دو ٹوک الفاظ میں فرمایا کہ ہندوستان کا مسئلہ صحیح طور پہ حل کرانے کے لئے سب سے پہلے ہندو مسلم سمجھوتہ ضروری ہے۔ لہذا اگر میں لندن جانے سے پہلے فرقہ دارانہ سمجھوتہ نہ کرا سکا تو میرا لندن جانا بے کار ہے۔" کراچی ہی میں کانگریس کی مجلس عاملہ سے گاندھی جی نے بطور خاص مسلمان لیڈروں کے ساتھ بات چیت کرنے کا اختیار بھی حاصل کیا۔ لیکن کراچی کانگریس نے اس سلسلے میں ایک اور عجیب قدم بھی اٹھایا۔ یعنی اقلیتوں کو تحفظ اور "بنیادی حقوق" کا یقین دلانے کی غرض سے ایک طویل قرارداد پاس کر دی جس میں کئی دوسری باتوں کے علاوہ (جن سے بظاہر برطانوی لیبر پارٹی کے لیڈروں کے نقطۂ نگاہ کے ساتھ اپنی ہم آہنگی جتانا مقصود تھا) تناسب نمائندگی کے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ پورے ملک میں حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہوں گے۔ لیکن ایسی اقلیتوں کے لئے جو آبادی کی پچیس فیصد سے کم ہوں ہر جگہ ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق نشستیں مخصوص ہوں گی اور انہیں زائد نشستوں کے لئے انتخاب لڑنے کا حق بھی حاصل رہے گا۔

کانگریس کے اس فیصلے کے بعد سمجھوتے کی گفت وشنید کے کیا معنی ہو سکتے تھے؟ لیکن گاندھی جی نے پھر بھی سمجھوتے کے لئے بہت بے تابی اور سرگرمی دکھائی۔ کراچی سے دہلی پہونچ کر آپ نے جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرتے ہوئے اپنا یہ قول دہرایا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ سمجھوتہ کرائے بغیر میرا لندن جانا بے سود ہے۔ ہندو مسلم مسئلے کے متعلق گاندھی جی اس سے پہلے بھی دو متضاد نعرے بلند کرتے رہتے تھے۔ ایک نعرہ یہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی نہیں مل سکتی" اور دوسرا نعرہ یہ تھا کہ "آزادی کے بغیر (یعنی انگریز کو درمیان سے خارج کئے بغیر) ہندو مسلم اتحاد نہیں ہو سکتا۔" یعنی اتحاد کی مرغی موجود نہ ہو تو آزادی کا انڈہ نہیں مل سکتا اور آزادی کا انڈہ پہلے موجود نہ ہو تو اتحاد کا چوزہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس مرتبہ بھی آپ نے فرقہ وارانہ سمجھوتے کی کوشش اسی نعرے سے شروع کی کہ پیشگی سمجھوتے کے بغیر میرا لندن جانا تضیع اوقات ہے اور پھر آہستہ آہستہ پینترا بدلا۔

کانگریس کے اجلاس کراچی اور دہلی میں جمعیت علمار کے اجلاس میں تقریروں کے بعد آپ نے فرقہ وارانہ سمجھوتے کے لئے گفت وشنید شروع کی اور ایک پبلک بیان میں یہاں تک فرمایا کہ میں سمجھوتے کی خاطر مسلمانوں کو "کورا چیک" دینے کو تیار ہوں۔ وہ جو مطالبات چاہیں اس میں درج کر لیں۔ مجھے سب منظور ہیں۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ شرط یہ تھی کہ ان مطالبات پر کانگریسی مسلمان بھی صاد کرتے ہوں۔ لیکن کانگریسی مسلمان اس فارمولے سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھے جو کانگریس کراچی میں منظور کر چکی تھی۔ مولانا شوکت علی نے نواب بھوپال کی معرفت کانگریسی مسلمانوں کے تین نمائندوں (ڈاکٹر انصاری مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی اور چودھری خلیق الزماں) اور مسلم کانفرنس کے تین نمائندوں (سر محمد شفیع۔ علامہ اقبال اور مولوی شفیع داؤدی) کے درمیان گفتگو کا انتظام کرایا۔ ان کا پہلا اجلاس بھوپال میں منعقد ہوا۔ دوسرا اجلاس شملہ میں ہوا۔ کیونکہ مسلم کانفرنس کے نمائندے سر فضل حسین کو بھی مشورے میں شریک رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن نمائندگی کے طریق اور تناسب کے متعلق دونوں گروپوں کے درمیان ہر نکتے پر بنیادی اختلاف تھا جو رفع نہ ہو سکا۔ کانگریسی گروپ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو مخلوط انتخاب کی بنیاد پر آبادی کے تناسب کے مطابق نشستوں کی تخصیص سے زیادہ کوئی رعایت منظور نہ کرتا تھا۔ سوائے اس کاغذی رعایت کے کہ انہیں زائد حلقوں میں بھی انتخاب

لڑنے کا حق حاصل رہے گا۔ دوسرے گروپ کا مطالبہ تھا کہ ان صوبوں میں مسلم اقلیت کو وہی نمائندگی دی جائے جو "لکھنؤ پیکٹ" کے تحت انہیں حاصل تھی۔ وہ بھی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے۔ پنجاب اور بنگال کے لئے کانگریسی گروپ مسلمانوں کے لئے نشستوں کی تخصیص بھی منظور نہ کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مخلوط حلقوں اور بالغ رائے دہندگی کے ذریعے مسلمانوں کو اکثریت حاصل کر لینے کی امید پر انحصار کرنا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر برطانوی پارلیمنٹ جس کے ہاتھ میں آئین سازی کا اختیار تھا۔ بالغ حق رائے دہندگی کا اصول منظور نہ کرے اور محدود رائے دہندگی کا اصول جاری رکھے تو کیا ہوگا؟ کانگریسی گروپ اس امکان کا سامنا نہ کرتا تھا۔ اور مسلم کانفرنس کے نمائندے اس بارے میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ ان حالات میں بات چیت بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ یہ مئی ۱۹۳۱ء کے واقعات ہیں۔ اس دوران میں مہاتما جی سکھوں کے نمائندوں سے بھی بات چیت کرتے رہے تھے۔ جس کے بعد فرقہ وارانہ سمجھوتے کی شرائط نے عملاً یہ صورت اختیار کر لی کہ کانگریسی اور غیر کانگریسی مسلمان بھی متفق ہوں اور پھر مسلمان اور سکھ بھی کسی فارمولے پر متفق ہوں۔ اس کی کوئی صورت نہ بنی تو مہاتما جی کے لئے یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ کیا کریں؟ لندن جانے کی تیاری کریں یا اپنے قول کے مطابق سمجھوتے کے بغیر لندن جاکر وقت ضائع کرنے کا خیال چھوڑ دیں؟ اس سوال کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے حل کر دیا۔ اس نے جون ۱۹۳۱ء میں ایک قرارداد منظور کی جس کے الفاظ یہ تھے کہ "اگر بدقسمتی سے فرقہ وارانہ سمجھوتے کی کوششیں ناکام رہیں۔ تب بھی مہاتما جی کو کانگریس کا نقطہ نگاہ پیش کرنے کے لئے گول میز کانفرنس میں جانا چاہیئے تاکہ کانگریس کے نقطہ نگاہ کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے نہ پائے"۔ اس کے بعد مہاتما جی نے اپنے اخبار "ہریجن" مورخہ ۱۸ جون ۱۹۳۱ء میں تحریر فرمایا کہ ایک جمہوریت پسند انسان کی حیثیت سے میرے لئے مجلس عاملہ کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن سمجھوتے کی کوششیں بہر صورت جاری رہیں گی۔

اس سے پہلے آپ سمجھوتے کے لئے اپنی مساعی اور ان کے راستے میں مشکلات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اور بیان بھی دے چکے تھے جس کے آخری حصے کے الفاظ یہ تھے "اگر مسلمان اس بات پر اصرار کریں کہ جب تک فرقہ وارانہ سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ آزادی کا آئین بنایا ہی نہ جائے تو یہ آزادی کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ ذمہ دار مسلمان یا سکھ لیڈر اس قسم کا رویہ اختیار کر

ہیں تو دوسری بات ہے۔ ورنہ سوراج کے لئے جو جنگ شروع ہے۔ یہ اسی وقت ختم ہوگی جب ملک ایسا آئین حاصل کرلے گا جو سوراج کا ظاہری نشان ہو۔" ایک طرف "فرقہ وارانہ سمجھوتہ" اور دوسری طرف "سمجھوتے کے ساتھ یا سمجھوتے کے بغیر آزادی" کے دوگونہ نعروں کو ساتھ لے کر مہاتما جی ۱۹ اگست سال ۱۹۳۱ء کو لندن کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اس دوران میں دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے مسٹر جناح ایک ذاتی کام کے سلسلے میں چند دن کے لئے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اس دورے میں آپ بہت صاف گوئی کے ساتھ ملک کے حالات کے متعلق اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرتے رہے۔ ۱۰ اگست ۱۹۳۱ء کو الہ آباد میں یو۔پی مسلم کانفرنس کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: "میرے نزدیک سب سے اہم مسئلہ ہندو۔مسلم سمجھوتے کا ہے۔ اس بارے میں میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ ہندوؤں کو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کا اصول تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اگر ہندو اس بات پر آمادہ ہو جائیں تو بہت جلد سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلم اکثریت جداگانہ انتخاب کے ذریعے یا مخلوط طرزِ انتخاب کے ذریعے؟ آپ میں اکثر صاحبان کو علم ہے کہ میں ذاتی طور پر مخلوط انتخاب کی بنیاد پر پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کی نشستوں کا تعین پسند کروں گا۔ لیکن مسلمانوں کی بھاری اکثریت جداگانہ طرزِ انتخاب پر اصرار کرتی ہے۔ اگر سمجھوتہ اس کے بغیر نہ ہو سکے تو پھر سمجھوتے کی خاطر جداگانہ انتخاب کو قبول کرنے سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے اور اس بات پر بھروسہ رکھنا چاہیئے کہ آزادی کے بعد جب ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل جل کر ملک کا آئین چلانا پڑے گا تو ان کی باہمی بدگمانی ختم ہو جائے گی اور جداگانہ انتخاب بھی ختم ہو جائیں گے۔" اسی دورے میں آپ نے بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: میں اول ہندوستانی ہوں اور اسکے بعد مسلمان ہوں۔ لیکن کوئی ہندوستانی مسلمانوں کو نظرانداز کر کے اپنے وطن کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا۔ میری نظر کسی پارٹی پر نہیں ہے۔ نہ مجھے ہر دلعزیزی کی بھوک ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ہندوؤں نے اس وقت جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ سراسر احمقانہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے آخر گول میز کانفرنس میں جانا منظور کر لیا ہے۔ میں خود بھی اس میں شرکت کروں گا۔ لیکن وہاں کیا ہو گا؟ حکومت برطانیہ فوراً کہدے گی کہ آپ لوگوں میں کوئی بنیادی اتحاد ہی نہیں۔ لہٰذا آپ آزادی کا آئین کس طرح چلائیں گے؟"

دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتے میں شروع ہوئی۔ اس میں مہاتما گاندھی کی شخصیت بہت نمایاں تھی۔ آپ نے اقلیتوں کے ساتھ سمجھوتے کے متعلق خاص دلچسپی لی اور اس سوال کو خاص طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آپ نے اس بارے میں گفت و شنید تو بہت سرگرمی کے ساتھ کی لیکن اس گفت و شنید میں آپ کراچی کانگریس کے منظور کردہ فارمولے سے آگے بڑھنے کو تیار نہ ہوئے۔ اس فارمولے اور مسلمانوں کے موقف کے درمیان بہت بعد تھا۔ پھر آپ نے اس سوال پر تعطل سے بچنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ اس مسئلے کو فی الحال معلق رکھتے ہوئے نیا آئین مرتب کر لیا جائے اس شرط کے ساتھ کہ اس آئین کا نفاذ اسی وقت ہوگا جب کوئی فرقہ وارانہ سمجھوتہ ہو جائے گا۔ لیکن مسلم مندوبین کو یہ تجویز منظور نہ تھی۔

یہ کانفرنس ابھی جاری تھی کہ برطانیہ میں عام انتخابات کے ذریعے حکومت بدل گئی اور ایک کولیشن کابینہ برسر اقتدار آگئی جس کے سربراہ لیبر لیڈر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ ہی تھے لیکن اس کی پالیسی میں کنزرویٹو پارٹی کو برابر کا عمل دخل حاصل ہو گیا۔

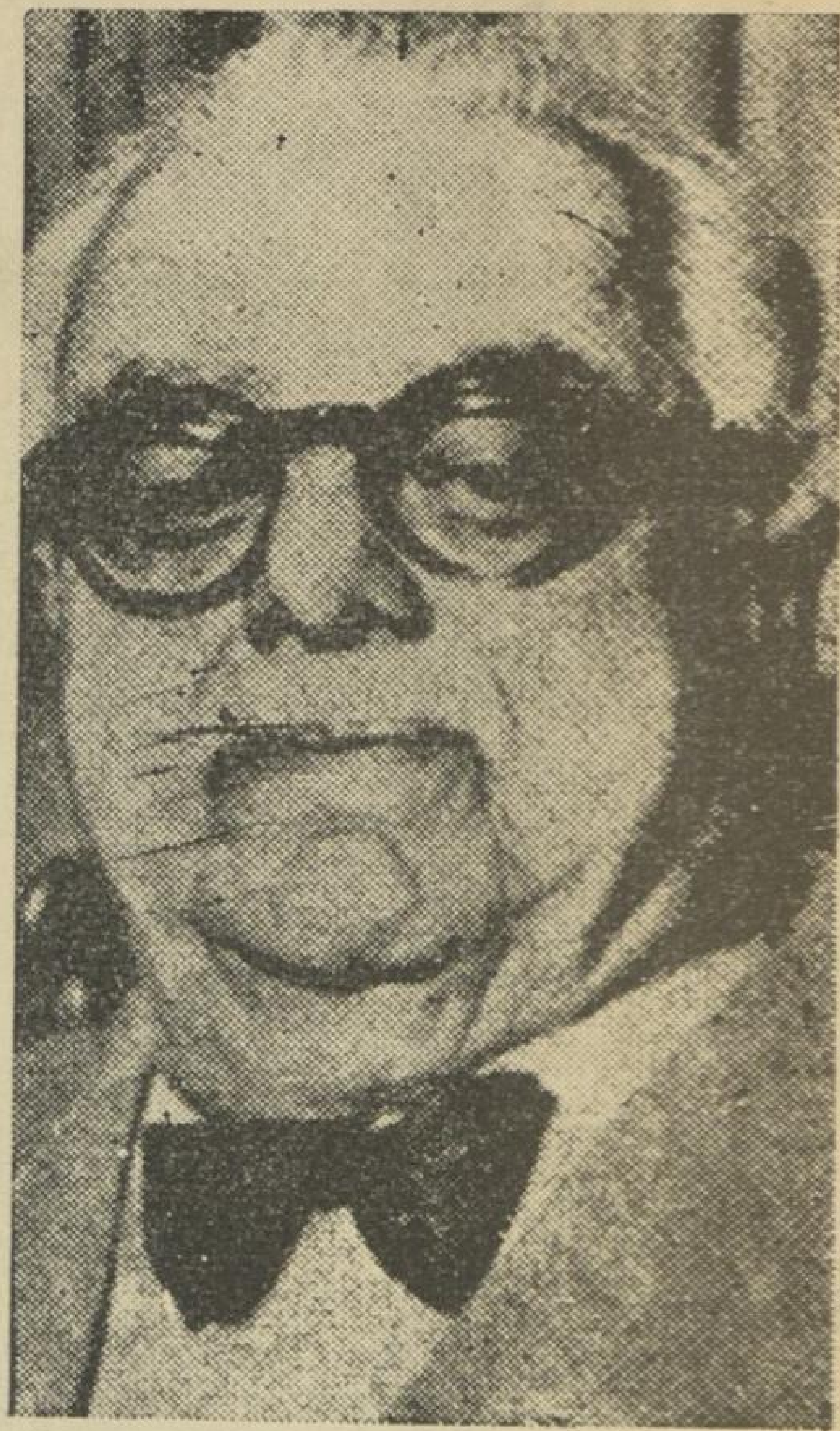
مہاتماجی کی ٹال مٹول اور ہر مرتبہ کانگریس کے فارمولے پر اصرار سے تنگ آکر سر محمد شفیع نے ہمت کی۔ اور دوسری اقلیتوں کے نمائندوں سے بات چیت کر کے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو ایک سمجھوتہ وزیر اعظم کو پیش کر دیا جس پر سکھوں کے سوا باقی تمام اقلیتوں کے دستخط تھے۔ لیکن اصل مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تھا جو دوسری اقلیتوں کے ساتھ سمجھوتے سے حل نہ ہوتا تھا۔ ۱۳ نومبر ۱۹۳۱ء کو مہاتما گاندھی نے اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاس میں یہ اعلان کر دیا کہ سمجھوتے کے لیے میری تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اس ناکامی کی ذمہ داری حکومت برطانیہ پر ڈالتے ہوئے آپ نے اپنی دلیل کو دہرایا اور فرمایا کہ مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قدم آنے سے پہلے ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ جب تک برطانوی حکومت ہمارے درمیان پھوٹ ڈلوانے کے لیے موجود ہے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ جب ملک آزاد ہو جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ ہندو مسلمان سکھ۔ یورپین اور اینگلو انڈین سب یک جان ہو جائیں گے۔ یعنی اگر ملک کو غیر مشروط طور پر کانگریسی اکثریت کے حوالے کر دیا جائے تو فرقہ وارانہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

اس تقریر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ برطانوی حکومت نے اس کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے جن لوگوں کو جمع کیا ہے وہ تمام مسلمانوں کی صحیح نمائندگی ہی نہیں کرتے اس کا جواب سر محمد شفیع نے دیا۔ اور اس تلخ بحث پر اقلیتی سب کمیٹی کی کارروائی ختم ہوگئی لیکن آئین مرتب کرنے کی خاطر فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی نہ کوئی تصفیہ بہر حال ضروری تھا اس ضرورت کے پیش نظر آخر تمام پارٹیوں نے وزیر اعظم کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ایک ثالث کی حیثیت سے اس کا جو فیصلہ مناسب سمجھیں کر دیں۔ یہ تجویز سر محمد شفیع ہی نے پیش کی وہ مسلم مندوبین کی جانب سے یہ اعلان اس سے پہلے کر چکے تھے کہ سمجھوتہ کی خاطر مسلمان بدرجہ آخر کس حد تک جانے کو تیار ہیں۔ آپ نے مسلم ڈیلی گیشن کا آخری موقف یہ بتایا کہ

(۱) پنجاب میں مسلمانوں کو جداگانہ حلقوں کے ذریعے کل ایوان کا ۴۹ فیصد دے دیا جائے۔ لیکن کچھ مخلوط حلقے خاص مفادات کی نمائندگی کے لیے ہوں جن کے ذریعے مسلمان پورے ایوان میں کم از کم ۵۱ فیصد نمائندگی حاصل کر لیں۔

(۲) اسی طرح بنگال میں مسلمانوں کو جداگانہ حلقوں کے ذریعے پورے ایوان کا ۴۸ فیصد دے کر انہیں خاص مفادات کے مخلوط حلقوں کے ذریعے اکثریت حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔

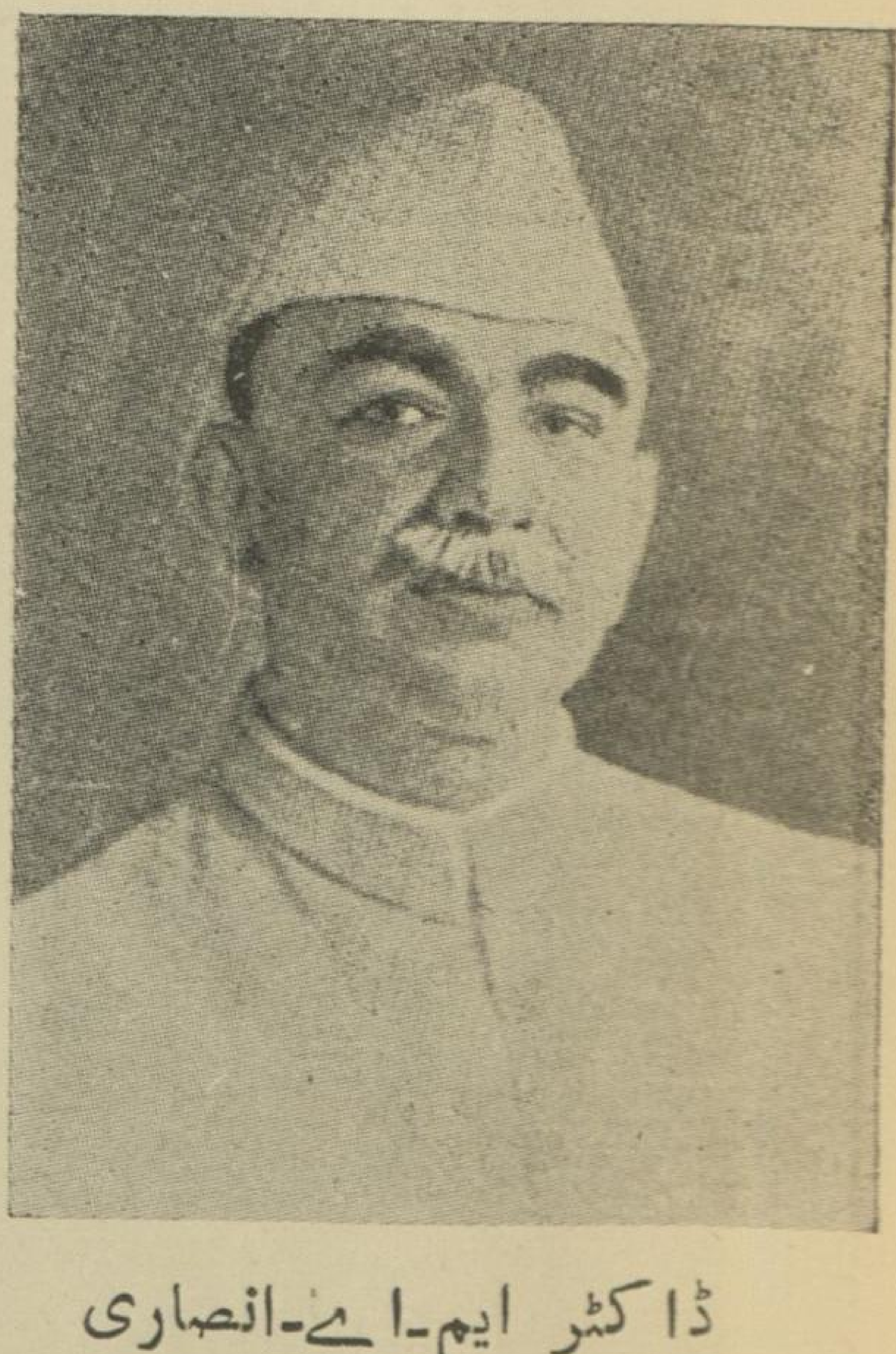
(۳) مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب نمائندگی جداگانہ انتخاب کے ذریعے وہی رہے جو لکھنؤ پیکٹ میں مقرر تھا۔ سر فضل حسین حکومت ہند میں اپنے ساتھیوں کو اس فارمولے کی پوری حمایت پر متفق کر چکے تھے۔



ہز ہائینس سر آغا خان



سر محمد شفیع



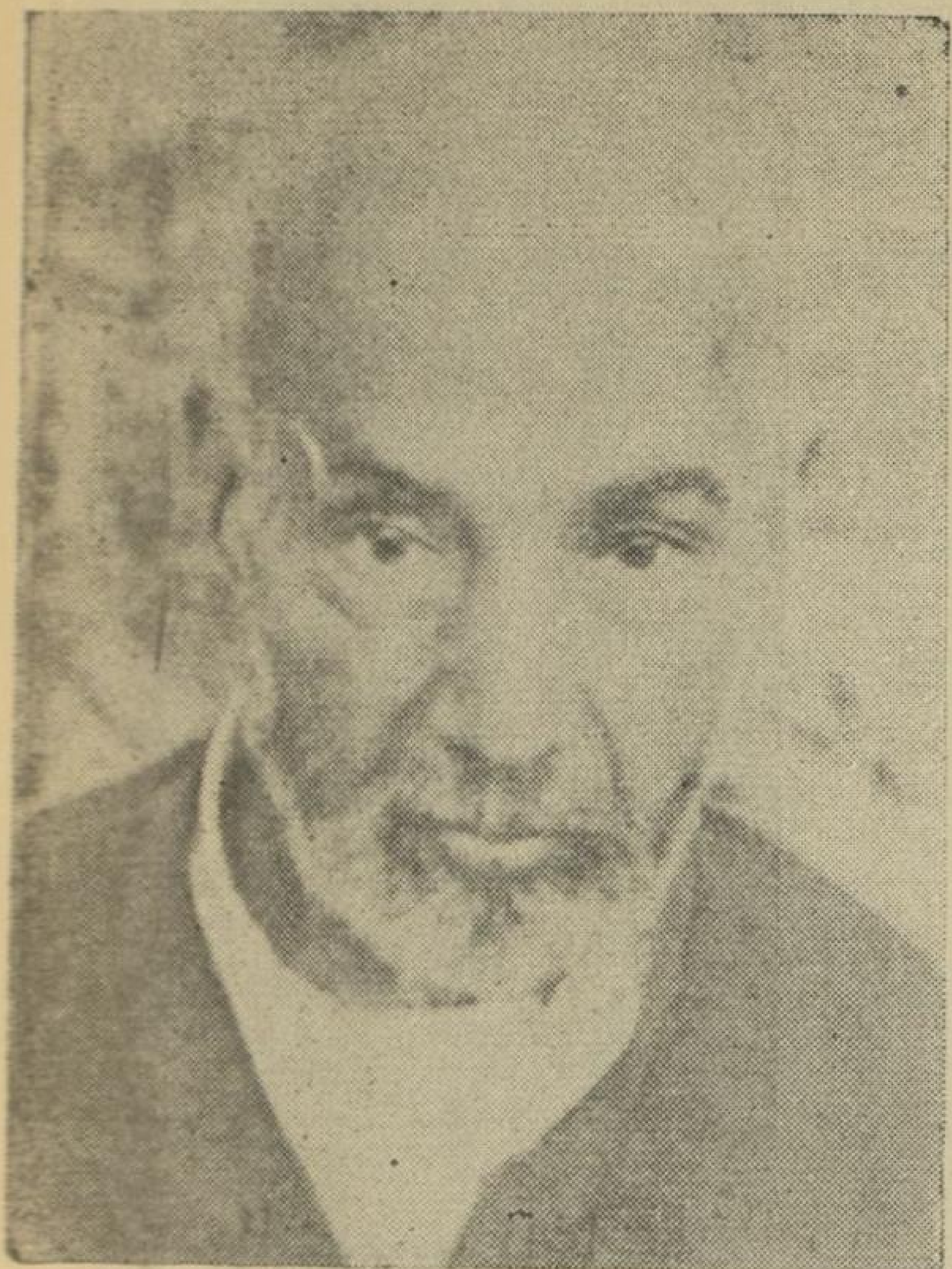
ڈاکٹر ایم۔اے۔انصاری



چودھری رحمت علی
جنھوں نے سب سے پہلے ''پاکستان''
کے نام سے ایک آزاد مسلم مملکت
کی تجویز پیش کی



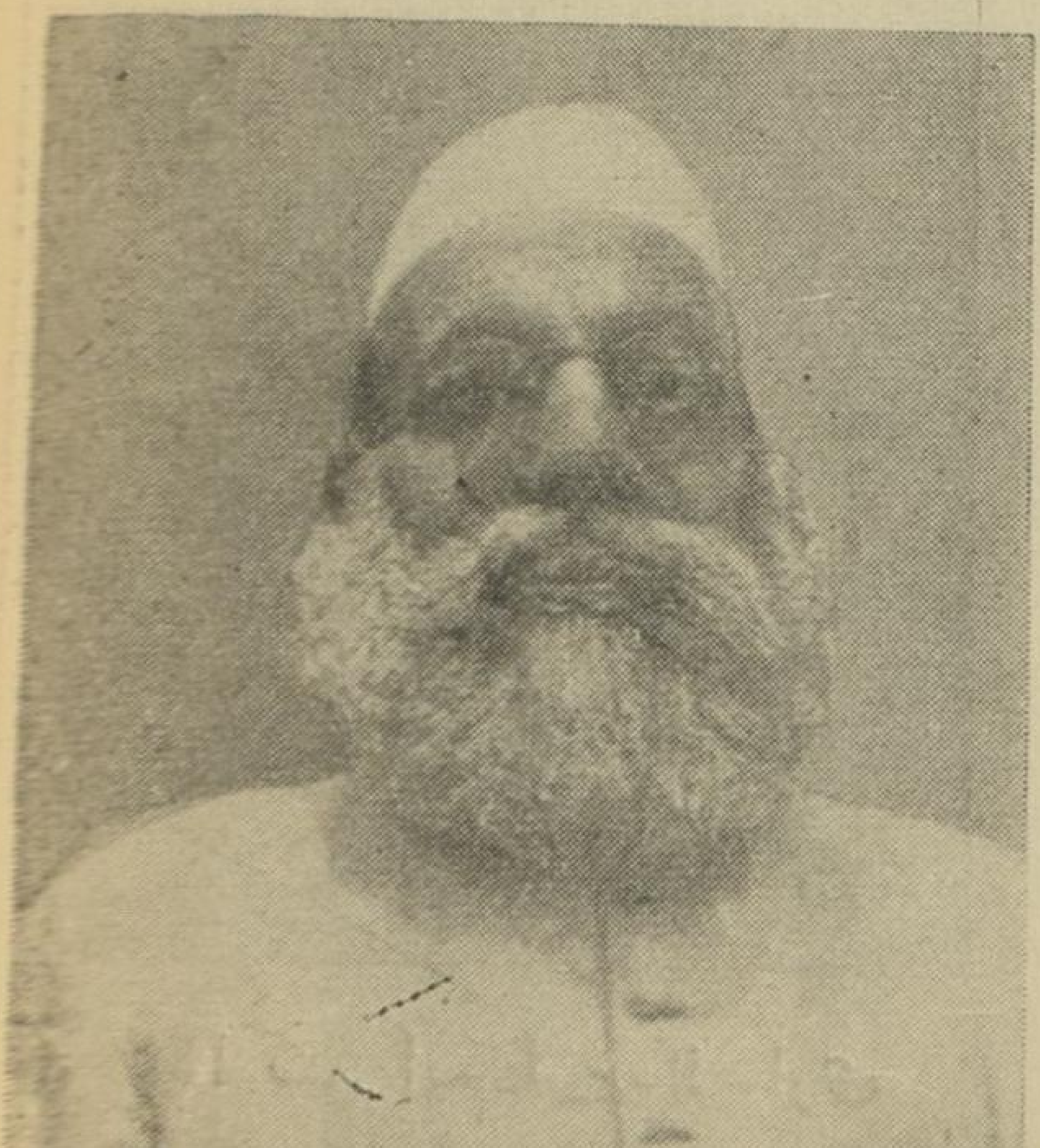
علامہ سر محمد اقبال



مولانا ظفر علی خان



سید غلام بھیک نیرنگ



سید فضل الحسن حسرت موہانی

٣٢۔ صوبہ سرحد کو کانگریس کی آغوش میں کس طرح دھکیلا گیا

مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے آئین پسند لیڈر صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات دلانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں صوبہ سرحد کے اندر ایسے واقعات پیش آئے کہ یہ مسلم صوبہ مسلمانوں کی سیاست سے کٹ کر کانگریس کی سیاست کے زیر اثر آگیا۔ اور اس کے بعد قیام پاکستان تک اس صوبے کی سیاست میں کانگریس کا بہت مؤثر عمل دخل رہا۔

جب پنجاب کو انگریزی حکومت کے مقبوضہ ہندوستان میں شامل کیا گیا تو صوبہ سرحد پنجاب ہی کا ایک حصہ تھا۔ یہ صوبہ اسی شکل میں نصف صدی تک قائم رہا پھر صوبہ سرحد کو ۱۹۰۱ء میں پنجاب سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شمال مغربی سرحد کی حفاظت کی غرض سے انگریزی حکومت اس علاقے میں نیم فوجی حکومت قائم رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں آئینی اصلاحات آتی رہیں۔ لیکن صوبہ سرحد کو ان سے محروم رکھا گیا۔ یہاں تک کہ جب دوسرے صوبوں میں نظم و نسق کا نصف حصہ منتخب شدہ وزیروں کے ذریعے کونسلوں کے ماتحت کر دیا گیا تو صوبہ سرحد میں کوئی منتخب شدہ میونسپل کمیٹی بھی موجود نہ تھی۔ بڑی مشکل سے صرف یہاں [illegible] شہر کی میونسپل کمیٹی میں سرکاری اور نامزد ممبروں کے ساتھ چند منتخب شدہ ممبروں کو جگہ دی گئی۔

یہ صوبہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک قبائلی علاقہ جہاں قبائل کو نیم خود مختاری حاصل تھی۔ ان پر ان کے سردار اور جرگے حکومت کرتے تھے۔ اور ان سرداروں کو انگریزی حکومت کے پولیٹیکل ایجنٹ قابو میں رکھتے تھے۔ دوسرا علاقہ ان اضلاع پر مشتمل تھا۔ جو ایک چیف کمشنر کے ذریعے حکومت ہند کے ماتحت تھے۔ قبائلی علاقے سے متعلق پولیٹیکل ایجنٹوں کا سربراہ بھی یہی چیف کمشنر تھا۔ جہاں تک ان "آئینی" اضلاع کا تعلق تھا۔ حکومت کی پالیسی اس مفروضے پر مبنی تھی کہ چند بڑے بڑے جاگیردار اور خوانین آسودہ حال اور مطمئن اور حکومت کے وفادار رہیں۔ تو عوام کا فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لہذا صوبے میں

سکول ہسپتال اور اقتصادی ترقی کے مواقع مہیا کرنے کی جانب بہت کم توجہ دی گئی اور سرحد پر جو فوج رکھنی پڑتی تھی اسے حکومت کا دبدبہ قائم رکھنے کا کافی موثر ذریعہ سمجھا جاتا رہا۔ لیکن جو نئی تبدیلیاں دوسرے صوبوں میں آ رہی تھیں وہ صوبہ سرحد کے لوگوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہیں۔

ستمبر ۱۹۲۹ء میں ایک شخص سید قاسم شاہ نے صوبہ سرحد میں ایک قطعاً غیر سیاسی تنظیم افغان جرگہ کے نام سے قائم کی جسے مقاصد کے اعتبار سے غیر سرکاری دیہات سدھار کمیٹی کہا جا سکتا تھا۔ اس کے پروگرام میں کسانوں کو مقدمہ بازی، انتقامی جرائم اور مسرفانہ رسوم سے روکنا اور انہیں اپنی اخلاقی اور اقتصادی اصلاح پر آمادہ کرنا تھا۔ اس "افغان جرگہ" کے ماتحت دیہات میں رضاکار مقرر کیے گئے جنہیں "خدائی خدمت گار" کا نام دیا گیا۔ چونکہ ان کی وردی میں سرخ قمیص شامل تھی۔ اس لیے بعض لوگوں نے انہیں "ریڈ شرٹ" (سرخ پوش) کہنا شروع کر دیا۔ عوام کے دبے ہوئے جذبات کو اپنے اظہار کا ایک بھلا بُرا ذریعہ ملا اور یہ تنظیم جنگل کی آگ کی طرح دیہات میں پھیل گئی۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تو اس تنظیم کے تین چار ممبر جن میں خان عبدالغفار خاں بھی شامل تھے۔ اس اجتماع میں تماشائیوں کے طور پر شامل ہوئے۔ اور وہاں سے ایک نیا تاثر اپنے ساتھ لے گئے۔ شراب نوشی کی روک تھام ان کے پروگرام میں پہلے سے شامل تھی۔ اس کے ساتھ انہوں نے شراب کی دکانوں پر پکٹنگ شروع کرنے کا ارادہ کر لیا۔

صوبائی حکومت ہر قسم کی تنظیم کو مشتبہ نگاہ سے دیکھتی تھی۔ جب اسے پکٹنگ کے پروگرام کی اطلاع ملی تو اس سے پیشتر کہ کسی ایسے پروگرام کو عمل میں لایا جاتا (ممکن تھا کہ اس پر بالآخر عمل کیا ہی نہ جاتا) حکومت نے پیش بندی کے طور پر "خدائی خدمتگار" تنظیم کے نو افراد کو پشاور میں اور دو کو پشاور سے باہر گرفتار کر لیا۔ ان میں خان عبدالغفار خاں بھی شامل تھے۔ پشاور کے گرفتار شدگان کو جب پولیس کی لاری تھانے لیجا رہی تھی تو لاری راستے میں خراب ہو گئی اور انہیں پیدل پولیس کی حراست میں چلنا پڑا۔ ان کے ساتھ ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

صوبہ سرحد کی نیم فوجی حکومت نے محض اتنی بات پر فوجی طاقت کے مظاہرے کا بندوبست کر لیا۔ دو بکتر بند گاڑیاں آگئیں۔ اور جب ہجوم تھانے کے قریب پہنچا تو بکتر بند گاڑیوں کو ہجوم کے اندر سے گزرنے کا حکم مل گیا۔ ایک درجن کے قریب انسان ان کے نیچے کچلے گئے۔ ہجوم نے مشتعل ہو کر ان گاڑیوں پر حملہ کیا تو ہجوم پر فائر کئے گئے۔ ہجوم منتشر ہوا اور پھر جمع ہو گیا۔ پھر فائرنگ ہوئی۔ اس طرح دو تین گھنٹے تک ہوتا رہا۔ ہجوم نے ان گاڑیوں کو آگ لگا دی۔ لیکن ان کی فائرنگ سے سرکاری اعلان کے مطابق تیس اور غیر سرکاری بیانوں کے مطابق ڈیڑھ سو کے قریب افراد ہلاک ہو گئے۔

معاملہ یہیں ختم نہ ہوا۔ حکام نے چھاؤنی سے گڑھوال رائفلز کی دو پلٹنیں منگالیں۔ انہیں ہجوم پر فائرنگ کر کے اسے منتشر کرنے کا حکم ملا۔ لیکن ان سپاہیوں نے نہتے ہجوم پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ حکام کے لیے یہ صورت حال بالکل غیر متوقع اور بہت ہی پریشان کن تھی۔ فوج کو فوراً چھاؤنی میں واپس بھیج کر شہر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ پشاور شہر میں ۲۴ اپریل سے ۴ مئی تک حکومت کا نظم و نسق معطل رہا۔ ۴ مئی کو گورا فوج نے شہر پر دوبارہ قبضہ کیا۔ اور حکومت کے بیان کے مطابق وہاں "امن و امان" قائم کیا گیا۔ لیکن حکومت کی غیر موجودگی میں شہر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ خان عبدالغفار خان اور ان کے چند ساتھیوں کو مقدمات کی سرسری سماعت کے بعد قید کی سزائیں دے دی گئیں۔

ان واقعات سے نہ صرف صوبہ سرحد کے دوسرے "آئینی" اضلاع میں عوام کے جذبات مشتعل ہوئے اور مظاہرے اور گرفتاریاں ہوئیں۔ اور بعض جگہ گولیاں چلیں۔ بلکہ قبائلی علاقے کے لوگوں نے لشکر جمع کر کے بار بار سرکاری چوکیوں پر حملے کیے اور فوج نے ان پر بمباری کی۔

اگست ۱۹۳۰ء میں پشاور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ جو جنوری تک قائم رہا۔ اس طرح صوبہ کی سیاست ایک ہی جست میں آئین پسندانہ مطالبات کی حد سے گزر کر کانگریس کی سول نافرمانی کے پروگرام پر چل پڑی۔ خان عبدالغفار خان نے پہلی مرتبہ قید سے رہائی کے بعد مہاتما گاندھی سے ۱۹۳۱ء میں اس زمانے میں ملاقات کی۔ جب مہاتما جی اور

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو دوسری گول میز کانگریس میں شرکت کے سوال پر غور کرنے کے لیے رہا کیا گیا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ایک طرف خان عبدالغفار خاں کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ پٹھانوں کو انگریز کی استبدادی حکومت سے نجات دلانے کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ اس مقصد کو کانگریس کی جنگ آزادی کے مقصد میں ضم کر دیا جائے۔ دوسری طرف مہاتما جی نے اس بات کا انتظار کیے بغیر کہ "خدائی خدمت گار" تنظیم باضابطہ اپنے آپ کو کانگریس کے ساتھ وابستہ کرے۔ اس تنظیم کی پوری سرپرستی اور امداد کو عملاً کانگریس کے مقاصد میں شامل کر لیا ۱۹۳۱ء میں خان عبدالغفار خاں نے صوبہ سرحد کے دیہاتی علاقوں کا طوفانی دورہ کیا۔ اور اپنے لیے "خدائی خدمت گار" تنظیم میں وہی مقام حاصل کر لیا۔ جو مہاتما گاندھی کو کانگریس میں حاصل تھا۔ پھر وہ مسلسل کانگریس کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے۔ اور ان کی تنظیم قیام پاکستان تک کانگریس کا ایک حصہ بنی رہی۔

یہ کہنا غلط نہیں کہ حکومت ہند نے خود اپنی بندوقوں اور سنگینوں کے ذریعے صوبہ سرحد کو کانگریس کی آغوش میں دھکیل دیا۔ اور اس ۹۵ فی صد مسلم آبادی کے صوبے کی سیاست کو ہندو کانگریس کی سیاست کا آلہ کار بنا دیا۔ اس زمانے کی مسلم قیادت بھی اس قابل ثابت نہ ہوئی کہ وہ صوبۂ سرحد کے ان حالات میں وہاں کے عوامی جذبات کے ساتھ کوئی مضبوط رشتہ قائم کر سکتی۔

۲۴۔ مسلم لیگ کی تنظیم میں ابتری

گول میز کانفرنس کے زمانے میں جو جماعتیں مسلمانوں کے آئینی مطالبات کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ ان کی تنظیم اندر سے کھوکھلی تھی۔ اس کا مضحکہ خیز ثبوت آل انڈیا مسلم لیگ نے بہت جلد پیش کر دیا۔ مسٹر جناح نے ذرا پیٹھ پھیری تو مسلم لیگ سخت ابتری کا شکار ہو گئی۔ یہ غنیمت تھا کہ دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخر میں آغا خاں کے زیر صدارت جو اجتماع آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مستقل شکل دے دی تھی۔ اس نام سے ایک پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ قائم رہا۔ اور جب مسلم لیگ کا پلیٹ فارم طفلانہ حرکتوں کا میدان بن گیا تو مسلم کانفرنس مسلمانوں کی نمائندگی کا فرض بظاہر باوقار طریق پر ادا کرتی رہی۔ گو مسلمان لیڈروں کا ایک طبقہ اس جماعت کو حکام پرستوں کی جماعت سمجھتا رہا۔

مسٹر جناح کی غیر حاضری میں مسلم لیگ صرف ایک سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۳۰ء میں سنجیدہ طریق پر کر سکی۔ یہ اجلاس وہی تھا جو الہ آباد میں منعقد ہوا تھا جس میں علامہ اقبال نے اپنا مشہور خطبۂ صدارت دیا تھا۔ اس سے اگلے سالانہ اجلاس کے لیے مسلم لیگ کونسل نے چودھری ظفر اللہ خاں کو صدر چن لیا۔ یہ انتخاب سر فضل حسین کا تھا۔ سر فضل حسین نے جن لوگوں کو اپنے معاون کے طور پر مختلف عہدوں اور مناصب کیلئے اپنے ذہن میں چن رکھا تھا۔ ان میں چودھری ظفر اللہ خاں کو وہ سب سے قابل سمجھتے تھے۔ ان کی قابلیت کی بات درست تھی۔ لیکن سر فضل حسین ایک اہم بات کو نظر انداز کر رہے تھے۔ چودھری ظفر اللہ احمدی تھے۔ اور اپنے نزدیک غیر احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ اور صرف یہ بات چودھری صاحب کے انتخاب کو مسلمانوں کے نزدیک ناقابل قبول بنانے کے لئے کافی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ء

کو ختم ہوئی اور چودھری ظفر اللہ نے لندن سے روانگی میں جلدی کی تاکہ بروقت پہنچ کر مسلم لیگ کی صدارت کے لیئے تیار ہو جائیں۔ لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر کے آخری ہفتے میں دہلی میں ہونے والا تھا۔ وہاں اجلاس کی صبح کو مسلمانوں کا ایک ہجوم جلسہ گاہ کے قریب جمع ہو گیا۔ اور اجلاس پر حملہ اور قبضہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ چودھری صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بہ عجلت آپس میں مشورہ کیا۔ اور کسی اور جگہ جلسہ کرنے کے لیئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہجوم کا ارادہ تھا۔ کہ انہیں کہیں بھی جلسہ نہ کرنے دے۔ لہٰذا وہ بھی ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ اب آگے آگے مسلم لیگ تھی۔ اور اس کے پیچھے ہجوم، لیکن مسلم لیگ موٹر کاروں میں تھی۔ اور ہجوم پیدل، موٹر کاریں ایک جگہ رکیں۔ وہاں جلسہ کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا۔ لیکن یہ مقام بھی غیر محفوظ تھا۔ ہجوم کے پہنچنے سے پہلے مسلم لیگ وہاں سے آگے روانہ ہو گئی۔ بالآخر اس نے خان صاحب نواب علی کے پرائیویٹ مکان میں پناہ لی اور وہاں بیٹھ کر اپنی کارروائی شروع کی۔ ہجوم کو یہ پتہ ہی نہ چل سکا۔ کہ کارروائی کہاں ہو رہی ہے۔ اگلی صبح اخباروں میں چودھری ظفر اللہ کا خطبۂ صدارت اور مسلم لیگ کی قراردادوں کے متن چھپ گئے۔ ایک قرارداد ایسی بھی تھی۔ جس میں صدر کو اس بات کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے عہدہ داروں کے ساتھ دونوں جماعتوں کو ملا کر ایک جماعت بنانے کے مقصد کے لیے گفت و شنید کریں۔ ایک کمیٹی اس معاملے میں صاحب صدر کی امداد کے لیے مقرر کر دی گئی تھی۔

پھر بعض لوگوں نے دعوے کیا کہ جن لوگوں نے اصل جلسہ گاہ سے بھاگ کر اور ایک خفیہ مقام پر بیٹھ قرار دادیں پاس کیں۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ نہ تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ ہم ہیں۔ کیونکہ ہم نے مقررہ پروگرام کے مطابق اسی جلسہ گاہ میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کیا۔ اور مسلم لیگ کا صدر مسٹر عبد العزیز کو چن لیا۔ مسٹر عبد العزیز پشاور کے ایک بیرسٹر تھے۔ جو کئی سال سے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں پابندی کے ساتھ شرکت کر رہے تھے۔ اس طرح کا غذ پر دو مسلم لیگیں قائم ہو گئیں۔ لیکن چودھری ظفر اللہ خاں اپنے لیے حالات سازگار نہ پا کر عملاً میدان سے ہٹ گئے اور لیگ کے نام پر مسٹر

عبدالعزیز کا قبضہ قائم رہا۔

کچھ عرصے کے بعد مسٹر عبدالعزیز نے لیگ کونسل کا جلسہ کرنا چاہا کوئی نہیں جانتا تھا کہ مسٹر عبدالعزیز کب کس کے ہاتھوں میں کھیلنے لگ گئے۔ لہٰذا سر فضل حسین نے اپنے بعض آدمیوں کو اشارہ کیا کہ لیگ کونسل کے اجلاس میں لیگ کو توڑ دینے کی قرارداد پاس کرا دی جائے تاکہ یہ جماعت قانوناً ختم ہو جائے۔ اور مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے صرف ایک جماعت مسلم کانفرنس رہ جائے۔ ملک فیروز خاں نون نے اس قسم کی قرارداد پیش کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اور مسلم لیگ کونسل میں شرکت کے لیے ایک ٹیم تیار کی۔ پیرسٹر عبدالعزیز کو بھی یہ افواہ پہنچ گئی۔

انہوں نے کونسل کے دوسرے با اثر ممبروں کے پاس بھاگ دوڑ شروع کی جو لیگ کے وجود کو ختم کرنے کے خلاف تھے۔ اس سلسلہ میں وہ راجہ غضنفر علی خاں سے بھی دہلی میں ملے۔ راجہ صاحب کو ایک دلچسپ مشغلہ مل گیا۔ وہ نہ صرف مسٹر عبدالعزیز کے حامیوں میں شامل ہو گئے۔ بلکہ نون گروپ کی جنگی چالوں کا توڑ سوچنے کے لیے ان کے سرگرم مشیر بن گئے۔ انہوں نے مسٹر عبدالعزیز کے لیے مسلم لیگ کے آئین سے حوالے نکال کر ایک رولنگ تیار کر دی۔ اور عبدالعزیز صاحب نے اسے ٹائپ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اور ان کے مشورے کے مطابق آئینی ہتھیاروں کے علاوہ مار پیٹ کے امکان کے لیے بھی تیاری کر لی۔

جب اجلاس منعقد ہوا اور دوسری رسمی کارروائی کے بعد فیروز خاں اپنی قرارداد پیش کرنے کے لیے اٹھے۔ تو صاحب صدر کسی قدر جلد بازی کر گئے۔ ابھی ملک فیروز خاں اپنی تقریر کے تمہیدی فقرے ادا کر رہے تھے۔ کہ صاحب صدر نے اٹھ کر انہیں روکا اور اپنی رولنگ پڑھ دی۔ ملک صاحب پوچھنے لگے کہ آپ نے کس قرارداد کو خلاف قاعدہ قرار دیا ہے۔ میں نے ابھی کوئی قرارداد پیش ہی نہیں کی۔ صدر صاحب نے کہا میری مراد اس قرارداد سے ہے جو آپ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر کچھ بے معنی بحث ہوئی۔ اور ملک فیروز خاں اپنے ساتھیوں سمیت

واک آؤٹ کر گئے۔ لیکن باہر جا کر انہوں نے سوچا۔ کہ واک آؤٹ کرنا صحیح جنگی چال نہ تھی۔ وہ اور ان کی پارٹی پھر واپس آ گئے۔ ایک بجے پنچ کے وقت اجلاس دو گھنٹے کے لیے ملتوی ہونے والا تھا۔ راجہ غضنفر علی خاں نے صدر کے کان میں کہا کہ ہال پر قابض رہنا سب سے بڑی جنگی چال ہے۔ ممکن ہے ہماری غیر حاضری میں دشمن مورچے پر قبضہ کر لے۔ چنانچہ صدر صاحب نے اپنی تمام پارٹی کے لیے پھل، سینڈ وچ اور چائے لانے کے لیے آدمی بھیج دیئے۔ ملک فیروز خاں نون کی پارٹی پنچ سے جلدی جلدی فارغ ہو کر واپس آئی تو مسٹر عبدالعزیز کی پارٹی پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں موجود تھی۔ آخر مخالف پارٹی نے حملے کا طریقہ بدلا۔ صدر کے رویہ کے خلاف سخت احتجاجوں کے بعد سر شیر محمد نے (جنہوں نے گول میز کانفرنس میں فوجی پنشنروں کی نمائندگی کی تھی) ڈائس پر جا کر صدر پر حملہ کر دیا۔ اس پر ہال میں مکوں اور کرسیوں کی جنگ شروع ہو گئی اور تھوڑی دیر میں صدر عبدالعزیز کی پارٹی نے مخالف پارٹی کو ہال سے باہر نکال دیا۔ پھر پولیس آ گئی اور جلسہ مزید گڑبڑ کے بغیر جاری رہا۔

مسٹر عبدالعزیز کی مسلم لیگ کے علاوہ ایک اور آل انڈیا مسلم لیگ کلکتہ میں بن گئی۔ پھر دونوں مسلم لیگوں نے صوبائی لیگوں کا الحاق منظور کرنا شروع کیا۔ دو تین آدمی اکٹھے ہو کر اپنے آپ کو صوبائی لیگ کا نام دیتے تھے۔ اور کسی نہ کسی مرکزی لیگ سے الحاق کر لیتے تھے تاہم جلسوں کا تسلسل مسٹر عبدالعزیز کی لیگ ہی نے قائم رکھا وہ کچھ نہ کچھ خرچ کرتے رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا ڈھونگ قائم رہا۔ مسلم لیگ کی تنظیم میں یہ ابتری آخر اس وقت ختم ہوئی۔ جب مسٹر جناح نے اپریل ۱۹۳۴ء میں ہندوستان واپس تشریف لا کر اس جماعت کا چارج سنبھالا۔

۲۵- سول نافرمانی اور کمیونل ایوارڈ

گاندھی جی کی دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی سے پہلے ہی پنڈت جواہر لال نے یو-پی کے ایک مقامی مسئلے کے سلسلہ میں "مالیہ کی ادائیگی سے انکار" کی مہم چلانے کا فیصلہ کر لیا اور وائسرائے نے فوراً ایک آرڈیننس نافذ کر کے پنڈت جی کی گرفتاری کا حکم دیدیا۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خاں نے اس معاملہ میں پنڈت جی کا ساتھ دیا۔ وہاں نہ صرف گرفتاریاں ہوئیں۔ بلکہ کوہاٹ میں پولیس اور فوج کو فائرنگ کرنی پڑی۔

یہ حالات تھے جب گاندھی جی نے ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھا۔ انہیں حالات کی اطلاع پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور وہ اپنے طرز عمل کے متعلق سوچ بچار کرتے رہے تھے۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ وائسرائے کو ایک تار بھیجا۔

"صوبہ سرحد اور یو-پی کے نئے آرڈیننس، صوبہ سرحد میں فائرنگ اور دونوں صوبوں میں میرے عزیز دوستوں کی گرفتاریاں، یہ اچانک حالات ایسے ہیں جن کے لیے میں تیار نہ تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں انہیں حکومت کیساتھ دوستانہ تعلقات کے خاتمے کا نشان سمجھوں یا ابھی آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے مل کر کچھ رہنمائی حاصل کروں کہ مجھے کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے اور کانگریس کو کیا مشورہ دینا چاہیئے؟"

گاندھی جی کو توقع تھی کہ وائسرائے جواب میں گفت و شنید کا موقع پیدا کرے گا لیکن اب گاندھی جی کا سابقہ مقابلتاً نرم طبیعت لارڈ ارون کے بجائے لارڈ ولنگڈن سے تھا جو ایک ڈنڈے باز حاکم کی شہرت رکھتا تھا۔ (ارون اپریل ۱۹۳۱ء میں اپنے عہدے کا چارج لارڈ ولنگڈن کو دیکر ہندوستان سے رخصت ہو چکا تھا) مہاتما جی کے تار کا جواب نئے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کی جانب سے بہت خشک تھا: "حضور وائسرائے نے فرمایا ہے کہ وہ اور ان کی حکومت تمام سیاسی جماعتوں سے دوستانہ

تحفظات رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یو۔پی اور صوبہ سرحد میں کانگرس کی سرگرمیاں ان دوستانہ تحفظات کے منافی ہیں جن کا ہندوستان کا مفاد تقاضا کرتا ہے۔" مزید خط و کتابت ہوئی لیکن وائسرائے کا رویہ یہی رہا کہ پہلے سول نافرمانی بند کرو پھر مجھ سے بات کرو۔ لہٰذا گاندھی جی کے لیے پنڈت جواہر لال کی چلائی ہوئی مہم کا ساتھ دینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ سنتے آرڈیننس کی خلاف ورزی شروع ہو گئی۔ اور وائسرائے نے کانگریس کے مختلف اداروں کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اور پورے زور سے سول نافرمانی کا مقابلہ شروع کر دیا۔ خود گاندھی جی ۴؍ جنوری ۱۹۳۲ء کو گرفتار ہو گئے۔ اس سول نافرمانی میں گرفتاریاں بہت وسیع پیمانے پر ہوئیں۔ اور عورتوں نے سول نافرمانی میں خاص طور پر نمایاں حصہ لیا۔ پھر دہشت پسند انقلابیوں کی جماعت نے بم اور پستول سنبھال لیے، اور بنگال میں کئی دہشت پھیلانے والی کارروائیاں کیں۔

دسمبر ۱۹۳۱ء میں سر فضل حسین کو ایک خاص مشن پر ہندوستان سے باہر جانا پڑا۔ ان کی غیر حاضری میں سر محمدؐ شفیع کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا عارضی ممبر مقرر کر لیا گیا تھا۔ وہ ابھی اسی عارضی عہدہ پر تھے۔ کہ ۶؍ جنوری ۱۹۳۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ سر فضل حسین نے ۵؍ فروری کو دہلی واپس آ کر اپنا عہدہ سنبھالا۔ اس وقت کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک پورے زور سے جاری تھی۔ اور فساد و تشدد کے واقعات بھی رونما ہو رہے تھے۔ مسلمان لیڈروں کو لامحالہ یہ اندیشہ لاحق ہوا۔ کہ کانگریس کی اس مہم کا دباؤ کہیں اس ثالثی فیصلے پر اثر انداز نہ ہو جس کا اختیار دوسری گول میز کانفرنس میں برطانوی وزیر اعظم کو دے آئے تھے۔

اندرونی حالات کے علم کی بنا پر سر فضل حسین یہ اندازہ کر سکتے تھے۔ کہ فیصلہ اسی، فارمولے کے مطابق ہونے والا تھا۔ جو سر محمدؐ شفیع نے مسلمانوں کے آخری موقف کے طور پر پیش کیا تھا۔ لیکن فیصلے کے اعلان میں تاخیر شکوک و شبہات پیدا کرتی تھی۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کے بعض ممبروں نے کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں اس مضمون کی قرارداد پیش کرنے کا اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کو برطانوی وزیر اعظم پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے

مطالبات منوانے کے لیے "ڈائریکٹ ایکشن" کی مہم شروع کرنی چاہیئے۔ وائسرائے اتنا بے خبر تو نہ تھا کہ وہ مسلم کانفرنس کے خان بہادروں کو سول نافرمانی کا اہل سمجھ لیتا۔ لیکن اسے غالباً یہ بات سمجھائی گئی کہ اگر مسلم کانفرنس نے ایسی قرارداد پاس کر دی تو حالات سے فائدہ اٹھانے کے لئے مجلس احرار میدان میں کود پڑے گی۔ اور حکومت کو فی الواقعہ دو تحریکوں کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ مسلم کانفرنس کے اجلاس کی تاریخ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء مقرر تھی۔ وائسرائے پر اس نفسیاتی حملے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اجلاس سے دو دن پہلے ۱۹ مارچ کو ایک سرکاری اعلان ہوگیا جس میں برطانوی حکومت کی جانب سے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ فرقہ وارانہ فیصلے کے اعلان میں غیر ضروری تاخیر ہرگز روا نہ رکھی جائے گی۔ جتنی جلد ممکن ہوگا۔ برطانوی وزیر اعظم اپنی اخلاقی ذمہ داری پوری کریں گے۔

اس اعلان کی روشنی میں کانفرنس کی قرارداد اس طرح مرتب ہوئی کہ جون کے آخر تک فیصلے کا انتظار کیا جائے۔ اگر اس تاریخ تک وزیر اعظم نے کوئی فیصلہ نہ کیا تو ۳ جولائی کو کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں منعقد کیا جائے تاکہ وہ "ڈائریکٹ ایکشن" کا پروگرام مرتب کرے۔ اس کانفرنس کی صدارت علامہ اقبال کر رہے تھے۔

جون کے آخر تک وزیر اعظم کے فیصلے کا اعلان نہ ہوا تو علامہ اقبال نے مجلس عاملہ کے ممبروں سے غیر رسمی مشورہ کرکے اس کا اجلاس کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا۔ انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ اعلان آنے ہی والا ہے۔

آخر وزیر اعظم کا اعلان ۱۴ اگست کو شائع کیا گیا۔ اور مسلمان لیڈروں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ اعلان صرف صوبائی نشستوں پر حاوی تھا۔ مرکزی اسمبلی کے متعلق فیصلہ ابھی باقی تھا۔ جس حد تک فیصلہ ہو گیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے مطالبات کے حرف بہ حرف مطابق تو نہ تھا لیکن ان کے خلاف بھی نہ تھا۔ مسلم کانفرنس کا ملتوی شدہ اجلاس ۳۰ اگست کو دہلی میں ہوا۔ اس نے وزیر اعظم کے فیصلے کو مسلمانوں کے مطالبات سے کم قرار دیا۔ لیکن یہ بات کہے بغیر کہ ہم اسے قبول کرتے ہیں۔ قبول کر لیا۔ اور زیادہ زور اس بات پر دیا کہ جو نکات ابھی فیصلہ طلب ہیں۔ ان کا تصفیہ مسلمانوں کے مطالبات

کے مطابق ہونا چاہیئے وزیر اعظم کے ثالثی فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) کے باقی ماندہ حصہ کا اعلان ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کیا گیا۔

جس حد تک نئے آئین کے سلسلہ میں مسلمانوں کے مطالبات مان لئے گئے تھے۔ اسے مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مسلمانوں کو مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں ہر جگہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے نمائندگی دینا منظور کر لیا گیا۔

(۲) مرکزی اسمبلی میں ان کی نمائندگی کا تناسب پورے ایوان کا ایک تہائی مقرر کر دیا گیا۔

(۳) ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ انہیں آبادی کے تناسب سے زائد نمائندگی کی وہی رعایت دی گئی۔ جو ۱۹۱۶ء کے "لکھنؤ پیکٹ" میں انہیں حاصل تھی۔ ان صوبوں میں سب سے اہم یوپی تھا۔ جو کئی لحاظ سے اسلامی تہذیب اور کلچر کا مرکز تھا۔ علیگڑھ یونیورسٹی اور دیوبند کا مدرسۃ العلوم اور مسلمانوں کے کئی مشہور علمی اور مذہبی ادارے اسی صوبہ میں تھے۔ یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب صرف ۱۴ فیصد تھا۔ ان کے لیے تیس فیصد نمائندگی کی رعائت بحال رکھی گئی۔ باقی اقلیتی صوبوں میں مراعات کی صورت کم و بیش یہی تھی۔

(۴) پنجاب کی مجوزہ اسمبلی کی کل ایک سو پچھتر نشستوں میں چھیاسی نشستیں مسلمانوں کے لئے علٰحدہ انتخاب کے ذریعے مخصوص کر دی گئیں۔ کچھ نشستیں مخلوط انتخاب کے ذریعے پر ہونے والی تھیں۔ ان میں کم از کم چار پر مسلمانوں کا قبضہ یقینی تھا۔ یعنی مجموعی طور پر اسمبلی میں باقی تمام بیاسی ممبروں کے مقابلے میں مسلمان ممبروں کی تعداد نوّے ہو جاتی تھی۔

(۵) بنگال اسمبلی میں کل دو سو پچاس نشستوں میں ایک سو انیس مسلمانوں کے لیے جداگانہ حلقوں کے ذریعے مخصوص کر دی گئیں۔ سولہ نشستیں مخلوط انتخاب کے ذریعے پر ہونے والی تھیں۔ لیکن اس بات کی امید نہ ہو سکتی تھی کہ مسلمان ان کے

ذریعہ پنجاب کی طرح اکثریت حاصل کرسکیں گے تاہم ان کی پوزیشن "لکھنؤ پیکٹ" کی چالیس فی صد کے مقابلہ میں بہت بہتر ہوگئی تھی۔

(۶) سندھ کو غیر مشروط طور پر بمبئی سے الگ کرکے ایک علیحدہ صوبہ بنانا منظور کرلیا گیا۔ صوبہ سرحد کو پہلے ہی دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دیدیا گیا تھا۔

(۷) مرکزی ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے ایک چوتھائی حصہ مقرر کردیا گیا (ان کا مطالبہ ایک تہائی کے لئے تھا۔)

(۸) یہ اصول گول میز کانفرنس ہی میں طے ہوگیا تھا۔ کہ مرکز کی ساخت وحدانی طرز کی نہ ہوگی۔ (جیسا کہ کانگریس اس سے پہلے مطالبہ کرتی رہی تھی) بلکہ فیڈرل طرز کی ہوگی۔ اور صوبے آئینی حدود کے اندر خود مختار ہوں گے۔ لیکن نئے ایکٹ کے اس حصے کی جو مرکز کی ساخت سے تعلق رکھتا تھا تکمیل کی نوبت ہی نہ آئی۔

کانگرس کی سول نافرمانی کی تحریک چلتی رہی۔ گاندھی جی جیل میں رہے۔ لیکن قید کی حالت میں بھی وہ ایک کارنمایاں کر گئے۔ وزیراعظم کے فیصلے میں اچھوتوں کو الگ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے نمائندگی دی گئی تھی۔ مہاتما جی نے اس کیخلاف احتجاج کیا۔ اور مرن برت رکھ لیا۔ جس نے ملک میں ہلچل پیدا کردی۔ ہندوؤں کے کئی ممتاز افراد نے گاندھی جی اور اچھوتوں کے لیڈر امبیدکار کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی۔ بالآخر مسٹر راجگوپال اچاریہ کے تجویز کردہ فارمولے پر سمجھوتہ ہوگیا۔ اچھوتوں کے لیے زیادہ نشستیں مخصوص کردی گئیں۔ لیکن ان کے حلقہ ہائے انتخاب ہندوؤں کے ساتھ مخلوط کردیئے گئے۔ حکومت نے یہ سمجھوتہ مان لیا۔ اور گاندھی نے مرن برت ختم کردیا۔

۱۹۳۲ء کے آخر تک کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک عملاً ختم ہوگئی۔ عام سول نافرمانی کی یہ تیسری تحریک ایک لحاظ سے پہلی دو تحریکوں سے زیادہ ناکام ثابت ہوئی۔ پہلی تحریک جو سنہ ۱۹۲۱ء میں شروع کی گئی تھی۔ مہاتما جی نے چوراچوری کے واقعہ کے بعد خود بند کردی تھی اور ایسے وقت بند کی تھی۔ جب یہ تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ دوسری

تحریک "گاندھی۔ اروِن سمجھوتہ" کے ذریعے ختم ہوئی تھی۔ لیکن اس تیسری تحریک کے سلسلے میں لارڈ ولنگڈن نے کسی سمجھوتے کی بات چیت سے صاف انکار کر دیا اور سمجھوتے کے لئے ہر کوشش کا ایک ہی جواب دیتا رہا۔ پہلے سول نافرمانی کو غیر مشروط طور پر ختم کرو۔ پھر مجھ سے بات کرو۔

آخر ۸ رمئی ۱۹۳۳ء کو گاندھی جی نے تزکیہ نفس کے لیے اکیس دن کا برت رکھنے کا اعلان کیا۔ اور حکومت نے انہیں جیل سے رہا کر دیا۔ برت سے فارغ ہو کر گاندھی جی نے ۱۲ر جولائی کو پونا میں کانگریسی لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس بلائی۔ وائسرائے کے ساتھ بات چیت کے لیے پھر سلسلہ جنبانی کی گئی۔ لیکن وائسرائے نے وہی جواب دیا۔ پھر گاندھی جی نے عام سول نافرمانی بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن یہ فیصلہ کیا کہ اگر اس اعلان کے باوجود کوئی شخص انفرادی حیثیت سے سول نافرمانی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ نے یہ اعلان کر دیا کہ کسی اور شخص کو سول نافرمانی کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فرض کفایہ تمام کانگریسیوں کی طرف سے میں اکیلا ہی ادا کرتا رہوں گا۔

کانگریسی لیڈروں نے پہلی تحریک کے خاتمے پر بھی یہ کیا تھا۔ کہ پارلیمانی پروگرام شروع کر کے اپنے پیروؤں کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔ سول نافرمانی کی دوسری تحریک ختم ہی گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کے لیے کی گئی تھی۔ اب تیسری تحریک کے ختم ہونے پر کانگریسی لیڈروں نے پھر پارلیمانی پروگرام کی جانب توجہ کی۔ ایک سال کے بعد مرکزی اسمبلی کے نئے انتخاب ہونے والے تھے۔ لہٰذا ان کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔

۲۶- پھر وہی منزل وہی راستہ

دوسری گول میز کانفرنس کے عارضی فیصلوں اور "کمیونل ایوارڈ" کی بنیاد پر ہندوستان کے نئے آئین کا ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے تیسری گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۲ء میں بلائی۔ اس کانفرنس کے ممبروں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ اور ان میں صرف ایسے لوگ شامل تھے۔ جو حکومت کے منشا کے مطابق آئین سازی کے کام میں تعاون کرنے والے تھے۔ مسٹر جناح دوسری گول میز کانفرنس ہی میں مجوزہ فیڈرل سکیم کی سخت مخالفت کر چکے تھے۔ وہ تیسری کانفرنس میں شریک نہ تھے۔ اس کانفرنس نے اپنے کام میں تیز رفتاری کا ثبوت دیا۔ اور دو تین مہینوں میں نئے آئین کی تفاصیل مرتب کر دیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۳ء میں برطانوی حکومت نے ایک قرطاس ابیض کی صورت میں شائع کر دیا۔ مجوزہ آئین کا بنیادی نقشہ وہی تھا۔ جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ یعنی فیڈرل نظام کے تحت صوبوں اور فیڈرل مرکز کے درمیان اختیارات کی حد بندی۔ صوبائی حکومتوں پر عوام کی نمائندہ وزارتوں کا کنٹرول لیکن فیڈرل حکومت میں گورنر جنرل کا تقریباً مکمل عمل دخل۔

مسٹر جناح لندن میں قانونی پریکٹس کرتے رہے۔ اور حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ جس قسم کا آئین بنایا جا رہا تھا وہ ان کے نزدیک ملک کی آزادی کے نقطۂ نگاہ سے سخت مایوس کن تھا۔ لیکن وہ اپنے عمر بھر کے انداز فکر پر قائم تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ جب تک ہندو اور مسلمان دونوں اس آئین کے خلاف مشترکہ جدوجہد کے لیے تیار نہ ہوں۔ اسے بدلوانا اور اس کی جگہ بہتر آئین حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ البتہ اب "کمیونل ایوارڈ" نے ہندو مسلم سمجھوتے کے لیے ایک ٹھوس بنیاد مہیا کر دی تھی۔ بشرطیکہ کانگریس حقیقت پسندی سے کام لے۔ اور اسی بنیاد پر مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے قدم

بڑھاتے۔ کمیونل وارڈ کو مسلمانوں نے عام طور پر قبول کر لیا تھا۔ اور اسے ان کی مرضی کے بغیر بدلا نہ جا سکتا تھا۔ اگر کانگریس فرقہ وارانہ مسئلے کے اس تصفیہ کو قبول نہیں کرتی تب بھی یہ فیصلہ قائم تھا۔ لیکن اگر کانگریس اسے قبول کر لے۔ کم از کم اس وقت تک کے لیے قبول کر لے۔ جب تک کسی اور متبادل بنیاد پر سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ تو جنگ آزادی کا آخری مورچہ فتح کرنے کے لیے کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و تعاون کا راستہ نکل سکتا تھا۔ کیا کانگریس یہ راستہ اختیار کرنے کو تیار ہوگی؟ مسلمانوں کا تعاون حاصل کیے بغیر اس کی سیاسی جد وجہد کا تجربہ کانگریس کے سامنے موجود تھا۔ کیا اب بھی کانگریس مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ایک بہت چھوٹا سا قدم اٹھانے کو تیار نہ ہوگی؟ ان حالات میں مسٹر جناح کو امید کی جھلک نظر آتی تھی۔

۱۹۳۳ء کے موسم گرما میں یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی۔ کہ کانگریس اپنی سول نافرمانی کی آخری مہم کی ناکامی کے بعد پھر آئینی جنگ کے طریقوں کی جانب رجوع کرنے والی ہے۔ مسٹر جناح کے کئی دوست اور مداح ان پر زور دے رہے تھے کہ وہ ہندوستان واپس تشریف لائیں اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت پھر اپنے ہاتھ میں لیں۔ مسٹر جناح لندن کی رہائش کے زمانے میں وقتاً فوقتاً ہندوستان کے چکر لگاتے رہے تھے۔ ۱۹۳۴ء کے شروع میں انہوں نے اپنے وطن میں واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپریل ۱۹۳۴ء میں آپ یہاں واپس تشریف لے آئے۔ آپ کے اقوال و افعال سے یہ بات واضح تھی کہ اس وقت آپ کے سامنے وہی پرانا مقصد تھا۔ یعنی مجوزہ آئین کی جگہ ہندوستان کی آزادی کا آئین حاصل کرنے کے لیے کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و تعاون قائم کرنے کی کوشش۔

اپریل ۱۹۳۴ء میں بمبئی پہنچ کر آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ دو یا تین متوازی مسلم لیگوں کو ایک متحدہ مسلم لیگ کونسل کی صورت اکٹھا کیا۔ نئی مسلم لیگ کونسل کے عہدہ داروں کا انتخاب کرایا۔ اس کونسل نے مسٹر جناح کو اپنا مستقل صدر چن لیا۔ حافظ ہدایت حسین نے (جنہوں نے بیرسٹر عبد العزیز کی مسلم لیگ کے مقابلے میں ایک متوازی لیگ قائم کر رکھی تھی)

نئی متحدہ کونسل میں سیکرٹری کا عہدہ قبول کر لیا۔ اسی کونسل سے مسٹر جناح نے ایک قرارداد پاس کرائی۔ جس کے الفاظ یہ تھے۔"جب تک مختلف پارٹیوں اور فرقوں میں کوئی باہمی سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ یہ کونسل کمیونل ایوارڈ کو اس کی موجودہ صورت میں قبول کرتی ہے۔ تاکہ ایسے نئے آئین کی جانب قدم بڑھایا جاسکے جو ملک کے لیے قابل قبول ہو"۔ اس اجلاس کے فوراً بعد آپ نے ایک اخباری انٹرویو میں اپنے مقصد اور نقطۂ نگاہ کی مزید وضاحت کی اور فرمایا "اصل سوال یہ ہے کہ اس مجوزہ آئین سے جو غلامی کے طوق کی طرح اس ملک کے گلے میں ڈالا جا رہا ہے۔ نجات کس طرح حاصل کی جائے۔ یہ مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعاون کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میں دونوں کو متحد کر سکوں۔ مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد پاس کی ہے۔ جو ملک کے سامنے ہے۔ یہ ایک ایسی بنیاد کی نشاندہی کرتی ہے جس پر فوری اتحاد اور تعاون ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں واپس آنے کے بعد میں نے دیکھا ہے کہ ملک کی آئندہ سیاسی ترقی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ ایک ہی ہے۔ البتہ "مسلمان کمیونل ایوارڈ پر اصرار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان یہ اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ آزادی کے آئین میں انہیں کم از کم وہ تحفظات ضرور حاصل ہوں گے۔ جو کمیونل ایوارڈ میں درج ہیں۔ جنہیں وہ اپنے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں"۔

ہندوستان میں چند ہفتے قیام کرنے کے بعد مسٹر جناح اپنا کاروبار سمیٹنے کی غرض سے پھر انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں اس کام میں انہیں بہت دیر لگی۔ ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ مسٹر جناح ابھی انگلستان ہی میں تھے۔ ان کی غیر حاضری میں بمبئی شہر کے مسلم حلقے کی جانب سے ان کے کاغذات نامزدگی داخل کئے گئے۔ اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ اس انتخاب میں کانگریس کی سوراج پارٹی نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں "کمیونل ایوارڈ" کے متعلق غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اور کہا تھا کہ کانگریس اس ایوارڈ کو نہ منظور کرتی ہے نہ نامنظور"۔ اس رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر پنڈت مالویہ نے جو کمیونل ایوارڈ کی دو ٹوک مخالفت چاہتے تھے۔ سوراج پارٹی کے مقابلے میں "نیشنلسٹ" پارٹی کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کئے۔ لیکن وہ سوراج پارٹی کے چوالیس ممبروں کے مقابلے میں گیارہ سے زائد ممبر نہ لا سکے۔ اس انتخاب کا ایک پہلو بہت دلچسپ تھا۔

کانگریس کے چند مسلمان ممبروں نے جن میں چودھری خلیق الزماں پیش پیش تھے۔ مہاتما گاندھی کی رضامندی یا نیم رضامندی سے سوراج پارٹی سے الگ ایک مسلم یونٹی بورڈ قائم کر لیا اور اس کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کئے۔ اس بورڈ میں کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ جمعیت علمائے ہند کے لیڈر اور کئی اور ایسے مسلمان شامل تھے۔ جو کانگریس کے رسمی ممبر نہ تھے۔ لیکن آزادی کے سوال پر وہی سیاسی موقف رکھتے تھے۔ جو کانگریس کا تھا۔ "مسلم یونٹی بورڈ" کے انتخابی منشور کے مرکزی نکات دو تھے۔ (۱) کمیونل ایوارڈ کی حمایت (۲) مجوزہ آئین کی مخالفت اور اس کی جگہ آزادی کے آئین کا مطالبہ۔ اس بورڈ کے امیدواروں کو یو۔ پی میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اسمبلی کے اندر اس بورڈ کے نمائندوں کا گروپ عملاً سوراج پارٹی کا حصہ بن گیا۔ لیکن "کمیونل ایوارڈ" کے سوال پر اس نے مسٹر جناح کا ساتھ دیا۔

مسلم یونٹی بورڈ کے علاوہ کسی اور جماعت کی طرف سے (لاہور میں مجلس احرار کے امیدوار مسٹر خالد لطیف گابا کے علاوہ) مسلم حلقوں میں امیدوار نامزد نہ کئے گئے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے (غالباً سر فضل حسین کے ایما پر) صرف اتنا کیا تھا کہ شملہ میں ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کر کے ایک بیان جاری کر دیا تھا۔ جس میں مسلم ووٹروں سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ صرف ایسے امیدواروں کو ووٹ دیں جو کمیونل ایوارڈ اور مسلم مفاد کی حمایت کا وعدہ کرتے ہوں۔ لیکن یہ اپیل بے معنی تھی۔ کیونکہ یہ وعدہ ہر امیدوار کرتا تھا۔ مسلم امیدوار مختلف صوبوں سے اپنے اپنے ذاتی اثر و رسوخ کے ذریعے کامیاب ہو کر اسمبلی میں آئے۔ تاہم ملک کے اندر عام فضا کا یہ اثر تھا کہ اسمبلی کے اندر مسلمان ممبر پہلے کی نسبت بہت زیادہ تعداد میں مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح کے زیر قیادت جمع ہو گئے۔ مسٹر جناح اب بھی اپنی پارٹی پر فرقہ وارانہ لیبل لگانے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے لیے وہی پرانا نام "انڈی پنڈنٹ پارٹی" پسند کیا۔ لیکن اب مسلمان ممبروں نے بھاری تعداد میں اس پارٹی کے اندر جمع ہو کر اسے عملاً ایک مسلم پارٹی بنا دیا۔ ۱۹۲۴ء کی اسمبلی میں مسٹر جناح کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کی تعداد اٹھارہ تھی۔ جن میں صرف چار مسلمان تھے۔ ۱۹۲۶ء کے انتخاب کے بعد کئی ہندو اس پارٹی کو چھوڑ گئے تھے۔ اور اس پارٹی کی تعداد صرف ۱۰ رہ گئی تھی۔ جن میں پانچ مسلمان تھے۔ ۱۹۳۰ء

کے انتخاب میں مسٹر جناح نے حصہ ہی نہ لیا تھا۔ اب ۱۹۳۴ء کے انتخاب کے بعد اس پارٹی کی تعداد بائیس ہو گئی جن میں اٹھارہ مسلمان تھے۔

نئی مرکزی اسمبلی میں پارٹیوں کی پوزیشن اس طرح تھی۔ سرکاری بلاک نامزد ممبر اور یورپین بلاک کے پچاس ممبر تھے۔ جو حکومت کی مرضی کے مطابق ووٹ کرتے تھے۔ کانگریس کے نمائندوں کی تعداد چوالیس اور پنڈت مالویہ کی پارٹی کے ممبر گیارہ تھے۔ مسٹر جناح کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کے بائیس ممبر اور پندرہ کے قریب آزاد ممبر تھے۔ مسٹر جناح کی پہلی فتح اس اسمبلی میں سپیکر کے انتخاب پر ہوئی۔ سوراج پارٹی نے اس عہدے کے لئے مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی کو اپنا امیدوار کھڑا کیا۔ پنڈت مالویہ کی نیشنلسٹ پارٹی نے بھی ان کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ مسٹر جناح نے ان کے مقابلے میں سر عبدالرحیم کو (جو ہائیکورٹ کی ججی سے ریٹائر ہونے کے بعد مسلم لیگ کی سیاست میں سرگرم حصہ لیتے رہے تھے) اپنی پارٹی کا امیدوار نامزد کیا۔ سرکاری بلاک کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ بھی کانگریسی امیدوار پر سر عبدالرحیم کو ترجیح دے۔ چنانچہ وہ باسٹھ کے مقابلے میں ستر ووٹوں سے جیت گئے۔

۴ فروری ۱۹۳۵ء کو ہندوستان کا نیا آئین (برطانوی پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ کی رپورٹ کی صورت) میں زیر بحث آیا۔ سرکاری بلاک کے لیڈر سر این این سرکار نے مسودے پر غور کرنے کی تحریک پیش کی۔

مسٹر جناح نے تین بھی لڑائی لڑنے کے لیے ایک ترمیم پیش کر دی جو تین حصوں پر مشتمل تھی۔ جن کا مطلب یہ تھا۔

(۱) یہ ایوان کمیونل ایوارڈ کو منظور کرتا ہے۔

(۲) اس ایوان کی رائے میں آئین کا صوبائی حصہ ناقص اور قابل اصلاح ہے۔ اسے درست کیا جائے۔ (ان نقائص کی نشاندہی بھی کی گئی تھی)

(۳) اس ایوان کی رائے میں مجوزہ آئین کا وہ حصہ جو فیڈرل مرکز کی ساخت کے متعلق ہے۔ بنیادی طور پر خراب اور برطانوی ہندوستان کے باشندوں کے لیے قطعاً ناقابل قبول ہے۔ یہ ایوان حکومت برطانیہ کو مشورہ دیتا ہے کہ اس حصے کے متعلق تجاویز کو آئین میں شامل

کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ مرکز کی ساخت کے مسئلے پر از سرِ نو غور کیا جائے۔ اور ہندوستان کی رائے عامہ کے مشورے سے نئی تجاویز مرتب کی جائیں۔

تین دن کی بحث کے بعد جب رائے شماری ہوئی تو مسٹر جناح کی ترمیم کے پہلے حصے (کمیونل ایوارڈ کی منظوری کے متعلق) پر سرکاری بلاک نے لامحالہ مسٹر جناح کا ساتھ دیا۔ پنڈت مالویہ کی نیشنلسٹ پارٹی نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔ لیکن وہ اس کی مخالفت میں اکیلی رہ گئی۔ کیونکہ کانگریس پارٹی اپنے اعلان کردہ موقف کے مطابق غیر جانبدار رہنے پر مجبور تھی۔ چنانچہ نیشنلسٹ پارٹی کے گیارہ اور متفرق آزاد ممبروں کے چار ووٹ ملا کر اس کے خلاف کل پندرہ ووٹ دیئے گئے۔ اس کے حق میں ۶۸ ووٹ تھے۔

جہاں تک ترمیم کے دوسرے حصے کا تعلق تھا۔ (جس میں مجوزہ آئین کے صوبائی حصے کو مسترد کئے بغیر اس کے بعض نقائص کی نشاندہی اور شکایت کی گئی تھی) اگر اسمبلی کی کثرتِ رائے سے یہ حصہ حذف ہو جاتا تو اسمبلی کے پورے فیصلے کی صورت یہ بنتی تھی کہ کمیونل ایوارڈ منظور ہے صوبائی حصۂ آئین کے متعلق اسمبلی کی کوئی تنقید نہیں ہے۔ یعنی اسمبلی اسے کسی تنقید کے بغیر قبول کرتی ہے۔ صرف مرکزی حصے کو وہ مسترد کرتی ہے۔ لہٰذا کانگریس پارٹی اور نیشنلسٹ پارٹی مجبور تھیں کہ مسٹر جناح کی ترمیم کے دوسرے حصے کو سرکاری ووٹوں کی اکثریت سے مسترد نہ ہونے دیں۔ تیسرے حصے کے متعلق (جو آئین کے مرکزی حصے کو قطعی طور پر مسترد کرتا تھا) مسٹر جناح اور کانگریس اور نیشنلسٹ پارٹی کے موقف ایک ہی تھے۔ لہٰذا مسٹر جناح کی ترمیم کے دوسرے اور تیسرے حصوں پر اکٹھی رائے شماری ہوئی۔ کانگریس پارٹی اور نیشنلسٹ پارٹی نے مسٹر جناح کے ساتھ ان کی ترمیم کے حق میں ووٹ دیا۔ اور حکومت نے ان کے خلاف۔ یہ دونوں حصے اٹھاون کے مقابلے میں چوہتر ووٹوں سے منظور ہو گئے۔

اگلے دن کانگریسی اخباروں نے مسٹر جناح پر برسے کی۔ اور کہا کہ انہوں نے کانگریس اور حکومت کے درمیان اپنی پارٹی کی کلیدی پوزیشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قومی نقطۂ نگاہ کے مقابلے میں فرقہ وارانہ نقطۂ نگاہ کی کامیابی کا بندوبست کیا ہے۔ اور قومی مفاد کو نقصان پہنچایا ہے جس کی قوم پرست مسٹر جناح سے توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ ایک اخبار نے لکھا کہ مسٹر جناح اسمبلی کے

فیصلے کو بیشک اپنی ذاتی فتح سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ بھی سمجھنا چاہئیے کہ ان کی ذاتی فتح میں ملک کی شکست مضمر تھی۔

مسٹر جناح نے دہلی سے ایک کالج میں تقریر کرتے ہوئے اس تنقید کا جواب دیا اور کہا کہ اس قسم کی تنقید کرنے والوں نے عجیب انداز فکر اختیار کر رکھا ہے۔ انہوں نے اس بنیادی حقیقت سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعاون کے بغیر ملک کی آزادی کی جانب قدم اٹھانا ممکن نہیں ہے۔ ان دونوں کے درمیان سمجھوتے کے بغیر ہم ہمیشہ ایک بیرونی طاقت کے غلام رہیں گے۔ جب تک باہمی سمجھوتے کا کوئی بہتر اور زیادہ اطمینان بخش فارمولا دستیاب نہ ہو۔ اس وقت تک کے لئے اگر کمیونل ایوارڈ کو قبول کر کے مسلمانوں کو مستقبل کے متعلق مطمئن کر دیا جائے اور انہیں مشترکہ جنگ آزادی میں حصہ دار بنا لیا جائے تو یہ میری فتح نہیں بلکہ پوری ہندوستانی قوم کی فتح ہے۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ جب مسٹر جناح نے مرکزی اسمبلی سے کمیونل ایوارڈ کی منظوری کا فیصلہ کرا لیا۔ اسی زمانے میں اس ایوارڈ کے بجائے کوئی اور اطمینان بخش فارمولا تلاش کرنے کے لئے کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد کے ساتھ ان کی بات چیت ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو مشترکہ دوستوں کی سلسلہ جنبانی سے اسمبلی کے اجلاس سے پہلے شروع ہوئی۔ اور اسمبلی کی منظور کردہ قرارداد کے بعد بھی جاری رہی۔ لیکن یہ گفتگو اس سوال پر آکر رکی۔ کہ اگر ان دونوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس کا پابند کون ہوگا؟ کیا بابو راجندر پرشاد اس بات کی ذمہ داری لے سکتے ہیں کہ ہندو مہاسبھا اس کی پابند ہوگی؟ کیا سکھ اس کے پابند ہوں گے؟ کانگریس کے صدر ان جماعتوں کے متعلق کوئی ذمہ داری نہ لے سکتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ دو فرد آپس میں سمجھوتہ کر کے اپنی تجاویز ملک کے سامنے پیش کر دیں اور پھر مشترکہ طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ ملک کی مختلف پارٹیاں اسے منظور کر لیں۔ مسٹر جناح کو یہ پروگرام بے نتیجہ نظر آیا۔

۲۷- یونینیسٹ پارٹی میں فضل حسین کے خلاف سازشیں

"کمیونل ایوارڈ" کے اعلان کے بعد پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے ذہن پر "مسلم راج" کا خوف مسلط کر لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر نئے آئین کے تحت سر فضل حسین کو پنجاب کا وزیر اعظم بننے کا موقعہ ملا تو "مسلم راج" کا ہوّا حقیقی صورت اختیار کرلے گا۔ لہٰذا وہ ہر شخص کو جو سر فضل حسین کو وزارت عظمٰی کے عہدے سے علیحدہ رکھ سکے۔ اپنا تعاون پیش کرنے کو تیار تھے۔ اس صوبے کی یونینیسٹ پارٹی میں سر فضل حسین کے بعد سب سے نمایاں حیثیت سر سکندر حیات خاں نے حاصل کرلی تھی۔ جب سر فضل حسین گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں تھے۔ تو صوبائی کابینہ میں ان کی جگہ سر سکندر نے سنبھالی۔ اور اپنے اس عہدے کے زمانے میں انہیں ایک مرتبہ دو ماہ اور دوسری مرتبہ چار ماہ کے لئے قائمقام گورنر بننے کا موقعہ مل گیا۔ یہ اعزاز اس سے پہلے کسی پنجابی کو حاصل نہ ہوا تھا۔

ہندو شہری پارٹی کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ کے ساتھ سر سکندر کے خاندانی تعلقات تھے۔ اگر پنجاب کا وزیر اعظم کسی مسلمان کو قبول کئے بغیر چارہ نہ ہو تو اس صورت میں ہندوؤں اور سکھوں کے لئے سر فضل حسین کے مقابلے میں سر سکندر بہت زیادہ قابل قبول تھے۔ ملک فیروز نون کے ساتھ سر فضل حسین کی قرابت داری ہو گئی تھی۔ اس لئے نون ٹوانہ گروپ کو سر فضل حسین کے مقابلے پر کھڑا کرنا ممکن نہ تھا۔ ان حالات میں بعض ہندو اور سکھ لیڈروں نے سر سکندر اور ان کے دوستوں کو اپنے تعاون کی امید دلانا شروع کیا۔

سر سکندر کے دائیں اور بائیں دو شخص تھے جو ان حالات میں خود سر سکندر سے بھی زیادہ انہیں پنجاب کا وزیر اعظم بنانے کے خواہشمند ہو گئے۔ ایک ان کے رشتے کے بھائی اور عمر کے لحاظ سے بزرگ نواب مظفر خاں تھے۔ جو سرکاری عہدہ دار تھے۔ اور ریفارمز کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہونے والے تھے۔ دوسرے سر سکندر حیات کے جگری دوست میاں احمد یار دولتانہ جن کی زندگی سر سکندر کی خدمت کے

لئے وقف تھی۔ نواب مظفر خاں کو پنجاب میں ایک اور باثر جماعت ایسی نظر آئی جس کا تعاون سر فضل حسین کی مخالفت کے سوال پر حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ مجلس احرار تھی۔ جو وسط پنجاب کی مسلم شہری آبادی میں مقبولیت حاصل کر رہی تھی اور بوجوہ سر فضل حسین کی مخالف ہو گئی تھی۔ چنانچہ دولتانہ صاحب اور نواب مظفر خاں نے ایک طرف ہندو اور سکھ لیڈروں سے اور دوسری طرف مجلس احرار کے چودھری افضل حق کے ساتھ ساز باز شروع کر دی۔ خود سر سکندر کا ایسا رویہ محتاط تھا۔ وہ اس ساز باز سے الگ رہے۔ اور ایک خوش خلق انسان کی طرح ہر ایک کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے۔ لیکن ان کے دونوں ساتھیوں نے انہیں ایک شرمیلے دولہا کی حیثیت دے رکھی تھی۔ اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ دولہا کو عروس وزارت کے ساتھ اپنے رشتے کے لئے سرگرمی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ دولہا کے رشتے کی بات چیت اس کے عزیز و اقارب ہی کیا کرتے تھے۔

جب ان کے عہدے کی میعاد پوری ہونے والی تھی تو ۱۹۳۴ء کی گرمیوں میں سر سکندر انگلستان کی سیر کو چلے گئے۔ اور اپنے ساتھ میاں احمد یار دولتانہ کو بھی لے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں سر فضل حسین نے غالباً ان سازشوں کو ختم کرانے کی غرض سے جن کی اطلاع انہیں پہنچتی رہتی تھی۔ سر سکندر کے لئے پنجاب سے باہر ایک اور اچھے عہدے کا بندوبست کرا دیا۔ یہ عہدہ ریزرو بنک آف انڈیا کی ڈپٹی گورنری کا تھا۔ انگلستان سے واپسی پر سر سکندر کو اس عہدے کی پیشکش کی گئی۔ جو انہوں نے قبول کر لی۔

لیکن اس کے بعد بھی سازشیں ختم نہ ہوئیں۔ بلکہ تیز تر ہو گئیں۔ سر فضل حسین یکم اپریل ۱۹۳۵ء کو گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل سے ریٹائر ہو کر سیاست میں سرگرم حصہ لینے کو تیار ہو گئے۔ اور چند دن لاہور میں قیام کرنے کے بعد گرمیوں کا موسم گزارنے کے لئے ایبٹ آباد چلے گئے۔ وہ جسمانی صحت کے لحاظ سے ناطاقتی کی تقریباً آخری حد تک پہنچ چکے تھے۔ اور کئی سال سے ایک دائم المریض انسان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن انہوں نے بیماری کے بستر کو دفتر کا میز بنا رکھا تھا۔ اسی حالت میں وہ جتنا کام کرتے تھے۔ اس کی مقدار حیرت انگیز تھی۔ جب وہ ایبٹ آباد میں صاحب فراش تھے تو لاہور میں شہید گنج کا واقعہ ہو گیا۔ جس کی تفصیل ایک علیحدہ باب

میں بیان کی جائے گی۔

ایبٹ آباد سے لاہور واپس آکر سر فضل حسین نے اپنی پارٹی کی اندرونی سازشوں پر پہلا وار ایک چٹھی کی صورت میں کیا۔ جو انھوں نے یونینسٹ پارٹی کے ممتاز مسلمان ممبروں کو بھیجی (ان میں سر سکندر حیات۔ نواب مظفر خاں۔ نواب دولتانہ۔ چوہدری شہاب الدین، ملک فیروز خاں نون سب شامل تھے) چٹھی کا مفہوم یہ تھا کہ غالباً میری صحت مجھے پبلک کاموں کی ذمہ داری اٹھانے کی اجازت نہ دے گی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مجھے درمیان سے خارج تصور کر کے آپ صاحبان اس اہم سوال پر غور کریں کہ پنجاب کی کابینہ کا کیا نقشہ ہوگا۔ مسلمان وزیر کون ہوں گے؟ ان کا لیڈر کون ہوگا؟ ان کے غیر مسلم ساتھی کون ہوں گے؟ صوبائی حکومت میں مسلمانوں کی بالادستی قائم کرنے کے لیے آپ اپنا لیڈر کسے بنانا چاہتے ہیں؟ ان سوالوں کے متعلق آپ صاحبان متفق ہو جائیں۔ تو آپ یکجہتی سے کام کر سکیں گے۔ ورنہ جو کچھ مسلمانوں کے پلے کئی سال کی محنت سے حاصل کیا گیا ہے وہ ضائع ہو جائے گا۔

اس خط کا یہ صاحبان کیا جواب دے سکتے تھے؟ سب نے بشمول سر سکندر جواب میں یہی کہا کہ قیادت آپ کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا۔ ہم سب آپ کے فرمانبردار رہنے کو تیار ہیں۔ آپ فی الحال سیاست سے ریٹائر ہونے کا خیال دل سے نکال دیں۔ سر فضل حسین غالباً اسی جواب کی توقع کر رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے حقیقی یا ظاہری تامل اور تکلف کے ساتھ ان کی درخواست قبول کر لی۔ لیکن درپردہ سازشیں پھر بھی جاری رہیں۔

نومبر ۱۹۳۵ء میں سر فضل حسین کے ڈاکٹر کرنل ہاربر نیلسن نے انھیں یہ خبر سنائی کہ نواب مظفر خاں خفیہ طور پر ان سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سر فضل حسین کی خرابی صحت کے پیش نظر ان کی زندگی کی میعاد پوری ہونے کی توقع کب کی جا سکتی ہے؟ سر فضل حسین نے سر سکندر کو خط لکھ کر پوچھا کہ نواب مظفر خاں چونکہ آپ کے نمائندہ خیال کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا کیا یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش وہ آپ کے ایما پر کر رہے ہیں؟ سر سکندر نے جواب میں قسمیں کھائیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اسی زمانے میں لاہور میں گورو تیغ بہادر کی برسی کے موقع پر سکھوں اور مسلمانوں کے

درمیان فساد ہو گیا۔ سر فضل حسین نے شہید گنج کے فساد کے موقع پر بھی یہ بات بری طرح محسوس کی تھی اور اب پھر محسوس کی کہ گورنر امیرسن کا رجحان مسلمانوں کے خلاف اور ہندوؤں اور سکھوں کے حق میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کابینہ کے دونوں مسلمان ممبر (نواب مظفر خاں اور ملک فیروز خاں نون) ایک جہتی سے کام کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو ناکام کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور دونوں بالکل بے اثر ہو گئے ہیں۔ لہذا سر فضل حسین نے فیصلہ کیا کہ کابینہ میں ایک عہدہ وہ خود سنبھال لیں۔ کچھ دنوں کے لیے ملک فیروز خاں نون ان کے لیے اپنی جگہ خالی کر دیں۔ اور کچھ دنوں کے لیے نواب مظفر خاں۔ تاکہ ان دونوں کے درمیان مساوات قائم رہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ تمام پارٹی یکجہتی کے ساتھ ان کی مرضی کے مطابق چلنے کو تیار ہو۔

اس فیصلے کی تفاصیل ان کی پرائیویٹ ڈائری میں درج ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ پہلے ملک فیروز خاں نون وزارت سے مستعفی ہو جائیں اور ان کی جگہ میں لے لوں۔ تین مہینے کے بعد نواب مظفر خاں تین ماہ کی چھٹی پر چلے جائیں (جس کے بعد ان کے ریٹائر ہونے کی تاریخ آجاتی تھی) اور میں وزارت سے مستعفی ہو کر ان کی جگہ ریونیو ممبر بن جاؤں اور ملک فیروز خاں نون وزارت میں واپس آجائیں۔

سر فضل حسین نے یہ تجویز ملک فیروز خاں کے سامنے رکھی۔ انہیں کوئی انکار نہ تھا پھر یہی تجویز نواب صاحب کو پیش کی۔ انہیں بھی کوئی انکار نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے گورنر سے ملاقات کے لیے وقت مقرر کر لیا۔ لیکن جس دن سہ پہر کے وقت وہ گورنر سے ملنے والے تھے اسی دن صبح کو نواب مظفر خاں ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میری رائے بدل گئی ہے میں سر سکندر کی منظوری حاصل کئے بغیر اس تجویز کے متعلق آخری فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سر فضل حسین مقررہ وقت پر گورنر سے ملے لیکن اب وہ اس کے سوا کیا کر سکتے تھے کہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلے آئیں۔

سر فضل حسین کو نواب مظفر خاں کے رویہ پر بہت رنج ہوا۔ انہیں اور بھی زیادہ رنج اس بات کا ہوا کہ سر سکندر نے بھی اس تجویز کو ٹالنے کی کوشش کی۔ اس پر وہ سوچنے لگے کہ اگر میری زندگی میں ان کا طرز عمل یہ ہے تو میرے بعد یہ کیا کریں گے؟ کیا مسلمانوں کے

شخصی دھڑے عہدوں کے لئے ہندوؤں اور سکھوں کے پیچھے بھاگتے پھریں گے اور اپنے آپ کو ان کا آلہ کار بنانے کی کوشش کریں گے؟ کیا میری تمام محنت کا نتیجہ میرے مقاصد کے بالکل برعکس صورت اختیار کرے گا اور پنجاب کا مسلمان افراد کی اس شطرنج کی وجہ سے پٹ جائے گا؟ اس صورت حال کا علاج کیا ہے؟

سر فضل حسین نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ اس صورت پر مجھے اتنی شدید ذہنی کوفت ہوئی کہ میں نے خودکشی کر کے اس سے نجات حاصل کرنا چاہا۔ لیکن پھر میری طبیعت سنبھل گئی۔ اور میں نے حالات کا مقابلہ کر کے اس کی اصلاح کا ارادہ کر لیا۔

پھر سر سکندر کا ایک خط انہیں ملا کہ میں کرسمس کے دنوں میں لاہور آؤں گا۔ اور آپ کے ساتھ مفصل گفتگو کروں گا۔ اس گفتگو میں سر سکندر نے سر فضل حسین کو پورے تعاون کا یقین دلایا۔ اور اس بات پر زور دیا کہ آپ یہ اعلان کر دیں کہ آپ جو پارٹی بنائیں گے۔ میں آپ کے حکم کے مطابق اس کی کابینہ میں شریک ہونے کو تیار رہوں گا۔ یہ فیصلہ ہو گیا اور اس کے بعد سر فضل حسین نے پارٹی کی اندرونی سازشوں کو ختم کرنے کا یہ عملی طریقہ سوچ لیا کہ ملک فیروز خاں نون کے لئے لندن میں وزیر ہند کی کونسل کی ممبری کا بندوبست کرا دیا۔ اور سر سکندر کو یہ اطمینان دلا دیا کہ سر فضل حسین کے بعد ان کے لئے وزارت عظمٰی کا عہدہ ایک یقینی شے ہے۔ اس عہدہ کو حاصل کرنے کے لئے انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے پیچھے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس طرح یونینسٹ پارٹی متحد ہو کر پھر سر فضل حسین کی مٹھی میں آ گئی۔

٢٨۔ شہید گنج کا ہنگامہ اور مجلس احرار

پنجاب کی سیاست میں مجلس احرار یکایک ابھری اور یکایک ختم ہو گئی۔ رسمی طور پر یہ جماعت سن ١٩٣١ء میں قائم ہوئی۔ مسلم حقوق سے متعلق اس کا موقف مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سے مختلف نہ تھا۔ لیکن اس نے مسلم عوام کو مسلم کانفرنس کے بالمقابل ایسی قیادت کی امید دلائی جو ضرورت کے وقت حکومت کے ساتھ بھی ٹکر لے سکتی تھی۔ جلد ہی اسے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے پہلا کامیاب ایجی ٹیشن مغلپورہ انجینیرنگ کالج کے انگریز پرنسپل کی ایک حرکت کے خلاف کیا۔

اسی زمانے میں کشمیر کے مسلم عوام میں شیخ عبداللہ کے زیر قیادت آزادی کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ اسے دبانے کے لیئے وہاں کی پولیس اور فوج نے لوگوں پر بے پناہ مظالم کیئے۔ کئی جگہ گولیاں چلیں سینکڑوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ فوج نے دیہات میں لوٹ مار اور عورتوں پر مجرمانہ حملے کیئے۔ یہ خبریں برطانوی ہند میں پہنچیں تو مسلمانوں میں قدرتاً اضطراب پیدا ہوا۔ کشمیری مسلمانوں کی امداد کے لیئے جماعت احمدیہ بھی حرکت میں آئی۔ یہ ایک منظم اور باوسائل جماعت تھی۔ کئی مسلمان لیڈروں نے اس بارے میں امیر جماعت احمدیہ کے تعاون کو غنیمت سمجھا اور ان کے زیر صدارت ایک کشمیر کمیٹی قائم کر لی۔ اس جماعت نے اور بعض مسلمانوں نے انفرادی طور پر کشمیر کے اندر صحیح حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ریاست کی حکومت نے انہیں ریاست میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ لوگ بے بس ہو گئے۔ لیکن ان احکام کی خلاف ورزی کرنے کے لیئے مجلس احرار میدان میں آگئی۔ اور اس نے کئی محاذوں پر کشمیر کے اندر جتھے بھیجنے کی مہم شروع کر دی۔

ضلع سیالکوٹ، ضلع جہلم اور راولپنڈی کے مختلف مقامات سے جتھے "کشمیر چلو" کے نعرے لگاتے ہوئے ریاست کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

سرحد سے ورے انہیں پنجاب پولیس گرفتار کر لیتی تھی۔ اور جو لوگ سرحد پار کر جاتے تھے۔ انہیں کشمیر کی پولیس گرفتار کر لیتی تھی۔ کہیں کہیں پولیس کے ساتھ تصادم اور لاٹھی چارج بھی ہوئے۔

یہ مہم سنہ ۱۹۳۱ میں شروع ہوئی۔ اور کئی مہینے منظم طریق پر چلتی رہی۔ عوام کی توجہ امیر جماعت احمدیہ کی کشمیر کمیٹی سے ہٹ کر اسی مہم پر مرکوز ہو گئی۔ بہرطور پر کچھ اس مہم کا دباؤ پڑا۔ کچھ حکومت ہند نے ایسے واقعات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کا مشورہ دیا۔ اس نے اس دوگونہ دباؤ کے سامنے جھک کر تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور ریاست کے اندر لیڈروں سے سمجھوتہ کر لیا۔ مجلس احرار نے اپنی تحریک ختم کر دی۔ اور اس سلسلے میں گرفتار ہونے والے قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔

جب کشمیر کمیٹی کو جس کے صدر امیر جماعت احمدیہ تھے۔ ریاست کے اندر اپنے کارکن بھیجنے اور وہاں کے مسلمانوں کی آئینی اور قانونی امداد کرنے کا موقعہ ملا تو کمیٹی کے باقی مسلمان ممبروں پر منکشف ہوا کہ کشمیر کمیٹی کے نام سے جو کام کیا جا رہا تھا۔ اس کا مقصد احمدیت کی تبلیغ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر مسلمان ممبروں نے اپنے آپ کو کشمیر کمیٹی سے علیحدہ کیا۔ ان کی ترجمانی علامہ اقبال نے کی۔ علامہ صاحب نے ایک پبلک جلسے میں تمام حالات کی وضاحت کی۔ خود اس کمیٹی سے استعفےٰ دے دیا۔ ایک نئی کشمیر کمیٹی بنوائی۔ اور اس کا آئین مرتب کیا۔ امیر جماعت احمدیہ نے اپنے مقاصد کے لیے اس نئی کمیٹی میں کوئی گنجائش نہ دیکھی۔ تو انہوں نے اپنا علیحدہ کام "تحریک کشمیر" کے نام سے شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی علامہ اقبال اور نئی کشمیر کمیٹی کو اپنے تعاون کی پیش کش کی۔ علامہ اقبال نے ایک بیان میں فرمایا کہ جس مقصد کے لیے جماعت احمدیہ کام کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ کون مسلمان تعاون کر سکتا ہے؟ پھر ریاست کشمیر میں احمدیوں کی تبلیغی مہم کا جواب دینے کے لیے کچھ احرار بھی وہاں پہنچ گئے۔ احمدی "تحریک کشمیر" آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔

اس کے بعد مجلس احرار نے کوئٹہ کے زلزلے کے سلسلے میں بھی خاصا نمایاں کام کیا۔ آفت زدگان کی امداد کے لیے غیر سرکاری انجمنوں نے جو کیمپ قائم کئے۔ ان میں

سب سے زیادہ منظم اور خدمت گزار کیمپ اسی جماعت کا تھا۔ مجلس احرار کے یہ پروگرام وقتی اور عارضی تھے۔ احمدیت کے خلاف تبلیغ اس کے پروگرام کا مستقل جز بنی رہی۔ اس جماعت کی سیاسی پالیسی چوہدری افضل حق کے دماغ کی مرہون منت تھی۔ عوامی جلسوں سے خطاب کرنے کے لیے اس کے پاس ایک سحر انگیز خطیب مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی صورت میں موجود تھا۔

۱۹۳۲ء میں چودھری ظفر اللہ خاں کو عارضی طور پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں لیا گیا تو یہ بات مجلس احرار کے لیے پراپیگنڈہ کا بہت اچھا موضوع بن گئی۔ یہ بات عام طور پر معلوم تھی کہ چودھری صاحب کو یہ موقع دلانے میں سر فضل حسین کا ہاتھ تھا۔ لہٰذا وہ بطور خاص اس پروپیگنڈہ کا نشانہ بن گئے۔

۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے نئے انتخاب ہوئے۔ اس وقت مجلس احرار لاہور اور وسطی پنجاب کے دوسرے شہروں میں سب سے زیادہ باثر عوامی جماعت تھی۔ سر فضل حسین کے اشارے سے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سیکرٹری حاجی رحیم بخش لاہور اور مضافات کے حلقے میں بطور امیدوار کھڑے ہوئے۔ مجلس احرار نے آنجہانی لالہ ہرکشن لال کے بڑے بیٹے کو جو کچھ عرصہ پہلے اسلام قبول کر کے اپنا اسلامی نام خالد لطیف گابا رکھ چکے تھے (بعد میں وہ نقل وطن کر کے بھارت آ گئے اور مذہب تبدیل کر کے پھر ہندو بن گئے) اپنا امیدوار چن لیا۔ لیکن اس انتخابی معرکے میں مسٹر گابا کی پشت پر صرف مجلس احرار کا اثر و رسوخ نہ تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے اندر سر فضل حسین کے درپردہ مخالف عنصر کی خفیہ امداد بھی مسٹر گابا کو ملی۔ غالب قیاس یہ تھا کہ گابا اس امداد کے بغیر بھی جیت جاتے۔ بہرحال وہ بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ یونینسٹ پارٹی کے ”باغی“ عنصر اور مجلس احرار کے لیڈروں کے درمیان پختہ و پنہاں آئندہ پروگرام کے متعلق بھی ہوتی رہی۔ گو دونوں فریق اس پر پردہ ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مجلس احرار نے علانیہ طور پر سر فضل حسین کو اپنا سیاسی مخالف نمبر ایک گردان لیا۔

۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے بعد مجلس احرار کے لیڈر چودھری افضل حق نے آنے والے صوبائی انتخابات کے مسئلے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ پھر جولائی ۱۹۳۵ء میں یکایک

مسجد شہید گنج کا ہنگامہ پیش آگیا۔ جس کے متعلق مجلس احرار کے زعماء کو اپنا طرزِ عمل فوری طور پر طے کرنا پڑا۔ اس وقت کس نے کس کو کیا مشورہ دیا۔ اور اندرونِ خانہ کیا باتیں ہوئیں۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ اس کے متعلق بعد میں مختلف پارٹیوں نے اپنا اپنا کیس بنانے کی کوشش کی۔ مجلس احرار کا یہ بیان تھا کہ سارا ہنگامہ اس کے خلاف سوچی سمجھی سازش کے مطابق ہوا۔ جو واقعات معلوم ہیں۔ ان کی بناء پر اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے۔ بلکہ اس روایتی لطیفے کی مانند معلوم ہوتا ہے جو ایک دیہاتی نے میلے میں اپنی چادر گم کرنے کے بعد پیدا کیا تھا۔ اس نے گھر والوں سے کہا تھا کہ اس میلے کا سارا ڈھونگ میری چادر ہتھیانے کے لیئے رچایا گیا تھا۔ اس ہنگامے کا صحیح تاریخی پس منظر اور اس کے صحیح واقعات حسب ذیل تھے۔

شہید گنج کے گوردوارے کے ساتھ ایک ہی احاطے میں ایک عمارت تھی۔ جو گوردوارے کی تعمیر سے پہلے کسی زمانے میں مسجد تھی۔ پھر سکھوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں اس مسجد پر قبضہ کر کے اس کے قریب ایک گوردوارہ بنا لیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس رقبہ کی صورت یہ تھی کہ مسجد کی عمارت کے قریب ایک گوردوارہ تھا اور گوردوارہ کا گرنتھی مسجد کی عمارت کو رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اور ملحقہ دوکانوں کا کرایہ وصول کرتا تھا۔ اسی احاطے میں ایک اصطبل بھی تھا۔ جہاں سکھ زائرین کے گھوڑے بندھتے تھے۔ جب انگریزوں کی حکومت آئی تو ان عمارتوں کی یہی صورت رہی۔ گوردوارے کے سیوادار کی اولاد مسجد کی عمارت اور ملحقہ جائیداد پر قابض رہی۔ اور انہیں اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر استعمال کرتی رہی۔ مسجد کی عمارت جو سو سال سے بھی زیادہ پرانی تھی۔ بالکل بوسیدہ حالت میں تھی۔ سکھ مالکوں نے اسے مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی پیشکش بھی کی۔ لیکن اس کا کوئی خریدار نہ تھا۔

پھر انگریزوں کی عملداری قائم ہونے کے پچاس ساٹھ سال کے بعد ایک شخص نے اپنے آپ کو مسجد کا متولی ظاہر کر کے اسے (بلکہ زیادہ تر ملحقہ دوکانوں کو) سکھوں کی ملکیت سے واگذار کرنے کے لیئے دیوانی دعوے کیا۔ جو ایک صدی کے قبضہ کی بناء پر خارج ہو گیا۔ ١٩٢٥ء میں سکھ گوردوارہ ایکٹ بنا جس کے تحت سکھوں کے گوردوارے

اور ان کے ساتھ وقف جائیدادیں (جو کروڑوں روپیہ کی تھیں) ہندوؤں کے قبضے سے نکال کر سکھوں کی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کرنے کے لیے ضابطہ مقرر کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت جو ٹربیونل قائم ہوا۔ اس کے روبرو مسجد شہید گنج پر قابض سکھوں نے اس عمارت اور ملحقہ دوکانوں وغیرہ کو اپنی ذاتی ملکیت ظاہر کرکے عذرداری کی۔ جب یہ مقدمہ چل رہا تھا تو انجمن اسلامیہ پنجاب کے سیکرٹری سید محسن شاہ نے بھی ایک درخواست دی کہ مسجد کی عمارت گوردوارہ کی ملکیت بھی نہیں اور سکھ قابضین کی ذاتی جائیداد بھی نہیں ہے۔ بلکہ مسجد ہے۔ اسے انجمن کے حوالے کیا جائے۔ ٹربیونل نے تمام عمارتوں کو گوردوارے کی ملکیت قرار دیا۔ سکھ قابضین نے اس کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل کی۔ انجمن اسلامیہ نے کوئی اپیل نہ کی ہائیکورٹ کے ایک ڈویژن بنچ نے اپیل نامنظور کر دی۔ یہ فیصلہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں ہوا اور ضابطے کی ضروری کارروائیوں کی تکمیل کے بعد ان عمارتوں کا قبضہ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی مقامی شاخ کے حوالے مارچ ۱۹۳۵ء میں کر دیا گیا۔

اس کے بعد پربندھک کمیٹی نے احاطے کی درستی اور عمارتوں کی شکست و ریخت کا کام شروع کیا۔ ابھی معمار و مزدور مسجد کی عمارت تک نہ پہنچے تھے۔ کہ مسلمانوں کی طرف سے بعض لوگ اخراج کرنے لگے۔ اور کئی ٹولیاں وقتاً فوقتاً اس عمارت کے قریب کچھ احتجاج کی خاطر اور کچھ محض تماشائیوں کے طور پر جمع ہونے لگیں۔ اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ احاطے کے اندر کسی بوسیدہ دیوار کو گراتے ہوئے ایک سکھ معمار میلا سنگھ نامی ملبے کے نیچے دب گیا۔ اور ہلاک ہو گیا۔ یہ خبر اخباروں میں چھپی اور اس کی بناء پر یہ افواہ پھیل گئی کہ اس معمار نے مسجد کو گرانے کا ارادہ کیا تھا جس کی سزا اسے ملی۔ اگلے دن مسلمان کافی تعداد میں جمع ہو گئے۔ باہر مسلمان تھے اور احاطے کے اندر سکھ ڈپٹی کمشنر ایس پرتاپ (جو سکھ سے عیسائی ہو گیا تھا) اور سٹی مجسٹریٹ (یہ بھی سکھ تھا) خطرے کے پیش نظر موقعہ پر پہنچے۔ انہوں نے سکھوں کو حکم دیا کہ وہ دوسری عمارتوں پر کام کرتے رہیں۔ مسجد کی عمارت کو ابھی ہاتھ نہ لگائیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو سمجھا بجھا کر منتشر کر دیا۔ اور احاطے کے اردگرد پولیس کا پہرہ لگا دیا۔ یہ حکم سکھوں کو ۲۸ جون ۱۹۳۵ء کو دیا گیا۔

شہر میں فضا کشیدہ ہو گئی۔ مسلمانوں کا دعوے یہ تھا کہ مسجد کو منہدم نہ ہونے دیا جائے گا۔ سکھ اپنے قانونی حق کے دعویدار تھے۔ ۲۸ جون سے چند دن پہلے گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے مسلمانوں کے مظاہرے کے خطرے کے پیش نظر جوابی مظاہرے کے لیئے باہر سے سکھ جتھے بلوانے کا انتظام کر لیا تھا۔ اب یہ جتھے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیئے لاہور میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ اس بات نے مسلمانوں میں مزید اضطراب پیدا کیا۔ ڈپٹی کمشنر دونوں فریقوں کے نمائندوں سے بات چیت کرتا رہا جو لامحالہ اسی بنیاد پر تھی کہ تصفیہ کی کوئی صورت نکلنے تک مسجد کو منہدم نہ ہونے دیا جائیگا۔ احاطے کے اردگرد پولیس کا پہرہ اور زیادہ سخت کر دیا گیا۔ سکھ جتھوں کی آمد پر کوئی پابندی نہ لگائی گئی۔ وہ جلوس کی صورت میں نعرے لگاتے ہوئے آتے تھے اور کشیدگی میں اضافہ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے جلسے بھی ہوتے۔ اور انہوں نے جلوس کی صورت اختیار کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ شہید گنج کا رخ کرتے تھے۔ تو پولیس انہیں روکتی تھی۔ کہیں کہیں لاٹھی چارج بھی ہوتے۔ گورنر امرسن شملہ میں تھا۔ اسے یہ رپورٹیں ملیں تو ۶ جولائی کو وہ بھی لاہور پہنچ گیا۔ مسلمانوں کا ایک وفد اسے ملا۔ وفد کا موقف یہ تھا کہ عدالت کے فیصلوں سے انکار کوئی نہیں کرتا لیکن ان سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ سکھ اپنے مالکانہ حقوق کا استعمال مسلم عوام کے جذبات سے بے نیاز ہو کر کریں۔ اور فساد کی دعوت دیں۔ حکومت اس عمارت کو پبلک مفاد میں معاوضہ دے کر حاصل کر سکتی ہے اور محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر سکتی ہے یا کوئی اور مناسب راستہ فساد کے خطرے کو روکنے کے لیئے اختیار کر سکتی ہے۔ گورنر نے غور کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن ۸ جولائی کو آدھی رات کے وقت سکھوں نے مسجد کی عمارت کو گرانا شروع کر دیا اور صبح تک اسے ملبے کا ڈھیر کر دیا۔ کیا انہیں گورنر نے اشارہ کیا تھا؟ یا انہوں نے از خود ایسا کیا؟ یہ بات بھی مشہور ہوئی کہ انہدام کے لیئے سرکاری کرین مہیا کیا گیا تھا۔ لیکن یہ حکایت قطعاً بے بنیاد تھی۔ نہ کوئی کرین آیا نہ چند بوسیدہ دیواروں کو گرانے کے لیئے کرین کی ضرورت تھی۔ بہر حال ۹ جولائی کی صبح کو جب یہ خبر عام ہوئی تو مسلمانوں کے اندر غم و غصہ کا ہیجان پیدا ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ گورنر نے ان کے ساتھ بد عہدی کی ہے۔ اس نے تصفیہ کے متعلق غور و فکر کا وعدہ کیا۔ لیکن سکھوں کو من مانی کرنے کا موقع دیا۔ اب گورنر کا رویہ یہ تھا کہ اگر سکھوں نے اس کی مرضی کے خلاف یہ اقدام کیا تب بھی وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کو تیار نہ تھا۔ ۹ جولائی کی صبح کو جو قدم گورنر نے اٹھایا وہ یہ تھا کہ چھاؤنی سے گورا فوج کی دو پلٹنیں بلا کر شہید

گنج کے آس پاس متعین کر دیں اور آنے والی رات کے لیے کرفیو اور اخباروں پر سنسر لگا دیا۔ ۹ جولائی کو میاں عبدالعزیز بیرسٹر کے مکان پر کچھ مسلمان جمع ہوئے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ جس طرح ممکن ہو مسلمانوں کا غصہ ٹھنڈا کیا جائے ۹ جولائی کو کوئی اور خاص واقعہ نہ ہوا۔ ۱۰ اور ۱۱ جولائی بھی کسی واقعہ کے بغیر گذر گئے۔ ۱۲ جولائی کو جمعہ تھا۔ اس دن اندیشہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جمعہ کی نماز کے بعد مسلمان منتشر ہو گئے اور کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔

حکومت کو کچھ اطمینان ہوا۔ ۱۳ جولائی کو ایک پلٹن واپس چھاؤنی بھیج دی گئی اور کرفیو کا حکم نرم کر دیا گیا۔ ۱۴ جولائی کو حکومت نے مسلمانوں کو راضی کرنے کے لیے یہ اعلان کر دیا کہ اس نے شاہ چراغ کی عمارت انجمن اسلامیہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے یہ بھی کسی زمانے میں مسجد اور اس کی ملحقہ جائداد تھی۔ جو حکومت کے قبضے میں چلی آ رہی تھی۔ ۱۴ جولائی کو موچی دروازہ کے باہر مسلمانوں کے جلسے کے لیے سہ پہر کا وقت مقرر تھا۔ یہی وہ جلسہ تھا جو عوام کی نگاہ میں مجلس احرار کے وقار کو ختم کرنے والا ثابت ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ظفر علیخاں نے کہا کہ احرار لیڈروں کو اس جلسے میں لانے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن انہوں نے یہاں آنے سے انکار کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں کی باقی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ شاہ چراغ کے متعلق حکومت کا اعلان اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن مسلمان مسجد شہید گنج کی جگہ ہندو لے کر رہیں گے۔ اور اس کے لیے دس ہزار والنٹیر بھرتی کر کے سول نافرمانی کریں گے۔ نیلی پوش رضاکاروں کی بھرتی کی تحریک یہیں سے شروع ہوئی۔ اسی رات کو حکومت نے چار افراد کو گرفتار کر کے لاہور سے باہر بھیج دیا۔ یہ تھے مولانا ظفر علی۔ سید حبیب۔ ملک لال خاں اور میاں فیروزالدین۔ اگلے دن پبلک جلسوں پر پابندی لگا دی گئی اور اخباروں پر سنسر کی میعاد بڑھا دی گئی۔ ۱۴ جولائی کے جلسے میں جن لیڈروں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تیز اور تند تقریریں کی تھیں۔ وہ خود نظربند ہو کر چلے گئے۔ لیکن عوام کے جذبات کو از سر نو مشتعل کر گئے۔ ۱۵ اور ۱۶ جولائی کو مسلمانوں کے ہجوم اکٹھے ہوئے انہیں مجمع خلاف قانون قرار دے کر منتشر ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور ان پر لاٹھی چارج کئے گئے۔ ۱۷ جولائی کو گورنر نے مجلس قانون

سازش کے ممبروں کے ایک اجلاس سے خطاب کیا اور اپنی صفائی پیش کی کہ میرے خلاف بد عہدی کا الزام غلط ہے میں نے یہ ذمہ داری نہیں لی تھی کہ سکھ متنازعہ عمارت کو نہیں گرائیں گے۔ کونسل کے ممبروں نے بھی عوام سے پر امن رہنے اور قانون کا احترام کرنے کی اپیل کی۔ ۱۷ اور ۱۸ جولائی کو کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ لیکن مسلمانوں میں اضطراب اور رنج و غصہ کا احساس ابھی باقی تھا جس کے باعث ۱۹ جولائی کو (یہ جمعہ کا دن تھا) مسلمانوں کا بہت بڑا ہجوم بادشاہی مسجد میں جمع ہو گیا۔ یہاں نماز کے بعد پھر جلسہ ہوا۔ لیکن بجائے اس کے کہ کوئی ذمہ دار شخص مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے یا انہیں کسی قابل عمل راستے پر چلانے کے لیے سامنے آتا۔ مولانا اختر علیخاں کو تقریر کے لیے کھڑا کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنے والد محترم مولانا ظفر علیخاں سے منسوب کر کے ایک پیغام بہت جذبات انگیز الفاظ میں دیا۔ "کعبہ کی بیٹی کی بے حرمتی سکھوں کے ہاتھوں سے ہوئی ہے۔ اب اس کی ناموس مسلمانوں کو پکار پکار کر بلا رہی ہے"

اس قسم کے فقروں نے مجمع میں آگ لگا دی اور ایک ہجوم سر فروشی کے جذبات لیے شہید گنج کی جانب چل پڑا۔ دہلی دروازہ کے باہر ایک جگہ ان کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کے دوسری طرف پولیس اور فوج تھی۔ ہجوم جم کر وہیں بیٹھ گیا اور تمام رات وہیں بیٹھا رہا۔ وہیں اس نے نمازیں ادا کیں۔ اس کی پشت پر شہر کے اندرونی حصے میں رت جگا ہو رہا تھا۔ کرفیو آرڈر پھر سخت کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی پرواہ کون کرتا تھا۔ بازاروں میں رات کے وقت دن سے زیادہ چہل پہل تھی۔ مجاہدین کے لیے دیگیں پک رہی تھیں۔ اگلے دن اس مجمع پر لاٹھی چارج ہوئے۔ اس پر پانی پھینکا گیا۔ لیکن ان سب اقدامات کے باوجود مجمع اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ بلکہ دوسرے راستوں سے بھی مسلمانوں کے ہجوم کوتوالی کے چوک کی جانب آنے کی کوشش کرتے رہے اور لاٹھی چارج اور فائرنگ کے ذریعے انہیں منتشر کیا جاتا رہا۔ اتوار ۲۱ جولائی کو اصل مجمع کئی ڈپلومیٹک کوششوں کے بعد منتشر ہوا۔

اس سخت ہیجان کے زمانے میں جب مسلمانوں کو کوئی قابل عمل اور صحیح راستہ دکھانے کی ضرورت تھی نہ مجلس احرار نے حالات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی نہ کوئی اور ذمہ دار لیڈر سامنے آیا۔ مولانا ظفر علیخاں اور ان کے چند ساتھیوں

کو شروع ہی میں نظر بند کر دیا گیا تھا اس کے بعد عوام کے جذبات کو غیر ذمہ دار افراد کے تعرض کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے سینے گورا فوج کی گولیوں کے لیئے کھول دیئے۔ سینوں پر گولیاں کھائیں۔ حاصل کچھ نہ ہوا۔ نہ ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ شکست کا شدید احساس لے کر پسپا ہو گئے۔

اس احساس کا ردِ عمل سب سے زیادہ احرار کیخلاف ہوا۔ کیونکہ اسی جماعت سے لاہور کے عوام ہمنوائی کی توقع کرتے تھے۔ اور اس جماعت نے اس معاملہ سے یکسر پہلو تہی کی تھی۔ اس پہلو تہی کی وجہ کیا تھی؟ کیا احرار کے زعما کو یہ خطرہ نظر آیا کہ اگر حکومت نے انہیں نظر بند یا گرفتار کر لیا تو آئندہ انتخاب کے سلسلہ میں ان کا سارا پروگرام درہم برہم ہو جائے گا؟ غالب قیاس یہی تھا۔ بہر حال جہاں تک مجلس احرار کا تعلق تھا۔ اس ہنگامے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مقبولیت اس جماعت نے چار پانچ سال کی محنت سے حاصل کی تھی۔ وہ چند ہی دنوں میں ختم ہو گئی۔

دو چار دن کے بعد مسلمانوں کا اجتماع پھر مسجد وزیر خاں میں ہوا۔ یہاں تحریک شہید گنج کو زندہ رکھنے کی صورت یہ نکالی گئی کہ پانچ پانچ آدمیوں کا جتھا ہر روز اپنے آپ کو گرفتاری کے لیئے پیش کرے۔ یہ تحریک چند دن چلی پھر کمزور پڑ گئی۔ ستمبر میں پیر سید جماعت علیشاہ نے اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور حکومت اور تحریک کے درمیان مصالحت کی کوشش کی۔ جو کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن یہ تحریک ایک کمزور شکل میں پھر بھی چلتی رہی۔ تا آنکہ فروری ۱۹۳۸ء میں مسٹر جناح نے لاہور آ کر اسے قطعی طور پر ختم کرا دیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر عالم نے ایک نیا دیوانی دعوے بھی دائر کیا۔ جو کچھ دن لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور بالآخر خارج ہو گیا۔

۲۹۔ مسٹر جناح اور فضل حسین کی آخری ملاقات

جب ہندوستان کے نئے آئین نے پارلیمنٹ کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت اختیار کی تو ابھی صرف اس کا ایک حصہ (صوبائی خودمختاری کے متعلق) نافذ ہونے والا تھا۔ مرکز کو نئی فیڈرل صورت دینے کا مرحلہ ابھی بہت دور اور غیر یقینی تھا۔ اس سے پہلے والیان ریاست کے ساتھ گفت و شنید اور فیڈریشن کے ساتھ ان کے الحاق کی شرائط طے کرنا ضروری تھا۔ عبوری دور کے لیے مجوزہ فیڈریشن کے اختیارات موجودہ مرکزی حکومت کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔

صوبائی خودمختاری کے نظام کو عملی شکل دینے کے لیے صوبوں میں انتخابات کی آمد آمد ہوئی تو ایک نکتے پر مسٹر جناح اور سر فضل حسین کے درمیان پھر اختلاف پیدا ہو گیا۔ بظاہر نکتہ اختلاف صرف یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کی اسمبلیوں کے لیے مسلمانوں کو فرقہ وارانہ پارٹیاں بنانی چاہئیں۔ یا یونینسٹ پارٹی کے نمونے پر غیر فرقہ وارانہ پارٹیوں کے ذریعے کام کرنا چاہیئے۔ مسٹر جناح نے اپنے ذہن میں یہ پروگرام بنایا کہ تمام صوبوں میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑے جائیں۔ ان کا نقطہ نگاہ بہت صاف اور واضح تھا۔ جیسے وہ بار بار دہرا چکے تھے۔ وہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے زیر قیادت ایک آزادی پسندانہ پروگرام پر چلانا چاہتے تھے۔ جس کی عملی صورت اس مرحلے پر ان کے نزدیک یہی تھی۔ کہ صوبائی انتخابات کے ذریعے پورے ملک میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مسلمانوں کی ایک پارلیمانی پارٹی ابھر آئے جو ملک کی آزادی کے سوال پر کانگریس کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کرے۔ یہ پروگرام اس ذہنی مفروضے پر مبنی تھا کہ کانگریس بھی اپنی طرف سے اس بات کی ضمانت دینے کو تیار ہو جائے گی کہ آزادی کے آئین میں مسلمانوں کو کم از کم وہ تحفظات حاصل ہونگے جو کمیونل ایوارڈ میں درج تھے۔ آزادی کے لیے اس آئینی جنگ کے ساتھ ساتھ مسٹر جناح صوبائی

مسلم لیگ پارٹیوں کو وزارتیں بنانے اور وزارتوں میں حصہ لینے کی اجازت دینا منظور کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ وہ اس پروگرام پر مسلمانوں سے مختلف گروپوں اور مکاتیبِ خیال کو جمع کر سکیں گے۔ جب آپ نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلم لیگ کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ تو سب سے پہلے اس اجلاس کی صدارت سر فضل حسین کو پیش کی۔ ایک خط مورخہ ۶؍ جنوری ۱۹۳۶ء میں آپ نے سر فضل حسین کو لکھا۔ "مسلم لیگ کونسل کے ممبروں کی یہ عام خواہش ہے کہ آپ سے لیگ کے آئندہ سیشن کی صدارت کرنے کی درخواست کی جائے۔ جونہی میں نے آپ کا نام تجویز کیا۔ اس تجویز کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ میں اور میرے کئی ساتھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مرحلے پر ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے آپ سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی نہیں ہے...... آپ اس وقت بہت بڑی خدمت سر انجام دے سکتے ہیں۔ جو آپ کے کارناموں میں اضافہ کرے گی۔ ہمیں آپ کی قابلیت اور تجربے کی ضرورت ہے...... شاید میں پوری طرح ظاہر نہیں کر سکا کہ مجھے اس بات کا کتنا احساس ہے کہ مسلمانوں کے مفاد میں آپ کا ہمارے ساتھ تعاون بہت اہم ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری خواہش کا اندازہ لگا لیں گے۔ اور مجھے جواب میں صرف دو لفظی تار "مجھے قبول ہے" بھیج دیں گے۔ آپ کا انکار ذاتی طور پر میرے لیے سخت مایوسی کا باعث ہوگا۔"[1] سر فضل حسین کو مسٹر جناح کے پروگرام سے بنیادی اختلاف تھا۔ انہوں نے جواب میں معذرت لکھ بھیجی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کونسل نے سر وزیر حسن کو لیگ کے آئندہ اجلاس کا صدر چنا۔ کونسل کے اس اجلاس میں راجہ غضنفر علیخاں موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب سر وزیر حسن کا نام تجویز کیا گیا تو مولانا شوکت علی نے اس کی سخت مخالفت کی۔ وہ کہتے تھے کہ سر وزیر حسن نے اپنی زندگی میں مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کی۔ لہٰذا وہ اس اعزاز کے مستحق نہیں۔ بحث نے طول پکڑا اور لنچ کا وقت آگیا اجلاس کو لنچ کے لیے ملتوی کرنے کے بعد مسٹر جناح نے راجہ غضنفر علی سے کہا کہ وزیر حسن شاید ایک لحاظ سے موزوں ثابت ہوں۔ آئندہ سال کیلئے کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو ہیں جن کے ساتھ وزیر حسن کے ذاتی تعلقات

---

[1] "فضل حسین۔ ایک سیاسی جائزہ" مصنفہ عظیم حسین صفحہ [illegible]

اچھے ہیں۔ شاید یہ بات کانگریس اور لیگ کے درمیان تعاون کے نقطۂ نگاہ سے مفید رہے۔
راجہ صاحب نے لنچ کے وقفے میں مولانا شوکت علی کو مسٹر جناح کے خیال سے آگاہ کیا۔ جب
اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو مولانا نے اپنی مخالفت ترک کر دی۔ سر فضل حسین کو مسٹر جناح کے
پروگرام سے کیا اختلاف تھا؟ فی الحقیقت اختلاف کی بنا یہ تھی مسٹر جناح کے نزدیک اصل اور
اہم سوال ملک کی آزادی کا تھا اور سر فضل حسین کی توجہ صوبائی خودمختاری کے مواقع پر مرکوز
تھی۔ تصویر کا جو رخ سر فضل حسین پیش کرتے تھے۔ وہ بھی اپنی جگہ دلچسپ تھا۔ وہ کہتے تھے
کہ فرض کیجئے کہ میں مسٹر جناح کے پروگرام کے مطابق پنجاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر
انتخابی مہم شروع کروں۔ اس کے دو لازمی نتائج ہوں گے۔ (۱) میں اپنے امیدوار زیادہ سے
زیادہ ۸۶ مسلم حلقوں میں نامزد کر سکوں گا۔ (۲) فرقہ وارانہ نعرے پر میری انتخابی مہم کا لازمی،
ردعمل یہ ہو گا کہ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی فرقہ وارانہ پارٹیوں کو تقویت حاصل ہو گی۔ اور
چھوٹو رام گروپ کے لیئے اپنے حلقوں میں سخت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ گویا خود اپنے
عمل سے میں اس غیر مسلم گروپ کی شکست کے اسباب مہیا کروں گا۔ جو بارہ سال
سے مضبوطی کے ساتھ مسلم کیمپ کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ چھیاسی
نشستیں صوبائی اسمبلی کے کل ایک سو پچھتر کے ایوان میں پہلے ہی اقلیت کی حیثیت
رکھتی ہیں۔ لیکن عملی بات یہ ہے کہ انتہائی کامیابی کی صورت میں بھی مجھے پانچ دس فیصد
حلقوں میں شکست کے لیئے تیار رہنا چاہئے۔ لہٰذا میری پارٹی انتخابات سے لازماً ایک
اقلیت کی صورت میں برآمد ہو گی۔ اس کے بعد میں ایسے گروپ تلاش کروں گا
جو میرے ساتھ کولیشن کرنے کو تیار ہوں اور دوسری پارٹیاں میری پارٹی کے بالمقابل کولیشن
قائم کرنے کی کوشش کریں گی۔ میں چند ہندو سکھ ممبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا سکوں گا یا
دوسری پارٹیاں چند مسلمانوں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیں گی؟ ایسے غیر یقینی حالات میں گورنر اگر چاہے گا
تو مسلمان لیڈر کی وزارت بنوا دے گا اور اگر چاہے گا تو ہندوؤں اور سکھوں کی وزارت
بنوا دے گا اور دونوں صورتوں میں منافقت اس کے ہاتھ میں کھلونا بنی رہے گی۔ بعینہٖ
یہی صورت بنگال میں پیش آئے گی مسلم اکثریت کے یہی دو بڑے صوبے ہیں۔ لہٰذا اگر مقصد یہ ہے

کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں نئے آئین کے تحت مسلمانوں کو سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے جو مواقع ملے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا نہیں۔ بلکہ ضائع کرنے کا ہے۔

اس کے بالمقابل وہ اپنا پروگرام یہ بتلاتے تھے کہ یونینسٹ پارٹی کے نام سے میں ایک ایسے پروگرام کی بنیاد پر جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے ایک پسماندہ طبقے کے لیئے بھی اقتصادی کشش رکھتا ہو۔ تمام مسلم حلقوں اور کم از کم نصف غیر مسلم حلقوں میں انتخاب لڑنا چاہتا ہوں۔ پنجاب کی دیہاتی آبادی کو سود خوار مہاجن کے قرضے سے نجات دلانا اس انتخابی مہم کا بنیادی نعرہ ہو گا۔ اس طرح مجھے کم از کم یہ موقعہ ملتا ہے کہ میں ایک قطعی اکثریت رکھنے والی پارٹی لے کر اسمبلی میں جاؤں جس میں مسلمانوں کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل ہو اور ایک مضبوط اور فعال وزارت بناؤں۔ اسی طرح ان کے خیال کے مطابق بنگال میں مسلمانوں کے لیئے ایک غیر مسلم عنصر کو ساتھ ملانے کے لیئے ٹھوس اقتصادی بنیاد موجود تھی۔ یعنی دوامی بندوبست کے تحت قائم شدہ جاگیرداریوں کی تنسیخ اور کسانوں کو ان کی زیر کاشت زمینوں کی ملکیت دلانے کا پروگرام۔ ان جاگیروں پر ہندوؤں کے ایک طبقے کی تقریباً مکمل اجارہ داری تھی جس کے بوجھ کے نیچے اس صوبے کے مسلمان اور ان کے ساتھ ہندو کسان بری طرح پس رہے تھے۔ فضل حسین کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر مضبوط اکثریت حاصل کرنے اور مضبوط وزارت قائم کرنے کا موقع مل سکتا تھا جو اسمبلی کو فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم کرنے سے نہ ملتا تھا۔ صوبہ سرحد اور سندھ کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو قطعی اکثریت حاصل تھی۔ لیکن سر فضل حسین کے خیال میں وہاں بھی مسلمانوں کے لیئے فرقہ وارانہ پارٹیاں بنا کر اسمبلیوں میں جانے سے کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ گورنروں کو اقلیتوں کی حفاظت کے نام پر وزارت سازی میں دخل اندازی کا موقع ملے۔

ان دلائل کے پیش نظر ان کی رائے یہ تھی کہ مسلم لیگ کو صوبائی انتخاب میں دخل ہی نہ دینا چاہیئے۔ صرف مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنانی چاہیئے۔ البتہ صوبائی انتخابات میں دخل دیئے بغیر اسے مسلمانوں کے ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم کی حیثیت سے (اس

سب سے پہلے اس کی یہی حیثیت تھی) اپنے آپ کو زیادہ مضبوط اور اپنی آواز کو زیادہ موثر بنانا چاہیئے اس کی صورت ان کے خیال میں یہ تھی کہ صوبائی انتخاب کے بعد مسٹر جناح تمام صوبوں کے منتخب شدہ مسلمان ممبروں کا (خواہ وہ صوبائی اسمبلی میں کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں) اور مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے منتخب شدہ ممبروں کا ایک کنونشن طلب کریں اور اس کنونشن کو مستقل صورت دے کر اسے مسلم لیگ کی تنظیم میں بنیادی اور کلیدی جگہ دیں۔ انہوں نے آل پارٹیز مسلم لیگ کانفرنس کے ایگزیکٹو بورڈ کے ایک اجلاس میں جو ۱۷ فروری ۱۹۳۶ء کو آغا خان کے زیر صدارت دہلی میں منعقد ہوا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ انتخابات کے بعد اگر مسٹر جناح نے اس قسم کا کنونشن بلانے کی تجویز کو قبول نہ کیا تو میں خود اس کا اہتمام کروں گا تاکہ ایک قرار واقعی نمائندہ حیثیت کی مرکزی تنظیم قائم ہو جائے۔ جو مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا احساس کرے۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی حفاظت کے لیئے بھی موثر قدم اٹھائے اور ہر اہم مسئلہ پر پوری مسلم قوم کے نقطہ نگاہ کی ترجمانی کر سکے۔ لیکن کیا مختلف صوبائی پارٹیوں میں ابھرے ہوئے مسلمان ممبر ایک مرکزی مسلم تنظیم میں جمع ہو جاتے؟ سر فضل حسین کا خیال تھا کہ کانگریسی مسلمانوں کو چھوڑ کر (لیکن اگر وہ آنا چاہیں تو انہیں ضرور جگہ دی جائے) باقی صوبائی پارٹیوں کے مسلمان ممبر اس قسم کی مرکزی تنظیم کی جانب یقینی اور مضبوط کشش محسوس کریں گے اور اسے ضرور اپنائیں گے۔ مسلمانوں کے اندر قومی یکجہتی کا جو احساس موجود تھا۔ وہ اس تجویز کی کامیابی کی ضمانت ثابت ہوگا اور ان کی مرکزی تنظیم اور ان کی صوبائی سیاست کے درمیان ہم آہنگی قائم رکھے گا۔

سر فضل کا یہ پروگرام حقیقت پسندانہ تھا یا نہ تھا۔ لیکن اس پروگرام میں ملک کی آزادی کے مسئلے کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ اس اعتراض کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ پہلا قدم پہلے۔ اس سے اگلے قدم کی فکر اس کے بعد۔ مسلمانوں کو صوبائی انتخاب اس مقصد اول کے ساتھ لڑنا چاہیئے کہ چار خود مختار صوبوں میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے جو مواقع موجود ہیں۔ ان پر مضبوطی کے ساتھ قبضہ کریں۔ یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اور مسلمان اپنی مرکزی تنظیم کو بھی مضبوط دیکھیں تو آگے قدم بڑھانے میں مدد ملے گی۔ جس کے لیئے پالیسی سوچ سمجھ کر اور

آنے والے حالات کے مطابق متعین کرنی پڑے گی لیکن ان کے ذہن میں جو الگے فوری قدم تھے وہ بھی انگریزی حکومت کے خلاف کوئی سیاسی محاذ قائم کرنے کے لیئے نہ تھے۔ بلکہ ان کے ساتھ جوابی تعاون کے ذریعے فیڈرل نظام میں مسلم صوبوں کی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیئے تھے۔ مثلاً بلوچستان کو مسلمانوں کا پانچواں خود مختار صوبہ بنانا۔ تقسیم اختیارات کی فہرستوں میں ردّ و بدل۔ اس آئندہ مطالبے کے لیئے بنیاد قائم کرنے کی کوشش کہ فیڈرل نظام میں نہ صرف چھوٹے اور بڑے صوبوں کو یکساں نمائندگی حاصل ہو۔ بلکہ اہم مسائل کے متعلق انفرادی ویٹو کے ذریعے یا فیصلے کے لیئے دو تہائی اکثریت کی شرط کے ذریعے کسی نہ کسی طریق پر پانچ مسلم صوبوں کو سات ہندو صوبوں کے ساتھ عملاً مساوات کا درجہ حاصل ہو جائے" تاکہ جب آزادی آئے تو ہندوستان کی مسلم اقلیت پر کسی کھلے ظلم کا امکان باقی نہ رہے[1]"۔ یعنی ان کے ذہن میں آزادی سے پہلے ایک لازمی عبوری دور کا تصوّر تھا۔ اور اس عبوری دور میں وہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ کانگریس اور انگریزی حکومت کے درمیان ایک تیسری پارٹی بنائے رکھنا چاہتے تھے اور اپنے مقاصد کے لیئے کانگریس سے زیادہ انگریز سے مدد لینے کی توقع رکھتے تھے۔

۱۹۳۶ء کے آغاز میں مسٹر جناح نے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق مسلم لیگ کے زیر اہتمام انتخابی مہم کے لیئے تیاریاں شروع کیں۔ اور لاہور میں سر فضل حسین نے اپنے مخصوص طریق کار کے مطابق بیماری کے بستر پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر نوٹ اور خطوط لکھوانے اور ملاقاتیوں کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسٹر جناح کو ابتدائی گفت و شنید میں سب سے زیادہ حوصلہ افزا کامیابی یوپی میں ہوئی۔ جہاں "مسلم یونٹی بورڈ" کے لیڈروں نے اپنے آپ کو مسلم لیگ کی انتخابی مہم میں مدغم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سر فضل حسین کے نقطۂ نگاہ کے ساتھ اتفاق کرنے والوں میں سندھ کے سر عبداللہ ہارون اور صوبہ سرحد کے اس زمانے کے وزیر اعلیٰ سر عبدالقیوم شامل تھے۔ انہوں نے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی

---

[1] سر شفاعت احمد کے نام ایک خط کے الفاظ۔

کے نمونے پر سندھ یونائیٹڈ پارٹی اور فرنٹیئر یونائیٹڈ پارٹی قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو سر فضل حسین نے ممدوٹ ولا لاہور میں یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کی رسم افتتاح ادا کی۔ اور اس کی باضابطہ سیکرٹریٹ قائم کر دی۔ دس دن کے بعد ۱۱ اپریل کو بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس نے مسٹر جناح کو مرکزی اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے اور ان کے زیر اہتمام انتخابی مہم منظم کرنے کا اختیار دے دیا۔ تقریباً اسی وقت کانگریس کے کھلے اجلاس نے بھی جو پنڈت جواہر لال نہرو کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ صوبائی انتخاب لڑنے کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن وزارتی عہدے قبول کرنے یا نہ کرنے کے سوال پر فیصلہ کانگریس کمیٹی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

اپریل ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتے میں مسٹر جناح دہلی کے ایک پبلک جلسے میں جو جمعیت علمائے ہند کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ تقریر کرتے ہوئے کانگریس کو کمیونل ایوارڈ منظور کرنے اور اس بنیاد پر مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتے کی دعوت دے چکے تھے۔ آپ کے الفاظ یہ تھے "حکومت نے یہ آئین تمام پارٹیوں کی مرضی کے خلاف اس ملک پر محض اس وجہ سے ٹھونس دیا ہے کہ ہندوستانی آپس میں متحد نہ تھے۔ اور اپنے خانگی اختلافات کا تصفیہ خود نہ کر سکے تھے۔ تاہم مسلمان آزادی کی جنگ میں ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ صرف اپنا تحفظ چاہتے ہیں چونکہ وہ اقلیت میں ہیں۔ یہ کوئی مذہبی سوال نہیں ہے۔ بلکہ خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ میں ہندوؤں سے اپیل کرتا ہوں۔ کمیونل ایوارڈ پر بحث کا دروازہ بند کرو تاکہ ہم سب مل کر آگے بڑھ سکیں۔ اور ملک کے بڑے مسئلے کی طرف توجہ دیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ منظم ہونا چاہیئے۔ اگر دونوں منظم ہو گئے تو انہیں تعاون کے راستے پر چلنے میں دیر نہ لگے گی۔" پھر ۱۲ اپریل کو آپ نے مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی میں بہت زوردار الفاظ میں اسی دعوت کو دہرایا۔ آپ نے فرمایا: "اگر مجھے اس آئین کے جبری نفاذ کو برداشت کرنا پڑے تو میں مجبوراً اسے برداشت کروں گا۔ لیکن اس کے خلاف احتجاج کرتا رہوں گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح جرمن قوم نے معاہدۂ وارسائی کو قبول کیا تھا۔ جرمن قوم کو بھی مجبوراً معاہدۂ وارسائی پر دستخط کرنے پڑے تھے۔ میں بھی اس

آئین کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو جرمنی نے معاہدۂ وارسائی کے ساتھ کیا تھا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ایک ایک صفحہ کو پھاڑ ڈالوں گا۔ ہم اس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک اس آئین کی جگہ ایسا آئین نہ آجائے جو ہمارے لئے قابل قبول ہو۔ لیکن آزادی کی یہ جنگ مسلمان اکیلے نہیں لڑ سکتے۔ یہ اسی طرح لڑی جا سکتی ہے کہ دونوں بڑے فرقے دوش بدوش کھڑے ہوں اور باہم تعاون کریں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ کانگریس جو سب سے بڑی تنظیم ہے ابھی تک روائتی شتر مرغ کی پالیسی پر عمل پیرا ہے اور یہ کہہ رہی ہے کہ میں پورے ملک کی نمائندہ ہوں اور کسی ایک فرقے کو اہمیت نہیں دے سکتی۔ لہٰذا میں (فرقہ وارانہ اختلافی مسئلے کے متعلق) غیر جانبدار ہوں۔...... میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس قسم کا رویّہ اختیار کر کے کانگریس اس منزل تک کبھی نہ پہنچ سکے گی جہاں وہ اور ہم دونوں پہونچنا چاہتے ہیں۔ اگر کانگریس برطانوی تسلط کے دور کو طول دینا چاہتی ہے تو بے شک اپنی موجودہ پالیسی پر چلتی رہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان پر اپنے فرقے اور اپنے ملک دونوں کے حقوق ہیں۔ خواہ کانگریس ان کا تعاون چاہے یا نہ چاہے وہ اپنے آپ کو منظم کریں اور کانگریس کو اپنے ساتھ تعاون کے لئے مجبور کر دیں"۔ لیکن کانگریس ان اپیلوں کو سنتی رہی۔ اور ان کا کوئی جواب دیئے بغیر اپنے راستے پر چلتی رہی۔

البتہ یو۔ پی میں مقامی کانگریسی لیڈر "مسلم یونٹی بورڈ" کے لیڈروں کے ساتھ یہ پخت و پز کرتے رہے کہ حکومت پرست نیشنل ایگریکلچرل پارٹی (تعلقہ داروں کی پارٹی) کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلم حلقوں میں "مسلم یونٹی بورڈ" اپنے امیدواروں کو کھڑا کرے۔ اور ہندو حلقوں میں کانگریس کے امیدوار کھڑے کئے جائیں۔

مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا اعلان کرنے سے پہلے اپریل ۱۹۳۶ء کی آخری تاریخوں میں مسٹر جناح لاہور تشریف لائے یہاں مشترک دوستوں نے ان کی سر فضل حسین کے ساتھ ملاقات اور بالمشافہ گفتگو کا انتظام کیا۔ ملاقات جو ان دونوں کی آخری ملاقات تھی سر فضل حسین کے مکان پر ہوئی۔ اس عمارت میں اب لاہور ریڈیو سٹیشن کے

سٹوڈیو کام کر رہے ہیں۔ دونوں نے اکٹھے چائے پی اور ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس گفتگو کے متعلق بعد میں جو کچھ معلوم ہو سکا اس میں ایک نکتہ بہت دلچسپ اور اہم تھا۔

مسٹر جناح نے دوران گفتگو میں اپنے میزبان سے پوچھا۔ فرض کیجئے آپ کی مخلوط پارٹی کو ہندو حلقوں میں کامیابی حاصل ہو۔ لیکن وہ مسلم حلقوں میں شکست کھا کر عملاً ہندو اکثریت کی پارٹی بن جائے۔ تو آپ کیا کریں گے؟ سر فضل حسین نے کہا "میرا اصرار یہ ہے کہ اگر مسلمان من حیث الجماعت میرے منصوبے کو قبول کریں تو وہ آپ کے منصوبے کی نسبت بہتر نتائج حاصل کرنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان میرے منصوبے کو مسترد کر دیں۔ تو میں یقیناً اسے ترک کر کے نہ صرف میدان آپ کے منصوبے کے لیے چھوڑ دوں گا۔ بلکہ اس کی کامیابی کے لیے حتی الوسع زور لگاؤں گا" ایک سوال سر فضل حسین نے ان سے پوچھا "اگر مسلمان ممبروں کی اکثریت میرے ساتھ ہو اور چند مسلم نشستیں مسلم لیگ پارٹی جیت لے تو وہ پارٹی کیا کرے گی؟" مسٹر جناح نے فرمایا "اس بارے میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ پارٹی وہی قدم اٹھائے گی۔ جو اس کے نزدیک مسلمانوں کے اور ملک کے مفاد میں ہو گا" اس گفتگو کے بعد مسٹر جناح اور ان کے ساتھ چودھری شہاب الدین (یہ بھی گفتگو میں شریک تھے)۔ مکان سے باہر نکلے تو دو تین اخبار نویس ان کے منتظر تھے۔ مسٹر جناح نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا "صاحبان ہم دو باتوں پر متفق ہو گئے ہیں۔ ایک اس بات پر کہ ہم دونوں کی رائے میں اپنا اپنا راستہ درست ہے۔ اور دوسرے اس بات پر کہ انتخابات کا نتیجہ نکلنے کے بعد ہم پھر ملاقات اور تبادلہ خیال کریں گے۔ لیکن اس ملاقات کی نوبت نہ آسکی۔ اس گفتگو سے تقریباً تین مہینے کے بعد ۸ اگست ۱۹۳۶ء کو سر فضل حسین اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ صوبائی انتخابات میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔

۲۰۔ مسلم قومیت پر بھرپور حملہ "جناح سکندر پیکٹ" اور مسلمانوں کا نیا سیاسی محاذ

صوبائی خود مختاری کے آئین کے تحت پہلے صوبائی انتخابات ۱۹۳۷ء کے آغاز میں ہوئے۔ جہاں تک مسلم اکثریت کے صوبوں کا تعلق تھا، پنجاب میں گذشتہ انتخابات کی تاریخ دہرائی گئی۔ سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی (جس کی تنظیم زمانہ گذشتہ میں صرف اسمبلی کی چار دیواری تک محدود تھی اس سے باہر کوئی نہ تھی) کی تنظیم کا جو پروگرام بنایا تھا۔ وہ صرف اس صوبائی ہیڈ کوارٹر تک محدود رہا جو وہ اپنی زندگی میں قائم کر گئے تھے۔ ان کی وفات کے فوراً بعد اسی ہیڈ کوارٹر کے عہدہ داروں نے سر سکندر حیات کو پارٹی کا نیا لیڈر چن لیا۔ لیکن انھیں ریزرو بنک میں اپنے عہدے سے فراغت حاصل کرنے میں کچھ دیر لگی۔ جب وہ یہاں پہنچے تو ان کے زیر قیادت پارٹی کی انتخابی مہم نے یہ صورت اختیار کی کہ چند دیہاتی حلقوں میں پارٹی کی صوبائی قیادت نے اپنے امیدواروں کے حق میں زور لگایا۔ ان میں ہندو دیہاتی حلقے بہ طور خاص شامل تھے۔ اکثر مسلمان دیہاتی حلقوں میں کسی ایک امیدوار کے ساتھ پارٹی ٹکٹ چسپاں کرنا ضروری نہ سمجھا گیا بلکہ سابقہ روایات کی بناء پر یہ فرض کر لیا گیا کہ آپس میں مقابلہ کرنے والے امیدواروں میں جو شخص کامیاب ہوگا وہ یونینسٹ پارٹی ہی میں شامل ہو جائے گا۔ یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے۔ راجہ غضنفر علی خاں اور ملک برکت علی لیکن ان کی کامیابی کا بھی ان کے ٹکٹ سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ وہ اپنے یا اپنے حامیوں کے ذاتی اثر و رسوخ اور مقامی دھڑے بندیوں کے طفیل کامیاب ہوئے۔ کانگریس کے ٹکٹ پر بھی مسلمان حلقوں سے صرف دو امیدوار کامیاب ہو سکے۔ تین چار شہری مسلم حلقے آزاد

امیدواروں کے حصے میں آئے۔ باقی اکیاسی مسلمان ممبر (بڑے زمینداروں کے حلقوں سے کامیاب ہونے والے مسلمانوں سمیت) اور تینتیس۳۳ ہندو زمیندار اور اچھوت ممبر یونینسٹ پارٹی میں جمع ہو گئے۔ پنجاب کے اضلاع میں اور صوبائی اسمبلی میں مسلمان زمینداروں کے دو بڑے دھڑے موجود تھے۔ سر سکندر نے کابینہ مرتب کرتے وقت دوسرے دھڑے کے نمائندہ ملک خضر حیات ٹوانہ کو اپنے ساتھ لے لیا۔ انتخابات جس صورت میں ہوئے تھے۔ اس کے باوجود سر سکندر کی کابینہ نے مثالی یک جہتی کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے آئندہ سات سال تک یونینسٹ پارٹی کی صفوں میں اندرونی یک جہتی اور ڈسپلن کا معیار خاصا بلند رہا۔ اس عرصے میں صرف تین ممبروں نے پارٹی کو چھوڑا۔

صوبہ سرحد اور سندھ میں بھی مسلمان حلقوں میں بیشتر انتخابات امیدواروں کے انفرادی اثر و رسوخ کی بنا پر لڑے گئے۔ ان صوبوں میں مسلم لیگ کی انتخابی مہم نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کا کوئی امیدوار کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ صوبہ سرحد کی سرخ پوش جماعت نے جو کانگریس کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ پارٹی ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کئے جو اسمبلی کے اندر ایک مضبوط حزب اختلاف بن گئے۔ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے نمونے پر صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم نے اور سندھ میں سر عبداللہ ہارون نے فرنٹیئر یونائیٹڈ پارٹی اور سندھ یونائیٹڈ پارٹی کی بنیاد ڈال دی تھی۔ سر عبداللہ نے خود انتخاب میں حصہ نہ لیا اور اپنی پارٹی کا پارلیمانی لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو بنایا۔ ان پارٹیوں نے مسلمان ممبروں کے ساتھ غیر مسلم اقلیت کے نمائندوں کو ملا کر اپنی اپنی صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی اور انہیں وزارتیں بنانے کا موقعہ بھی مل گیا۔ لیکن یہ دونوں بالکل نئے صوبے تھے۔ جہاں حالات پنجاب سے بالکل مختلف تھے۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے گیارہ بارہ سال کے عرصے میں کم از کم مسلمان اور ہندو زمینداروں کے ذہن کو مہاجن اور ساہوکار طبقے کے مقابلے میں ایک پارلیمانی پارٹی کے ذریعے کام کرنے کی روایت سے آشنا کر دیا تھا۔ صوبہ سرحد اور سندھ کی یونائیٹڈ پارٹیوں کی پشت پر نہ یکجہتی کی کوئی روایت تھی نہ یک جہتی پیدا کرنے والے کسی پروگرام کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ صوبہ سرحد کی وزارت کو ایک حادثہ پیش آ گیا کہ چند مہینوں کے اندر سر عبدالقیوم جن کی شخصیت کے گرد

فرنٹیئر یونائیٹڈ پارٹی جمع ہوئی تھی۔ وفات پاگئے۔ اس کے بعد جلد ہی صوبائی اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے وزارتی پارٹی کے ہندو و سکھ ممبروں کے ساتھ ساز باز کر کے وزارت کو صرف ایک ووٹ سے شکست دیدی۔ اور ستمبر ۱۹۳۷ء میں کانگریس پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر خانصاحب کے زیر قیادت کانگریس اور "ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی" کی کولیشن وزارت قائم ہو گئی۔ فرنٹیئر یونائیٹڈ پارٹی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ اور اس کا نام پھر کبھی سننے میں نہ آیا یہی حشر ایک سال کے بعد یونائیٹڈ سندھ پارٹی کی وزارت کا ہوا۔ اس پارٹی کے ممبروں نے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹ کر وزارتی عہدوں کے لیے جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ اور نت نئے گٹھ جوڑ قائم کرنے اور آئے دن کی وزارتی اکھاڑ پچھاڑ کا ایسا عجیب کھیل کھیلا جو اپنی مثال آپ تھا۔

بنگال میں عجیب صورت حال پیدا ہوئی۔ وہاں مولوی فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی بظاہر اسی طرز کی تھی۔ جیسی سر فضل حسین اس صوبے کے لیے تجویز کرتے تھے۔ لیکن وہ مسلم حلقوں کی صرف ایک تہائی کے قریب نشستیں جیت سکی۔ ایک تہائی نشستوں پر مسلم لیگ اور باقی نشستوں پر آزاد امیدوار قابض ہو گئے۔ لیکن پرجا پارٹی کے لیڈر کو بھی اکثریت حاصل کرنے اور وزارت بنانے کا موقعہ اس طرح مل گیا کہ مسلم لیگ اور پرجا پارٹی نے باہمی انتخابی جنگ کے بعد مولوی فضل الحق کے زیر قیادت کولیشن قائم کر لیا جسے آزاد مسلم ممبروں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ پرجا پارٹی کے ہندو ممبروں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ مسلم لیگ اور پرجا پارٹی کے کولیشن کے سلسلے میں ایک بہت دلچسپ آئینی نکتہ سامنے آیا۔ مولوی فضل الحق انتخابی معرکے سے پہلے مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے۔ بلکہ مسٹر جناح نے ان کا نام مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ میں بھی شامل کر لیا تھا۔ لیکن مولوی صاحب نے انتخاب پرجا پارٹی کے ٹکٹ پر مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے امیدواروں کے خلاف لڑا۔ ایک حلقے میں خود ان کا مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر خواجہ ناظم الدین کے ساتھ مقابلہ ہوا اور خواجہ صاحب ہار گئے۔ پھر خواجہ صاحب ایک ضمنی انتخاب میں منتخب ہوئے۔ لیکن اس زمانے میں مسلم لیگ کا جو آئین تھا (یہی آئین ۱۹۴۱ء تک قائم رہا) اس کی رو سے مسلم لیگ کے سرکاری امیدواروں کے خلاف انتخاب لڑنے کے باوجود مولوی فضل الحق کی پوزیشن مسلم لیگ کے اندر بدستور قائم تھی۔ وہ اب بھی مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے۔ اور

اس عہدے سے یا مسلم لیگ کی ممبری سے اس وقت تک خارج نہ ہو تے تھے۔ جب تک مسلم لیگ کونسل تادیبی کارروائی کے طور پر انہیں مسلم لیگ سے خارج نہ کرے۔ اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ جب مسلم لیگ پارٹی نے ان کے ساتھ کولیشن قائم کیا تو انہیں یہ یقین دلا دیا گیا کہ ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہ کی جائے گی۔ لہٰذا مولوی صاحب پرجا پارٹی کے لیڈر بھی رہے اور مسلم لیگ کے ممبر بھی۔

فی الحقیقت مسلم لیگ کا آئین اس زمانے کی یادگار تھا۔ جب اس جماعت کا مقصد مختلف پارٹیوں کے مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا۔ مسلم لیگ اس حیثیت کو ترک کر کے ایک انتخاب لڑنے والی جماعت بن گئی تھی۔ لیکن اس نے اپنا آئین ابھی نہ بدلا تھا۔

بہرصورت مسلم اکثریتی صوبوں میں تاریخ نے سر فضل حسین کی وفات کے بعد ان کے منصوبے کے کم از کم جزوی امتحان کا موقعہ پیدا کر دیا۔ لیکن پنجاب کے سوا کسی صوبے میں یہ امید پوری نہ ہو سکی کہ وہاں صوبائی پارٹیوں کے قائد مضبوط اور فعال وزارتیں بنا سکیں گے۔ اور مسلمانوں کے مفید مطلب پروگراموں کو بروئے کار لا سکیں گے۔ البتہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت نے مضبوطی کے ساتھ ایک جاندار پروگرام پر عمل کیا۔ اور مختلف قوانین کے ذریعے پنجاب کے دیہات میں ہندو ساہوکار کے سودی کاروبار کا قلع قمع کر دیا۔ اس صوبے کی زرعی معیشت کا یہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پنجاب کی زراعت پیشہ آبادی جس میں بڑے چھوٹے زمیندار اور کسان سب شامل تھے۔ ہندو ساہوکار وں کے تقریباً دو ارب روپیہ کے قرض کے بوجھ میں دبی ہوئی تھی۔ جس پر تیس چالیس کروڑ روپیہ سالانہ سود ادا کیا جا رہا تھا۔ اور اس سود کی زمین بوجھ علاقائی مسلمانوں کی بیب سے جا رہی تھی۔ اس بوجھ سے اس آبادی کو یک قلم نجات دینا اس وزارت کا ایک حقیقی کارنامہ تھا۔ جس نے اس زمانے میں کانگریس کے لیے جو اسمبلی میں حزب مخالف تھی۔ پنجاب کے دیہات میں قدم جمانا محال کر دیا تھا۔

مسلم اکثریت کے صوبوں میں صوبائی خود مختاری کی ابتدا ان حالات میں ہوئی۔ لیکن ہندو اکثریت کے صوبوں میں انتخاب کے نتائج ہندوستان کی سیاست میں ایک عظیم انقلاب

کا نقطۂ آغاز بن گئے۔ وہاں چھ صوبوں کی اسمبلیوں میں کانگریس کو اتنی ٹھوس اکثریت مل گئی کہ کانگریسی ممبروں کی مرضی کے بغیر کوئی وزارت نہ بن سکتی تھی۔ ساتویں صوبے آسام میں بھی کانگریس پارٹی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ لیکن قطعی اکثریت نہ رکھتی تھی۔ اس غیر متوقع کامیابی کے نشہ کے زیر اثر کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے زیر اقتدار صوبوں میں مسلم اقلیت کی اجتماعی حیثیت کو اور ایک جماعت کی حیثیت سے اس کی تھوڑی بہت سیاسی طاقت کو ختم کرنے اور اس کے شیرازے کو منتشر کرنے کے لیے ایک بھرپور اور دانشگاف حملے کا آغاز کر دیا۔ اس حملے کے کئی محاذ تھے۔

(۱) کانگریس ہائی کمان نے انتخابات کا نتیجہ نکلنے کے بعد سب سے پہلے تمام منتخب شدہ کانگریسی ممبروں کا ایک کنونشن دہلی میں بلایا۔ اور صوبائی اسمبلیوں کی پارٹیوں کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ مرکز کی اجازت کے بغیر مقامی طور پر کسی پارٹی سے سمجھوتہ نہ کریں گی۔

(۲) پھر گورنروں کو یہ الٹی میٹم دیدیا گیا۔ کہ کانگریس چھ صوبوں میں نہ کوئی وزارت بنائے گی نہ بننے دے گی۔ تاوقتیکہ گورنر یہ وعدہ نہ کریں کہ وہ اپنے اختیارات خصوصی استعمال نہ کریں گے۔ ان اختیارات کا سب سے اہم مقصد اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت تھا۔

(۳) اس رسہ کشی کا مقصد حاصل کرنے کے بعد کانگریس ہائی کمان نے مسلمانوں کو مسلم لیگ پارٹیوں کے ذریعے یا ایک اجتماعی گروپ کی حیثیت سے صوبائی کابینہ میں نمائندگی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ کہا یہ گیا کہ کانگریس کسی دوسری پارٹی کے ساتھ کولیشن کرنے اور مخلوط وزارتیں بنانے کے اصول کے خلاف ہے۔ اور ایک پارٹی کی وزارت کے اصول کی قائل ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ حملہ صرف مسلمانوں کی سیاسی اجتماعیت کو منتشر کرنے کے لیے تھا۔ وقت آنے پر صوبۂ سرحد میں کانگریس پارٹی کو ہندو ۔ سکھ نیشلسٹ پارٹی کے ساتھ کولیشن وزارت بنانے کی اجازت دیدی گئی۔ بلکہ اس کی پوری حوصلہ افزائی کی گئی۔

(۴) مسلم اقلیت کو کانگریس میں مدغم کرنے کی غرض سے مسلم ماس کنٹیکٹ کے نام سے ایک خاص مہم چلانے کے لیئے کانگریس کا ایک الگ محکمہ قائم کر دیا گیا۔

(۵) اعلان جنگ کے طور پر یہ دانشگاف الٹی میٹم دیدیا گیا کہ کسی مسلم جماعت کے ساتھ

بطور جماعت سمجھوتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے صرف دو فریق ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسرا برطانوی سامراج۔ تیسری پارٹی کوئی نہیں جو لوگ آزادی چاہتے ہیں۔ ان کے لئے کانگریس کے جھنڈے تلے آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کی برطانوی حکومت کے آلہ کار سے زیادہ اور علیحدہ کوئی حیثیت نہیں ہے یہ پنڈت نہرو کے الفاظ تھے۔

یہ قدم یکے بعد دیگرے بہت تیزی اور عزم کے ساتھ اٹھائے گئے۔ اور یہ حقیقت بہت عریاں صورت میں مسلمانوں کے سامنے آگئی کہ کانگریس کے تصور آزادی میں خود ان کا مستقبل کیا تھا۔ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی انتخابی مہم کو اس مقصد سے منظم کیا تھا۔ کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے زیر قیادت ہندو اور مسلمان ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لئے باہم تعاون کریں گے۔ لیکن کیا اس آزادی کے لیئے جس کے ذریعے اگر کانگریس کو اکثریت کا اقتدار حاصل ہو جائے تو وہ سب سے پہلا قدم مسلمانوں کے اجتماعی وجود کو ختم کرنے کے لیئے اٹھائے؟ اور اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا قومی وجود ہی باقی نہ رہے۔ تو اس کلچر اور تہذیب کے بقا اور نشوونما کی کیا گنجائش تھی جو ان کے قومی وجود اور قومی شیرازے سے وابستہ تھا؟ کیا مسلمانوں کو ایسی آزادی حاصل کرنے کے لیئے کانگریس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔ یا ایسی آزادی کی مزاحمت کرنی چاہیئے؟ کانگریس کے اس رویئے نے مسٹر جناح کو حیران کر دیا۔ کیا جس راستے پر وہ مسلمانوں کو چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی منزل یہ تھی کہ وقت آنے پر کانگریس کے ذریعے ہندو اقتدار پر قبضہ کر لیں۔ اور مسلمانوں کو لات مار کر حزب مخالف کے بنچوں کی جانب دھکیل دیں؟ اس کے بعد آپ کو ہندوستان کے پورے سیاسی مسئلے کے متعلق از سر نو غور کرنا اور کانگریس کے واشگاف عزائم کی روشنی میں اپنی پالیسی کو از سر نو مرتب کرنا پڑا۔ یہاں سے قائداعظمؒ کے انداز فکر میں ایک انقلابی تبدیلی آئی۔ جس نے بہت تھوڑے عرصے میں ہندوستان کا سیاسی نقشہ بدل دیا۔

یو۔ پی میں مسلم لیگ اور کانگریس نے صوبائی انتخابات بڑی حد تک ہم آہنگی اور ذہنی تعاون اور یک جہتی کی فضا میں لڑے تھے۔ اس صوبے کی مسلم لیگ عملاً وہی تھی۔ جس نے ۱۹۳۶ء میں

مسلم یونٹی بورڈ کے نام سے مرکزی اسمبلی کے انتخابات کانگریس کے مسلم بازو کی حیثیت سے لڑے تھے۔ اب صوبائی انتخابات کے بعد کیفیت یہ تھی کہ صوبے میں مسلمانوں کو صوبائی حکومت میں کوئی حقیقی نمائندگی اس صورت کے سوا نہ مل سکتی تھی کہ کانگریس مسلم لیگ کو ایک کولیشن کابینہ میں جگہ دے۔ پروگرام کا کوئی اختلاف اس کولیشن کے راستے میں حائل نہ تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کے سلوک کا اصل امتحان اسی صوبے میں ہوا۔ وہاں کانگریس ہائی کمان نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ذریعے صوبائی مسلم لیگ پارٹی کو یہ الٹی میٹم بھیج دیا کہ اپنی علیحدہ ہستی کو ختم کر دو اور کانگریس میں مکمل ادغام قبول کر لو یعنی مسلم ووٹروں نے جس ٹکٹ پر آپ لوگوں کو منتخب کیا ہے۔ اس سے انحراف اور اپنے ووٹروں سے بدعہدی کرو۔ ورنہ آپ کا کوئی نمائندہ وزارت میں نہ لیا جائے گا۔ مولانا نے مسلم لیگ پارٹی کے سامنے اس کی موت کا وارنٹ ۱۵ر جولائی ۱۹۳۷ء کو رکھا۔ یہ ایک ٹائپ شدہ مسودہ تھا جس پر مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر چودھری خلیق الزماں سے دستخط کرنے کو کہا گیا۔ انہوں نے انکار کیا۔ پھر مسودے کے الفاظ میں خفیف رد و بدل کی گئی لیکن اس کا مفہوم یہی رہا کہ اسمبلی کے اندر مسلم لیگ کا کوئی علیحدہ وجود باقی نہ رہے گا اور مسلم لیگ پارٹی کے ممبر مکمل طور پر کانگریس پارٹی میں مدغم ہو جائیں گے۔

چودھری خلیق الزماں نے نواب اسمٰعیل خاں سے مشورے کے بعد مسودے میں ترمیم کے طور پر صرف یہ اضافہ کرنا چاہا۔ کہ فرقہ وارانہ مسائل پر مسلم لیگ پارٹی کے ممبر اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ دے سکیں گے۔ تو یہ ترمیم بھی منظور نہ کی گئی۔ لہٰذا بات چیت ٹوٹ گئی اور جب صوبائی اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو مسلم لیگ پارٹی مخالف بنچوں پر بیٹھ گئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو شاید یہ اندازہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر اپنی علیحدہ قومیت کا احساس کتنا گہرا تھا۔ اور مسلم قومیت کے وجود پر انہوں نے جو بڑا حملہ شروع کیا تھا۔ اس کا ردعمل کیا ہو گا۔ اس مہم میں انہیں اتنی کامیابی ضرور ہوئی۔ کہ جمعیت العلمائے ہند کے وہ ممبر جو مسلم یونٹی بورڈ کے مسلم لیگ میں ادغام کے بعد مسلم لیگ کی انتخابی مہم میں شریک ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ کانگریس اب صاحب اقتدار اور مسلم لیگ محروم اقتدار ہونے والی ہے چپ چاپ مسلم لیگ کیمپ سے نکل کر کانگریس کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ سیاسی اغوا کا یہ کارنامہ بھی مولانا ابوالکلام

آزاد کے ہاتھوں سر انجام ہوا۔

ایک اور صاحب جنہوں نے فوراً سیاسی چولا بدل لیا۔ مسلم لیگ کے گزشتہ سیشن کے صدر سر وزیر حسن تھے۔ یہ واقعہ بہت عجیب تھا کہ ۱۹۳۶ء کے سیشن کے صدر کو ان کے بیانوں کی بناء پر ۱۹۳۷ء کے سیشن میں لیگ سے خارج کرنا پڑا۔ ان کے علاوہ کانگریس کو دوسرے صوبوں میں بھی اکا دکا افراد وزارتوں اور پارلیمانی عہدوں کے لالچ کی خاطر کانگریس کے حلف ناموں پر دستخط کرنے کے لیے مل گئے۔ لیکن اس مہم کا مجموعی ردّعمل کانگریسی لیڈروں کی توقعات کے بالکل برعکس ہوا۔ پورے ملک کے مسلمانوں میں "ہندو راج" کی مزاحمت کا ایک نیا جوش ابھرنے لگا۔ جس کی قیادت مسٹر جناح نے اسی عزم کے ساتھ سنبھالی جس عزم کے ساتھ وہ پچیس تیس برس تک ہندو مسلم اتحاد اور مسلم لیگ کانگریس تعاون کے لیے کام کرتے رہے تھے۔

پنجاب میں یونینسٹ وزارت نے اپریل ۱۹۳۷ء کے آغاز میں عہدے کا حلف اٹھا لیا تھا۔ اسی مہینے میں پنجاب کی نئی اسمبلی کا پہلا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ راجہ غضنفر علی کا بیان ہے کہ انہوں نے اسی زمانے میں سر سکندر حیات کے ساتھ اس سوال پر گفتگو شروع کی۔ کہ کیا اب اس تبادلہ خیال کا وقت نہ آگیا تھا جو سر فضل حسین اور مسٹر جناح انتخابات کے بعد کرنا چاہتے تھے؟ بنگال کی مثال سامنے آگئی تھی۔ کیا پنجاب میں اسی قسم کا کوئی انتظام نہ ہو سکتا تھا جس کے ذریعے صوبائی اسمبلی کے اندر یونینسٹ پارٹی اپنی پوری پارلیمانی قوت بھی قائم رکھے۔ اور اس پارٹی کے مسلمان ممبر مسلمانوں کی مرکزی تنظیم میں بھی شامل رہیں؟ سر سکندر کا ذہنی رجحان اس قسم کے انتظام کے حق میں تھا۔ لیکن وہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کی عملی مشکلات محسوس کرتے تھے۔ ابھی یہ بات بھی واضح نہ تھی کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مفاہمت کی کوشش کیا صورت اختیار کریگی۔ اگر مفاہمت ہوئی تو کن شرائط پر ہوگی۔ اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی ان شرائط کا ساتھ دے سکے گی یا نہیں۔ لاہور کے مختصر اجلاس کے دو مہینے بعد پنجاب اسمبلی کا ایک طویل سیشن شملہ میں شروع ہوا۔ یہاں پھر اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ خود یونینسٹ پارٹی کی صفوں میں کئی ممبر ایسے تھے۔ بالخصوص نواب شاہنواز ممدوٹ جو سر سکندر کو مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کا مشورہ دے رہے تھے۔ اس وقت تک یہ یقین بھی حاصل کیا جا چکا تھا

کہ سر سکندر مسلم لیگ کی تنظیم کا حصہ بننے کے راستے میں جو عملی مشکلات محسوس کرتے تھے۔ مسٹر جناح ان مشکلات کو حل کرنے میں انہیں ہر جائز مدد دینے کو تیار تھے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کانگریس کی جانب سے مسلم لیگ کے ساتھ عدم تعاون اور اس کے مقاصد کے خلاف سیاسی جنگ نے واضح صورت اختیار کرلی۔ سر سکندر کا تذبذب ختم ہو گیا۔ کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کے ذریعے مسلمانوں کا مضبوط محاذ قائم کرنے کا پروگرام ایسا تھا۔ جو سر سکندر کے لیے ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق تھا۔

کانگریس کے عزائم کی مزاحمت ان کی اپنی وزارتی سیاست کو بھی راس آتی تھی۔ اور پورے ملک کے مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نگاہ سے بھی درست تھی۔

اس کے بعد مسلم لیگ نے لکھنؤ میں اپنا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو ان یونینسٹ ممبروں کو جو انتخاب سے پہلے مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے (آئینی لحاظ سے اب بھی ان کی یہ حیثیت قائم تھی) اس اجلاس کے لیے باضابطہ دعوت نامے موصول ہو گئے۔ چنانچہ یونینسٹ پارٹی کے سرکردہ ممبر سر سکندر سمیت اجلاس لکھنؤ میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے۔ ان میں راجہ غضنفر علی بھی شامل تھے۔ جو جولائی ۱۹۳۷ء میں یونینسٹ وزارت میں پارلیمانی سیکرٹری کا عہدہ قبول کر چکے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے شملہ کے حالات سے اور اپنے اقدام سے مسٹر جناح کو مطلع کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا تھا۔ کہ اگر چھ مہینے کے اندر یونینسٹ پارٹی کا مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ تو وہ اس عہدے اور اس پارٹی سے مستعفی ہو جائیں گے۔

پنجاب میں اس وقت مسلم لیگ کی ایک صوبائی شاخ پہلے سے موجود تھی۔ اس کے صدر علامہ اقبال اور سیکرٹری مسٹر غلام رسول بیرسٹر تھے۔ لیکن اس میں اصل فعال حیثیت ملک برکت علی کو حاصل تھی۔ اس صوبائی لیگ کی جانب سے علامہ اقبال تو لکھنؤ نہ جا سکے لیکن اس کے چار پانچ نمائندے ملک برکت علی سمیت اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس طرح پنجاب کی دو پارٹیاں لکھنؤ پہنچیں۔ ظاہر ہے کہ پنجاب کے وزیر اعظم کی اس اجلاس میں موجودگی کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ بنگال کے وزیر اعظم بھی وہاں موجود تھے۔

طے شدہ پلان کے مطابق لکھنؤ میں مسٹر جناح اور سر سکندر کے درمیان گفتگو ہوئی۔ زیر بحث نکات پر بہ آسانی سمجھوتہ ہو گیا۔ لیکن گفتگو کے نتیجے کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی۔ تو کچھ مشکلات پیدا ہوئیں۔ اس سلسلے میں ایک مسوّدہ ملک برکت علی نے تیار کیا۔ لیکن جب یہ مسوّدہ سر سکندر کو دکھایا گیا تو انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ اور کہا کہ اس مسوّدے کا مقصد مجھے لیگ کے اندر رکھنے کے بجائے لیگ سے باہر رہنے پر مجبور کرنا معلوم ہوتا ہے۔

پھر ایک مسوّدہ میر مقبول محمود نے راجہ غضنفر علی اور نواب ممدوٹ کے ساتھ بیٹھ کر تیار کیا۔ یہ مسوّدہ کافی رات گئے تیار ہوا۔ راجہ غضنفر علی اس کی دو ٹائپ شدہ کاپیاں لے کر مسٹر جناح کی قیام گاہ پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ مسٹر جناح سونے کے کمرے میں تشریف لے گئے ہیں۔ لیکن ملازم نے بتایا کہ ان کی خواب گاہ میں ابھی لیمپ روشن ہے۔ راجہ نے اپنی اطلاع بھجوائی۔ مسٹر جناح نے انہیں اندر بلا لیا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھے۔ راجہ صاحب نے انہیں مسوّدہ دکھایا۔ جسے پڑھ کر مسٹر جناح نے فرمایا "یہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں"۔ راجہ صاحب ایک کاپی جس پر سر سکندر کے دستخط تھے۔ مسٹر جناح کے پاس چھوڑ آئے۔ اور دوسری کاپی جس پر مسٹر جناح نے دستخط فرما دیئے۔ واپس لے آئے۔

مسٹر جناح اور سر سکندر کے درمیان مفاہمت ۱۴ اکتوبر کی شب کو ہو گئی تھی۔ اگلے دن ۱۵ اکتوبر کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں سر سکندر نے خاص دعوت پر شرکت کی۔ یہاں اس مفاہمت کا مسوّدہ کونسل کی توثیق کے لئے پیش کیا گیا اور اسے جوش و خروش کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

جو مفاہمت مسٹر جناح اور سر سکندر کے درمیان ضبط تحریر میں آئی۔ وہ عرف عام میں جناح سکندر پیکٹ کے نام سے مشہور رہی۔ لیکن قائداعظم نے ایک مرحلے پر یہ نکتہ واضح کر دیا کہ اس کی آئینی حیثیت کسی ایسے معاہدے کی نہ تھی۔ جو دو متقابل افراد یا دو متقابل پارٹیوں کے لیڈروں کے درمیان کیا گیا ہو۔ آئینی لحاظ سے یہ لیگ کا ایک گھریلو انتظام تھا۔ جسے پنجاب کے مخصوص حالات کے پیش نظر اور لیگ کے اندر سر سکندر اور ان کے ساتھیوں کی پوزیشن میں عملی تضاد کو ختم کرنے کے لئے مسلم لیگ کونسل نے منظور کر لیا تھا۔ جو ضابطہ کار منظور کیا گیا

اس کا متن حسب ذیل تھا۔

آج سر سکندر حیات خاں نے مسٹر جناح کے ساتھ مشورہ کیا جس کے بعد انہوں نے خاص دعوت پر (سر سکندر اس وقت لیگ کے ممبر تھے۔ لیکن لیگ کونسل کے ممبر نہ تھے) مسلم لیگ کونسل کے جلسے میں شرکت کی۔ اس جلسے میں مندرجہ ذیل بیان پیش کیا گیا۔

(۱) یہ کہ پنجاب میں واپس جانے کے بعد سر سکندر حیات اپنی پارٹی کا ایک خاص اجلاس بلائیں گے۔ اور پارٹی کے تمام مسلم ممبروں کو جو پہلے ہی مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں۔ مسلم لیگ کے عقیدے (کریڈ) پر دستخط کرنے اور اس میں شامل ہونے کا مشورہ دیں گے۔ اس حیثیت میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی پارلیمانی بورڈ کے قواعد و ضوابط کے پابند ہوں گے۔ یہ بات یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہ ہوگی

(ب) یہ کہ اس انتظام کے نفاذ کے بعد آئندہ عام یا ضمنی انتخابات میں وہ گروپ جو موجودہ یونینسٹ کولیشن میں شامل ہیں۔ متفقہ طور پر ان امیدواروں کی حمایت کریں گے جنہیں یہ گروپ کھڑا کریں۔

(ج) یہ کہ اسمبلی کے مسلمان ممبر جو لیگ ٹکٹ پر منتخب ہوں یا اس ٹکٹ کو قبول کریں۔ اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کی حیثیت رکھیں گے۔ اس طرح جو مسلم لیگ پارٹی بنے گی اسے اجازت ہوگی کہ وہ لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی کے ساتھ کولیشن یا موافقت قائم کرے یا قائم رکھے۔ اس قسم کی موافقت انتخاب سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے۔ اور انتخاب کے بعد بھی۔ جو اتحاد اس وقت قائم ہے وہ اپنا موجودہ نام یعنی یونینسٹ پارٹی قائم رکھے گا۔

(د) مندرجہ بالا انتظام کے پیش نظر صوبائی پارلیمانی بورڈ از سر نو مرتب کیا جائے گا۔

عملی لحاظ سے اس مفاہمت کے دو نکات اہم تھے۔

(۱) اصولی طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ یونینسٹ پارٹی ایک منفرد پارٹی نہیں بلکہ مسلم لیگی ممبروں اور غیر مسلم ممبروں کا کولیشن ہے۔ لیکن عملی طور پر اس کولیشن کو اپنا اندرونی اتحاد مضبوط رکھنے کی خاطر اپنے پرانے نام کو قائم رکھنے اور ایک منفرد پارٹی کی طرح آئندہ انتخابات

یا ضمنی انتخابات لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔

(۲) یونینسٹ پارٹی کا مسلم لیگی بازو مرکزی اور صوبائی پارلیمانی بورڈ کے قواعد وضوابط کا پابند ہوگیا۔ لیکن صوبائی بورڈ پر کنٹرول خود اسی بازو کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ متن کے الفاظ یہ تھے کہ صوبائی بورڈ از سر نو مرتب کیا جائے گا۔" لیکن مقصد یہی تھا اور کیا بھی گیا کہ مسٹر جناح نے صوبائی لیگ کے پورے نظام کو از سر نو مرتب کرنے کے لئے ایک آرگنائزنگ کمیٹی مقرر کردی جس میں سر سکندر کے ساتھیوں کو بھاری اکثریت دے دی۔ سر سکندر خود اس کے صدر تھے۔ البتہ صوبائی نظام پر (خواہ اسے سر سکندر کے حوالے کر دیا گیا تھا) مرکز کی بالادستی بہر حال قائم تھی۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ پورے ملک کے مسلمانوں نے اس مفاہمت کا پرتپاک اور پرجوش خیر مقدم کیا۔ مسلم عوام پر نئی صورت حال کا نفسیاتی اثر بہت حوصلہ افزا اور ولولہ انگیز ہوا۔ اس سے پہلے مسلمان بظاہر غیر متحد پارٹیوں میں بٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ اور مسلم اقلیتی صوبوں میں کانگریس کے مقابلے میں سیاسی طور پر پسپا ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ کے لکھنؤ سیشن میں جب اکثریتی صوبوں کے برسر اقتدار مسلمان اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے دوش بدوش کھڑے نظر آئے تو مسلم عوام کے ذہنوں میں مسلم قومیت اور مسلم اتحاد کے جذبے کو نئی تقویت پہنچی اور ان کے اندر نیا حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوگیا۔ مسلم لیگ عملی طور پر پورے ملک کے مسلمانوں کے اتحاد کا نشان بن گئی۔ اور مسلمانوں نے ایک قوم ایک سیاسی پلیٹ فارم اور ایک لیڈر کے احساس کے ساتھ اپنی سیاسی زندگی کا ایک نیا باب شروع کیا۔

مسلم لیگ کے اجلاس کی کارروائی نے کانگریسی لیڈروں کو چوکنا کر دیا۔ اور انھوں نے سوچ سمجھ کر مسٹر جناح کو سیاسی گفت وشنید کے نرغے میں گھیرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف پنڈت جواہر لال نہرو نے اور دوسری طرف مہاتما گاندھی نے ان کے ساتھ خط وکتابت شروع کی۔ پھر کانگریس کے نئے صدر مسٹر سبھاش چندر بوس نے کانگریس کی جانب سے یہ گفتگو جاری رکھی۔ جب گفت وشنید ناکام ہوگئی تو تمام خط وکتابت شائع کر دی گئی۔

اس خط وکتابت کو غور سے پڑھا جائے تو اس کے چند پہلو بہت دلچسپ تھے۔ کانگریسی لیڈر مسٹر جناح کو گھیر کر اس نکتے پر لانا چاہتے تھے کہ وہ ملک کی آزادی کے نصب العین کو

پیشِ نظر رکھتے ہوئے وُہ اسی نصب العین کی حدود یعنی جمہوری آزادی کے آئین کے اندر مسلمانوں کے مطلوبہ تحفظات کا تعین کریں لیکن حقیقت یہ تھی کہ تحفظات کا سوال پیدا ہونے سے پہلے "جمہوری آزادی" اور "قومی حکومت" کا وُہ نصب العین ہی مسٹر جناح کے نزدیک نظرِ ثانی کا محتاج ہوگیا تھا جس کی جانب وُہ مسلمانوں کو دعوت دیتے رہے تھے جمہوری آزادی اور قومی حکومت کے تصورات کو کانگریس جو عملی شکل دینا چاہتی تھی اس کا نمونہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں سامنے آگیا تھا۔ ان صوبوں میں کانگریس نے عملاً صرف ہندو حلقہ ہائے انتخاب میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اور صرف ہندو حلقوں کی تعداد کی بناء پر اسمبلیوں میں قطعی اکثریت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس عملی حقیقت کو نظرانداز کر کے کانگریس اس بات پر اصرار کرتی تھی کہ اُسے اسمبلیوں میں قطعی اکثریت حاصل ہے۔ لہٰذا اسے جمہوریت کے عام پارلیمانی اصولوں کے مطابق خالص کانگریسی وزارتیں قائم کرنے کا پورا حق ہے۔ اور وُہ اس جماعت (مسلم لیگ) کے ساتھ جسے مسلمان ووٹروں نے اپنی نمائندگی کی سند دی ہے۔ کولیشن کرنے اور اُسے وزارت میں حصہ دار بنانے کی محتاج نہیں ہے۔

اس لفظی منطق کا عملی نتیجہ اظہر من الشمس تھا۔ مسلمانوں پر ہندوؤں کی عملاً فرقہ دارانہ حکومت۔ خواہ اسے "ہندو" کے بجائے "جمہوری اکثریت" کا نام دینے کی لاکھ کوشش کی جائے۔ اور اگر آئندہ مرکز میں بھی کانگریس نے اسی منطق کے مطابق "جمہوری اکثریت" کی قومی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تو اس کا مطلب ہوگا پورے ملک پر ہندو راج۔ ایسے تحفظات کیا ہو سکتے تھے جو اس خطرے سے (جسے کانگریس کی اپنی منطق اور عملی پالیسی نے واشگاف کر دیا تھا) مسلمانوں کو محفوظ کر سکیں؟ اس مسئلے پر از سرِ نو غور کی ضرورت تھی۔

کانگریسی لیڈروں کی جانب سے گفت و شنید کی پیشکش کو مسٹر جناح نے مسترد نہ کیا۔ لیکن گفتگو کے لئے انہوں نے ایک شرط کو اپنا بنیادی موقف بنا لیا۔ شرط یہ تھی کہ پہلے اس عملی حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندہ ہے اور کانگریس ہندو اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے۔ مسٹر جناح ایک طرف اس موقف پر مضبوطی سے قائم رہے۔ اور دُوسری طرف مسلم لیگ کے لکھنؤ سیشن کے بعد انھوں نے ایک ہی عملی مقصد کو سامنے رکھا یعنی کانگریس کے بالمقابل مسلمانوں کی عوامی قوت کی علیحدہ تنظیم۔ اس مقصد اور کوشش کو لبیک کہنے کے لئے

مسلمانوں کا ذہن پہلے ہی تیار تھا۔ اب انھیں اس مقصد کی جانب ایک ایسا لیڈر بُلا رہا تھا جس کی دیانت ۔ قابلیت اور خلوص شک وشبہ سے بالاتر تھے ۔ ان عوامل نے مل کر جادو کا کام کیا۔ اور مسلم لیگ کا نعرہ حیرت انگیز تیزی کے ساتھ مسلم عوام کے دلوں کی آواز بن گیا۔

لکھنؤ سیشن کے بعد اپریل ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ نے ایک خاص سیشن کلکتہ میں منعقد کیا جو لکھنؤ سیشن سے بھی زیادہ کامیاب رہا۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۳۸ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا کلکتہ اور پٹنہ دونوں جگہ اجلاس کی صدارت مسٹر جناح نے کی۔ نئے آئین کے فیڈرل حصے کو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں پہلے بھی مسترد کر چکی تھیں لیکن اس نقطۂ نگاہ سے کہ اس میں گورنر جنرل کے اختیاراتِ خصوصی کے ذریعے اور دوسرے طریقوں سے عوام کی نمائندہ اسمبلیوں اور وزیروں کے اختیارات کو قطعاً بے اثر کر دیا گیا تھا۔ پٹنہ میں مسٹر جناح نے پہلی مرتبہ مجوزہ فیڈرل نظام کو اِس بناء پر مسترد کیا کہ اس کے ذریعے ہندو اکثریت کے ہاتھ میں جو طاقت آنے والی تھی وہ ہندوستان پر ہندو راج کے مترادف تھی۔ قائدِ اعظمؒ نے اس وقت اس کا کوئی مثبت بدل تجویز نہ کیا۔

پٹنہ کے سیشن کے متعلق ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ مسٹر جناح کے لئے قائدِ اعظم کا لقب اسی سیشن کی یادگار ہے۔ اس سیشن میں لاہور کے ایک زندہ دل اور قومی کاموں میں دلچسپی لینے والے نوجوان میاں فیروز الدین احمد نے جنھوں نے مسلم لیگ کے جلسوں میں نعرے لگوانے کا فرض اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ "قائدِ اعظم محمد علی جناح زندہ باد" کا نعرہ لگایا اور یہ لقب اتنا مقبول ہوا کہ مسٹر جناح کے نام کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ ہو گیا۔

مسٹر جناح کی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کا ایک لازمی جزو یہ تھا کہ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں مرکزی اسمبلی میں اپنی انڈی پنڈنٹ پارٹی کو توڑ کر ایک خالص مسلم لیگ پارٹی بنالی۔ اس سے پہلے وہ مرکزی اسمبلی میں مسلم پارٹی کی تنظیم کی تجویز اور اس کی قیادت کی پیشکش کو بار بار مسترد کر چکے تھے۔ نئی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر جناح خود تھے۔ اس کے ڈپٹی لیڈر مشرقی پنجاب کے مسلم حلقہ کے نمائندہ سید غلام بھیک نیرنگ منتخب ہوئے۔ سید صاحب اپنے علاقے کے مشہور وکیل اور ادبی حلقوں میں شاعر کی حیثیت سے معروف رہ چکے تھے۔ اس مخلص، بے غرض اور درویش صفت

مسلمان ادیب کی یاد کے ساتھ مولانا حسرتؔ موہانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس زمانے کی مُسلم سیاست میں اپنی قسم کے یہی بزرگ نظر آتے تھے۔

مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کو عددی طاقت کے لحاظ سے حکومت اور کانگریس پارٹی کے درمیان طاقت کا توازن حاصل تھا۔ اس کا ڈسپلن بھی مثالی قسم کا تھا۔ اسے اس کے قائد کی ذاتی قابلیت اور ان کے سیاسی مقام کی وجہ سے خاص اخلاقی قوت بھی حاصل تھی۔ اس زمانے میں قائدِ اعظمؒ نے اسمبلی کے اندر کئی معرکۃ الآرا تقریریں کیں۔ اپنی پارٹی کی پوزیشن کو جو اس وقت بنیادی طور پر ایک منفی پوزیشن تھی۔ انہوں نے جس قابلیت اور جس شان کے ساتھ نبھایا وُہ انہی کا حصہ تھا حکومت کے خلاف ان کا لہجہ اور رویہ ہمیشہ سخت رہا۔ وُہ تین مطالبات کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالتے رہے۔ (۱) مرکزی سکیم کو ترک کر کے مرکز کی آئندہ شکل کے متعلق از سرِ نو غور کرنے کا بندوبست کرو۔ (۲) اس بات کا وعدہ کرو کہ آئندہ کے لئے کوئی ایسی نئی سکیم منظور نہ کی جائے گی جو مسلمانوں کے لئے اطمینان بخش نہ ہو۔ (۳) کانگریسی وزارتوں کے ماتحت صوبوں میں اور بعض ریاستوں میں مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں۔ انہیں ختم کراؤ۔ گورنروں کے اختیاراتِ خصوصی اور ریاستوں پر وائسرائے کے اختیارات آخر کس مرض کی دوا ہیں؟

اس زمانے (۱۹۳۷-۳۹ء) کے واقعات کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے ذہن آئینی مسئلے کے متعلق سوچ بچار کرنے اور نئی آئینی سکیمیں مرتب کرنے میں بہ طورِ خاص مصروف تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے آئندہ آئین کے متعلق کئی حضرات نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ ایک سکیم سر سکندر حیات نے پیش کی۔ ایک حیدر آباد کے ڈاکٹر ایس اے لطیف نے پیش کی۔ ایک اور تجویز "علی گڑھ کے پروفیسروں کی سکیم" کے نام سے شائع ہوئی۔ پنجاب کے میجر کفایت علی نے ایک پنجابی کے نام سے ایک تجویز مرتب کی جو نواب شاہ نواز ممدوٹ نے "کنفیڈریسی آف انڈیا" کے نام سے چھپوائی۔ ایک تجویز سندھ میں مرتب کی گئی۔ اور سر عبداللہ ہارون کمیٹی کی جانب سے شائع ہوئی۔

ان تجاویز کے علاوہ ایک اور تجویز بھی تھی۔ جس پر اس زمانے کے مسلم اخبارات میں بحث شروع ہو چکی تھی۔ یہ وہی تجویز تھی جو "پاکستان" کے نام سے کیمبرج یونیورسٹی کے ایک پنجابی طالب علم

چودھری رحمت علی نے ۳۳-۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس کے مندوبین کے سامنے ایک پمفلٹ کی شکل میں پیش کی تھی لیکن کسی نے اسے سنجیدہ توجہ کا مستحق نہ سمجھا تھا۔ باقی تمام تجاویز کے مقابلے میں چودھری رحمت علی کی تجویز کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ یہ پورے ہندوستان کے لئے کوئی واحد نظام فیڈریشن یا کانفیڈریشن کی شکل میں قبول نہ کرتی تھی بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ آزاد مملکتوں کے تصور پر مبنی تھی۔ اب نئے حالات میں یہ تجویز جسے لوگ بھول چکے تھے۔ پھر زندہ ہوگئی۔ اور ان مختلف تجاویز میں شامل ہوگئی جن پر اس زمانے میں قائداعظمؒ غور کر رہے تھے۔ اس غور و خوض کا نتیجہ آخر اس قرارداد کی صورت میں برآمد ہوا۔ جو مسلم لیگ کے آئندہ سالانہ اجلاس میں پاس ہوئی اور "قرارداد پاکستان" کے نام سے مشہور ہوئی۔

۳۱۔ عالمی جنگ، قرار داد لاہور، پس منظر کے واقعات

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اور وائسرائے (لارڈ لنلتھ گو) نے ہندوستان میں اعلان کر دیا کہ یہ ملک بھی جرمنی کے خلاف جنگ میں شریک ہے۔ اس کے بعد وائسرائے نے ہندوستان کی مختلف پارٹیوں سے جنگی مساعی میں تعاون اور امداد کی اپیل کی اور ان کے لیڈروں کے ساتھ گفت و شنید کی تو لامحالہ اسے کانگریس اور مسلم لیگ کے مطالبات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دونوں پارٹیوں کے مطالبات کے درمیان بنیادی تضاد تھا۔ کانگریس لفظی ردّ و بدل کے ساتھ دو بنیادی مطالبوں پر اصرار کرتی تھی۔ (۱) ہندوستان کے لئے آزادی کے حتمی وعدے کے طور پر یہ اعلان کر دیا جائے کہ جنگ کے بعد عوام کی منتخب کردہ دستور ساز اسمبلی کو آزادی کا آئین بنانے کا حق دیا جائے گا۔ (۲) نیا آئین تو جنگ کے بعد ہی بنے گا لیکن حکومت اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لئے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو فوری طور پر ایک "قومی حکومت" کی عملی شکل دے یعنی ایگزیکٹو کونسل میں ایسے ممبروں کو شامل کیا جائے جنھیں مرکزی اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں کی تائید و حمایت حاصل ہو۔ قائدِ اعظم کو ان دونوں مطالبات کا عملی نتیجہ صاف نظر آتا تھا۔ آئین ساز اسمبلی کے لئے خواہ کوئی طریقِ انتخاب اختیار کیا جائے کانگریس عملی طور پر صرف ہندوؤں کے ووٹ سے اس میں اکثریت حاصل کر سکتی تھی۔ اِس قسم کی اسمبلی کو آئین سازی کا حق دینا اکیلی کانگریس کو آئین سازی کا اختیار دینے کے مترادف تھا۔ قائدِ اعظم کو یہ صورت ہرگز منظور نہ تھی۔ فوری "قومی حکومت" کے نام پر کانگریس جو مطالبہ کرتی تھی اس کا عملی نتیجہ بھی یہی تھا کہ فوری طور پر مرکزی حکومت کو کانگریس کے تابع فرمان کر دیا جائے کیونکہ مرکزی اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں میں کانگریس کو قطعی اکثریت حاصل تھی۔ قائدِ اعظم اس بات کو بھی منظور نہ کرتے تھے لیکن کیا ملک کی آزادی کی جانب کوئی قدم بڑھایا ہی نہ جائے؟ قائدِ اعظم اس بات کی ذمہ داری حکومت پر ڈالتے تھے کہ وہ سوچ سمجھ کر کوئی ایسا راستہ نکالے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے قابلِ قبول ہو اور مسلمانوں کے اطمینان کی خاطر یہ حتمی اعلان کر دے کہ آئندہ کوئی ایسا آئین نافذ کرنے کی

کوشش نہ کی جائے گی جسے مسلمان من حیث الجماعت قبول نہ کرتے ہوں اور ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے فیڈرل حصے کو منسوخ کر دیا جائے۔ کیونکہ اسے بروئے کار لانے سے پورے ملک پر مرکزی حکومت کے ذریعے ہندو راج کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔

وائسرائے کے لئے ان متضاد مطالبات کے پیشِ نظر کوئی قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ کانگریس کو راضی کرنے کے لئے وُہ مسلم لیگ کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ کیونکہ جنگی مساعی میں سب سے بڑی امداد فوجی بھرتی کی تھی جس میں مسلم لیگ کی مخالفت سخت رکاوٹ ڈال سکتی تھی۔ ان حالات میں وائسرائے صرف اتنا کر سکا کہ اس نے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو مرکزی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے تمام پارٹیوں سے امداد کی اپیل کی اور ایک مطالبہ جس پر کانگریس اور مسلم لیگ بہ ظاہر متفق نظر آتی تھیں۔ جزوی طور پر مان لیا۔ یعنی ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے فیڈرل حصے کو "معطل" کرنے کا اعلان کر دیا۔ پھر مختلف سیاسی لیڈروں سے مزید گفتگو کرنے کے بعد وائسرائے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ۱۷۔ اکتوبر کو ایک اور اعلان کیا جس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے موقف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد ڈومی نین کے درجے کی آزادی کا آئین مرتب کرنے کے لئے "تمام پارٹیوں کے مشورے سے" قدم اُٹھایا جائے گا۔

کانگریس کی مجلسِ عاملہ ان گول مول الفاظ پر مطمئن نہ ہوئی۔ کانگریسی لیڈروں کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کا یہی موقعہ ہے۔ چنانچہ مجلسِ عاملہ نے وائسرائے کے اعلان پر مایوسی ظاہر کرتے ہوئے اپنے ۲۲ ۔ اکتوبر کے اجلاس میں کانگریس کی صوبائی وزارتوں کو حکم دے دیا کہ وہ ۳۱۔ اکتوبر تک اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں۔ یعنی جنگی مساعی کے ساتھ عدم تعاون کی جانب ایک قدم اُٹھا لیا گیا۔ اس فیصلے سے مسلم لیگ کی اس مہم کا مقصد جو وُہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے خلاف چلا رہی تھی۔ خود بخود پُورا ہو گیا۔ اور قائدِ اعظم نے مسلمانوں سے کہا کہ وُہ کانگریسی وزارتوں کے خاتمے پر ۲۲۔ دسمبر کو "یومِ نجات" منائیں۔

وائسرائے کے ساتھ مختلف لیڈروں کی ملاقاتوں میں جو گفتگو ہوتی تھی اس کا سرکاری ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس ریکارڈ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے مسلم لیگ کے ساتھ تصادم کا خطرہ مول نہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن وُہ وقتاً فوقتاً قائدِ اعظم کے منفی رویّہ پر اعتراض کرنے سے

بھی نہ چوکتا تھا۔ قائدِ اعظم کی مرکزی دلیل یہ تھی کہ اگر ملک کی آزادی کے نام پر کوئی ایسا قدم اُٹھایا گیا جو آئین سازی یا حکومت کے اختیارات ہندو اکثریت کے ہاتھ میں دے دے تو یہ مسلمانوں پر ہندو راج مسلط کرنے کے مترادف ہوگا۔ مسلمان اس صورتِ حال کو ہرگز برداشت نہ کریں گے اور خانہ جنگی (سول وار) تک نوبت پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ وائسرائے پوچھتا تھا کہ یہ سب باتیں درست ہوں تب بھی اِس بات کا کیا علاج ہے کہ ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں؟ آزادی کی صورت میں حکومتی اختیارات جس ادارے کے ہاتھ میں آئیں گے اس میں بہ ہر حال ہندو نمائندوں کی اکثریت ہوگی۔ اِس صورتِ حال کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ اقلیت مناسب "تحفظات" مانگنے میں ضرور حق بہ جانب ہے لیکن اکثریت سے اس کا حق کیسے چھین سکتی ہے اور ہر اقدام پر "ویٹو" کرنے کا حق کیسے مانگ سکتی ہے؟

۶ فروری ۱۹۴۰ء کو ایک ملاقات کے دوران میں لارڈ لنلتھ گو نے قائدِ اعظم سے کہا۔ کہ مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کو ہندوستان میں یا برطانیہ میں کوئی مدبّر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر ایک اقلیت محض اِس بنا پر کہ وُہ اقلیت ہے۔ اکثریت کی آزادی کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے اور حکومت اور کانگریس کے درمیان تعطل کو برقرار رکھنا چاہے تو اس نقطۂ نگاہ کو برطانیہ کی کسی پارٹی کی حمایت حاصل نہ ہو سکے گی۔ وائسرائے کا اشارہ اس قرارداد کی جانب تھا جو صرف دو دن پہلے (۴ فروری کو) مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے ایک وفد لندن بھیجنے کے متعلق پاس کی تھی۔ اس وفد میں مولوی فضل الحق۔ سر سکندر حیات خاں۔ خواجہ ناظم الدین اور چودھری خلیق الزمان کو شامل کرنا تجویز کیا گیا تھا۔

ان بحثوں میں مسلم لیگ کے موقف کے متعلق جو سوال بار بار اُٹھایا جاتا تھا اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ مسلمان اور ہندو ایک ہی قوم کی اقلیت اور اکثریت نہیں ہیں۔ ایک قوم جو اقلیت میں ہے دُوسری قوم کی آزادی کا راستہ روکنے کا حق بے شک نہیں رکھتی لیکن مسلمان قوم کو ملک کے خاصے وسیع علاقوں میں اکثریت کی حیثیت حاصل ہے۔ وُہ اپنی اکثریت کے علاقوں کے لئے حقِ خود ارادیت ضرور مانگ سکتی ہے۔ قائدِ اعظم کا ذہن اس جواب پر مرکوز ہو رہا تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے پہلی مرتبہ ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو وائسرائے کے ساتھ اپنی ملاقات میں

کیا آپ نے فرمایا کہ اگر حکومت متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اطمینان کی کوئی صورت نکالنے سے قاصر ہے تو لامحالہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی شکل میں ملک کی تقسیم کا مطالبہ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس ملک کی آزادی کا مسئلہ ایک ہی قوم کے اندر "اکثریت اور اقلیت" کے تصوّر کی بنیاد پر حل نہیں ہو سکتا بلکہ دو قوموں کے تصوّر کی بنیاد پر حل ہو سکتا ہے۔

صرف نو دن کے بعد مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا جس کی تاریخوں کا رسمی فیصلہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی مورخہ ۵ فروری ۱۹۴۰ء میں کیا گیا تھا۔ اس دوران میں سر سکندر حیات خاں نے پیش قدمی کی اور حالات اور قائدِ اعظم کے خیالات کا رجحان دیکھتے ہوئے ملک کی تقسیم کے مطالبے کو ایک نرم شکل اور اپنی پسند کی اصطلاحوں میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے لیگ کے سیشن میں پیش کرنے کے لئے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا اور اسے میر مقبول محمود کے ہاتھ قائدِ اعظمؒ کی منظوری کے لئے دہلی بھیج دیا۔ قائدِ اعظمؒ نے اسے سب جیکٹس کمیٹی کے سامنے رکھنا منظور کر لیا۔ اسی مسودے نے مزید کانٹ چھانٹ اور تبدیلیوں کے بعد "قراردادِ لاہور" کی صورت اختیار کی۔

سر سکندر نے ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قراردادِ لاہور کا مسودہ بے شک میں نے ہی تیار کیا تھا لیکن سب جیکٹس کمیٹی نے اس میں اتنی تبدیلیاں کر دیں کہ منظور شدہ قرارداد کو میری تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ پھر اسی تقریر میں آپ نے آئندہ آئین کے متعلق اپنے ذاتی خیالات کی وضاحت کی۔ سر سکندر کے مسودے کا متن اب دستیاب نہیں ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس میں آئندہ آئین کو دو بنیادی اصولوں پر مبنی کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ (۱) صوبوں کو خود مختار اور حاکمانہ حیثیت رکھنے والی (sovereign) مملکتوں کی حیثیت دی جائے اور (۲) چند محکمے (دفاع۔ امورِ خارجہ اور مواصلات) ایک مرکزی ادارے یا بورڈ کی تحویل میں رہیں جس کی حیثیت خود مختار صوبوں کے ایجنٹ کی ہو۔

سر سکندر مسلم لیگ کے مقصد کو صوبائی خود مختاری کی اصطلاح میں بیان کرنا چاہتے تھے اور ایک ایسے نعرے کی شکل دینا چاہتے تھے جس کی تائید وہ ایک پنجابی کی حیثیت سے صوبائی حب الوطنی کے نام پر کر سکیں اور اسے اپنے غیر مسلم یونینسٹ ساتھیوں کے لئے بھی قابلِ قبول بنا سکیں لیکن

قائدِ اعظم مسلمانوں کے قومی مطالبے کو صاف اور واضح طور پر مسلم قوم کے حقِ خود ارادیت کی منطق پر مبنی کرنا پسند کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق اس منطق کے سوا کسی اور منطق کی بنا پر ملک کی تقسیم کا کوئی جواز نہ تھا۔ لہٰذا سب جیکٹس کمیٹی کے اجلاس میں (سر سکندر اس وقت اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے وہاں موجود نہ تھے) سر سکندر کے مسودے کے الفاظ میں کانٹ چھانٹ کر کے اسے نئی شکل دی گئی۔ صوبوں کی جگہ "مسلم اکثریت کے علاقوں" کی اصطلاح استعمال کی گئی اور اس کے مطابق الفاظ میں ردّ و بدل اور فقروں کو آگے پیچھے اور ان میں حک و اضافہ کیا گیا۔ پھر بھی ترمیم شدہ مسودے میں ایک آدھ لفظ ایسا رہ گیا جو اصل مسودے میں درست تھا لیکن ترمیم شدہ عبارت میں آج بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مسلم اکثریت کے علاقوں کی آزاد مملکتوں کے "یونٹوں" کے لئے "sovereign" (حاکمانہ حیثیت) کی اصطلاح کا استعمال۔

سب جیکٹس کمیٹی نے اس قرارداد کو جو آخری شکل دی۔ اس شکل میں اسے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں مولوی فضل الحق نے پیش کیا۔ تائید کرنے والوں میں چودھری خلیق الزمان (یو۔ پی) مولانا ظفر علی خاں (پنجاب) سر عبداللہ ہارون (سندھ) نواب اسمٰعیل خان (بہار) قاضی محمد عیسےٰ (بلوچستان) عبدالحمید خاں (مدراس) مسٹر چندریگر (بمبئی) سیّد عبدالرؤف شاہ (سی پی) ڈاکٹر محمد عالم (پنجاب) سیّد ذاکر علی (یو پی) بیگم مولانا محمد علی جوہر (یو پی) مولانا عبدالحمید قادری (یو پی) اور سردار اورنگ زیب خاں (صوبہ سرحد) شامل تھے۔

اس قرارداد کے متن میں پہلے دو پیرے تمہیدی اور رسمی تھے۔ ان میں مجلسِ عاملہ کے بعض سابقہ فیصلوں کی توثیق کی گئی تھی۔ وائسرائے کے ایک اعلان کے متعلق عدم اطمینان ظاہر کیا گیا تھا۔ اور لیگ کا موقف دہرایا گیا تھا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کا وہ حصّہ جو فیڈریشن کی ساخت سے تعلق رکھتا تھا مسلمانوں کے لئے قطعاً ناقابلِ قبول تھا۔ اور آئینی مسئلے پر از سرِ نو غور ضروری تھا۔ اصل اہمیت قرارداد کے اس حصّے کو حاصل تھی جس میں آئندہ کے لئے مطلوبہ آئین کی نوعیت بیان کی گئی تھی۔ اور برّصغیر میں مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ قرارداد کے اس حصّے کے انگریزی متن کا اردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) آل انڈیا مسلم لیگ کے اِس سیشن کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اِس ملک میں وہی آئین قابلِ عمل

اور مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ جو ذیل کے بنیادی اصولوں کے مطابق تیار کیا جائے۔ یعنی یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے باہم متصل یونٹوں کی خطوں (ریجن) کی صورت میں حد بندی کی جائے۔ اور یہ خطے ضرورت کے مطابق علاقائی ردّو بدل کر کے اِس طرح قائم کئے جائیں۔ کہ ان علاقوں (ایریا) کو جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حِصّوں (زون) میں ہے۔ آزاد (انڈی پنڈنٹ) مملکتوں کی صورت میں اکٹھا کر دیا جائے جن کے اندر شامل ہونے والے یونٹ خود مختار اور مکمل حاکمیت کے حامل (ساورن) ہوں۔

(۲) یہ کہ ان یونٹوں اور علاقوں کے آئین میں اقلیتوں کے مذہبی۔ ثقافتی۔ اقتصادی۔ سیاسی۔ نظم و نسق کے متعلق اور دوسرے حقوق کی خاطر ان سے مشورے کر کے کافی اور مؤثر آئینی تحفظات رکھے جائیں۔ اِسی طرح کے تحفظات کے ذریعے ہندوستان کے ان حِصّوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔

(۳) مزید برآں یہ سیشن مجلسِ عاملہ کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق ایک آئینی سکیم مرتب کرے جس میں اس بات کا انتظام کیا جائے کہ دونوں خطے بالآخر تمام اختیارات مثلاً دفاع، امورِ خارجہ، مواصلات، کسٹم اور دوسرے ایسے معاملات جو ضروری ہوں سنبھال لیں۔

اِس قرارداد کی عبارت کے متعلق تین نکتے دلچسپ تھے:۔

۱۔ اس عبارت میں دو آزاد مملکتیں قائم کرنے کا مقصد ظاہر کیا گیا تھا۔ ایک مملکت ہندوستان کے شمال مغربی خطّے میں اور دوسری مشرقی خطّے میں۔

۲۔ آخری پیراگراف میں مجلسِ عاملہ کو نیا آئین مرتّب کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ آئین میں ایسا انتظام رکھا جائے کہ ان دونوں خطّوں میں قائم ہونے والی آزاد مملکتیں بالآخر تمام اختیارات (دفاع وغیرہ) سنبھال لیں۔ یہ "بالآخر" کا لفظ معنی خیز تھا۔ یعنی کوئی ایسا عرصہ بھی پیشِ نظر تھا جس میں یہ مملکتیں دفاع وغیرہ کے اختیارات کی حامل نہ ہوں گی۔

۳۔ مجوّزہ آزاد مملکتوں کے رقبے کی نشان دہی سے بہت احتیاط کے ساتھ اجتناب کیا گیا تھا نہ "صُوبے" کا لفظ استعمال کیا گیا نہ ضلع کا اور نہ کسی اور معیّن قانونی معنی رکھنے والی اصطلاح کا۔ یعنی رقبے کے متعلق بحث کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ سوائے اِس اشارے کے کہ "مسلم اکثریت" کے علاقوں

کو علیحدہ مملکتوں کی صورت دینا مقصود تھا لیکن مسلم عوام کو الفاظ کی باریکیوں سے دلچسپی نہ تھی ۔ ان کے سامنے اس قرارداد نے (اور اس سے بھی زیادہ ان نعروں نے جو ہندو پریس نے فوراً اس قرارداد کے خلاف بلند کئے) ایک آزاد مسلم مملکت کا صاف سیدھا اور واضح تصور پیش کر دیا جو بہت تیزی کے ساتھ پوری قوم کے دل و دماغ میں گھر کر گیا ۔ قرارداد کے الفاظ میں دو مملکتیں اور "بالآخر" کے مفہوم رہے، لیکن مسلمانوں کے عوامی مطالبے نے فوراً ایک واحد آزاد اسلامی مملکت (پاکستان) کے مطالبے کی صورت اختیار کر لی ۔

پانچ چھ سال کے بعد ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو مسلمانوں کے پانچسو آئینی نمائندوں کے ایک اجتماع نے جو دہلی میں منعقد ہوا مسلم لیگ کے مطالبے کو "ایک پاکستان" ہی کی صورت میں دہرایا اور اس کے رقبے کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے علاوہ پنجاب بنگال اور آسام کے پورے صوبوں پر مشتمل ظاہر کیا ۔

سر سکندر حیات نے قرارداد لاہور کے بعد بھی ذہنی طور پر اس منطق (مسلم قوم کا حق خود ارادیت) کو جسے ان کی اپنی منطق (صوبائی خود مختاری) کی جگہ تقسیم ملک کے مطالبے کی بنیاد بنایا گیا تھا تسلیم نہ کیا ۔ اگر آل انڈیا مرکز کو بالکل حذف کرنا مقصود ہو، تب بھی ان کی کوشش یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان کے امتیاز کو درمیان میں لائے بغیر تقسیم کا مقصد پنجاب اور اس کی "مارشل قوموں" کو "بنیوں اور پنڈتوں" کے زیر اثر آنے والی مرکزی حکومت سے آزاد رکھنا قرار دیا جائے ۔ شاید انہیں توقع تھی کہ ہندوؤں اور سکھوں کا کم از کم ایک طبقہ اس مقصد کی ہمنوائی کرنے کو تیار ہوگا ۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے مسلم لیگ سے بالا بالا ایک عجیب کوشش کی حکومت ہند کے کہنے پر وہ دوم تبہ جنگ کے محاذوں پر ہندوستانی (بیشتر پنجابی) سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لئے گئے ۔ دوسرے دورے میں جو ۴۲-۱۹۴۱ء کے موسم سرما میں ہوا ۔ انہیں قاہرہ میں چرچل کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا موقعہ ملا ۔ انہوں نے واپسی پر اپنی کابینہ کے بعض ساتھیوں کو (ان میں چودھری چھوٹو رام بھی شامل تھے) اور بعض دوسرے دوستوں کو بتایا کہ چرچل کے ساتھ ان کی گفتگو کا ایک موضوع ہندوستان کا آئینی مسئلہ بھی تھا ۔ سر سکندر کے قول کے مطابق انہوں نے چرچل پر یہ دو باتیں واضح کرنے کی کوشش کی :-

۱۔ برطانوی دولتِ مشترکہ کی جنگوں کو جیتنے کے لئے ہندوستان کا جو صُوبہ حقیقی امداد دیتا ہے۔ وُہ پنجاب ہے۔ اور جو طبقہ دلی وفاداری کے ساتھ تعاون کرتا ہے وُہ پنجاب کی "مارشل" قومیں ہیں لہٰذا اگر ہندوستان کی آزادی کے نام پر ایسا آئین بنا دیا گیا جس کے تحت کانگریس کے پنڈت اور مہاشے مرکزی حکومت کے ذریعے پنجاب اور اس کی مارشل قوموں پر راج کرنے لگیں تو یہ بے انصافی اور احسان فراموشی کی انتہا ہوگی۔

۲۔ وفادار پنجاب اِس بات کا مستحق ہے کہ اسے ایک الگ ڈومی نین بنا دیا جائے۔ یا ایسی ڈومی نین میں شامل کر دیا جائے جس میں سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد بھی شامل ہوں۔

سر سکندر کی اِس گفتگو سے چرچل نے کیا اثر قبول کیا۔ یہ کہنا مشکل ہے لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ چند مہینوں کے بعد (مارچ ۱۹۴۲ء میں) چرچل نے مختلف سمتوں سے دباؤ کے تحت ہندوستان کے لئے بعد از جنگ آزادی کی ایک سکیم اپنی جنگی کابینہ کے ایک رکن سر سٹیفورڈ کرپس کے ہاتھ یہاں بھیجی۔ اس سکیم کی بُنیاد یہی تھی کہ صوبوں کو اِس بات کا موقعہ دیا جائے گا کہ اگر وُہ چاہیں تو ہندوستان کی یونین سے الگ ہو جائیں۔ حکومتِ برطانیہ انہیں علیحدہ ڈومی نین کا درجہ دینے کو تیار ہوگی۔ اگر برطانوی کابینہ کی یہ سکیم سر سکندر کی پرائیویٹ اپیل کا نتیجہ تھی تو حالات نے سر سکندر کو دوبارہ مایوس کیا۔ کیونکہ اِس سکیم کو جس کی تفصیل آئندہ پیش کی جائے گی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے مسترد کر دیا لیکن اس سکیم سے پاکستان کے مقصد کو اس حد تک ضرور تقویت پہنچی کہ حکومتِ برطانیہ کی پیش کش کے ذریعے تقسیمِ ملک کی تجویز عملی سیاسیات کے دائرے میں شامل ہو گئی۔

حسبِ توقع قرارداد لاہور کے شائع ہوتے ہی ہندو پریس میں مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف سخت لے دے شروع ہو گئی۔ بعض ہندو کانگریسی لیڈروں کے علاوہ کانگریسی مسلمان بھی اس نئے مطالبے کی مخالفت کرنے کے لئے میدان میں اتر آئے۔ انہوں نے اپریل ۱۹۴۰ء میں جمعیت العلمائے ہند مجلسِ احرار اور شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے مشترکہ اہتمام کے تحت دہلی میں ایک "آزاد مسلم کانفرنس" منعقد کی اور اپنی قرارداد میں اس مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے مسلم لیگ کے اس دعوے کو چیلنج کیا کہ وُہ تمام مسلمانوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف جو نعرے اس مرحلے پر بلند کئے گئے۔ ان میں ایک نعرے کا قائدِ اعظم نے بطور خاص نوٹس لیا۔ اور لیگ کے اجلاس لاہور

کے بعد اپنے بیانوں اور تقریروں میں بار بار اس کا جواب دیا۔ نعرہ یہ تھا کہ قرارداد لاہور میں مسلم لیگ نے صرف "مسلم اکثریت کے علاقوں" کے سوال کو پیشِ نظر رکھا ہے اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کے مفاد اور مستقبل کو توجہ کا مستحق ہی نہیں سمجھا۔ انھیں مجوزہ "پاکستان" سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اس کے جواب میں قائدِ اعظم نے بار بار مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو اس پراپیگنڈے کی جانب توجہ دلائی اور کہا کہ اس کا مقصد ان میں بددلی پیدا کرنا اور انہیں مسلم لیگ کے مطالبے کی مخالفت پر اکسانا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو مسلمان بہر حال اقلیت میں رہیں گے۔ خواہ ملک تقسیم ہو یا نہ ہو۔ انھیں اپنے بھائیوں کے راستے میں رکاوٹ ہرگز نہ بننا چاہیئے جنھیں تقسیمِ ملک کے ذریعے صحیح سیاسی آزادی مل سکتی ہے۔ اگر پورے برِّصغیر پر ایک واحد حکومت مسلّط ہوئی تو نو کروڑ مسلمانوں کو ہندو فرقہ دارانہ اکثریت کی سیاسی غلامی برداشت کرنی پڑے گی۔ کیا پوری قوم کے نقطۂ نگاہ سے اس صورت کو قبول کر لیا جائے یا بصورتِ دیگر کم از کم چھ کروڑ مسلمانوں کو بہ یک وقت انگریز اور ہندو اکثریت کے غلبے سے آزاد کرانے اور اپنی مخصوص روایات اور ملّی نظریات کے مطابق اپنے مستقبل کی تعمیر کا موقعہ دلانے کے لئے جدوجہد کی جائے؟ اس صاف۔ سادہ اور مختصر دلیل سے اقلیتی صوبوں کے مسلمان جس حد تک متاثر ہوئے اس پر بعد کی تاریخ کے واقعات شاہد ہیں۔

۲۱۔ زمانۂ جنگ میں سیاسی کشمکش "کرپس تجاویز"

برطانیہ کے لئے ۱۹۴۰ء کے موسمِ گرما میں جنگ کے حالات بہت نازک ہو گئے۔ مئی اور جون میں ہٹلر کی فوجوں نے نصف یورپ پر قبضہ کر لیا۔ ناروے۔ ڈنمارک، بلجیم۔ ہالینڈ اور فرانس سب یکے بعد دیگرے جرمن فوجوں کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ ہندوستان سے پوری جنگی امداد حاصل کرنے کا مسئلہ نئی اہمیت اختیار کر گیا۔ اور برطانوی کابینہ کے مشورے پر وائسرائے نے ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ بعد از جنگ کے آئین پر بحث کو طول نہ دیں۔ بلکہ فوری طور پر حکومت کا عملی چارج سنبھالنے کے لئے ایگزیکٹو کونسل میں اپنے نمائندوں کو شامل کر دیں۔ اس غرض سے اس نے ۸ اگست ۱۹۴۰ء کو ایک اہم اعلان کیا جس میں کہا گیا کہ (۱) یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کی جائے۔ اور ایک دفاعی مشاورتی کونسل قائم کی جائے (۲) جو شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر یہ بات دوبارہ واضح کی جاتی ہے کہ آئندہ کوئی ایسا آئین نافذ نہ کیا جائے گا جسے ملک کا کوئی بڑا طبقہ منظور نہ کرتا ہو۔ (۳) آئین سازی کا مسئلہ جنگ کے زمانے میں اٹھانا ممکن نہیں۔ جنگ کے بعد آئین سازی کے لئے ایک نمائندہ ادارہ قائم کیا جائے گا۔

کانگریس نے اس پیشکش کو فوراً مسترد کر کے حکومت پر مزید دباؤ ڈالنے کے لئے سول نافرمانی کا راستہ اختیار کر لیا۔ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے اس اعلان پر اطمینان ظاہر کیا۔ اور قائدِ اعظم کو یہ اختیار دے دیا کہ ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کی تجویز کے متعلق وائسرائے سے وضاحت حاصل کریں کہ اس کی تفصیلی صورت کیا ہو گی۔

بالآخر وائسرائے کے ساتھ گفت و شنید کے بعد قائدِ اعظم نے بھی اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ جس خاص نکتے پر قائدِ اعظم اور وائسرائے کی بات چیت ٹوٹی وہ دلچسپ تھا۔

قائدِ اعظم توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل کے ہندوستانی ممبروں میں مسلم لیگ کی اکثریت مانگتے

تھے ۔ وائسرائے یہ بات ماننے کو تیار تھا۔ لیکن قائدِ اعظمؒ کا ایک اور مطالبہ بھی تھا۔ جسے وُہ اہمیّت دیتے تھے۔ وُہ کہتے تھے کہ آج جب کہ کانگریس سول نافرمانی اور عدم تعاون کر رہی ہے مسلم لیگ نظم و نسق میں حکومت کا ہاتھ بٹانے کی بیشتر ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ اگر آئندہ کسی وقت کانگریس نے ایگزیکٹو کونسل میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تو کیا ہوگا؟ اس وقت کانگریس کو زیادہ اہمیّت دے کر اس پارٹی کو جو آج تعاون کرتی ہے پسِ پشت تو نہ ڈال دیا جائے گا؟ لہٰذا وُہ اس بات کی ضمانت مانگتے تھے۔ کہ آج مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتے کے بعد آئندہ کسی مرحلے پر مسلم لیگ کے منشا کے خلاف کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ نہ کیا جائے گا۔ وائسرائے کا موقف یہ رہا کہ اگر ایسا مرحلہ آیا اور ایگزیکٹو کونسل کی تعداد میں مزید اضافے کا سوال پیدا ہوا تو وائسرائے قدرتاً ایگزیکٹو کونسل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھائے گا۔ لیکن اس کے خیال کے مطابق قائدِ اعظمؒ "ویٹو" کا حق مانگ رہے تھے۔ لہٰذا وُہ مطلوبہ ضمانت دینے کو تیار نہ ہوا۔ اِس گفت و شنید کے بعد مسلم لیگ نے بھی ۲۶ دسمبر ۱۹۴۰ء کو کابینہ میں توسیع اور دفاعی مشاورتی کونسل کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

جنگ کے پُورے زمانے میں قائدِ اعظم نے جنگی مساعی میں امداد کے سوال پر ایک سوچا سمجھا اور متوازن رویہ قائم کئے رکھا۔ وُہ کہتے تھے کہ (۱) حکومت کے اختیارات میں مؤثر طریق پر حصّہ دار بنے بغیر مسلم لیگ جنگی مساعی میں ہاتھ بٹانے کی پوری مثبت ذمہ داری نہیں لے سکتی (۲) لیکن مسلم لیگ حکومت کی مساعی میں کوئی رکاوٹ ڈالنا بھی نہیں چاہتی۔ چنانچہ مسلم لیگی وزیروں کو اپنے عہدوں کی ذمہ داری پورا کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ (۳) البتہ اگر حکومت نے کوئی ایسا اعلان کیا یا قدم اُٹھایا جو آئندہ آئین کے سوال پر مسلم لیگ کے مطالبے اور موقف کو نقصان پہنچانے والا ہو تو لیگ حکومت کے خلاف لڑنے پر مجبور ہوگی۔ لیکن اس زمانے میں کانگریس نے حکومت کے خلاف جو اعصابی جنگ جاری رکھی وُہ بہت دلچسپ تھی اور اس میں گاندھی جی کا حصہ اور بھی زیادہ دلچسپ تھا۔

جب وائسرائے نے شروع میں یعنی اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی ہندوستان سے امداد کی اپیل کی۔ اور کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے تعاون کے لئے اپنی شرائط پیش کیں تو گاندھی جی نے کانگریس کے سرکاری موقف سے الگ ہٹ کر ذاتی طور پر یہ بیان دیا تھا کہ کانگریس کی جانب سے تعاون کی

پیش کش غیر مشروط ہونی چاہیئے۔ گاندھی جی اپنے آپ کو وائسرائے اور کانگریس کے درمیان مصالحت کنندہ کی پوزیشن میں رکھنا چاہتے تھے۔ پھر ۲۶ ستمبر ۱۹۳۹ء کو انہوں نے وائسرائے کے ساتھ ایک ملاقات میں کہا کہ اگر میں دس پندرہ برس کم عمر کا ہوتا تو کانگریس کی قرارداد کا مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری خود لیتا لیکن اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ آپ نے وائسرائے کو مشورہ دیا کہ وہ کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد اور کانگریس کی روح رواں پنڈت جواہر لال نہرو کو بلا کر ان سے بات چیت کریں۔ وائسرائے نے ان دونوں سے ۲ اکتوبر کو ملاقات کی۔ وہ اپنا موقف نرم کرنے کو تیار نہ تھے۔ پہلے ہماری شرائط۔ پھر تعاون۔ اس کے بعد وائسرائے نے ۱۷ اکتوبر کو جو اعلان کیا۔ وہ کانگریس کے مطالبات کے مطابق نہ تھا۔ لہذا کانگریس کی مجلس عاملہ نے حکومت پر دباؤ ڈالنے کا پہلا قدم اٹھایا۔ اور کانگریسی وزارتوں کو مستعفی ہونے کا حکم دے دیا۔ وائسرائے کے ردِ عمل کا دو تین مہینے انتظار کرنے کے بعد گاندھی جی نے پھر بات چیت کا دروازہ کھولا۔

وائسرائے نے ۱۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو بمبئی میں ایک تقریر کرتے ہوئے حکومت کے موقف کو دہرایا۔ گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھ کر بھیجا کہ آپ کی تقریر سے مجھے کچھ اُمید پیدا ہوئی ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ میں آپ سے ملوں تو ایک تار یا خط کافی ہو گا۔ وائسرائے نے گاندھی جی کو بلانے سے پہلے پنجاب اور بنگال کے وزرائے اعظم کا نقطہ نگاہ اپنی بعض تجاویز کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں نے ان مراعات کی جو وائسرائے کانگریس کو دینا چاہتے تھے مخالفت کی اور کہا کہ مسلم لیگ ان تجاویز کو ہرگز قبول نہ کرے گی۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی جب وائسرائے سے ملے تو اس سے کوئی بات نہ منوا سکے جس کے بعد کانگریس نے سول نافرمانی کی دھمکی کو زیادہ مؤثر شکل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ کے سالانہ سیشن میں کانگریس نے سول نافرمانی کی قرارداد پاس کر دی اور یہ ذمہ داری مہاتما گاندھی نے سنبھال لی کہ وہ مناسب وقت پر اور مناسب طریق پر سول نافرمانی کی مہم کا آغاز کریں گے۔

دن گزرتے گئے لیکن وائسرائے نے کانگریس کو منانے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ ظاہر تھا کہ اب سول نافرمانی کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد گاندھی جی مصالحت کنندہ کا کردار ادا نہ کر سکتے تھے۔ اب مصالحت کے لئے سلسلہ جنبانی کون کرے؟ یورپ میں جنگ کے

حالات برطانیہ کے نقطۂ نگاہ سے ایسے خراب ہو گئے تھے۔ کہ کانگریسی لیڈروں کا یہ خیال ہوا کہ اگر پھر "مطالبات کا حملہ" کیا جائے تو شاید وائسرائے مان لے۔ لیکن گاندھی جی کانگریس کی سول نافرمانی کی مہم سے الگ ہو کر غیر جانبداری کی حیثیت اختیار کئے بغیر کوئی گفتگو شروع کرنے کے قابل نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک بیان دے دیا۔ کہ یورپ کے ملکوں کو ہٹلر کی فوجوں کا مقابلہ عدم تشدد کے ہتھیار سے کرنا چاہیئے۔ اور ہندوستان کو بھی اپنا دفاع اسی طرح کرنا چاہیئے۔ اس بیان کی آڑ لے کر کانگریس کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد پاس کر دی کہ گاندھی جی کے خیالات اتنے بلند ہیں کہ کانگریس مکمل طور پر ان خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لہٰذا انہیں کانگریس کی سرگرمیوں کی ذمہ داری سے سبکدوش کیا جاتا ہے۔

گاندھی جی نے ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر وائسرائے سے ملاقاتوں میں انہیں ہموار کرنے کی کوششیں پھر شروع کر دیں۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے پھر اپنی شرائط کے ساتھ جنگ میں تعاون کی پیش کش دہرا دی۔ لیکن وائسرائے کو دوسری طرف بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ وہ ہندوستان کی آئندہ آئین سازی کا اختیار دستور ساز اسمبلی کو اور فوری طور پر اپنی کابینہ میں غالب حصہ کانگریس کو دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے تمام حالات دیکھتے ہوئے ۸ اگست والا اعلان کر دیا۔ جس میں کسی حد تک مسلم لیگ کو مزید یقین دلانے کا پہلو موجود تھا۔

اس پر کانگریس نے سول نافرمانی کے فیصلے کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء کو سول نافرمانی کی مہم چلانے کی ذمہ داری پھر گاندھی جی نے سنبھال لی۔ وہ پھر کانگریس کے ڈکٹیٹر بن گئے۔ ایک سال تک انفرادی سول نافرمانی کی مہم چلتی رہی۔ اور پھر خود بخود ختم ہو گئی۔ جب سول نافرمانی کرنے والوں کی تعداد ختم ہو گئی اور یہ تحریک عملاً معطل ہو گئی۔ تو حکومت نے سول نافرمانی کے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اب پھر مطالبات پیش کرنے اور وائسرائے کے ساتھ گفتگو کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے ۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء کو باردولی میں پھر اپنے اسی مؤقف کو دہرایا کہ ملک کے دفاع کے لئے حکومت کے ساتھ پورا تعاون اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے مطالبات مان لیئے جائیں۔ اس پر گاندھی جی نے کانگریس کے صدر کو لکھا کہ کانگریس کے سامنے ملک کے دفاع کا جو تصور ہے وہ بہر حال تشدد کے ہتھیاروں کے ذریعے ہے۔ میں عدم تشدد پر ایمان رکھتا ہوں۔ لہٰذا مجھے

کانگریس کی قیادت سے سبکدوش کیا جائے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے گاندھی جی کو پھر سبکدوش کردیا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب جاپان جنگ میں کودا اور اس کے بحری بیڑے نے مشرق کی جانب سے ایک بڑی رفتار سیلاب کی طرح بڑھنا شروع کیا۔ چرچل پر نیا دباؤ پڑا۔ کچھ جنگ کے حالات کا اور کچھ امریکہ کا جو اصرار کر رہا تھا کہ جنگ میں ہندوستان کی امداد حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کے سیاسی مطالبے کی جانب سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی جائے۔ چرچل نے ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کو ایک معین پروگرام کی صورت میں ایک نئی پیشکش کی جو چرچل کی جنگی کابینہ کے ایک رکن سر سٹیفورڈ کرپس خود لے کر ہندوستان آئے۔ کانگریس نے ایک مرتبہ پھر یہ کوشش کی کہ برطانوی کابینہ فوری طور پر ہندوستان کی حکومت عملاً کانگریس کو سونپ دے۔ اور جب یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو مہاتما جی نے اس نازک موقعہ پر جب جاپان کی فوجیں ہندوستان کے دروازے پر کھڑی تھیں پھر سول نافرمانی (پوری قوت کے ساتھ عام سول نافرمانی) کا پستول حکومت کے سر پر تان دیا اور بالآخر اسے داغ دیا۔

دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپانی ہوائی جہازوں نے اچانک پرل ہاربر میں امریکی بحری جہازوں پر بمباری کرکے بظاہر امریکی بحری بیڑے کی کمر توڑ دی تھی۔ اگلے دن جاپان نے شنگھائی کی بندرگاہ پر قبضہ کرلیا۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر جاپانی فوجیں سیام اور برطانوی ملایا پر قابض ہوگئیں۔ پھر یہ سیلاب بلا اس طرح بڑھا کہ اس نے ایشیا کو سراسیمہ کردیا۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۲ء کو سنگاپور فتح ہوگیا۔ ۸ مارچ کو جاپانی فوجیں رنگون میں داخل ہوگئیں۔ ساتھ ہی انہوں نے جزائر انڈمان پر یعنی ہندوستان کے ایک جزیرے پر قبضہ کرلیا۔ ایک دو بار جاپانی ہوابازوں نے ہندوستان کے ساحل پر بھی بم پھینکے۔ حالات کا پس منظر یہ تھا۔ جب سر سٹیفورڈ کرپس اپنی نئی تجاویز لے کر ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہندوستان میں آئے۔ ان تجاویز میں (جو بعد میں "کرپس تجاویز" کے نام سے مشہور رہیں) ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے مختلف اور متضاد مطالبات کے درمیان مفاہمت کا راستہ نکالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کرپس تجاویز کے دو حصے تھے ایک جنگ کے بعد ہندوستان کو ایک ڈومینین کی صورت میں یا اگر کوئی صوبہ یا صوبے الگ ہونا چاہیں تو ایک سے زیادہ ڈومینینوں کی صورت میں آزادی دینے کے متعلق۔ اور دوسرا سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو فی الفور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل

میں جگہ دینے کے متعلق۔ شرط یہ تھی کہ دونوں حصّے اکٹھے منظور کئے جائیں۔ اور دوسری شرط یہ تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ یعنی ہندو اور مسلمان دونوں راضی ہوں گے۔ تو ان تجاویز کو عمل میں لایا جائے گا۔ جنگ کے بعد آزادی دینے کا طریقہ جس کی تشریح کرپس نے کی۔ خاصا پیچیدہ تھا۔

(۱) صوبوں میں نئے انتخاب کرائے جائیں گے

(۲) منتخب شدہ ممبروں کی رائے سے ایک دستور ساز اسمبلی بنائی جائے گی جو ہندوستان کے لیے ڈومی نین کی طرز کا آئین بنائے گی۔

(۳) پھر ہر صوبے سے پوچھا جائے گا کہ وہ اس ڈومی نین میں شریک ہونا چاہتا ہے یا نہیں؟ جن صوبوں کی اسمبلی کم از کم ۶۰ فیصد کی اکثریت سے "ہاں" کہہ دے۔ وہ اس ڈومی نین میں شامل ہو جائیں گے۔

(۴) جہاں صوبائی اسمبلی ۶۰ فیصد کی اکثریت سے "ہاں" نہ کہے ان صوبوں کو استصواب میں کثرت رائے کی بناء پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔

(۵) جو صوبے اس طرح الگ ہونے کا فیصلہ کریں۔ انہیں الگ الگ یا مشترکہ ڈومی نین کے طور پر اپنا آئین بنانے اور آزادی حاصل کرنے کے وہی مواقع حاصل ہوں گے جو ہندوستان کی ابتدائی ڈومی نین کے لیے مقرر کئے گئے ہیں۔

ممکن ہے کہ ان تجاویز کے مرتب کرنے والوں نے یہ سمجھا ہو کہ وہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان اور اس نقطۂ نگاہ کو جو سر سکندر نے وزیر اعظم چرچل کے سامنے پیش کیا تھا۔ مطمئن کرنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ لیکن مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے اس ضابطۂ کار میں تفصیلی نتائج کے لحاظ سے بعض خامیاں تھیں۔ مثلاً آسام کی پوری اسمبلی ۶۰ فیصد غیر مسلم اکثریت کے ووٹ سے "ہاں" کہہ سکتی تھی اور سلہٹ کا ضلع بھی ہندوستان میں چلا جاتا تھا۔ اس سے اگلے مرحلے یعنی استصواب رائے کے وقت پورے پنجاب کا ووٹ شاید علیحدگی کے حق میں ہی جاتا۔ لیکن بنگال کی صورت سخت غیر یقینی تھی۔ وہاں مولوی فضل الحق کی پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان اس وقت کھلی سیاسی جنگ ہو رہی تھی۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آئندہ صوبائی انتخابات یا استصواب پر اس کشمکش کا کیا اثر پڑے گا۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ

نے کرپس تجاویز کے "بعد از جنگ" والے حصے کو منظور نہ کیا۔ جس کے معنی پوری تجاویز کی نامنظوری تھے۔

جہاں تک کانگریس کا تعلق تھا۔ اس نے اس موقعہ پر کرپس تجاویز کے "بعد از جنگ" والے حصے میں چنداں دلچسپی نہ لی۔ تجاویز کا یہ حصہ اسے ناپسند تھا۔ کیونکہ اس میں تقسیم ملک کا اصول اور امکان دونوں شامل تھے۔ لیکن کانگریسی لیڈر یہ سمجھتے تھے۔ کہ برطانیہ جنگ ہار رہا ہے۔ لہٰذا برطانیہ کا وعدۂ فردا انہیں ایک ایسے شخص کے وعدے کے مانند نظر آتا تھا۔ جو بستر مرگ پر پڑا ہو۔ اور ڈاکٹر کو اپنی صحت یابی کے بعد فیس دینے کا مژدہ سنا رہا ہو۔

مہاتما گاندھی نے ایک بیان میں علانیہ طور پر "بعد از جنگ" کی تجاویز کو ایسے چیک سے تشبیہ دی۔ جس پر آئندہ کی تاریخ ڈال دی گئی ہے۔ حالانکہ جس بنک کے نام یہ چیک دیا جا رہا تھا۔ وہ گاندھی جی کے قول کے مطابق دیوالیہ ہو چکا تھا۔ کانگریسی لیڈروں کو صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ برطانیہ کا جاں بلب مریض فوری طور پر حکومت کی کنجیاں ان کے حوالے کرنے کو تیار ہے یا نہیں۔ وہ تمام وقت کرپس کے ساتھ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو عملاً ایک "قومی حکومت" کی شکل دینے پر بات چیت کرتے رہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یہ قومی حکومت مرکزی اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں کے سامنے جوابدہ ہو اور وائسرائے اپنے لئے محض آئینی حیثیت قبول کرے۔ لیکن فی الحال دفاعی امور کمانڈر انچیف کی تحویل میں رکھنے کا مناسب بندوبست کر لیا جائے۔ "قومی حکومت" اگر اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں کے سامنے جوابدہ ہو۔ جن میں کانگریس کو واضح اکثریت حاصل تھی۔ تو اس کے صاف معنی کانگریسی حکومت تھے۔ پورے ہندوستان کی حکومت فوری طور پر عملاً کانگریس کے حوالے کرنے کا مطالبہ نہ مانا گیا تو بات چیت ٹوٹ گئی۔ کرپس صاحب لندن واپس چلے گئے اور مہاتما گاندھی نے جنگ کے اس نازک ترین مرحلے پر قائداعظمؒ کے قول کے مطابق "جواری کا آخری داؤں" کھیلنے کی تیاری کر لی۔ لیکن اس مرحلے پر کانگریس کی مجلس عاملہ کے ایک ممتاز رکن مسٹر راجہ گوپال اچاریہ نے جرأت سے کام لیا اور کانگریس کا ذہن جن خطوط پر چل رہا تھا۔ انہیں غلط قرار دے کر ایک نیا راستہ اختیار کر لیا۔

راجہ گوپال اچاریہ جی کے نزدیک اس مرحلے پر کانگریس کا یہ نعرہ بھی غلط تھا۔ کہ "یہ جنگ برطانوی سامراج کی ہے۔ اس میں ہندوستان کیوں حصہ لے" ؟ اور یہ پالیسی بھی غلط تھی کہ مسلم لیگ کے مطالبے کو نظر انداز کرکے یا اس کے برخلاف حکومت برطانیہ سے ہندوستان میں "قومی حکومت" (جسے مسلم لیگ مانتی ہی نہ ہو۔) کے قیام کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر مسلمان ہندوستان کے ایک حصے میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کرنے پر مصر ہیں تو ان کے ساتھ اسی بنیاد پر سمجھوتہ کرنے کے سوا چارہ نہیں اگر اس بنیاد پر سمجھوتہ اور باہمی تعاون ہو سکے تو یہ صورت اس سے بہتر ہوگی کہ کوئی سمجھوتہ ہی نہ ہو اور کوئی قدم آگے نہ بڑھ سکے۔

ان خیالات کے تحت مسٹر راجگوپال اچاریہ نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اپنے صوبے کی معطل شدہ اسمبلی کے کانگریسی ممبروں کو اور صوبائی کانگریس کے دوسرے نمائندوں کو جمع کرکے انہیں قائل کیا۔ اور ۲۳ اپریل ۱۹۴۲ء کو ان کے اجلاس سے دو قرار دادیں پاس کرائیں ایک قرار داد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے یہ سفارش کی گئی کہ کانگریس کو آئندہ آئین کے سلسلے میں مسلم لیگ کا مطالبہ تقسیم ملک تسلیم کر لینا چاہیئے اور اس بنیاد پر مسلم لیگ کے ساتھ گفتگو شروع کرنی چاہیئے تاکہ باہمی سمجھوتے کے ذریعے موجودہ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے "قومی حکومت" قائم کرنے کی سفارش کی جا سکے۔ دوسری قرار داد میں یہ سفارش کی گئی کہ مدراس میں اسمبلی اور وزارت کو بحال کیا جائے اور مسلم لیگ کو وزارت میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ ان دو قرار دادوں نے بالخصوص پہلی قرار داد نے کانگریسی حلقوں میں سنسنی پھیلا دی۔

چھ دن کے بعد یعنی ۲۹ اپریل کو یہ سفارشات آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس الٰہ آباد کے سامنے پیش ہوئیں۔ اور بھاری اکثریت سے مسترد کر دی گئیں۔ کانگریس کمیٹی نے ان سفارشات کے برعکس یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایسی تجویز جس کا مطلب ملک کے حصے بخرے کرنا ہو۔ ہندوستان کے باشندوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ اور صوبوں اور ریاستوں اور پورے ملک کے مفاد کے نقطہ نگاہ سے بھی سخت مضر ہے۔ لہٰذا کانگریس کسی ایسی تجویز کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتی۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ نے اس شکست پر ہمت نہ ہاری۔ بلکہ کانگریس کی مجلس عاملہ سے اور مدراس اسمبلی کی نشست سے مستعفی ہو کر ایک آزاد سیاسی کارکن کی حیثیت سے اپنے خیال کی تبلیغ کرنے اور کانگریس کو اپنا ہم خیال بنانے کا فیصلہ

کر لیا۔ انھوں نے پہلے کانگریس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کمیٹی سے استعفیٰ دیا۔ پھر ۱۵ جولائی ۱۹۴۲ء کو معطل شدہ اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا جس کے وہ لیڈر رہتے۔ ایک اجلاس بلایا۔ اور اس سوال پر اسمبلی کی ممبری سے بھی رسمی طور پر استعفیٰ دے دیا۔ ان کی پارٹی کے سات اور ممبروں نے بھی ان کے ساتھ استعفیٰ دیا۔

مہاتما گاندھی اس وقت ایک نئی مہم چلا رہے تھے اور یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ حکومت برطانیہ کو چاہیئے کہ وہ ہندوستان کو اس کے حال پر چھوڑ کر اس ملک سے نکل جائے۔ اس مطالبے کو "ہندوستان سے نکل جاؤ" کے مختصر الفاظ میں پیش کیا گیا۔ اور یہ مطالبہ مہاتما جی کے اخبار "ہریجن" میں ان کے مسلسل مقالوں کا موضوع بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس کی مجلس عاملہ نے ۷ جولائی کو واردھا میں ایک قرار داد منظور کی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر حکومت برطانیہ ہندوستان سے فوراً دستبردار ہونا منظور نہیں کرتی تو کانگریس اپنے عدم تشدد کی پوری طاقت کے ساتھ حکومت کے خلاف جنگ شروع کر دے گی۔ ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس نے مجلس عاملہ کی قرار داد پر صاد کرتے ہوئے عام سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی۔ اس مرتبہ "زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر" سول نافرمانی کا فیصلہ کیا گیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی یہ قرار داد جس دن پاس ہوئی اس سے اگلی صبح کو مہاتما جی اور کانگریس کی مجلس عاملہ کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور حکومت نے مستعدی کے ساتھ سول نافرمانی کی مہم کو دبانے کی کوشش کی۔ تقریباً دو مہینے تک یہ مہم جاری رہی۔ کئی جگہ فساد، قتل و خون اور آتشزدگی کی وارداتیں ہوئیں۔ یوپی کے ضلع بلیہ میں دو ہفتے تک نظم و نسق کی مشینری بالکل معطل رہی۔ اور سول نافرمانی کے لیڈروں کا راج رہا۔ پھر حکومت نے اس ضلع کو دوبارہ فتح کیا اور وہاں اپنا راج قائم کیا۔ لیکن دو مہینے کے اندر یہ پوری تحریک ختم ہو گئی۔ اور حالات معمول پر آگئے۔ سوائے اس کے کہ کانگریسی لیڈر جیلوں میں رہے اور شاید اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ جاپانی فوجیں انہیں آکر رہا کریں گی۔ لیکن جاپانی سیلاب جہاں تک بڑھ چکا تھا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا بلکہ پیچھے ہٹنے لگا۔

راجگوپال اچاریہ جی کانگریس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کمیٹی سے مستعفی ہو چکے تھے۔ لہٰذا وہ گرفتار ہونے والوں میں شامل نہ تھے۔ انھوں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

۲۳- صوبائی سیاست کی جھلکیاں

جنگ کے زمانے میں کانگریسی اکثریت کے صوبے وزارتوں کے استعفوں کے بعد گورنری راج کے ماتحت رہے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں کام کرتی رہیں اور (پنجاب کے سوا) ہر جگہ وزارتی الھاڑ پچھاڑ بھی ہوتی رہی۔ بنگال میں مولوی فضل الحق کی وزارت عجیب حالات میں ختم ہوئی جن کا سلسلہ ۱۹۴۱ء میں وائسرائے کی دفاعی مشاورتی کونسل کے قیام سے شروع ہوا۔ یہ کونسل اس منصوبے کا ایک حصہ تھی جسے ۸ر اگست ۱۹۴۰ء کو وائسرائے نے سیاسی پارٹیوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ لیکن کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔ وائسرائے نے اس وقت اس منصوبے کو ملتوی کر دیا تھا۔ لیکن پھر جولائی ۱۹۴۱ء میں اسے عملی جامہ پہنا دیا اور صوبائی وزرائے اعظم کو دفاعی مشاورتی کونسل کی ممبری کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں مسلم لیگ کے نمائندوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے اپنے صوبے کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس ادارے میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے اور چونکہ مسلم لیگ کی جانب سے انہیں وزیروں کی حیثیت سے جنگی مساعی کے ساتھ تعاون کی عام اجازت ہے۔ لہذا اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں تو یہ بات مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے قابل اعتراض نہ ہوگی۔

وائسرائے نے یہ مناسب سمجھا کہ جو اقدامات وہ کر رہا تھا (ایگزیکٹو کونسل میں توسیع اور دفاعی مشاورت کمیٹی کا قیام) ان کے متعلق مسٹر جناح کو بھی مطلع کر دے۔ اس نے قائد اعظم کو ایک خط مورخہ ۲۱ر جولائی میں یہ اطلاع دی اور یہ اطمینان دلانے کی کوشش بھی کی کہ ان اقدامات میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ کی جائے گی۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کے نمائندوں کے طور پر مختلف نام گنوا دئے جن میں پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات۔ بنگال کے وزیر اعظم مولوی فضل الحق اور آسام کے وزیر اعظم سر محمد سعد اللہ

کے نام بھی شامل تھے۔ وائسرائے کے خط کا یہ فقرہ ایک سیاسی طوفان کا پیش خیمہ بن گیا۔ وائسرائے کا مقصد جو بھی تھا۔ اس کے خط کی عبارت کے قانونی معنی یہی بنتے تھے کہ ان ممبروں کو مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے لیا گیا ہے۔ قائد اعظم کو یہ خط بمبئی کے گورنر کے ذریعے موصول ہُوا۔ انہوں نے خط کو پڑھ کر اپنے پاس محفوظ رکھا اور مسلم لیگ کے سیکرٹری کو حکم دیا کہ ان تمام ممبروں کو نوٹس دے کر ان سے مسلم لیگ کے فیصلے کی خلاف ورزی کی بناء پر جواب طلبی کی جائے۔ ان کے جوابوں پر غور کرنے اور مناسب فیصلہ کرنے کے لئے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمبئی میں ۲۴ر اگست ۱۹۴۱ء کے لئے طلب کر لیا گیا۔

سر سکندر کو یہ نوٹس موصول ہوا تو وہ حیران رہ گئے۔ اور اس ارادے سے بمبئی گئے کہ اگر ان کی بات نہ مانی گئی تو وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائیں گے۔ پنجاب اسمبلی کے ۳، مسلمان ممبروں سے بھی لیگ کی رکنیت سے استعفے لکھوا کر انہوں نے جیب میں رکھ لئے۔ ۲۴ر اگست سے پہلی شام کو مسٹر جناح اور سر سکندر کی نجی ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ قائد اعظم نے انہیں وائسرائے کا خط دکھایا اور اس کی عبارت کے قانونی معنی کی جانب توجہ دلائی۔ سر سکندر کا موقف تھا کہ انہیں دفاعی مشاورتی کونسل میں شرکت کی جو دعوت ملی تھی۔ اس کی عبارت کی رو سے انہیں پنجاب کے وزیر اعظم کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ پھر کیا وائسرائے سے دریافت کیا جائے کہ کونسی عبارت ان کے صحیح مفہوم کو ادا کرتی تھی؟ اس قانونی بحث کو طول دیا جائے تو یہ مضحکہ خیز بن سکتی تھی۔ اصل سوال جس نے سر سکندر کے قول کے مطابق انہیں قائل کیا یہ تھا کہ اگر وہ اس بنیاد کے ساتھ متفق ہیں کہ وائسرائے اور کانگریس کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے مسلمانوں کی پوزیشن مضبوط رہنی چاہیئے تو پھر اس نقطۂ نگاہ کے مطابق کونسا راستہ بہتر تھا۔ ان کا مسلم لیگ سے استعفا یا دفاعی مشاورتی کونسل سے استعفا؟ قوم کے اتحاد پہ ضرب کاری یا محض ایک رسمی شے سے استعفا جس کی وجہ سے بہر حال وائسرائے کے نزدیک ان کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ بلکہ شاید کچھ اضافہ ہی ہو؟ سر سکندر نے مسٹر جناح کی بات مان لی اور دفاعی کونسل سے نہ صرف خود مستعفی ہونے کا بلکہ مولوی فضل الحق کو بھی اس پہ آمادہ کرنے کی کوشش کا وعدہ کر لیا۔

اگلے دن جب مجلس عاملہ کے اجلاس میں یہ معاملہ پیش ہوا تو چوہدری خلیق الزماں اس جواب طلبی پر جو مختلف ممبروں سے کی گئی تھی۔ اعتراض کرنے کے لئے اٹھے اور پوچھنے لگے کہ یہ نوٹس کس دفعہ یا قاعدہ کے تحت دیئے گئے ہیں جبکہ لیگ کی ایک سابقہ قرارداد کے ذریعے وزراء کو جنگی مساعی میں تعاون کی پوری آزادی حاصل ہے۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ اس پر بحث سے پہلے اجلاس کو سر سکندر حیات کا نقطۂ نگاہ سن لینا چاہیئے۔ سر سکندر حیات نے اٹھ کر کہا کہ میں نے دفاعی مشاورتی کونسل سے استعفا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مسٹر فضل الحق اس پر خاصے پریشان ہوئے۔ انہوں نے جواب دینے کے لئے مہلت مانگی۔ لیکن سر سعد اللہ نے (وہ ایک مسلم اقلیت کے صوبے کے وزیر اعظم تھے) سر سکندر کے ساتھ ہی اپنے استعفا دینے کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ مولوی فضل الحق نے بھی چند دنوں کے تامل کے بعد دفاعی کونسل سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ساتھ ہی مسلم لیگ کے سیکرٹری کو ایک خط لکھا اور لیگ کی مجلس عاملہ اور لیگ کونسل سے بھی استعفا دے دیا۔ مولوی صاحب نے اس خط میں صدر کے "خلاف آئین اور آمرانہ" رویہ کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ صاحب صدر نے اس معاملے کو ایسی صورت دے دی تھی کہ اگر مجلس عاملہ ان کی رائے کے خلاف فیصلہ کرتی تو یہ عدم اعتماد کے اظہار کے مترادف ہوتا۔ انہوں نے خط میں اور بھی کئی سخت باتیں لکھیں۔ لیکن پھر دوستوں کے سمجھانے بجھانے سے ان کے لئے معذرت کر دی۔ اس طرح یہ بحران تو ختم ہوا۔ لیکن مولوی فضل الحق نے اپنے دل میں قائد اعظم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۹۴۱ء کے آخر کے قریب مسلم لیگ کولیشن وزارت کے بجائے ایک نئی کولیشن بنانے کے لئے جوڑ توڑ کئے۔ اور ایک مرتبہ استعفا دے کر (جس سے پوری وزارت مستعفی ہو گئی) نئی وزارت بنالی۔ جس میں مسلم لیگ پارٹی کا کوئی نمائندہ شامل نہ تھا۔ مسلم لیگ پارٹی مخالف بنچوں پر جا بیٹھی لیکن جلد ہی مولوی صاحب کے خلاف مسلمانوں کے مظاہرے ہونے لگے۔ گورنر بھی ان کی حرکتوں سے ناراض ہو گیا اور اس نے مارچ ۱۹۴۲ء میں مولوی صاحب سے استعفا طلب کر لیا۔ ان کا استعفاء ۲۸ مارچ کو ہوا۔ ابھی بجٹ پاس نہ ہوا تھا۔ اور تین دن کے بعد نیا مالی سال شروع ہونے والا تھا۔ لہٰذا گورنر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فوری طور پر دفعہ

۹۳ کے تحت اسمبلی کو توڑ کر خود اختیارات سنبھال لے اور اپنے حکم سے بجٹ پاس کرنے کے بعد نئی وزارت کے قیام کا انتظام کرے۔ نئے مالی سال کے آغاز کے بعد خواجہ ناظم الدین کو مسلم لیگ کولیشن وزارت بنانے کا موقعہ دیا گیا۔ اس کے بعد مولوی فضل الحق قیام پاکستان تک برسر وزارت نہ آسکے۔

سندھ نے وزارتی اکھاڑ پچھاڑ کی بہت عجیب روایت قائم کی۔ وہاں پہلی وزارت سر غلام حسین ہدایت اللہ کی بنی تھی۔ لیکن ایک سال کے بعد خان بہادر اللہ بخش سر غلام حسین کی وزارت کو شکست دے کر خود وزیر اعظم بن گئے۔ پھر اس وزارت میں سر غلام حسین بھی وزیر کی حیثیت سے شریک ہو گئے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں دوسرے گروہوں نے اکٹھے ہو کر اللہ بخش وزارت کے خلاف اکثریت بنالی اور میر بندہ علی تالپور وزیر اعظم بن گئے۔ اس وزارت میں مسٹر کھوڑو اور مسٹر جی ایم سید شامل تھے۔ نومبر ۱۹۴۰ء میں میر بندہ علی کو پھر وزارت میں رد و بدل کرنا پڑا۔ اور خان بہادر اللہ بخش مخالف بنچوں سے اٹھ کر بندہ علی وزارت میں شامل ہو گئے۔ اس سے اگلا سیشن آیا تو اللہ بخش صاحب نے پھر نیا جوڑ توڑ کر لیا۔ وہ وزارت سے مستعفی ہو کر حزب مخالف سے جاملے اور میر بندہ علی کی وزارت کو شکست دلوا دی۔ نئی وزارت پھر خان بہادر اللہ بخش کے زیر قیادت قائم ہوئی۔ اللہ بخش صاحب کانگریس ہائی کمان کو خوش کرنا چاہتے تھے انہوں نے ستمبر ۱۹۴۲ء میں خان بہادر اور او بی ای کے خطاب واپس کر دیئے اس پر گورنر نے ان سے استعفا طلب کر لیا۔ ان کی وزارت میں غلام حسین ہدایت اللہ صاحب بھی شریک تھے۔ انہوں نے جھٹ نئی وزارت بنالی اور اپنے سابق وزیر اعظم کی پالیسی سے توبہ کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

آسام میں پہلی مسلم لیگ کولیشن وزارت سر محمد سعد اللہ نے اپریل ۱۹۳۷ء میں بنائی تھی۔ ایک ڈیڑھ سال کے بعد کانگریس پارٹی نے ان کے ہندو حامیوں کو توڑ لیا تھا۔ اور آزاد مسلم ممبروں کو ساتھ ملا کر کانگریس کولیشن وزارت بنالی تھی۔ کانگریسی وزارتوں کے ساتھ اس وزارت نے بھی اکتوبر ۱۹۳۹ء میں استعفا دیا تو سعد اللہ صاحب نے پھر اکثریت اپنے ساتھ کر کے وزارت بنالی۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں ان کی وزارت کو پھر شکست ہو گئی۔ لیکن کوئی متبادل

وزارت نہ بن سکی۔ لہذا گورنر نے دفعہ ۹۳ کے تحت اختیارات سنبھال لیے۔ یہ کیفیت کئی مہینے رہی آخر اگست ۱۹۴۲ء میں پھر اکثریت سعد اللہ صاحب کے ساتھ ہو گئی۔ اور گورنر نے دفعہ ۹۳ ختم کر کے انہیں پھر وزارت بنانے کا موقع دے دیا۔

مختلف صوبوں میں اس وزارتی ردوبدل سے قطع نظر اہم بات یہ تھی کہ عوامی سطح پر مسلم لیگ کا قدم تیزی سے بڑھتا رہا۔ پنجاب اس قسم کے وزارتی اکھاڑ پچھاڑ سے محفوظ رہا لیکن یہاں سر سکندر حیات کی وفات کے کچھ عرصے کے بعد ایک اور قسم کا سیاسی بحران پیدا ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں پنجاب کی دو اہم سیاسی شخصیتیں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ۲۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو صوبائی مسلم لیگ کے صدر نواب محمد شاہنواز خاں ممدوٹ انتقال فرما گئے۔ اس سے چند مہینے کے بعد ۲۶ دسمبر کی شب کو صوبائی وزیر اعظم سر سکندر حیات کی وفات عجیب المناک حالات میں ہوئی۔ وہ اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی یکے بعد دیگرے شادیوں کے ہنگامے سے فارغ ہو کر اپنی خوابگاہ میں آرام کے لیے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی بیگم اس کمرے میں گئیں تو سر سکندر کے بستر میں ان کا جسدِ خاکی ابدی نیند سو رہا تھا۔ اگلی صبح ان کی لاش اسی سجے سجائے شامیانے کے نیچے رکھی گئی جو شادیوں کی تقریبوں کے لیے نصب کیا گیا تھا۔

سر سکندر حیات کو قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ ایک نیک دل اور شریف طبیعت کے انسان تھے۔ اور ہر شخص کے ساتھ حتی الوسع مصالحت کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی سیاست کا مقصد بے شک ذاتی ترقی اور عہدہ حاصل کرنا بھی تھا۔ لیکن وہ اس بات کی بھی کوشش کرتے تھے کہ اپنی پوزیشن سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچا سکیں۔ ان کے روابط پنجاب سے باہر مسلمانوں کے لیڈروں کے ساتھ خاصے وسیع تھے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ طالب علمی کا کچھ زمانہ انہوں نے علی گڑھ کالجیٹ سکول میں گزارا تھا جہاں بورڈنگ ہاؤس کے ایک ہی کمرے میں ان کے ساتھ دو اور طالب علم رہتے تھے۔ ایک خواجہ ناظم الدین جو بعد میں بنگال کے وزیر اعلیٰ اور پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل بنے اور دوسرے نواب چھتاری جو اس زمانے میں سر سکندر کے قول کے مطابق مخمل کا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ یہ بھی بعد میں

کئی ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ سر سکندر اپنی پنجابی خصوصیات پر فخر کرتے تھے اور خاص طور پر اپنے طریے کو "پنجاب کی مارشل قوموں" کا طرہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے اندر مسلمان قومیت کا احساس بھی موجود تھا۔ ان کا یہی احساس تھا جو ایک بہت نازک موقعہ پر ان سے مسلمانوں کی تاریخی خدمت کرا گیا۔ یہ احساس یقیناً ان عوامل میں شامل تھا جنہوں نے سر سکندر کو اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی اور اپنی پارٹی کی سیاسی قوت کو اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر مجتمع کر دیں۔

نواب محمد شاہنواز خاں ممدوٹ عہدوں کی کشش سے بے نیاز تھے لیکن مسلم لیگ کی خدمت کا پرخلوص جذبہ دل میں رکھتے تھے۔ وہ پنجاب کے سب سے بڑے تین جاگیرداروں میں ایک تھے۔ لیکن اس بات سے ان کی سادگی پسند طبیعت اور عوام کے ساتھ ان کے میل جول اور خوش اخلاقی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ کئی دوسرے سیاستدانوں کی طرح وہ بھی سیاست میں یونینسٹ پارٹی کے راستے سے داخل ہوئے تھے۔ "جناح سکندر پیکٹ" کے بعد جب پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ میں سر سکندر کے ساتھیوں کو اکثریت دینے کا بندوبست کیا گیا تو نواب ممدوٹ صوبائی لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ان کی اصل وفاداری ہمیشہ لیگ کے ساتھ رہی جس کے لئے انہوں نے بہت خلوص کے ساتھ کام کیا اور اپنا وقت اور اپنا روپیہ خرچ کرنے سے کبھی دریغ نہ کیا۔ سر سکندر کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات بھی بہت اچھے تھے اور وہ تدبر اور قومی مفاد کا تقاضا بھی یہی سمجھتے تھے اور اس دوگونہ مقصد کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے کہ پنجاب میں سر سکندر کی سیاسی طاقت قائم بھی رہے اور یہ طاقت مسلمانوں اور مسلم لیگ کے لئے مفید بھی ثابت ہوتی رہے۔

نواب شاہنواز خاں کی جگہ ان کے نوجوان فرزند نواب افتخار حسین خاں صوبائی لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ سر سکندر کی وفات کے بعد صوبائی وزارت عظمیٰ کا عہدہ ان کی کابینہ کے رفیق ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کے حصے میں آیا۔ کابینہ میں ایک مسلمان وزیر کی کمی کو پورا کرنے کے لئے سر سکندر کے فرزند اکبر سردار شوکت حیات خاں کو جو

اس وقت فوج میں ملازم تھے۔ ان کے فوجی عہدے سے سبکدوش کرایا گیا اور کابینہ میں لے لیا گیا۔ اسمبلی میں سرسکندر کی خالی نشست پر ایک اور نوجوان میاں محمد ممتاز دولتانہ منتخب ہو گئے۔ سردار شوکت حیات اس کے بعد ایک اور ضمنی انتخاب میں اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ یہ تینوں نوجوان جنہوں نے اس موقعہ پر سیاست میں پہلا قدم رکھا اور نئے وزیر اعظم (فی الحقیقت وہ بھی سیاست میں نو وارد تھے) کسی سابقہ سیاسی یگانگت کی روایت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے اور اپنے اپنے الگ ذہنی رجحانات رکھتے تھے۔

پنجاب کے نئے وزیر اعظم ایک روائت پسند اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے ٹھیٹھ قسم کے زمیندار ثابت ہوئے۔ وہ متضاد سیاسی ذمہ داریوں کے وارث بن گئے تھے۔ لیکن ان ذمہ داریوں کو ایک عملی سیاست دان کے بجائے ایک روائت پرست انسان کی طرح نبھانا چاہتے تھے۔ اور اس بات کے قائل معلوم ہوتے تھے کہ جو عملی روایات قائم ہو چکی ہیں ان سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹیں گے لیکن ایک انچ آگے بھی نہ بڑھیں گے حالانکہ سیاسی حالات ہر روز بدل رہے تھے۔ انہوں نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ دہلی میں قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر "جناح۔ سکندر پیکٹ" کی تجدید کرائی۔ یعنی اس کے مطابق سرسکندر کے جانشین کی حیثیت سے مسلم لیگ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اقرار کیا۔ اور پھر ایک تحریری بیان میں جس کی تیاری میں انہوں نے راجہ غضنفر علی کو بھی شریک کیا "پیکٹ" کا نام بار بار لے کر سرسکندر کے نقشِ قدم پر چلنے کا اعلان کر دیا۔ لاہور میں واپس آکر انہوں نے اپنے رفقائے کابینہ کے ساتھ بھی یہ طے کر لیا کہ تمام کاروبار سابقہ روایات کے مطابق ہوگا۔ نہ قدم ایک انچ آگے بڑھایا جائے گا۔ نہ ایک انچ پیچھے ہٹایا جائے گا۔

اس قسم کی جامد اور "لکیر کی فقیر" پالیسی بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے تقاضوں کا ساتھ کہاں تک دے سکتی تھی؟ "جناح سکندر پیکٹ" کی صورت میں جو انتظام منظور کیا گیا تھا۔ اس پر عملدر آمد کے سلسلے میں بعض عجیب سوال پیدا ہوتے تھے۔ جنہیں ہر

زمانے میں ایک ہی طریق پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس انتظام کی اصولی بنیاد یہ تھی کہ اس کے تحت یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بن گئے تھے یعنی انہوں نے ایک علحدہ اور مستقل پارلیمانی پارٹی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ اس پارٹی کو یہ اجازت دی گئی تھی کہ وہ ایک "کولیشن" کی صورت میں باقی ماندہ (غیر مسلم) یونینسٹ ممبروں کے ساتھ اپنا اتحاد قائم رکھے اور یہ کولیشن مجموعی طور پر "یونینسٹ پارٹی" کے پرانے نام ہی سے کام کرتا رہے۔ لیکن اصل سوال نام کا نہ تھا بلکہ روزمرہ کے عملی طریق کار کا تھا۔ اگر اسمبلی میں پیش ہونے والے معاملات کے متعلق غور و بحث کے لئے مسلم لیگ پارٹی کا کوئی اجلاس بلایا ہی نہ جائے اور سابقہ دستور کے مطابق ہمیشہ کولیشن کے دونوں فریق ایک واحد پارٹی کی طرح اکٹھے بیٹھ کر فیصلے کرتے رہیں اور پالیسیاں مرتب کرتے رہیں۔ تو مسلم لیگ پارٹی کا علحدہ وجود بروئے کار آتا ہی نہ تھا اور محض کاغذی شے معلوم ہوتا تھا۔

"پیکٹ" کے بعد سر سکندر حیات کا عمل یہی رہا اور اس وجہ سے نبھتا رہا کہ صوبائی لیگ کے صدر نواب شاہنواز خاں کو جو اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ اس دستور العمل پر اعتراض کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ فی الحقیقت ۱۹۳۷ء کے بعد ۱۹۴۰ء تک مسلم لیگ کی پالیسی کا کوئی ایسا خاص پہلو نہ تھا۔ جس کی خاطر پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی اپنی علحدہ پارلیمانی حیثیت پر اصرار کرنا ضروری سمجھتی۔ "قرارداد لاہور" کے بعد حالات میں ایک اصولی تبدیلی آئی جس کے مضمرات مطالبۂ پاکستان کی بڑھتی ہوئی قوت اور شدت کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے۔ اب مسلم لیگ کا اصل مقصد صوبائی وزارتیں چلانا نہ تھا بلکہ پاکستان حاصل کرنا تھا۔ اور مطالبہ پاکستان کے لئے سیاسی جنگ اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ صوبائی اسمبلیوں کی مسلم لیگ پارٹیاں بھی مطالبۂ پاکستان کی تائید میں مثبت کردار ادا کریں اور جو وزارتیں مسلم لیگ پارٹیوں کی حمایت اور پشت پناہی پر بھروسہ کرتی تھیں وہ بھی مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کے ساتھ اپنے آپ کو عملاً اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ وابستہ کریں۔

۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے نئے صدر نواب افتخار حسین کے گرد اسمبلی کے مسلمان ممبروں کا ایک مختصر گروہ جمع ہو گیا جو مختلف طریقوں سے اس بات کے خلاف احتجاج کرنے لگا کہ

مسلم لیگ اسمبلی پارٹی ایک زندہ اور فعال جماعت کی حیثیت سے کام نہ کرتی تھی۔ وزیر اعظم ہر تبدیلی سے گریز کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے اور ان کی پارٹی کے "مسلم لیگی گروپ" کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی۔ اور قائدِ اعظم کو شکایتیں پہنچنے لگیں۔ تقریباً ایک سال تک مسلسل شکایات سننے رہنے کے بعد مسٹر جناح حالات کو سمجھنے اور درست کرنے کی غرض سے لاہور تشریف لائے۔ اپریل ۱۹۴۴ء کا بیشتر حصہ آپ نے یہیں گذارا اور ملک خضر حیات خاں کے ساتھ کئی ملاقاتیں اور طویل گفتگو کی۔ آپ نے وزارت کے غیر مسلم ارکان کا نقطۂ نگاہ سمجھنے کے لئے ان کے ساتھ بھی بالمشافہ بات چیت کی۔ غیر مسلم وزیروں نے وزارت کے کام میں مسلم لیگی لیڈر کی "دخل اندازی" کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر رکھا تھا۔ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد قائدِ اعظم نے فیصلہ کیا کہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے وجود کو عملاً قائم کرنے اور اسے ایک زندہ جماعت بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس ذہنی انتشار کو ختم کیا جائے جو "بہ یک وقت مسلم لیگی اور یونینسٹ" کے تصور سے پیدا ہوتا تھا۔ لہٰذا آپ نے حکم دیا کہ (۱) مسلم لیگ پارٹی کے ممبر آئندہ کے لئے صرف مسلم لیگ کا سیاسی لیبل اختیار کریں اور غیر مسلم ممبروں کے ساتھ اپنے کولیشن کو "مسلم لیگ کولیشن پارٹی" کا نام دیں۔ اور (۲) کولیشن وزارت کو بھی "یونینسٹ وزارت" کے بجائے "مسلم لیگ کولیشن وزارت" کا سرکاری نام دیا جائے۔ ملک خضر حیات عذر کرتے تھے کہ جناح سکندر پیکٹ کے پیش نظر اس قسم کا اقدام ان کی کابینہ میں مشکلات پیدا کرے گا۔ لیکن وزیر اعظم کوئی واضح اور دو ٹوک فیصلہ کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ آخر قائدِ اعظم نے اپنے حکم کو تحریر میں لا کر ان سے تحریری جواب طلب کیا۔ ملک خضر حیات نے ان کی چٹھی وصول کرنے سے بھی گریز کیا۔ نہ معلوم اس سے کونسی قانونی گنجائش پیدا کرنا مقصود تھا۔ ملک صاحب نے اس ڈرامے کو اتنا طول دیا کہ جب قائدِ اعظم نے پھر اپنی چٹھی دو "قاصدان عادلان" (نواب ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ) کے ہاتھ انہیں پہنچائی۔ تب بھی ایک محتاط اور مقدمہ باز زمیندار کی طرح ملک صاحب نے چٹھی کی وصولیابی کی رسید پر دستخط نہ خود کئے نہ اپنے عملے کے کسی فرد کو کرنے دیئے۔ دونوں قاصد قائدِ اعظم کے حکم کے مطابق چٹھی ان کے مکان پر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے جواب میں خاموشی کو حکم کی تعمیل سے انکار تصور کر کے قائدِ اعظم نے ملک صاحب کو مسلم لیگ کی رکنیت سے خارج کرنے کی سفارش لیگ کی "مجلس عمل" کو بھیج دی جس نے انہیں نوٹس دینے اور ان کی صفائی سننے کے بعد

انہیں لیگ سے خارج کر دیا۔

جب قائد اعظم اور ملک صاحب کی بات چیت ٹوٹنے والی تھی تو حکومت پنجاب نے ایک اور ڈرامائی قدم اٹھایا۔ گورنر کے حکم سے سردار شوکت حیات کو ان کے وزارتی عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ گورنر کے حکم میں ان کے خلاف سرکاری اختیارات کے ناجائز استعمال کا الزام لگایا گیا تھا لیکن جن حالات میں یہ برطرفی عمل میں آئی اس سے مسلم عوام نے یہی تاثر لیا کہ سردار صاحب کو مسلم لیگ کے ساتھ ہمدردی کی سزا دی گئی ہے۔ قائد اعظم کے حکم کے بعد دو پارلیمانی عہدہ دار (راجہ غضنفر علی اور صوفی عبدالحمید) اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔ اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں مسلمان ممبروں کی بھاری اکثریت وزارتی بنچوں ہی پر بیٹھی رہی۔ صرف بیس ممبروں کی ایک مسلم لیگ پارٹی حزب مخالف کے بنچوں پر جا بیٹھی۔ یہی مختصر جماعت پنجاب کے دیہات میں مسلم لیگ کی سیاسی جنگ کا ہراول بنی۔



سر سکندر حیات خاں



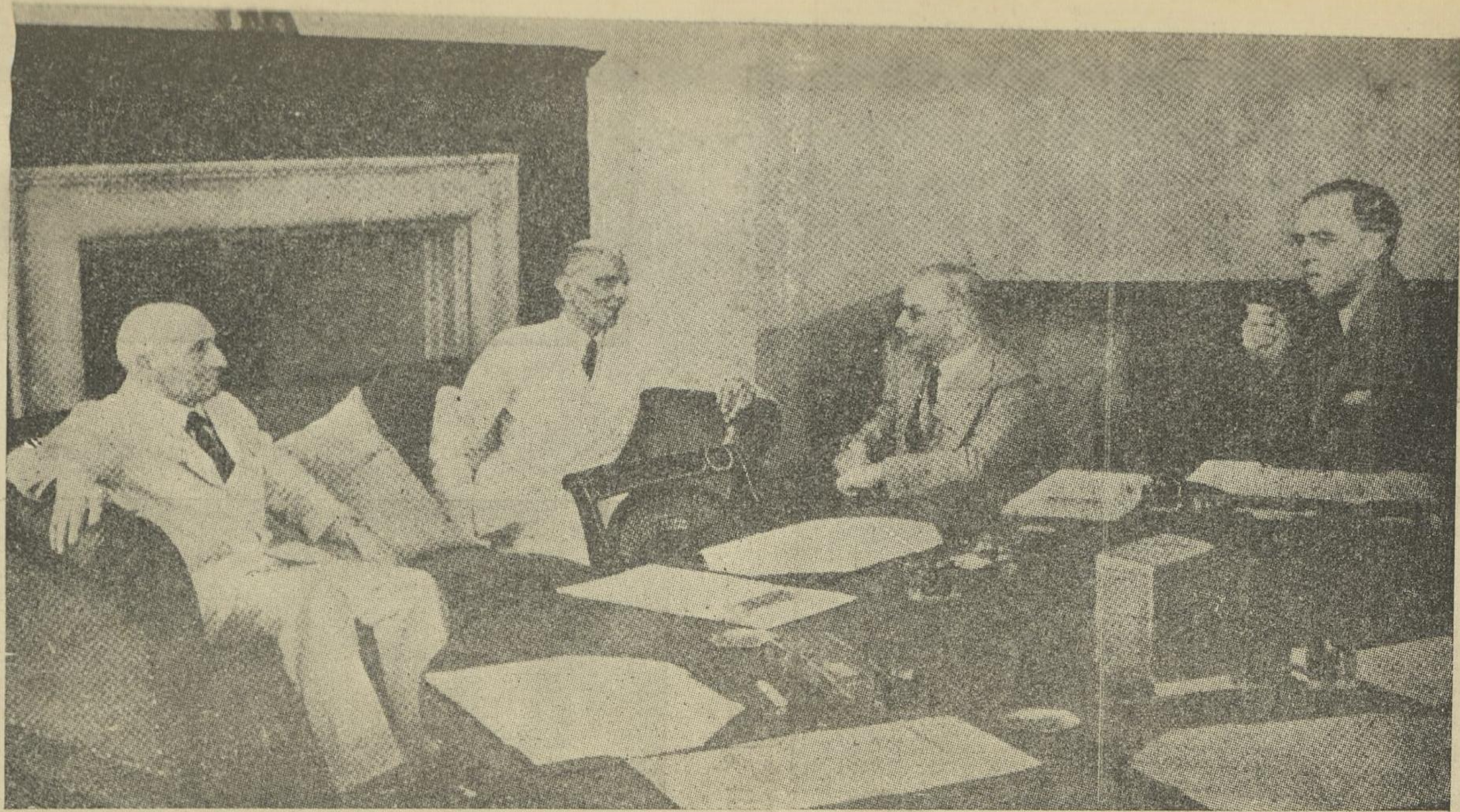
خواجہ ناظم الدین



نواب محمد شاہنواز خان ممدوٹ



مولوی فضل الحق



قائد اعظم کابینہ مشن کے ارکان کے ساتھ

۴۳۔ راجہ فارمولا۔ گاندھی جناح گفتگو اور لارڈ ویول کی شملہ کانفرنس

مسٹر راجہ گوپال اچاریہ نے کانگریس کا مسلم لیگ کے ساتھ قرار داد لاہور کی بنیاد پر سمجھوتہ کرانے کے لئے کوشش بہت ثابت قدمی کے ساتھ کی۔ آپ نے کانگریس کی اگست ۱۹۴۲ء والی سول نافرمانی کی تحریک کا ساتھ نہ دیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے نومبر ۱۹۴۲ء میں قائد اعظم کے ساتھ ملاقات کی اور ان کا نقطۂ نگاہ سمجھنے کے بعد سمجھوتے کا ایک فارمولا تیار کیا۔ پھر انہوں نے گاندھی جی کے ساتھ جیل میں ملاقات کی دو مرتبہ ناکام کوشش کی۔ حکومت نے انہیں اجازت نہ دی۔ پھر مہاتما جی نے ۱۰ فروری ۱۹۴۳ء کو جیل میں اکیس دن کا برت شروع کر دیا۔ حکومت نے انہیں رہا نہ کیا۔ لیکن ان کے کئی دوستوں اور عزیزوں کو ان سے ملاقات کی اجازت دیدی۔ ان میں راجہ گوپال اچاریہ بھی تھے۔ آپ نے اپنا فارمولا مہاتما جی کو دکھایا اور اس کے لئے ان کی اشیرباد حاصل کر لی۔ پھر آپ نے ۱۷ اپریل کو یہ فارمولا مسٹر جناح کے حوالے کر دیا اور انہیں بتا دیا کہ گاندھی جی اس پر صاد کرتے ہیں۔ قائد اعظم نے اس پیشکش کو لے کر جیب میں رکھا اور بہت دیر تک اس کے متعلق کوئی قدم نہ اٹھایا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ پیشکش مہاتما جی کی جانب سے آئے۔ اس اثنا میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ۲۴ اپریل کو دہلی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے راجہ گوپال فارمولے کا ذکر کئے بغیر یہ کہا کہ اگر گاندھی جی واقعی مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتے کے قائل ہو گئے ہیں تو وہ براہ راست مجھے خط کیوں نہیں لکھتے۔ وہ بے شک جیل میں ہیں۔ لیکن اگر وہ مجھے خط لکھنا چاہیں تو حکومت اسے روکنے کی جرأت نہ کرے گی۔ گاندھی جی نے اس کا جواب صرف یہ دیا کہ قائد اعظم کے نام ایک دو حرفی خط میں لکھ دیا "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں"۔ حکام نے ضابطے کے مطابق یہ خط روک لیا۔ لیکن

اس کا مضمون قائد اعظم کو پہنچا دیا۔ قائد اعظم نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے ایک بیان میں کہا کہ اس خط میں نہ مجھ سے ملنے کی کوئی پیشکش تھی نہ پالیسی میں کسی تبدیلی کا نشان ملتا تھا۔ اگر گاندھی جی کا مقصد یہ تھا کہ میں کسی جائز وجہ کے بغیر حکومت کے ساتھ ایک نئی بحث اور لڑائی شروع کر دوں تو میں اس مقصد کا آلۂ کار نہیں بن سکتا۔

وقت گذرتا گیا اور اکتوبر ۱۹۴۳ء میں وائسرائے کی حیثیت سے لارڈ لن لتھ گو کے عہدے کی میعاد ختم ہو گئی۔ وہ گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کو جیل میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کی جگہ ایک فوجی جنرل لارڈ ویول ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔ اب جنگ کے حالات بدل چکے تھے اور اتحادیوں کی فتح کے نمایاں آثار پیدا ہو چکے تھے۔ اب ہندوستان کے متعلق برطانیہ کی سیاسی پالیسی میں بھی بنیادی تبدیلی آ چکی تھی۔ جنگ سے پہلے برطانیہ ہندوستان پر سامراجی تسلط قائم رکھنے کے مقصد پر قائم تھا۔ جنگ کے زمانے میں جنگ جیتنے کی غرض سے وہ ہندوستان پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اب دنیا کے حالات بدل چکے تھے اور برطانیہ اپنے آپ کو اس قابل نہ پاتا تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان پر اپنا قبضہ قائم رکھ سکے اور جنگ کا خاتمہ چند مہینوں کی بات نظر آتا تھا۔ لہذا لارڈ ویول ہندوستان کے لئے جنگ کے بعد آزادی کا بندوبست کرنے کا مقصد ساتھ لے کر آیا لیکن اس فوجی وائسرائے کے ذہن پر ہندوستان کے دفاعی انتظامات کا نقطۂ نگاہ اس حد تک حاوی تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کا خیال اسے بالکل غلط معلوم ہوتا تھا۔ اس بات نے مسلم لیگ کے لئے نئے امتحان کا زمانہ پیدا کر دیا۔

لارڈ ویول نے اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنی پالیسی کی وضاحت ایک تقریر میں کی جو انہوں نے فروری ۱۹۴۴ء میں مرکزی مجالس قانون ساز کے مشترکہ اجلاس کے سامنے کی۔ یہ تقریر واضح طور پر کانگریس کے مقاصد کے مطابق اور مسلم لیگ کے مقاصد کے سراسر خلاف تھی۔ اس کے چند نکات اہم تھے۔ وائسرائے نے کہا کہ ہمارا پہلا کام جنگ جیتنا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آئندہ آئینی کے لئے تیاری کا کام رکا رہے۔ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہندوستان ایک آزاد۔ خوشحال اور متحدہ ملک بن جائے۔ تقسیم ملک کے متعلق آپ نے فرمایا کہ "جغرافیہ کو بدلنا ممکن نہیں۔ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے۔" کانگریس کے متعلق آپ نے کہا کہ اس کی صفوں میں بہت قابل لوگ موجود ہیں۔ لیکن ان

کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن جب تک کانگریسی لیڈر عدم تعاون اور رکاوٹ ڈالنے کی پالیسی ترک نہیں کرتے جو "ہندوستان سے نکل جاؤ" کے نعرے سے شروع ہوئی تھی۔ ان کی رہائی کا مطالبہ درست نہیں۔

یہ اشارے خاصے واضح تھے۔ ان کے جواب میں کئی جانب سے لارڈ ویول پر مصالحت کی یورش کی گئی۔ ایک حملہ خود گاندھی جی نے اپنے مخصوص انداز میں خطوں کے ذریعے کیا۔ دوسرا حملہ سر تیج بہادر سپرو اور ان کی "نان پارٹی کانفرنس" نے کیا۔ ان حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی کو ناسازیٔ طبع کی بنا پر۔ (انہیں اپریل ۱۹۴۴ء میں ملیریا بخار ہو گیا تھا) ۶رمئی ۱۹۴۴ء کو غیر مشروط رہائی دے دی گئی۔ مہاتما گاندھی وائسرائے کی تقریر کے رجحان کو نوٹ کر چکے تھے "جغرافیہ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے۔" انہوں نے وائسرائے کے ساتھ بھی خط و کتابت شروع کی اور مسٹر جناح کے ساتھ بھی سمجھوتے کی گفتگو کی خواہش ظاہر کی۔ ۱۷رجولائی ۱۹۴۴ء کو انہوں نے قائد اعظم کو ایک محبت بھرا خط لکھا کہ "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھئے۔ میں آپ کا اور تمام بنی نوع انسان کا دوست ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے۔" گاندھی جی کے طریقے بہت نرالے تھے۔ انہوں نے قائد اعظم کو خط گجراتی میں لکھا۔ اور یہ اشارہ کر کے کہ ہم دونوں کے خاندان گجرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک نئی وطنی اخوت کی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ قائد اعظم نے جواب انگریزی میں دیا اور کہا کہ انگریزی ہی ایسی زبان ہے جس میں میرے لئے اپنے مفہوم کی ادائیگی میں غلطی کرنے کا احتمال بہت کم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں کشمیر جا رہا ہوں۔ وہاں سے میری واپسی پر اگر آپ میرے مکان پر قدم رنجہ فرمائیں تو میں آپ کا استقبال کرنے میں بہت مسرت محسوس کروں گا۔

گاندھی جناح ملاقات بمبئی میں ۹رستمبر کو ہوئی۔ گفتگو کی بنیاد وہی فارمولا تھا جو مسٹر راجہ گوپال اچاریہ نے سمجھوتے کی بات چیت شروع کرانے کے لئے تیار کیا تھا۔ اس فارمولے کا متن حسبِ ذیل تھا:۔ (۱) آزاد ہندوستان کے آئین کے متعلق ان شرائط کے تحت جو ذیل میں درج ہیں۔ مسلم لیگ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کی حمایت کرتی ہے اور کانگریس کے ساتھ مل کر عبوری دور کے لئے ایک عبوری عارضی حکومت بنانے کو تیار ہے۔

(۲) جنگ کے خاتمے کے بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق

میں ان باہم متصل اضلاع کی حد بندی کرے گا، جہاں مسلمانوں کی آبادی قطعی اکثریت میں ہے۔ ان اضلاع میں تمام باشندوں کے استصواب رائے (بالغ حق رائے دہندگی یا کسی اور ممکن العمل فرنچائز کی بناپر) کے ذریعے علیحدگی کے سوال کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر اکثریت ہندوستان سے الگ ایک آزاد مملکت بنانے کے حق میں رائے دے تو اس فیصلے کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ سرحد پہ واقع اضلاع کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ جس مملکت میں چاہیں شامل ہو جائیں۔

(۳) استصواب رائے سے پہلے تمام پارٹیوں کو اپنے نقطۂ نگاہ کی تبلیغ کا حق ہوگا۔

(۴) علیحدگی کی صورت میں دفاع۔ تجارت اور مواصلات اور دوسرے ضروری امور کے متعلق باہمی معاہدات کئے جائیں گے۔

(۵) انتقال آبادی جس حد تک بھی ہو صرف رضا کارانہ بنیاد پہ ہوگا۔

(۶) ان شرائط کی پابندی صرف اسی صورت میں ہوگی کہ برطانیہ ہندوستان کی حکومت کے تمام اختیارات اور ذمہ داریاں منتقل کر دے۔

اس فارمولے میں رقبے کے تعین کا طریقہ خاصا واضح تھا۔ لیکن چند اور ابہام تھے مثلاً شق (۴) کا مطلب کیا تھا؟ "دفاع۔ تجارت۔ مواصلات اور دوسرے ضروری امور کے متعلق باہمی معاہدات" کرنے یا نہ کرنے کے لیے دونوں مملکتیں آزاد ہوں گی۔ یا اس بارے میں پہلے سے کوئی پابندی عائد ہو گی؟ اسی طرح شق (۶) "مطلب کیا تھا؟ کیا پہلے متحدہ ہندوستان کی حکومت تمام اختیارات اور ذمہ داریاں سنبھال لے گی۔ اور پھر علیحدگی کے پروگرام پر عمل اس کے زیر اہتمام ہوگا۔ یا علیحدگی کی تکمیل اور برطانیہ کی جانب سے اختیارات کی منتقلی بیک وقت ہوگی۔ یعنی اختیارات دو علیحدہ مملکتوں کو منتقل کئے جائیں گے؟ جہاں تک رقبے کا تعلق تھا۔ اس بات کی پے در پے شہادتیں موجود ہیں کہ قائدِ اعظم پاکستان کے اصول کے ساتھ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو شروع سے ناگزیر سمجھتے تھے اس کی شہادت خود قرارداد لاہور کے الفاظ ہی میں موجود تھی۔ انہوں نے اس نکتے پر سمجھوتے کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ پہلے تقسیم کا اصول مان لو۔ رقبے کا سوال اس کے بعد آئے گا۔ آپ نے جولائی کے آخری ہفتے میں لیگ کی عاملہ کا اجلاس لاہور میں بلایا اور گاندھی جی کے ساتھ گفتگو کا اختیار حاصل کیا تو یہ بھی واضح کر دیا کہ اس فارمولے کو گفتگو کی

بنیاد تسلیم کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا، کہ وہ رقبے کے متعلق اس کے مندرجات کو تسلیم کر رہے تھے۔ چنانچہ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے اس فارمولا کے ابہام اور نقائص کی جانب بھی اشارہ کیا اور یہ بھی کہا کہ اس کے ذریعے ایک "کٹے پھٹے" پاکستان کی پیشکش کی گئی ہے۔ تاہم آپ نے اس کی بنیاد پر گفتگو کے موقعہ کا خیر مقدم کیا۔

گاندھی۔ جناح ملاقاتیں ۹ ستمبر سے شروع ہو کر ۲۷ ستمبر تک ہوتی رہیں۔ ان کے درمیان گفتگو زبانی بھی ہوئی اور تحریری بھی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر ان کی خط و کتابت شائع کر دی گئی جس کے مطالعہ سے صاف ظاہر تھا کہ گاندھی جی دو آزاد مملکتوں کے تصور کے قریب بھی نہ آتے تھے۔ ان کا آخری موقف یہ تھا کہ

(۱) کانگریس ان کے قول و فعل کی پابند نہیں ہے۔ وہ کانگریس کو صرف مشورہ دے سکتے ہیں کہ ان کے کہے ہوئے سمجھوتے کو مان لے۔

(۲) قرارداد لاہور میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ "قومیں" ہیں جن کی لازماً دو الگ الگ آزاد مملکتیں قائم ہونی چاہئیں۔

(۳) قرارداد لاہور کا مطلب میرے نزدیک صرف یہ ہے (اور اسی مطلب کو راجہ گوپال آچاریہ فارمولے میں زیادہ واضح صورت دی گئی ہے) کہ ایک خاندان کے مختلف ممبر ہیں۔ اور ایک ممبر مشترکہ مکان کے الگ حصے میں رہنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے حدود کا تعین کر لیا جائے۔ اس کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔

(۴) پھر بھی پورے خاندان کے بعض امور مشترکہ ذمہ داریاں رہیں گے۔

(۵) "مشترکہ مکان کے کمروں" کی تقسیم پر عمل ہندوستان کو (اس کی موجودہ شکل میں) آزادی حاصل ہونے کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔ لہٰذا پہلا کام آزادی حاصل کرنا ہے۔

یہ تقسیم کے اصول کو ماننا نہ تھا بلکہ اس سے سراسر انکار کرنے کے مترادف تھا۔

اسی زمانے میں وائسرائے لارڈ ویول ہندوستان کی آئندہ آزادی کی جانب پہلا قدم بڑھانے کے لیے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنا رہا تھا۔ یہ منصوبہ وہی تھا۔ جس پر جنگ کے زمانے میں بار بار گفتگو ہوتی رہی تھی یعنی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع اور اس میں

ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کی شمولیت۔ یہ منصوبہ ایسا تھا کہ اس کے متعلق قائداعظم کو کئی باتیں سوجھنی پڑتی تھیں۔ کیا نئی ایگزیکٹو کونسل ایسی ڈھب کی بنوائی جا سکتی ہے جس سے مسلم لیگ کے اصل مقصد (پاکستان) کو تقویت ملے یا اگر تقویت نہ ملے تو نقصان بھی نہ پہنچے؟ حکومت کی جانب سے کہا جاتا تھا کہ مستقبل کے آئین کا سوال (پاکستان یا متحدہ ہندوستان؟) بدستور کھلا رہے گا اور عبوری انتظام اسی بنیاد پر قائم ہوگا کہ مستقبل کا کوئی آئین مختلف پارٹیوں کی رضامندی کے بغیر منظور نہ کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن تھا کہ عبوری انتظام مستقبل پر اثرانداز نہ ہو؟ اگر فی الحال ہندوستان کے متحدہ نظام کے اندر مختلف پارٹیاں متفقہ پالیسیوں پر عمل پیرا ہوں اور یہ پالیسیاں لامحالہ ہندوستان کے موجودہ یعنی متحدہ نظم و نسق ہی پر مبنی ہوں گی۔ تو کیا یہ انتظام بجائے خود متحدہ ہندوستان کے تصور کو مضبوط کرنے میں مددگار نہ ہوگا؟ عبوری انتظام جتنا کامیاب، مؤثر اور فعال ہوگا۔ اتنا ہی یہ تقسیم ملک کے مطالبے کو کمزور کرنے والا ثابت ہوگا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ایگزیکٹو کونسل میں شریک ہوتی ہیں تو مسلم لیگ کونسل کے اندر لامحالہ اقلیت میں رہے گی۔ مسلم لیگ زیادہ سے زیادہ "لیگ کانگریس مساوات یا ہندو، مسلم مساوات" کا مطالبہ کر سکتی تھی۔ لیکن اس مساوات کے باوجود کانگریس اور لیگ یا ہندو اور مسلم کے علاوہ دوسرے عناصر بھی تھے جنہیں "عبوری حکومت" میں نمائندگی دینے سے انکار نہ کیا جا سکتا تھا۔ ان عناصر کے متعلق یہ توقع نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کسی کھینچا تانی میں ایسی پالیسیوں کی حمایت کریں گے جو پاکستان کے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ اس کے برعکس یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ ان عناصر کے نمائندے کانگریس کے ساتھی اور کانگریس کی قوت میں اضافہ کرنے والے ثابت ہوں گے۔ لہٰذا ایگزیکٹو کونسل کا منصوبہ مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے بہت مشتبہ شے بن جاتا تھا۔

جب لارڈ ویول اپنے ذہن میں نئی ایگزیکٹو کونسل کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اسی زمانے میں مسٹر لیاقت علی خاں بطور خود مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ عبوری حکومت کے منصوبے کے متعلق سمجھوتہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ دونوں بالآخر اس تجویز پر متفق ہو گئے کہ عبوری حکومت میں کانگریس اور لیگ کی مساوی نمائندگی ہو۔ ایک دو نشستیں چھوٹی اقلیتوں کے نمائندوں کو دی جائیں۔ اس حکومت کو اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں کی تائید

فرمان کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور اس عارضی انتظام کو آئندہ آئین کے سوال سے الگ رکھا جائے۔ مسٹر ڈیسائی نے اپنی اس تجویز کا ذکر گاندھی جی سے کیا اور ان کی آشیرباد بھی حاصل کر لی اور اس کے بعد یہ تجویز وائسرائے کے سامنے جنوری ۱۹۴۵ء میں یہ کہہ کر پیش کر دی کہ اسے گاندھی جی اور لیاقت علی خان دونوں منظور کرتے ہیں اور امید کرنی چاہیئے کہ مسٹر جناح بھی اسے قبول کر لیں گے۔

لارڈ ویول اس خط و کتابت کے ذریعے جو وہ برطانوی کابینہ کے ساتھ کر رہے تھے۔ یہ طے کر چکے تھے۔ کہ وہ بعض نکات کے متعلق زبانی تبادلہ خیالات کی غرض سے لندن جائیں گے۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ لندن جانے سے پہلے "لیاقت ڈیسائی فارمولے" کے متعلق مسٹر جناح کا ردعمل معلوم کر لیں۔ انھوں نے بمبئی کے گورنر کی معرفت مسٹر جناح سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا کہ کیا وہ اس سلسلے میں دہلی آنے کی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں تاکہ اس بارے میں بات چیت کی جا سکے۔ قائدِ اعظم نے جواب میں کہا کہ مجھے "لیاقت ڈیسائی بات چیت" کا کوئی علم نہیں ہے۔ دہلی آنے کے متعلق انھوں نے اپنے پہلے سے مقرر شدہ پروگرام کی بنا پر معذرت کر دی۔ لارڈ ویول اپنی روانگی سے پہلے مسٹر جناح سے ملاقات نہ کر سکے۔ بہر حال اپنا منصوبہ ان کے ذہن میں تھا اور لیاقت ڈیسائی فارمولے کی ایک کاپی بھی ان کی جیب میں تھی۔ وہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو برطانوی کابینہ کے ارکان کے ساتھ زبانی گفتگو کے لئے لندن روانہ ہو گئے۔

اسی زمانے میں تقریباً دو ہفتوں کے اندر یکے بعد دیگرے دو صوبوں میں مسلم لیگی وزارتوں کو شکست ہو گئی۔ ۱۲ مارچ کو صوبہ سرحد میں سردار اورنگ زیب کی وزارت کو اور ۲۸ مارچ کو بنگال میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو۔ ابھی کانگریس ہائی کمان کا وہ حکم جس کے تحت کانگریسی وزارتیں ۱۹۳۹ء میں مستعفی ہوئی تھیں۔ منسوخ نہ کیا گیا تھا۔ لیکن صوبہ سرحد کے لئے کانگریس ہائی کمان نے بطور خاص ڈاکٹر خان صاحب کو متبادل وزارت بنانے کی اجازت دے دی۔ بنگال میں اس کے بعد آئندہ عام انتخابات تک (جو تقریباً نو مہینے کے بعد ہوئے) کوئی وزارت نہ بن سکی اور یہ صوبہ گورنری راج کے تحت رہا۔ گویا جب لارڈ ویول اڑھائی مہینے کے بعد اپنے منصوبے کے متعلق برطانوی کابینہ کی منظوری حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے تو مسلم لیگ

کے زیر اثر وزارتیں صرف دو صوبوں میں برسرِ عہدہ تھیں۔ ایک سندھ میں اور دوسری آسام میں۔ لیکن ان باتوں سے قائداعظم کی خود اعتمادی میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ وہ اس دعوے پر پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم تھے کہ مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کی حقدار تنہا مسلم لیگ ہے۔

ہندوستان واپس پہونچ کر وائسرائے نے اپنے منصوبے کا اعلان ۱۴؍جون کو کیا۔ اس کا مطلب مختصراً یہ تھا کہ ۲۵؍جون کو شملہ میں لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے گی اور مندرجہ ذیل اصحاب کو اس میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ (۱) ہر صوبے کا وزیر اعظم یا اگر کسی صوبے میں فی الحال وزارت موجود نہیں تو وہ شخص جو دفعہ ۹۳ کے نفاذ کے وقت وزیر اعظم تھا۔ (۲) مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی، نیشلسٹ پارٹی اور یورپین گروپ کے لیڈر اور مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر (۳) کونسل آف سٹیٹ کی کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر۔ (۴) کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی حیثیت سے گاندھی جی اور قائد اعظم جناح (۵) سکھوں اور اچھوت اقوام کا ایک ایک نمائندہ۔ وائسرائے نے بتایا کہ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ ان لیڈروں کے مشورے سے وہ اپنی ایگزیکٹو کونسل از سرِ نو منظم کرنا چاہتے ہیں اور اس میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو جگہ دینا چاہتے ہیں۔ ایگزیکٹو کونسل موجودہ آئین کے تحت کام کرے گی اور وائسرائے کو ویٹو کے وہ تمام اختیارات حاصل رہیں گے جو آئین کے تحت انہیں سپرد کئے گئے ہیں۔ دفاع کا محکمہ کمانڈر انچیف کی تحویل میں ہوگا۔ لیکن وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے علاوہ ایگزیکٹو کونسل میں مسلمانوں اور ہندوؤں (اچھوت اقوام کے علاوہ) کی تعداد برابر ہوگی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ان کانگریسی لیڈروں کو جو ابھی جیل میں تھے۔ غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا تاکہ وہ ان تجاویز کے متعلق آپس میں صلاح مشورہ کر سکیں اور متعلقہ افراد کو کانفرنس میں شرکت کے دعوت نامے بھیج دیئے گئے۔

گاندھی جی نے مندوبین کی فہرست سے اپنا نام یہ کہہ کر کٹوا لیا کہ میں کانگریس کا دو آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ کانگریس کی نمائندگی کیسے کر سکتا ہوں؟ اس کے صحیح نمائندہ اس کے صدر مولانا ابو الکلام آزاد ہیں۔ انہیں دعوت ملنی چاہیئے۔ وائسرائے کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے گاندھی جی کا نام کاٹ کر ان کی جگہ مولانا کا نام لکھ دیا اور کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے وہی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ گویا کانگریس کا یہ دعوے مجسم صورت میں دہرا دیا گیا کہ وہ صرف

ہندوؤں کی نہیں بلکہ پورے ملک کی نمائندہ ہے۔

کانفرنس میں وائسرائے نے بتایا کہ وہ نئی ایگزیکٹو کونسل کے لئے ناموں کا انتخاب اس طرح کرنا چاہتا تھا کہ مختلف پارٹیاں اپنی طرف سے اپنے کوٹے سے تین گنی تعداد میں ناموں کی فہرست پیش کر دیں۔ پھر وائسرائے خود ان فہرستوں سے ایسے افراد کو چنے گا۔ جو اس کی رائے میں اپنی پارٹیوں کے علاوہ ملک کے اعتماد کے بھی حامل ہوں اور ایک ٹیم کی طرح کام کرنے کے اہل ہوں۔ وہ ان فہرستوں کے علاوہ دوسرے ناموں پر بھی پارٹی لیڈروں کے مشورے سے غور کرنے کا حق اپنے لئے محفوظ رکھتا تھا۔ وائسرائے کے ذہن میں ایگزیکٹو کونسل کا عملی نقشہ یہ تھا۔ پانچ ہندو جو وہ کانگریس کی پیش کردہ فہرست سے چن سکتا تھا۔ پانچ مسلمان۔ ایک سکھ۔ ایک اچھوت اقوام کا نمائندہ اور ایک کوئی اور یعنی کل تیرہ۔ جہاں تک پانچ مسلمانوں کا تعلق تھا وہ چار نام مسلم لیگ کی پیش کردہ فہرست سے اور پانچواں یونینسٹ پارٹی کی (جو پنجاب کے "مارشل" صوبے کی آئینی لحاظ سے نمائندگی کا دعوےکرتی تھی) پیش کردہ فہرست سے چننا چاہتا تھا۔ کانگریس نے یہ بات مان لی کہ وہ پندرہ ناموں کی فہرست پیش کرنے کو تیار ہے۔ گویا وہ وائسرائے کو یہ موقعہ دینے پر بھی آمادہ ہو گئی کہ وہ کانگریس کے کوٹے میں اگر چاہے تو صرف پانچ ہندوؤں کو چن لے۔ دراصل کانگریس تعاون پر تلی ہوئی تھی اور ایگزیکٹو کونسل میں شرکت کے لئے بے تاب تھی۔ اور جس بات کو اصولاً نہ مانتی تھی اسے بھی عملاً منظور کرنے کو تیار تھی۔ کانفرنس کے باقی شرکا بھی وائسرائے کی ہر بات مان کر نئی ایگزیکٹو کونسل کے قیام کا راستہ صاف کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ لیکن ایک فرد واحد اپنی شرائط لے کر وائسرائے کی تجاویز کے راستے میں چٹان بن کر کھڑا ہو گیا۔ یہ قائدِ اعظم جناح تھے۔ آپ نے وائسرائے کی تجویز کے عواقب و نتائج کے متعلق سوچ بچار کر کے اسے مطلع کر دیا کہ میں مسلم لیگ کی جانب سے ناموں کی فہرست پیش کرنے کے لئے تیار نہیں تاوقتیکہ دو شرائط نہ مان لی جائیں۔ اوّل یہ کہ پانچوں مسلمانوں کے نام مسلم لیگ کی فہرست سے لئے جائیں۔ دوئم یہ کہ ایگزیکٹو کونسل کی کارکردگی کا یہ ضابطہ مقرر کیا جائے کہ پوری کابینہ کی دو تہائی اکثریت کی حمایت کے بغیر کونسل کوئی فیصلہ نہ کر سکے گی۔

وائسرائے نے سمجھوتے کے لئے درمیانی راستے نکالنے کی کوشش کی۔ مثلاً ایک یہ تجویز زیرِ

بحث آئی کہ پانچواں مسلمان پنجاب کا کوئی ایسا نمائندہ چن لیا جائے جو یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔ لیکن قائد اعظم نے اپنے رویہ میں لچک نہ آنے دی۔ اور وائسرائے کو مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ کانفرنس ناکام ہو گئی ہے۔ لہٰذا ایگزیکٹو کونسل کی تنظیم نو کا منصوبہ فی الحال ترک کر دیا گیا ہے۔

شملہ کانفرنس کے متعلق بعد میں سرکاری ریکارڈ کی بنا پر یہ انکشاف ہوا کہ لارڈ ویول اس بات کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ کہ اگر مسٹر جناح نہیں مانتے تو انہیں نظر انداز کر کے اپنی پسند کے پانچ مسلمانوں کو ایگزیکٹو کونسل میں نامزد کر دے اور اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنا دے۔ کانفرنس میں شریک ہونے والی باقی تمام پارٹیوں کا مطالبہ بھی یہی تھا۔ وہ وائسرائے پر زور دیتے رہے کہ ایک شخص واحد کو "ہندوستان کی ترقی" کے راستے میں رکاوٹ بننے اور کانفرنس کے "نیک مقاصد" کو ناکام بنانے کی اجازت دینا اس ملک کے ساتھ ظلم ہو گا۔ لیکن جب لارڈ ویول نے لندن سے رابطہ پیدا کیا تو برطانوی کابینہ نے اس تجویز کو منظور نہ کیا کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کا تعاون حاصل کئے بغیر عبوری حکومت قائم کی جائے۔ اس وقت چرچل برطانیہ کا وزیر اعظم تھا۔ چرچل کو ہندوستان کے متعلق دوسری باتوں کا صحیح علم تھا یا نہ تھا لیکن اسے ایک بات کا پورا احساس تھا۔ اس نے ایک تقریر میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اس کے قول کے مطابق جنگ کے نازک ترین مرحلوں میں ہندوستان کے نوکروڑ مسلمانوں نے نہ حکومت کی مشینری کو مفلوج کرنے کی کسی کوشش میں حصّہ لیا تھا۔ نہ جاپان کے ہاتھوں برطانیہ کو شکست دلانے کی کوشش کی تھی۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ جس وقت چرچل نے ویول کی بات ماننے سے انکار کیا تو ان کی وزارت کے ختم ہونے میں صرف چند دن باقی تھے۔ شملہ کانفرنس ۱۴ جولائی کو ختم ہوئی اور ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو برطانیہ میں حکومت کا چارج لیبر پارٹی نے سنبھال لیا۔

۲۵۔ نئے انتخابات نے قائد اعظم کا دعویٰ ثابت کر دیا

برطانیہ میں لیبر پارٹی کے برسر حکومت آنے سے کانگریسی لیڈروں کو جو خوشی ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ لیبر پارٹی کی واضح اور معلوم پالیسی یہ تھی کہ وہ ہندوستان کا اصل وارث کانگریس کو سمجھتی تھی جو اس کے خیال کے مطابق نصف صدی سے ہندوستان کی جنگ آزادی لڑ رہی تھی۔ مسلمانوں کی "علیحدہ قومیت" کا نظریہ اور فرقہ وارانہ مطالبات اسے اپنی سیاسی منطق کے خلاف اور ہندوستان کی آزادی کے راستے میں خواہ مخواہ کی رکاوٹ نظر آتے تھے۔ جب لیبر پارٹی نے حکومت کا چارج سنبھالا تو کانگریس کی جانب سے نئے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی کو مبارکباد کا تار گیا۔ جس کے الفاظ یہ تھے: "انتخابات کے نتیجے پر برطانیہ کے عوام کو دلی مبارکباد۔ جنہوں نے اس بات کا مظاہرہ کیا ہے کہ وہ پرانے نظریات کو ترک کر کے دنیا کے نئے نظام کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔"

مسٹر جناح نے برطانیہ میں سیاسی تبدیلی پر کوئی خاص رد عمل ظاہر نہ کیا سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر کے ایک قرارداد پاس کرا دی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہندوستان میں نئے انتخاب جلد از جلد کرائے جائیں۔ مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے اس وقت سب سے بڑی ضرورت بھی اسی بات کی تھی کہ وہ آئینی طریقوں سے یہ ثابت کر دے کہ اس کے مطالبے کی پشت پر پوری مسلم قوم کی تائید موجود ہے۔ فی الحال صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی کے اعتبار سے مسٹر جناح کی پوزیشن ان کے دعاوی کے منافی نظر آتی تھی اور مسلم لیگ کے مخالف ہر بحث میں قائد اعظم کے اس دعوے کو چیلنج کرتے رہتے تھے کہ مسلم لیگ ہی تمام مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

اگست ۱۹۴۵ء کے پہلے ہفتے میں ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکا گیا اور چند دنوں کے اندر جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جرمنی تین مہینے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں عام انتخابات کو ملتوی رکھنے کا کوئی جواز نہ رہا تھا جبکہ برطانیہ میں عام

انتخابات جنگ کے خاتمے سے پہلے ہی کرائے گئے تھے۔ چنانچہ ۲۱ر اگست ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے اعلان کر دیا کہ مرکزی اور صوبائی انتخابات آئندہ موسم سرما میں کرائے جائیں گے۔ دوسرا اعلان وائسرائے نے یہ کیا کہ وہ پھر لندن جا کر برطانیہ کی نئی کابینہ سے آئندہ پالیسی کے متعلق ہدایات حاصل کریں گے۔

لارڈ ویول ۲۴ر اگست ۱۹۴۵ء کو لندن روانہ ہوئے اور ۱۶ر ستمبر کو واپس آئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے جن الفاظ میں حکومت برطانیہ کے آئندہ مقاصد کا اعلان کیا۔ ان سے یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ نئی کابینہ ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے بے تاب ہے۔ لیکن وائسرائے کے بیان میں پاکستان کا کوئی نشان ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا تھا۔ وائسرائے نے جن آئندہ اقدامات کا اعلان کیا وہ یہ تھے۔

(۱) حکومت برطانیہ اس بات کی پوری کوشش کرے گی کہ ہندوستان کے لیڈروں کے تعاون سے ہندوستان کو جلد از جلد پوری آزادی دینے کا بندوبست کرے (۲) جیسا کہ پہلے ہی اعلان کیا جا چکا ہے اسی سال کے موسم سرما میں مرکزی اور صوبائی اسمبلی کے عام انتخابات کرائے جائیں گے حکومت کو امید ہے کہ انتخابات کے بعد سیاسی پارٹیاں صوبوں میں وزارتوں کا چارج سنبھال لیں گی۔ (۳) انتخابات کے بعد جس قدر جلد ممکن ہوگا ایک دستور ساز اسمبلی قائم کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔ (۴) اس سے پہلے حکومت صوبائی اسمبلیوں سے اس بارے میں مشورہ کرے گی کہ دستور ساز اسمبلی کی ساخت "کرپس تجاویز" کی بنیاد پر ہونی چاہیے یا کوئی اور بنیاد ان کے لیے زیادہ قابل قبول ہوگی۔ (۵) حکومت برطانیہ اس معاہدے کی شرائط پر بھی غور شروع کرنے والی ہے۔ جو آزاد ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان کیا جائے گا۔ (۶) انتخابات کے بعد سیاسی پارٹیوں کے مشورہ سے نئی ایگزیکٹو کونسل قائم کرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔

اب مستقبل کا دارومدار انتخابات کے نتیجے پر تھا۔ مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ یہ انتخابات پاکستان کے سوال پر لڑے جائیں گے۔ قائد اعظم نے مسلم ووٹروں سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگی امیدواروں کی انفرادی شخصیت سے قطع نظر کر کے انھیں مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کے نمائندوں کی حیثیت سے ووٹ دیں۔ اس سلسلے میں ان کا یہ فقرہ بہت مشہور ہوا کہ اگر مسلم لیگ کسی کھمبے پر اپنا ٹکٹ لگا دے تو اس کھمبے کو ووٹ دو۔ ہندوؤں کے حلقوں میں کانگریس کی پوزیشن واضح طور پر بہت مضبوط تھی۔ اس

نے مسلم حلقوں میں مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں "نیشلسٹ" مسلمانوں کو کھڑا کرنے اور ان کی امداد کرنے میں بھی خاص سرگرمی دکھائی۔ سب سے پہلے مرکزی اسمبلی کے انتخاب ہوئے۔ کانگریس نے خود قائدِ اعظم کے مقابلے میں بمبئی کے ایک دولت مند سیٹھ حسین بھائی لال جی کو کھڑا کر دیا لیکن اس کی ضمانت نہ صرف اس حلقے میں ضبط ہوگئی۔ بلکہ مسلمان ووٹروں نے اسے اس جسارت کی یہ سزا دی کہ ایک دوسرے حلقے میں بھی (وہ بہ یک وقت دو حلقوں میں امیدوار تھا) جہاں وہ مسلم لیگ کے ایک دوسرے امیدوار کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کی ضمانت ضبط کرا دی۔ یہی حشر اکثر نیشلسٹ مسلمان امیدواروں کا ہوا۔ دسمبر ۱۹۴۵ء کے آخر تک مرکزی اسمبلی کے تمام انتخابات کے سرکاری نتائج مکمل ہوگئے۔ مسلم لیگ کی کامیابی حیرت انگیز تھی۔ اس نے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستیں جیت لی تھیں۔ یہ سو فیصد کامیابی ہندوستان کے انتخابات کی تاریخ میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ووٹوں کی گنتی سے ثابت ہوا کہ تقریباً نوے فیصد مسلم ووٹروں نے مسلم لیگی امیدواروں کے حق میں ووٹ دیئے۔ ہندو حلقوں میں کانگریس کو بھی بہت نمایاں کامیابی ہوئی۔ تاہم یہ سو فیصد نہ تھی۔ باسٹھ ہندو حلقوں میں کانگریس نے ستاون جیت لئے تھے۔ یہ بہت اہم مورچہ تھا جو مسلم لیگ نے فتح کر لیا تھا۔ اس کی خوشی میں قائدِ اعظم کی تحریک پر مسلمانوں نے ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو ملک بھر میں "یومِ فتح" منایا۔

اس کے بعد صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات شروع ہوئے ان میں بھی صوبہ سرحد کے سوا باقی ہر صوبے میں مسلم لیگ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ صوبائی انتخابات کے نتائج کی تفصیل حسبِ ذیل تھی۔

صوبہ	کُل مسلم حلقے	کامیاب مسلم لیگی امیدوار
پنجاب	۸۶	۷۵
		(بعد میں ۴ مزید ممبران کے ساتھ آملے)
بنگال	۱۱۹	۱۱۳
آسام	۳۴	۳۳
سندھ	۳۴	۲۸
یو، پی	۶۶	۵۴

صوبہ	کُل مسلم علقے	کامیاب مسلم لیگی امیدوار
بمبئی	۳۰	۳۰
مدراس	۲۹	۲۹
سی پی	۱۴	۱۳
اوڑلیسہ	۴	۴
صوبہ سرحد	۳۸	۱۷
بہار	۴۰	۳۴

یہ کامیابی بہت عظیم الشان تھی۔ صوبہ سرحد کے سوا باقی ہر صوبے میں مسلم لیگ نے ۹۰ فیصد یا اس سے بھی زیادہ مسلم نشستیں جیت لی تھیں اور اس بات کا ٹھوس ثبوت مہیا کر دیا تھا کہ اس کے مطالبے کی پشت پر پوری قوم کی تائید و حمایت موجود تھی۔ پاکستان کے لئے جو آئینی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ اس کی کامیابی کے لئے ایک بنیادی ضرورت پوری ہو گئی۔

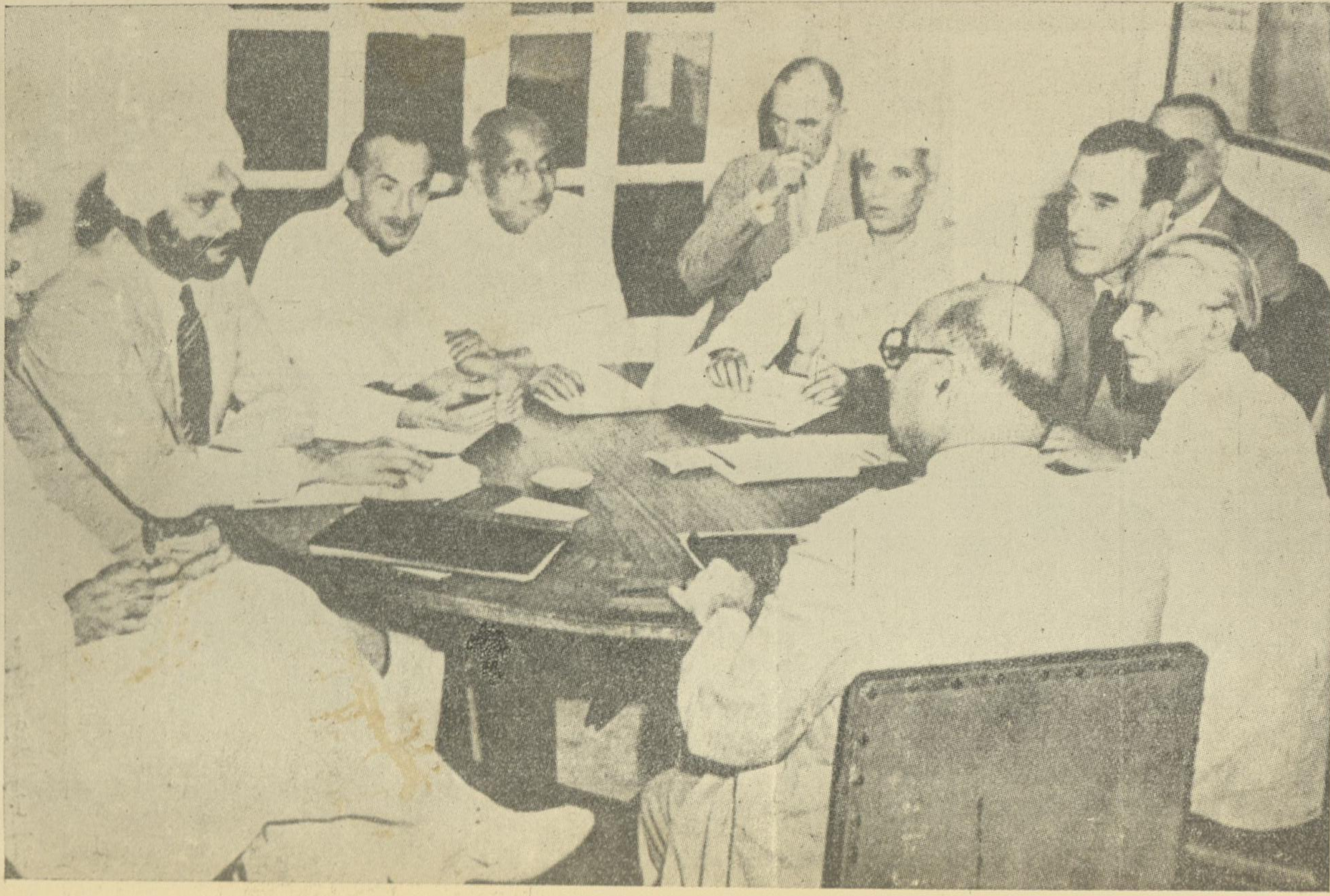
انتخاب کے بعد صوبوں میں وزارت سازی کا سوال آتا تھا۔ یہ ایک جداگانہ مسئلہ تھا۔ مسلم اکثریت کے تین صوبوں (پنجاب۔ بنگال اور سندھ) میں جہاں مسلم لیگ نے ۹۰ فیصد مسلم نشستیں جیت لی تھیں۔ اس کامیابی کے باوجود مسلم لیگ پارٹیوں کو صوبائی اسمبلیوں میں قطعی اکثریت حاصل نہ تھی۔ وہ صرف اپنی اپنی اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی ہونے کا دعوے کر سکتی تھیں۔ سندھ اور بنگال کے گورنروں نے وزارت سازی کے سلسلے میں سیدھا اور درست راستہ اختیار کیا۔ اور ایوان کی سب سے بڑی پارٹی کو وزارت سازی کی دعوت دی۔ سندھ میں آزاد مسلم ممبروں کا ایک گروہ جس کے قائد مسٹر جی۔ ایم سید تھے۔ کانگریسی اور دوسرے ہندو ممبروں کے ساتھ جوڑ توڑ کر رہا تھا۔ بلکہ یہ دعوے کر رہا تھا کہ انہوں نے کولیشن کے ذریعے اپنی تعداد انتیس یعنی مسلم لیگ کی تعداد سے ایک زیادہ کر لی ہے۔ لیکن گورنر فرانسس موڈی نے بجا طور پر اس بات کو اہمیت نہ دی اور یہ فیصلہ کیا کہ کولیشن قائم کرنے کا موقعہ جائز طور پر سب سے پہلے ایوان کی سب سے بڑی پارٹی ہی کو دیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت سازی کی دعوت دی اور دوسری چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ کولیشن کے امکانات سے استفادہ

کا موقع دیا۔ بنگال میں بھی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر حسین شہید سہروردی کو (خواجہ ناظم الدین اپنی روایتی نیک طبیعت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے مقابلے سے ہٹ گئے تھے) وزارت سازی کی دعوت دی گئی۔ ان دونوں صوبوں میں مسلم لیگ کی کولیشن وزارتیں قائم ہوگئیں۔

پنجاب میں گورنر گلانسی نے اس صاف اور سیدھے اصول سے انحراف کیا۔ وہ مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کو وزارت سازی کی باضابطہ دعوت دینے کے بجائے صرف یہ شک ظاہر کرتا رہا کہ مسلم لیگ کے ساتھ غیر مسلم پارٹیاں کولیشن کرنے کو تیار نہ ہوں گی۔ اگر ضابطے کے مطابق وزارت سازی کی سرکاری دعوت قبول کرنے کے بعد مسلم لیگی لیڈر کوئی قابل عمل وزارت نہ بنا سکتا تو یہ اس کی اپنی ذمہ داری ہوتی اور گورنر کسی متبادل گروپ کو ہی دعوت دینے میں حق بجانب ہوتا۔ لیکن گورنر نے چند دن کی ٹال مٹول اور فضول بحثوں کے ذریعے اپنی دل پسند کولیشن کے لئے راستہ صاف کر دیا اور یونینسٹ پارٹی۔ اکالی۔ کانگریس گٹھ جوڑ سے ایک ایسی وزارت بنا دی جس کی حمایت پر ایوان کے کل ۸۴ ہندو اور سکھ ممبر جمع تھے اور صرف دس گیارہ یونینسٹ مسلمان ممبر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس طرح صوبے کی مسلم اکثریت حزب مخالف بن گئی اور مسلمانوں کے نزدیک یونینسٹ پارٹی کا نام قوم سے غداری کا ہم معنی بن گیا۔

یہ غیر قدرتی وزارت تاریخ کا ایک عارضی ہنگامہ ثابت ہوئی۔ لیکن اس ہنگامے کا اصل افسوسناک پہلو یہ تھا کہ انتخابات کے بعد ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف اس صوبے کی سکھ اقلیت کے بیچ حقیقت پسندانہ مفاہمت کا جو بھلا برا موقعہ پیدا ہوا تھا۔ وہ ضائع ہو گیا۔ اگر اس مرحلے پر وزارت سازی کی ذمہ داری قطعی طور پر مسلم لیگ پر ڈال دی جاتی اور یونینسٹ گروپ اپنے آپ کو کانگریس اور اکالی پارٹی کے وزارتی گٹھ جوڑ کے لئے پیش نہ کرتا تو اس بات کا امکان ہو سکتا تھا کہ مسلم لیگ اور اکالی پارٹی ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کرتیں۔ جو ڈراما کھیلا گیا اس سے ہندوؤں اور سکھوں کے دلوں میں یہ غلط اور افسوسناک تاثر پیدا ہوتا تھا کہ انہیں مسلمانوں کے ساتھ من حیث القوم مفاہمت کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ ان کے ایک چھوٹے سے گروہ کو ساتھ ملا کر مسلم لیگ کے منصوبے کو شکست دی جا سکتی ہے۔ پنجاب میں یہ وزارتی گٹھ جوڑ ایک سال تک چلتا رہا۔ پھر یونینسٹ وزیر اعظم نے خود ہی مستعفی ہو کر اسے ختم کر دیا۔ لیکن اس

دوران میں فرقہ وارانہ تلخی بھی بڑھتی رہی۔ اور مفاہمت کا جو امکان فروری ۱۹۴۶ء میں ہو سکتا تھا۔ ایک سال کے واقعات کے بعد مارچ ۱۹۴۷ء میں اس کا نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔



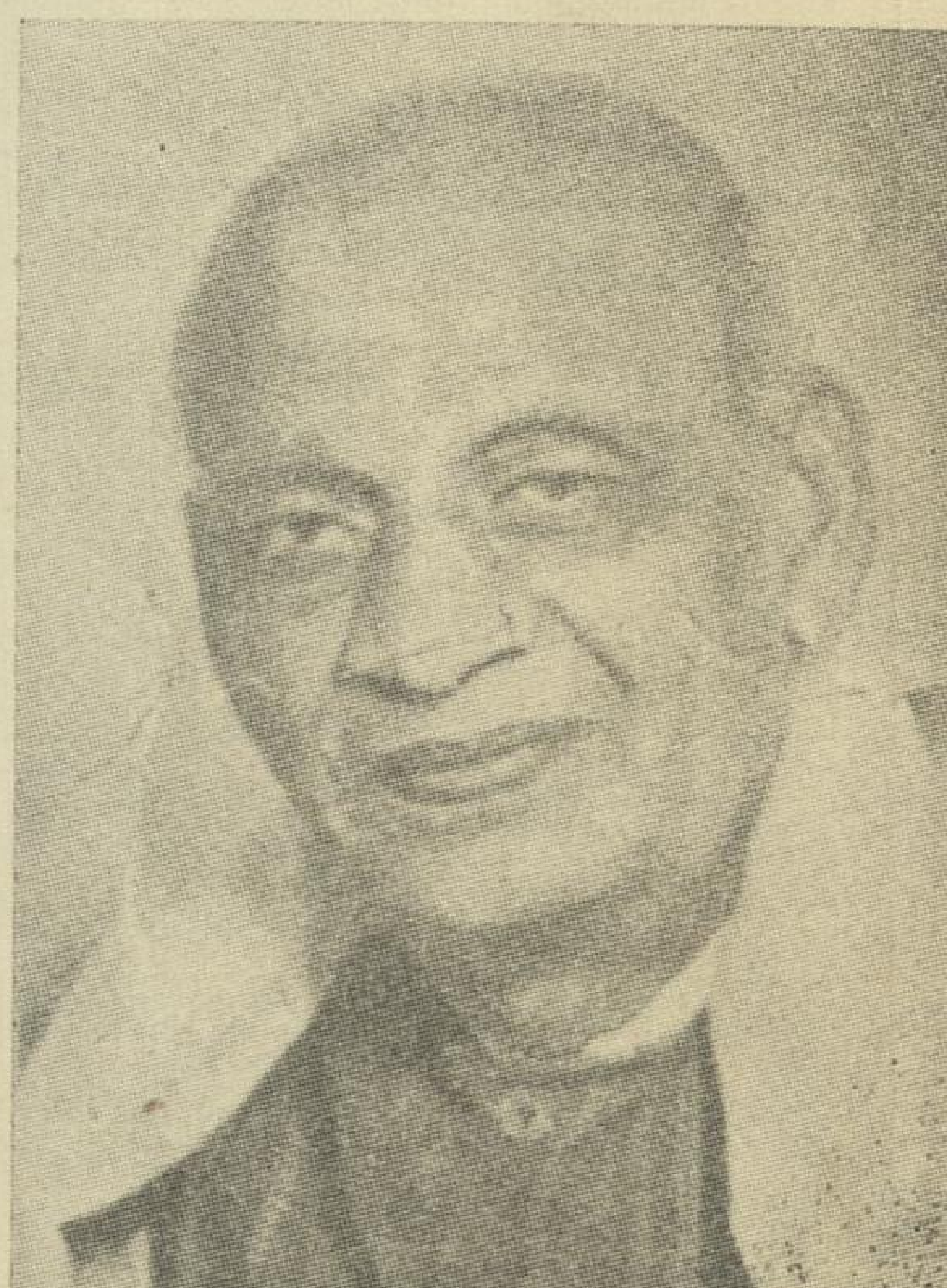
لارڈ ماونٹ بیٹن کے ساتھ پارٹیوں کے لیڈروں کی کانفرنس



پنڈت جواہر لال نہرو



مسٹر لیاقت علی خاں



سردار ولبھ بھائی پٹیل



سردار عبدالرب نشتر

۳۶۔ "کابینہ مشن پلان"

برطانیہ کی لیبر کابینہ کو ہندوستان کے مسئلے کے متعلق رپورٹیں مختلف ذرائع سے ملیں۔ وائسرائے نے اپنی رپورٹ دی۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کا ایک ڈیلی گیشن جنوری ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کا دورہ اور یہاں کے لیڈروں سے گفتگو کر تا رہا تھا۔ اس نے واپس جاکر اپنے تاثرات بیان کئے۔ لیبر کابینہ کا ایک رکن سر سٹیفورڈ کرپس جو سابقہ جنگ میں چرچل کابینہ کی جانب سے ایک سکیم لے کر یہاں آیا تھا۔ ہندوستان کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے باخبر تھا۔ اس کا مشورہ بھی اس کے ساتھیوں کو ملا۔ ان سب رپورٹوں پہ غور کر کے برطانوی کابینہ نے ایک اہم فیصلہ کیا اور وزیر اعظم اٹیلی نے ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو پارلیمنٹ میں اس کا اعلان کر دیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ کابینہ کے تین وزیروں کا ایک مشن ہندوستان جائے گا اور مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کے ساتھ صلاح و مشورے کے ذریعے ہندوستان کے آئینی مستقبل کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس اعلان پہ بحث کے سلسلے میں مسٹر اٹیلی نے یہ بھی کہا "ہم اقلیتوں کے حقوق سے غافل نہیں۔ انہیں ہر قسم کے خطرے سے آزادی ملنی چاہیئے۔ لیکن کسی اقلیت کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اکثریت کی آزادی کا راستہ روک لے۔" یعنی اٹیلی کے ذہن میں ابھی تک وہی ایک متحدہ ملک کی اکثریت اور اقلیت کا تصور قائم تھا۔

برطانوی کابینہ کے تین وزیروں کا یہ کمیشن ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو نئی دہلی پہونچ گیا۔ اس کے ایک ممبر وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس تھے۔ دوسرے ممبر سر سٹیفورڈ کرپس اور تیسرے ممبر مسٹر اے۔ وی الیگزنڈر تھے۔ دہلی پہونچتے ہی کمیشن کے ممبروں نے سب سے پہلے وائسرائے اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں سے اور ان کے بعد صوبائی گورنروں سے بات چیت کی۔ پھر مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں سے ملاقاتیں کیں ان میں صوبوں کے وزرائے اعظم اور حزب مخالف کے لیڈر بھی شامل تھے۔ ان ابتدائی ملاقاتوں کے بعد مشن کے ارکان نے دو پارٹیوں

یعنی کانگریس اور مسلم لیگ پر توجہ مرکوز کی۔ اس وقت قائد اعظم اور مسلم لیگ کی کیفیت تینوں واقعوں میں (بلکہ تینوں زبانوں میں) ایک زبان کے مانند تھی۔ وائسرائے اور صوبائی گورنر سب کے سب عام نظم ونسق اور دفاع کے نقطۂ نگاہ سے ملک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے خلاف رائے ظاہر کر رہے تھے۔ تمام سیاسی پارٹیاں۔ خواہ وہ کانگریس تھی۔ یا ہندو مہاسبھا۔ لبرل پارٹی تھی یا سکھوں کی مختلف پارٹیاں۔ مطالبۂ پاکستان کی سخت مخالف تھیں۔ دوسری باتوں کے متعلق یہ مختلف فریق اپنے اپنے مختلف خیالات ظاہر کرتے تھے۔ لیکن اس بات پر سب اتفاق کرتے تھے کہ مطالبۂ پاکستان کے مطابق ملک کو دو بالکل الگ الگ مملکتوں میں تقسیم کرنا غلط ہوگا۔ خود کابینہ مشن کے ارکان کا رجحان بھی بہت واضح طور پر ہندوستان کی وحدت کو قائم رکھنے کے حق میں تھا۔ لیکن کابینہ مشن ایک بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر مسلمانوں پر ہندو راج ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو مسٹر جناح ایسے حالات پیدا کر چکے تھے کہ مسلمانوں کی جانب سے ایسے آئین کے خلاف بغاوت کا حقیقی خطرہ موجود تھا۔ اور ایسی بغاوت کی صورت میں فوج اور پولیس کا رویہ بھی سخت غیر یقینی نظر آتا تھا۔ لیکن جو خطرہ مشن کے ارکان مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کو نظر انداز کرنے میں محسوس کرتے تھے۔ وہی خطرہ کانگریس کی طرف سے بھی تھا۔ لہٰذا ان دونوں پارٹیوں کو کسی بات پر متفق کئے بغیر مسئلہ حل نہ ہوتا تھا۔

کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ کابینہ مشن کی پہلی ملاقات ۳ر اپریل ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ اسی شام کو مشن کے ارکان نے گاندھی جی سے ملاقات کی۔ انہوں نے حسب عادت فرمایا کہ میری کوئی نمائندہ حیثیت نہیں ہے۔ میں صرف ذاتی حیثیت میں آپ کو مشورے دے سکتا ہوں۔ میرے مشورے یہ ہیں کہ (۱) تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دو (۲) نمک پر ٹیکس بالکل منسوخ کر دو (۳) مسلمانوں کی یہ خواہش بالکل درست ہے کہ ان کے کلچر کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جائے۔ اور جہاں وہ اکثریت میں ہیں انہیں سیاسی برتری کے مواقع حاصل ہوں۔ لیکن مسٹر جناح کا مطالبۂ پاکستان میری فہم سے بالاتر ہے۔ حالانکہ میں اٹھارہ دن اس مسئلہ پر ان سے بات چیت کرتا رہا ہوں۔ (۴) دو قوموں کا نظریہ میرے نزدیک بالکل غلط اور خطرناک ہے۔ ہندوستان کے ننانوے فیصد مسلمان ہندوؤں کے ساتھ خون اور نسل کا رشتہ رکھتے ہیں۔ اور ہندوستان کے تمام باشندے

سینکڑوں برس سے بھائیوں کی طرح رہتے آ رہے ہیں۔ (۸) نئے آئین کے متعلق سمجھوتے کی غرض سے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر ایسا مرحلہ آ جائے کہ مشن کے ارکان یہ محسوس کریں کہ سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی محسوس کریں کہ دستور ساز اسمبلی ایک ہی ہونی چاہیئے تو پھر انہیں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر آگے قدم بڑھانا چاہیئے (۹) جہاں تک عبوری حکومت کا تعلق ہے میری رائے یہ ہے کہ حکومت کو اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں کی حمایت حاصل ہونی چاہیئے۔ آپ بے شک مسٹر جناح کو اپنی پسند کی وزارت مرتب کرنے کی دعوت دے دیں۔ اگر مسٹر جناح اس دعوت کو مسترد کر دیں تو پھر کسی اور شخص کو یہ دعوت دی جائے۔

کانگریس کا سرکاری نقطۂ نگاہ اور گاندھی جی کا ذاتی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کے بعد کابینہ مشن نے مسٹر جناح کے ساتھ بات چیت کی۔ ان کے ساتھ پہلی ملاقات ۴؍ اپریل اور دوسری ملاقات ۱۶؍ اپریل کو ہوئی۔ ان دو ملاقاتوں میں نہ صرف قائدِ اعظم نے مطالبۂ پاکستان کی توضیح کی، بلکہ مشن کے ارکان نے بھی حکومت برطانیہ کا نقطۂ نگاہ ان کے سامنے خاصی وضاحت اور صاف گوئی کے ساتھ پیش کیا۔

۴؍ اپریل کی پہلی ملاقات میں مشن کے ارکان نے قائدِ اعظم سے کہا کہ سب سے پہلے ہم آپ کے خیالات اس سوال کے متعلق سننا چاہتے ہیں کہ ملک کی تقسیم کیوں ضروری ہے اور ہندوستان کا اتحاد قائم رکھنے میں کیا قباحت ہے؟ یہ ملاقات تقریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ اس میں بولنے کا کام زیادہ تر قائدِ اعظم کرتے رہے۔ مشن کے ارکان کبھی کبھی وضاحت طلبی کی غرض سے سوال پوچھ لیتے تھے اور کبھی کبھی کچھ نوٹ لے لیتے تھے۔

اس گفتگو کے مختصر سرکاری ریکارڈ کے مطابق قائدِ اعظم نے فرمایا کہ ہندوستان کا موجودہ اتحاد فی الحقیقت ایک مصنوعی اور غیر فطری شے ہے۔ جو صرف انگریزی حکومت کے فوجی غلبے اور تسلط کی وجہ سے قائم ہے۔ ہندو اور مسلمان بنیادی طور پر دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کے درمیان فرق صرف مذہبی اعتقادات کا نہیں۔ بلکہ دونوں قومیں اپنی اپنی تہذیب، اپنے جذبات اور اپنے رہن سہن کے طریقوں کے لحاظ سے اپنی اپنی الگ قومیت کا گہرا احساس رکھتی ہیں۔ جو انگریزی حکومت کے زمانے میں کم نہیں ہوا بلکہ شدید تر ہوتا رہا ہے۔ دونوں قومیں اپنی مختلف قومیت

کا اعتراف بھی کرتی رہی ہیں اور انگریز حکمران بھی اس بات کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ جب بہت ہی محدود دائرے کے اندر انتخابات کا سوال پہلی مرتبہ پیدا ہوا تو ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کے سلسلے میں مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لئے جداگانہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ کرنا پڑا جسے حکومت نے منظور کیا۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے پہلے خود کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں نے اسی بنیاد پر سمجھوتہ کیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ جن کا ایک دوسرے کے خلاف تحفظ ضروری ہے۔ جب ۱۹۳۵ء کی اصلاحات نافذ کی گئیں تو دونوں قوموں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور برطانیہ کے وزیر اعظم کو اپنا ثالثی فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) نافذ کرنا پڑا۔ لیکن آئینی تحفظات کے تصور کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر عمل کرانے کے لئے کوئی ایسا فریقین کے اوپر موجود ہو اور یہ طاقت رکھتا ہو کہ اگر ایک فریق تحفظات کو بے اثر بنائے یا ان کے مقاصد کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے تو اسے ایسا کرنے نہ دے۔ اب انگریزی حکومت یہاں سے رخصت ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ سوال بہت شدت کے ساتھ سامنے آگیا ہے کہ حکومت کے اختیارات آئندہ کس کے ہاتھ میں ہوں گے۔

میں تمام عمر کے تجربے اور غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ۲۵ کروڑ ہندوؤں اور دس کروڑ مسلمانوں پر اگر کوئی واحد جمہوری نظام حکومت مسلط کر دیا گیا۔ تو اس کا مطلب ایک قوم کی آزادی اور دوسری قوم کی سیاسی غلامی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ایسا نظام حکومت دو دن بھی نہ چل سکے گا۔ کیونکہ اس کا نتیجہ خانہ جنگی ہوگا۔ دس کروڑ مسلمانوں کی قوم سے یہ توقع کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقل سیاسی غلامی کا درجہ قبول کر لیں گے؟ ان دونوں کے مطالبۂ آزادی کو مطمئن کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ دونوں کی الگ الگ آزادی کا انتظام کیا جائے۔ دونوں کے الگ الگ اکثریتی علاقوں کی وجہ سے اس قسم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

وزیر ہند نے قائد اعظم سے ایک سوال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات بہت حد تک درست ہے کہ اس وقت ہندوستان کا اتحاد برطانیہ کی طاقت کے ذریعے قائم ہے لیکن کیا یہ بات کسی حد تک درست نہیں کہ اکثر ہندوستانی اس اتحاد کو نہ صرف بخوشی قبول کرتے رہے ہیں بلکہ بہت سے سیاسی لیڈر (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے) متحدہ ہندوستان

کی صورت میں آزادی کا خواب دیکھتے رہے ہیں اور اس کے لئے کوشش اور قربانیاں کرتے رہے ہیں؟ قائدِ اعظم نے جواب میں کہا کہ تجربے نے یہی ثابت کیا ہے کہ یہ چیز "ہندوستانی" قومی احساس کے نام سے پروان چڑھتی رہی ہے۔ وہ فی الحقیقت ہندو قومیت اور مسلمان قومیت کے الگ الگ جذبات ہیں۔ یہ جذبات الگ الگ ملکوں کے استحکام کے ضامن تو ہو سکتے ہیں لیکن ایک واحد مملکت کے استحکام کی بنیاد نہیں بن سکتے بلکہ ایک واحد مملکت کے استحکام اور اندرونی امن و امان کے منافی ہیں۔

۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو (یعنی مشن کے ارکان کے ساتھ قائدِ اعظم کی پہلی اور دوسری ملاقات کے درمیانی عرصے میں) پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے مسلم لیگی ممبروں اور مرکزی لیگ کے عہدہ داروں کا ایک کنونشن دہلی میں منعقد ہوا۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تقریباً پانچ سو آئینی نمائندوں کا تاریخی اجتماع تھا۔ اس میں شرکت کرنے والوں نے ایک قرارداد کے ذریعے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ حصولِ پاکستان کی مہم کو کامیاب کرنے کے لئے مسلم لیگ کے ہر حکم کی وفاداری کے ساتھ پابندی کریں گے اور ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کو تیار ہوں گے۔ ایک اور طویل قرارداد کے ذریعے انہوں نے پاکستان کے متعلق مسلمانوں کا مطالبہ دہرایا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اس اجتماع کی زبان سے مطالبۂ پاکستان جن الفاظ میں پیش کیا گیا۔ ان میں (قراردادِ لاہور کے الفاظ کو نظرانداز کر کے صرف ایک آزاد مملکت کا ذکر تھا جس میں پنجاب اور بنگال کے پورے صوبوں کو، صوبۂ سرحد، سندھ، بلوچستان اور آسام کو شامل کیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کے آئین مرتب کرنے کے لئے دو الگ الگ دستور ساز ادارے قائم کئے جائیں۔

۱۶ اپریل کی ملاقات میں مشن کے ارکان پاکستان کی دو متبادل صورتوں کے متعلق قائدِ اعظم کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ ایک صورت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مکمل علیحدگی کی تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ایک فیڈریشن ان صوبوں کی بن جائے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دوسری باقی صوبوں کی۔ لیکن دونوں مملکتیں دفاع۔ امورِ خارجہ اور مواصلات کے مشترکہ انتظام ایک مرکزی حکومت کے سپرد کر دیں۔ جس میں دونوں ملکوں کو مساوی نمائندگی حاصل

ہو۔ مکمل علیحدگی کی صورت کے متعلق مشن کے ارکان کہتے تھے کہ اگر مسلمان اپنی اکثریت کے علاقوں کو ہندوستان سے بالکل علیحدہ کرنا چاہیں تو ہندو اکثریت کے علاقوں کو پاکستان میں دھکیلنے کا کوئی جواز نہ ہو سکتا تھا اور کانگریس کو پاکستان کے حق میں دو متضاد اصولوں پر راضی کرنے کی کوشش بے سود تھی۔ لہٰذا اس صورت میں صوبوں کی تقسیم سے کوئی مفر نہ تھا۔

قائد اعظم نے "تین مرکز" کی بعض تفصیلات کے متعلق گفتگو کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ مساوی نمائندگی کی صورت میں ہندو فیڈریشن اور مسلم فیڈریشن کے نمائندوں کے درمیان اختلافات رفع کرنا بہت پیچیدہ مسئلہ بن جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ صورت ممکن العمل ہو تو اس قسم کا مرکز ہندو اکثریت والی مرکزی حکومت کے مقابلہ میں قدرے بہتر ہے۔ لیکن مساوی نمائندگی کا اصول قابل عمل معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جس ادارے میں ایک بڑی مملکت اور ایک چھوٹی مملکت شریک ہو تو چھوٹی مملکت کے لئے مساوی حیثیت قائم رکھنا بھی ممکن نہ ہو گا۔ واحد صحیح حل مکمل علیحدگی ہی ہے۔ لیکن اگر علیحدگی کا اصول مان لیا جائے تو مسلم لیگ پاکستان کے رقبہ کے سوال پر گفت و شنید اور سمجھوتے کے لئے تیار ہو گی۔ اس کے لئے صحیح طریق کار یہ ہو گا کہ حد بندی کے متعلق کانگریس اپنی تجاویز پیش کرے۔ ہمارا مطالبہ پورے صوبوں کے لئے ہے۔ کانگریس اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کرے کہ وہ ان صوبوں سے کتنا علاقہ کاٹنا چاہتی ہے۔ اس پر ہم غور کر سکیں گے کہ پاکستان کی بنیادی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم کانگریس کی تجاویز کس حد تک مان سکتے ہیں۔

اس سے اگلے دن مشن کے ارکان نے کانگریس کے نمائندوں سے گفتگو کی۔ اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ انہیں مسٹر جناح کے نقطۂ نگاہ سے کس حد تک قریب لایا جا سکتا ہے لیکن وہ مکمل علیحدگی کے اصول کے بھی مخالف تھے اور اس قسم کا مرکز بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ جیسا مشن کے ارکان کے ذہن میں تھا۔

دو تین دن مشن کے ارکان فرداً فرداً ایک طرف مسٹر جناح اور دوسری طرف پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی سے باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ چند دن آرام اور غور و خوض کے لئے کشمیر چلے گئے۔

مسٹر جناح اور کانگریسی لیڈروں کے ساتھ گفتگو کے بعد کابینہ مشن کے ممبروں کے ذہن میں ایک خیال جم گیا تھا اور یہ خیال آخر تک جما رہا۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے بنیادی مقاصد کو پورا کرنے کا ایک درمیانی راستہ نکالا جا سکتا ہے اور یہی راستہ اختیار کر کے دونوں کے درمیان اتفاق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان اکثریت کے صوبوں اور ہندو اکثریت کے صوبوں کو یہ موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی اپنی الگ فیڈریشن قائم کر لیں۔ اس بات کا ہر ایک گروپ اپنے متعلق خود فیصلہ کرے کہ کون سے محکمے صوبوں کے پاس رہیں اور کون سے محکمے فیڈریشن کے سپرد کئے جائیں۔ لیکن ان دونوں فیڈریشنوں کے اوپر ایک آل انڈیا یونین گورنمنٹ بھی قائم کی جائے۔ جس کی تحویل میں کم از کم تین محکمے ہوں۔ دفاع، امور خارجہ، مواصلات۔ آل انڈیا یونین گورنمنٹ کی ساخت ایسی ہو کہ مسلمانوں کو ہندو غلبے کا خطرہ باقی نہ رہے یعنی اس گورنمنٹ میں دونوں فیڈریشنوں کے نمائندے مساوی تعداد میں شریک ہوں۔

یہی تجاویز اپنے ذہن میں لے کر کابینہ مشن کے ارکان کشمیر سے ۲۳ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی واپس آئے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کو ان تجاویز پر متفق کرنے کے لئے وہ چند دن دہلی میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہوں نے مزید گفتگو کے لئے دونوں پارٹیوں کے چار چار نمائندوں کو شملہ میں بلایا۔ ۵ مئی سے ۱۲ مئی تک وہاں بحث اور گفتگو ہوتی رہی جس کے بعد مشن کے ارکان نے اعلان کر دیا کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ لیکن مشن اپنی کوشش جاری رکھے گا اور خود اپنی طرف سے مناسب تجاویز ملک کے سامنے پیش کرے گا۔

ان تجاویز کا (جو کابینہ مشن کے پلان کے نام سے مشہور ہو گئیں) اعلان ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو ہو گیا۔ یہ تجاویز اسی بنیادی خاکے کے مطابق تھیں۔ جس کی تفاصیل کے متعلق مشن کے ارکان کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ گفتگو کرتے رہے تھے۔ مشن نے اپنی پلان کی تمہید کے طور پر مطالبۂ پاکستان پر اپنے اعتراضات بیان کئے اور کہا کہ ہم نے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا ہے۔ پنجاب اور بنگال میں ہندو اکثریت کا ایسا وسیع علاقہ موجود ہے جسے پاکستان میں شامل کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ جس منطق کی رو سے پاکستان کو باقی ہندوستان سے علحدہ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اسی منطق کی رو سے پنجاب اور بنگال کے غیر مسلم اکثریت والے اضلاع کی

پاکستان سے علٰحدگی لازم آتی ہے۔ اور اگر ان علاقوں کو پاکستان سے الگ کر دیا جائے تو پاکستان بہت چھوٹا اور کمزور ملک رہ جاتا ہے جس کے لئے اپنے دفاع وغیرہ کے انتظام میں مشکلات پیش آئیں گی۔ لیکن دوسری طرف مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان کی صورت میں ہندو اکثریت کے سیاسی غلبے کا جو خطرہ نظر آتا ہے۔ اسے بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اپنی تجاویز مرتب کی ہیں۔ اس تمہید کے ساتھ مشن نے جو تجاویز پیش کیں۔ ان کے بنیادی نکات یہ تھے :-

(۱) صوبوں کو تین مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک گروپ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو، دوسرا گروپ بنگال اور آسام پر اور تیسرا گروپ باقی تمام صوبوں پر۔

(۲) ہر ایک گروپ کو اپنی مرضی کے مطابق اپنی اپنی فیڈریشن بنانے کا اختیار ہوگا لیکن تینوں فیڈریشنوں کے اوپر ایک آل انڈیا یونین ہوگی جس کی تحویل میں تین محکمے ہوں گے۔ دفاع۔ امور خارجہ اور مواصلات۔

(۳) دستور ساز اسمبلی ایک ہی ہوگی جس میں صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے ووٹ سے منتخب شدہ نمائندے شامل ہوں گے۔ مسلمان اور سکھ اپنے اپنے نمائندے اپنے علٰحدہ ووٹ سے منتخب کریں گے۔ "ہندو اور باقی سب" اپنے نمائندے اپنے علٰحدہ ووٹ سے منتخب کریں گے۔ دستور ساز اسمبلی میں ہر صوبے کا فرقہ وارانہ کوٹا ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق مقرر کر دیا گیا۔

(۴) تمام صوبوں کے منتخب شدہ نمائندے پہلے دن ایک ہی دستور ساز اسمبلی میں بیٹھیں گے لیکن صدر کا انتخاب اور اس قسم کی رسمی کارروائی کے بعد گروپوں میں بٹ جائیں گے اور اس کے بعد گروپ اپنا اپنا اور اپنے صوبوں کا آئین مرتب کریں گے۔ جب آئین کا یہ حصہ مکمل ہو جائے تو اس کے بعد مختلف گروپ پھر پوری دستور ساز اسمبلی میں بیٹھ کر آل انڈیا یونین کا آئین بنائیں گے۔

(۵) یونین کی مجلس قانون ساز کے آئین میں یہ شرط رکھی جائے گی کہ فرقہ وارانہ نوعیت کے امور کے متعلق (اس بات کا فیصلہ یونین کا صدر کرے گا) یا آئین میں ترمیم کرنے کے لئے نہ صرف پورے ایوان کی اکثریت کی تائید بلکہ ہندو اور مسلمان ممبروں کی اکثریت کی الگ الگ تائید بھی درکار

ہو گی۔ یونین کی حکومت کو اپنے اخراجات کے لئے براہِ راست ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔

(۶) آئین سازی کے زمانے میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو از سر نو مرتب کر کے اس میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو شامل کیا جائے گا اور جہاں تک موجودہ آئین کے ماتحت ممکن ہو گا اس عبوری حکومت کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ عبوری حکومت میں نشستوں کی تقسیم کا سوال گفت و شنید کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔

اس پلان کے ایک نکتے کی مشن کے ممبر سر سٹیفورڈ کرپس نے اگلے دن ایک پریس کانفرنس میں سوالوں کا جواب دیتے ہوئے خاص طور پر وضاحت کی۔ آپ نے بتایا کہ اس پلان کے منشا کے مطابق صوبوں کو شروع میں لازماً انہی گروپوں میں کام کرنا پڑے گا۔ جن میں انہیں شامل کیا گیا ہے لیکن جب نئے آئین کے تمام حصے مکمل ہو جائیں گے اور نئے آئین کے تحت پہلے انتخابات ہو چکیں گے تو اس کے بعد ہر صوبے کو اختیار ہو گا کہ اگر وہ چاہے تو ایک مخصوص ضابطے کے مطابق اس گروپ سے الگ ہو جائے۔

۳۷۔ ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ

کابینہ مشن نے اپنا منصوبہ شائع کرتے ہوئے دو باتیں واضح کر دی تھیں (۱) یہ منصوبہ کوئی ثالثی فیصلہ نہ تھا بلکہ ایک سفارش کی حیثیت رکھتا تھا جو اس امید اور درخواست کے ساتھ پیش کیا جا رہا تھا کہ ہندوستان کی دونوں بڑی پارٹیاں (کانگریس اور مسلم لیگ) اسے منظور کر لیں گی (۲) منظوری کی شرط پورے منصوبے کی بہ حیثیت مجموعی منظوری تھی۔ اس پورے حصے کی بھی جس میں آئندہ آئین کے خاکے اور آئین سازی کے ضابطے کی نشاندہی کی گئی تھی اور اس حصے کی بھی جو عبوری دور میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی ساخت کے متعلق تھا۔ لیکن عبوری دور کی ایگزیکٹو کونسل کی شکل کیا ہوگی؟ اس میں مختلف پارٹیوں کا تناسب نمائندگی کیا ہوگا؟ یہ بات منصوبے میں واضح نہ کی گئی تھی۔ لہذا قائد اعظم جناح نے منظوری یا نامنظوری کے متعلق کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وائسرائے سے زبانی گفتگو میں دریافت کیا کہ اس بارے میں اس کا ارادہ کیا ہے۔ وائسرائے نے بتایا کہ اس کا ارادہ ایگزیکٹو کونسل میں بارہ ممبر شامل کرنے کا ہے جن میں پانچ نمائندے کانگریس کے اور پانچ مسلم لیگ کے ہوں گے ایک نمائندہ سکھوں کا اور ایک دوسری اقلیتوں کا ہوگا یعنی ۵ : ۵ : ۲

اس دوران میں کانگریسی لیڈر مشن کے ارکان کے ساتھ ایک عجیب بحث شروع کر چکے تھے۔ جس کا مطلب سادہ الفاظ میں یہ تھا کہ کانگریس اس پلان کو اس شرط کے ساتھ منظور کرنا چاہتی تھی کہ اسے اپنے منشاء کے مطابق اس سے انحراف کرنے اور اکثریت کے بل پر من مانا آئین بنانے کا اختیار حاصل رہے گا۔ ابھی کانگریس نے سرکاری طور پر کابینہ مشن پلان پر کوئی رائے ظاہر نہ کی تھی کہ گاندھی جی نے ایک بیان میں اس پلان کو ان خاص معنوں میں شرف قبولیت بخش دیا۔ آپ نے فرمایا: ”کابینہ مشن کا اعلان ثالثی فیصلہ نہیں ہے۔ بلکہ محض سفارشات کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشن نے اپنی طرف سے آئین کا ایک خاکہ پیش کر دیا ہے۔ جو اس کی رائے میں ہندوستان کے مسئلے کا صحیح حل ہے۔ اس کے بعد دستور ساز اسمبلی کو اختیار ہے کہ وہ ان تجاویز کو نامنظور کر

دے یا ان میں ترمیم کر کے انہیں بہتر شکل دے دے۔ دستور ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہوگا۔ مثلاً مشن نے مرکز کے لئے بعض محکمے تجویز کئے ہیں۔ دستور ساز اسمبلی اگر چاہے تو ان کی تعداد میں کمی بیشی کر دے۔ اسی طرح دستور ساز اسمبلی اگر چاہے تو ہندو اور مسلم کا امتیاز جسے مشن نے بامر مجبوری تسلیم کیا ہے۔ بالکل اڑا دے۔ جہاں تک گروپ بندی کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی صوبے کو اس کی مرضی کے بغیر کسی گروپ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ان تشریحات کی شرط کے ساتھ کابینہ مشن پلان بہت اچھی دستاویز ہے۔ جس پر اس کے مصنف بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔"

گاندھی جی کی اس رہنمائی کے بعد کانگریسی لیڈروں نے اسی نقطۂ نگاہ کو اپنا لیا اور اس کے مطابق کابینہ مشن پلان کو بیک وقت منظور اور نامنظور کرنے کے لئے الفاظ کے ہیر پھیر کا کھیل شروع کیا۔ ۲۴ مئی کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے اس بارے میں پہلی قرارداد پاس کی۔ اس میں ایک بات تو یہ کہی گئی کہ مجلس عاملہ کی رائے کے مطابق پلان کے معنی اور منشا یہ ہیں کہ صوبوں کو شروع ہی سے یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ جس گروپ میں چاہیں شامل ہو جائیں (کانگریس آسام اور صوبہ سرحد کو مسلم صوبوں کے گروپوں سے نکال کر ہندو صوبوں کے گروپ میں شامل کرنا چاہتی تھی) اس کے علاوہ مجلس عاملہ کی قرارداد میں پلان پر کچھ اعتراض کئے گئے۔ لیکن منظوری یا نامنظوری کے سوال کو حالات کی مزید وضاحت تک ملتوی رکھا گیا۔

اگلے ہی دن (۲۵ مئی کو) کابینہ مشن کے ارکان نے صوبوں کی گروپ بندی کے متعلق یہ دوٹوک وضاحت کر دی کہ ہمارا منشا قطعی طور پر یہ ہے کہ ہر صوبہ شروع میں اسی گروپ میں شمولیت کا پابند ہوگا جس میں ہم نے اسے رکھا ہے۔ البتہ صوبائی آئین کی تکمیل اور نفاذ اور اس کے تحت پہلے انتخاب کے بعد صوبوں کو اپنا گروپ بدلنے کا موقع مل سکے گا۔ لیکن کانگریس اس موقف پر ڈٹی رہی کہ پلان کا منشا وہ ہے جو ہم سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں ہے جو پلان کے مصنف بیان کرتے ہیں۔ اگر ہم پلان کو قبول کریں گے تو ہم اس پر عمل خود اپنی ہی تشریح کے مطابق کریں گے۔ لیکن ابھی دوسرے نکات کے متعلق کانگریس وائسرائے اور مشن کے ارکان کے ساتھ خط و کتابت کرتی رہی۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق تھا۔ قائدِ اعظم نے ۲۲ مئی ۱۹۴۶ء کو (یعنی پلان کے شائع ہونے کے چھ دن بعد) ایک ذاتی بیان میں اس پلان پر تبصرہ کیا۔ آپ نے اس بات پر افسوس ظاہر

کیا کہ کابینہ مشن نے محض بودے دلائل کی بنا پر پاکستان کے تصور کو مسترد کر دیا ہے۔ حالانکہ اس ملک کے مسئلے کا بہترین حل وہی ہے۔ جہاں تک پلان کو منظور کرنے کا سوال تھا اس کا فیصلہ آپ نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ پر چھوڑ دیا۔ جس کا اجلاس چند دنوں کے بعد دہلی میں ہوا۔ قائد اعظم اس وقت تک عبوری حکومت کی ساخت کے متعلق وائسرائے کا عندیہ بھی معلوم کر چکے تھے۔ مسلم لیگ کی عاملہ کے اجلاس میں قائد اعظم نے ہر ممبر کو اپنی اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے کہا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اپنی رائے مجلس پر ٹھونسنا نہ چاہتے تھے۔ بلکہ اس بات کے خواہشمند تھے کہ مجلس اپنی صحیح اور سوچی سمجھی رائے کے مطابق فیصلہ کرے۔ انہیں اس فیصلے کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ مجلس کے ممبروں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اگر مشن کے پلان کے مطابق آئین بن جائے تو یہ بھی پاکستان ہی کی ایک متبادل صورت ہوگی۔ چونکہ دستور ساز اسمبلی پہلے دن کی رسمی کارروائی کے بعد الگ الگ گروپوں میں بٹ کر سب سے پہلے صوبوں اور صوبائی گروپوں کا آئین بنائے گی اور پھر آل انڈیا یونین کا آئین مرتب کرنے کی نوبت آئے گی۔ لہٰذا عملاً پاکستان اور ہندوستان کی الگ الگ دستور ساز اسمبلیوں کا مطالبہ پورا ہو جاتا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے دفاع۔ امور خارجہ اور مواصلات کا مشترکہ انتظام فی الحال آل انڈیا یونین کے سپرد کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ لیکن اس بات کی کافی گنجائش موجود ہے کہ کچھ عرصے کے بعد پاکستان (اگر وہ چاہے) مشترکہ انتظام ترک کر کے اپنے دفاع وغیرہ کا کل انتظام خود سنبھال لے۔ لہٰذا اس آئین میں پاکستان کی ٹھوس حقیقت موجود ہے۔ بنابریں مجلس عاملہ نے پلان کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۶ر جون ۱۹۴۶ء کو مجلس عاملہ کے فیصلے کی توثیق مسلم لیگ کونسل نے کر دی۔ ابھی کانگریسی لیڈروں کی بحث کابینہ مشن کے ارکان اور وائسرائے کے ساتھ جاری تھی۔ اور جو رویہ کانگریسی لیڈر اختیار کر رہے تھے۔ اس سے خطرہ پیدا ہوتا تھا۔ لہٰذا مسلم لیگ کونسل نے پلان کو منظور کرتے ہوئے آئندہ حالات و واقعات کی روشنی میں اپنے فیصلے کو بدلنے کا حق محفوظ رکھا۔ کونسل نے قائد اعظم کو عبوری حکومت کے متعلق وائسرائے کے ساتھ گفت و شنید کا اختیار بھی دے دیا۔

۸ر جون کو قائد اعظم نے ایک چٹھی کے ذریعے وائسرائے کو مسلم لیگ کونسل کے فیصلوں سے مطلع کرتے ہوئے اپنی سابقہ زبانی گفتگو کے حوالے سے مجوزہ عبوری حکومت میں ۵ : ۵ : ۲ کے

فارمولے کے متعلق وائسرائے کی یقین دہانی کی تحریری تصدیق طلب کی۔ وائسرائے نے جواب میں لکھا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا اسے حتمی "یقین دہانی" نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے یہ خیال ضرور ظاہر کیا تھا اور میں کانگریس کو اسی فارمولے کے ساتھ متفق کرنا چاہتا ہوں۔

چار دن کے بعد (۱۲رجون کو) وائسرائے نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ملاقات کا وقت دیا۔ پنڈت جی وائسرائے کی تجویز سن کر بپھر گئے اور کہنے لگے کانگریس اسے ہرگز منظور نہیں کر سکتی۔ کابینہ کے ممبروں کی کل تعداد پندرہ ہونی چاہیئے اور ان کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیئے:۔ سات کانگریسی (ایک اچھوت سمیت) ایک غیر کانگریسی ہندو۔ چار مسلم لیگی ایک غیر مسلم لیگی مسلم۔ ایک سکھ اور ایک عیسائی۔ لارڈ ویول نے کہا اس قسم کی تقسیم ممکن نہ ہوگی۔ مسٹر جناح اسے ہرگز نہ مانیں گے۔ اگلے دن ایک چٹھی کانگریس کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد (صدر) کے دستخط سے وائسرائے کو بھیجی گئی جس میں پنڈت نہرو کی پیش کردہ تجویز کی حمایت کی گئی تھی اور ساتھ ہی وائسرائے کو یہ یاد دلایا گیا تھا کہ جون ۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرنس میں ہندو مسلم مساوات کی صورت یہ تجویز کی گئی تھی کہ پانچ مسلمان اور پانچ اونچی ذات کے ہندوؤں کے علاوہ ایک اچھوت نمائندہ۔ اس طرح پانچ مسلمان اور چھ ہندو بنتے تھے۔ پھر پانچ مسلمانوں میں ایک غیر لیگی مسلمان کو شامل کرنے کی تجویز بھی تھی۔ موجودہ ۵ : ۵ : ۲ کا فارمولا ہندوؤں کے نقطہ نگاہ سے اس سے بدتر ہے۔ صحیح تقسیم وہی ہے جو پنڈت نہرو نے تجویز کی ہے۔

مولانا کے اس استدلال سے وائسرائے نے یہ تاثر لیا کہ شاید کانگریس پانچ مسلم لیگی نمائندوں کے مقابلے میں کانگریس کے چھ نمائندوں (ایک اچھوت شامل کر کے) کے اصول پر راضی ہو جائے۔ یعنی ۶ : ۵ : ۲ - ۱۔ لارڈ ویول نے قائد اعظم سے ملاقات کی اور یہ فارمولا ان کے سامنے رکھا۔ قائد اعظم نے کہا کہ پہلے آپ یہ فارمولا کانگریس سے منظور کرائیں۔ اگر کانگریس اسے منظور کرتی ہو تو اس صورت میں اس فارمولا کو میں بھی اپنی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کرنے کو تیار ہوں گا۔ اگر کانگریس اسے بھی نہ مانتی ہو تو پھر آپ کا میرے ساتھ ہوائی بات کرنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ وائسرائے نے یہ فارمولا کانگریس کے سامنے پیش کیا۔ لیکن کانگریس نے اسے بھی نامنظور کر دیا۔ اب کیا کیا جائے؟ لارڈ ویول اور کابینہ مشن کے ارکان پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں

نے کانگریس کے سامنے مزید جھک کر ۶ : ۵ : ۲ کے بجائے ۶ : ۵ : ۳ کا فارمولا مرتب کیا۔ یعنی کل چودہ ممبروں کی ایگزیکٹو کونسل میں چھ نمائندے کانگریس کے ہوں۔ پانچ مسلم لیگ کے اور باقی ۳ (سکھوں کے سمیت) چھوٹی اقلیتوں کے ہوں۔ کابینہ کی پوری تعداد میں "باقی اقلیتوں" کی نمائندگی میں ایک کا اضافہ کرنے کا مطلب بالواسطہ طریق پر مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کی قوت میں اضافہ کرنا تھا کیونکہ یہ بات ظاہر تھی کہ ہر اہم اختلافی سوال پر مسلم لیگ کے مقابلے میں باقی سب ممبر کانگریس ہی کا ساتھ دیں گے۔

یہ نیا فارمولا مرتب کرتے وقت کابینہ مشن اور وائسرائے نے اپنی رائے کے مطابق نام بھی منتخب کر لئے۔ اور ایک اہم اعلان یہ بھی کر دیا کہ اب اگر کوئی پارٹی اس فارمولے کی بنا پر عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کرے تو اسے نظر انداز کر کے جو پارٹیاں تعاون کے لئے تیار ہوں۔ اور آئین سازی کے متعلق کابینہ مشن پلان کو بھی قبول کرتی ہوں۔ انہیں شامل کر کے عبوری حکومت قائم کر دی جائے گی۔ البتہ یہ وضاحت کر دی گئی کہ پارٹیوں کے جن نمائندوں کے نام چنے گئے ہیں۔ اگر ان میں کوئی فرد ذاتی وجوہات کی بناء پر کابینہ کی ممبری قبول نہ کر سکے تو اس کی جگہ اسی پارٹی کا کوئی اور نمائندہ، اس پارٹی کے ساتھ مشورے سے لے لیا جائے گا۔

اس اعلان میں جن چودہ افراد کے نام شامل کئے گئے وہ حسب ذیل تھے۔

کانگریس :- (۱) پنڈت جواہر لال نہرو (۲) مسٹر راجہ گوپال اچاریہ (۳) ڈاکٹر راجندر پرشاد (۴) مسٹر ایچ کے مہتاب (۵) سردار ولبھ بھائی پٹیل اور (۶) اچھوت اقوام سے مسٹر جگجیون رام۔

مسلم لیگ :- (۱) مسٹر ایم۔ اے جناح ، (۲) مسٹر لیاقت علی خاں (۳) نواب اسمٰعیل خاں (۴) خواجہ ناظم الدین اور (۵) سردار عبدالرب نشتر

سکھ :- سردار بلدیو سنگھ

عیسائی :- ڈاکٹر جان متھائی

پارسی :- سر این۔ پی انجینئر

یہ ہنگامہ خیز اعلان ۱۶ رجون ۴۶ ۱۹ء کو شائع کیا گیا۔ جس میں صاف طور پر یہ کہا گیا تھا،

کہ اگر دونوں بڑی پارٹیاں (کانگریس اور مسلم لیگ) میں سے کوئی پارٹی اس تجویز کو (ناموں میں ردوبدل کی جاسکتی تھی) منظور نہ کرے تو اسے نظر انداز کر کے باقی پارٹیوں پر مشتمل عبوری حکومت قائم کر دی جائے گی۔

اس اعلان کے فوراً بعد قائد اعظم نے ایک مرتبہ پھر وائسرائے سے یہ وضاحت طلب کی کہ اب حکومت کا یہ فیصلہ آخری ہے اور حکومت اس پر قائم رہے گی یا پھر اس کے اصولوں میں ردوبدل شروع کر دے گی۔ وائسرائے نے انہیں یقین دلایا کہ صرف ناموں میں پارٹیوں کے مشورے سے ردوبدل کی گنجائش ہے۔ باقی تمام باتیں حتمی فیصلہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان باتوں کے متعلق وضاحت اور یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد مسٹر جناح نے انتظار کیا۔ ۲۵ / جون ۱۹۴۶ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد پاس کی جس میں (۱) عبوری حکومت میں شامل ہونے سے صاف انکار کر دیا اور (۲) آئین سازی کے متعلق یہ کہا کہ کانگریس مجوزہ دستور ساز اسمبلی میں ملک کے لئے صحیح معنوں میں آزادی کا آئین بنانے کی غرض سے شامل ہونے کو تیار ہے۔ یعنی پلان میں مقرر کردہ ضابطوں سے فرار کا راستہ پھر کھول لیا۔

جس دن کانگریس کی عاملہ نے یہ قرارداد پاس کی اسی شام کو مسلم لیگ کی عاملہ نے عبوری حکومت کی تجویز منظور کر لی۔ اور قائد اعظم نے وائسرائے اور کابینہ مشن کے ارکان سے پوچھا کہ کیا اب آپ صاحبان اپنے "حتمی فیصلہ" اور پبلک طور پر کئے ہوئے وعدے کے مطابق کانگریس کو نظر انداز کر کے باقی پارٹیوں پر مشتمل عبوری حکومت قائم کرنے کو تیار ہیں؟ لیکن کابینہ مشن کے ارکان اپنے وعدے سے پھر گئے اور کہنے لگے کہ فی الحال عبوری حکومت قائم کرنا مشکل ہے۔ لہذا اس کا قیام ملتوی کیا جاتا ہے۔ البتہ دستور ساز اسمبلی کے منصوبے پر عمل جاری رہے گا۔ کیونکہ اسے دونوں پارٹیاں منظور کرتی ہیں۔ حالانکہ جن معنوں میں کانگریس اس منصوبے کو "منظور" کرتی تھی۔ وہ فی الحقیقت اسے مسترد کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن برطانوی حکومت حقیقت سے آنکھیں بند کر کے اسے "منظوری" ہی سمجھنے کو تیار تھی۔ دو تین دن کے بعد

۲۹؍جون ۱۹۴۶ء کو کابینہ مشن کے ارکان ہندوستان سے چلے گئے اور اپنی بدعہدی اور کانگریس نوازی کے نتائج کا مقابلہ کرنے کا کام لارڈ ویول پر چھوڑ گئے۔

۲۵؍جون کو کانگریس کی عاملہ نے جو قرارداد منظور کی اس کے پس پردہ عجیب ڈرامائی واقعات ہو چکے تھے جن کا ذکر قائد اعظم نے ایک مہینے کے بعد اپنی ایک تقریر میں کیا۔[1] آپ نے فرمایا:
"میری اطلاع یہ ہے کہ کانگریسی لیڈر ۲۴؍جون کی شام کو آئین سازی کے پلان اور عبوری حکومت کی پیشکش دونوں کو مسترد کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اور انہوں نے کابینہ مشن کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا تھا۔ ۲۵؍جون کو علی الصباح سر سٹیفورڈ کرپس بھاگے بھاگے مہاتما گاندھی کے پاس بھنگی کالونی میں پہنچے اور ان کی منت سماجت کی۔ دوسری طرف لارڈ پیتھک لارنس نے سردار پٹیل کا تعاقب کیا جو ہوا خوری کو گئے ہوئے تھے۔ اور وہیں جا کر ان کا راستہ روکا اور انہیں اپنی رہائش گاہ پر لے گئے۔ وہاں یہ بحث ہوئی کہ اگر کانگریس خود اپنی من مانی تشریحات کے ساتھ مشن کی آئین سازی کی پلان کو "قبول" کرے تو مشن کے ارکان کے لئے عبوری حکومت کے سوال کو ٹالنے اور مسلم لیگ کے ساتھ ایفائے عہد سے انحراف کا کچھ نہ کچھ بہانہ مل جائے گا۔ ورنہ عبوری حکومت کو مسلم لیگ کے حوالے کرنا پڑے گا۔ یہ سارا کھیل اس سازش کے تحت ہوا ہے۔ میں وائسرائے اور کابینہ مشن کے ارکان سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ ان سنگین الزامات پر روشنی ڈالیں"۔ واضح رہے کہ ان صاحبان نے ان الزامات کی کوئی تردید نہ کی۔

کانگریس کی عاملہ کی قرارداد وائسرائے کو بھیجتے ہوئے مولانا ابو الکلام آزاد (صدر) نے اپنی چٹھی میں صاف لکھ دیا تھا کہ کانگریس نے آئین سازی کی پلان کو اپنی تشریحات کے ساتھ قبول کیا ہے۔ چند دنوں کے بعد یہ بات اور زیادہ واضح ہو گئی کہ اس "قبولیت" کے حقیقی معنی کیا تھے۔ ۶؍جولائی ۱۹۴۶ء کو یہی قرارداد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے سامنے توثیق کی غرض سے پیش ہوئی۔ اس اجلاس میں مولانا آزاد کی جگہ پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ توثیق کی قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے نئے صدر نے کہا کہ آئین سازی کی پلان کو منظور کرنے کے معنی

---

[1] مسلم لیگ کونسل کے اجلاس بمبئی مورخہ ۲۷؍جولائی میں تقریر کرتے ہوئے۔

صرف یہ ہیں کہ ہم اس پلان کے تحت قائم ہونے والی دستور ساز اسمبلی میں بیٹھنا منظور کرتے ہیں۔ لیکن جب دستور ساز اسمبلی ایک مرتبہ معرض وجود میں آجائے گی تو اس پر ان ضابطوں کی یا اس آئینی خاکے کی پابندی جو کابینہ مشن کی پلان میں درج ہیں۔ ہرگز لازم نہ ہوگی۔ کیونکہ دستور ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہوگی۔ اور جس قسم کا آئین چاہے بنا سکے گی۔ اس تشریح کے ساتھ کانگریس کمیٹی نے مجلس عاملہ کی قرارداد کی توثیق کر دی اور پلان کو شرف قبولیت بخش دیا۔ چار دن کے بعد صدر نہرو نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اور بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتایا کہ کانگریس نے پلان کو ان معنوں میں منظور کیا ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو (جہاں کانگریس اکثریت میں ہوگی) اس پلان سے انحراف کرنے اور من مانے ضابطوں کے مطابق اپنی پسند کا آئین بنانے کا پورا اختیار اور موقعہ حاصل ہوگا۔

کانگریس کابینہ مشن پلان کو قبول کر رہی تھی یا اس کی تمام پابندیوں کو مسترد کر رہی تھی؟ پنڈت نہرو کے بیانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے قائد اعظم نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت برطانیہ کو چاہیئے کہ نہ اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کرے نہ دوسروں کو دھوکا دے بلکہ ایمانداری کے ساتھ یہ اعلان کر دے کہ کانگریس نے کابینہ مشن پلان کو مسترد کر دیا ہے۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو وزیر ہند نے برطانوی دارالامراء میں اور سر سٹیفورڈ کرپس نے دارالعوام میں اس موضوع پر تقریریں کیں۔ انہوں نے یہ تو کہا کہ پلان میں جو ضابطہ اور جو آئینی خاکہ درج کیا گیا ہے۔ ان کی پابندی لازمی ہے اور انہیں دونوں بڑی پارٹیوں (کانگریس اور مسلم لیگ) کی متفقہ مرضی کے بغیر بدلا نہیں جا سکتا اور حکومت برطانیہ کوئی ایسا آئین منظور نہ کر سکے گی۔ جو پلان کے منشاء کے مطابق تیار نہ کیا گیا ہو۔ لیکن وہ اس نکتہ پر خاموش رہے کہ کانگریس جو کچھ کر رہی تھی اس کے معنی پلان کی منظوری تھے یا نامنظوری۔ اس کے برعکس وزیر ہند لارڈ ویول کو یہ ہدایت کر رہا تھا کہ اس مفروضے پر عمل کرتے رہو کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں آئین سازی کی پلان کو منظور کرتی ہیں اور ڈیڈ لاک صرف عبوری حکومت کے مسئلے پر ہے۔ لہذا اس ڈیڈ لاک کو رفع کرنے کی کوشش کرو اور کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ پھر عبوری حکومت کے متعلق گفت و شنید شروع کرو۔ چنانچہ ان ہدایات کے مطابق وائسرائے نے ۲۲ر جولائی کو پھر ایک ہی مضمون کی چٹھی پنڈت

جواہر لال نہرو اور مسٹر جناح کو بھیج دی۔ جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شرکت کی از سر نو دعوت دی گئی۔ اور انہیں زبانی بات چیت کے لئے بھی بلایا گیا۔ چٹھی میں یہ بھی کہا گیا کہ عبوری حکومت کی ساخت وہی ہوگی جو ۱۶ر جون کے اعلان میں تجویز کی گئی تھی۔ یعنی ایگزیکٹو کونسل کے چودہ ممبروں میں چھ کانگریسی (ایک اچھوت سمیت) اور پانچ مسلم لیگی اور تین باقی اقلیتوں کے نمائندے ہونگے۔

وائسرائے اور برطانوی حکومت کانگریس کی دھاندلی کی جس طرح چشم پوشی اور حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ قائد اعظم اس کے خلاف موثر احتجاج کا طریقہ سوچ رہے تھے۔ انہوں نے وائسرائے کی چٹھی کا فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ اور مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کا انتظار کیا جو ۲۷ر جولائی کو منعقد ہونے والا تھا۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے مسلم لیگ کے ساتھ حکومت کی بدعہدیوں کے واقعات دہرائے اور فرمایا کہ کانگریس فی الحقیقت کابینہ پلان کو مسترد کر چکی ہے۔ کابینہ مشن کے ارکان یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ دنیا کو یہ فریب دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کانگریس نے ان کے پلان کو منظور کر لیا ہے۔ انہوں نے کانگریس کو درپردہ یہ اجازت دیدی ہے کہ زبان پہ پلان کا نام رکھو اور عمل اس کے خلاف کرتے رہو۔ اور حکومت اپنی آنکھیں بند کر کے یہی کہتی رہے گی کہ کانگریس ہمارے پلان کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔

آپ نے مزید فرمایا کہ مسلم لیگ نے دیانت داری کے ساتھ آبرومندانہ سمجھوتے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن برطانوی حکومت اور ہندو کانگریس دونوں ملی بھگت کر کے مسلم لیگ کو شکست دینے پر تل گئی ہیں۔ اب مسلم لیگ کے لئے مسلم قوم کے سوا اور کوئی عدالت نہیں ہے۔ جس کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے۔ لہٰذا ہم کابینہ مشن پلان کے ساتھ تعاون کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ اب مسلم قوم کو اپنا مطالبۂ پاکستان منوانے کے لئے خود اپنی طاقت پہ بھروسہ کرنا پڑے گا۔

مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس نے دو فیصلے کئے۔ ایک فیصلہ یہ تھا کہ کابینہ مشن پلان کے ساتھ تعاون کا سابقہ فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ دوسرا فیصلہ "ڈائرکٹ ایکشن" کے متعلق ایک

قرارداد کی صورت میں کیا گیا۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ تھے "اب مسلمانوں کے لئے پاکستان حاصل کرنے اور برطانیہ کی غلامی اور ہندو غلبے کے امکانات سے نجات حاصل کرنے کے لئے ڈائرکٹ ایکشن کا راستہ اختیار کرنے کا وقت آگیا ہے۔ مسلم لیگ کونسل مسلم قوم سے توقع کرتی ہے کہ وہ پورے اتحاد کے ساتھ اپنی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی پیروی کرے گی اور ہر ایک قربانی کے لئے تیار ہوگی۔ مسلم لیگ کونسل مجلس عاملہ کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ اس پالیسی کے تحت جس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ڈائرکٹ ایکشن کا پروگرام مرتب کرے اور مسلمانوں کو اس تحریک کے لئے منظم کرے۔ جسے مناسب وقت پر شروع کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ کونسل مسلمانوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر حکومت کے دیئے ہوئے خطابات فوراً واپس کر دیں"۔ اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ ہم نے آج تک کبھی آئینی طریق کار کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھا۔ لیکن آج ہم نے مجبوراً "ڈائرکٹ ایکشن" کا پستول اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا ہے۔

اس کے بعد کونسل کی ہدایت کے مطابق لیگ کی مجلس عاملہ نے "ڈائرکٹ ایکشن" کا صرف اتنا ابتدائی پروگرام مرتب کیا کہ ۱۶ر اگست کو "ڈائرکٹ ایکشن" کا دن مقرر کر دیا اور مسلمانوں سے کہا کہ اس دن جلسے منعقد کئے جائیں۔ جن کے ذریعے مسلم لیگ کی تحریک کا پس منظر عوام پر واضح کیا جائے۔

ڈائرکٹ ایکشن کا دن پورے ہندوستان میں منایا گیا اور امن و امان سے گذر گیا۔ لیکن کلکتہ میں اس نے شروع ہی سے ہندو مسلم فساد کی صورت اختیار کر لی۔ اور یہ فساد ہر لمحے زیادہ شدت اختیار کرتا رہا۔ فساد کس نے شروع کیا اور کس طرح شروع ہوا۔ اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہندو اخباروں نے مسلمانوں پر اور مسلمان اخباروں نے ہندوؤں پر ذمہ داری ڈالنے کی کوشش کی۔ بنگال میں اس وقت مسٹر حسین شہید سہروردی کے زیر قیادت مسلم لیگ وزارت برسر اقتدار تھی۔ اس بات سے ہندو اخباروں کو فساد کی بیشتر ذمہ داری مسٹر سہروردی کے سر تھوپنے کا بہانہ مل گیا۔ لیکن اگر محض قیاسات اور منطق آرائی سے کام لیا جائے۔ تو یہ بات زیادہ یقین کے ساتھ کہی جاسکتی تھی کہ اس قسم کے فسادات حکومتیں اور وزارتیں نہیں کراتیں۔ بلکہ عام طور پر حکومتوں کو

بدنام کرنے کے مقصد سے کرائے جاتے ہیں۔ بہر حال یہ کوئی نہ بتا سکتا تھا۔ کہ فساد کب۔ کہاں اور کس طرح شروع ہوا۔ بعد میں فسادات کی تحقیقات کے لئے فیڈرل کورٹ کا ایک انگریز جج مقرر کیا گیا تھا کہ اتنے میں ملک تقسیم ہو گیا۔ اور حکومت ہند نے جس کے علاقے میں کلکتہ شامل تھا۔ خود ہی اس تحقیقات کی بساط لپیٹ دی۔

جو حقیقت سب کے سامنے تھی وہ یہ تھی کہ چار دن کے اندر اس فساد میں چار یا پانچ ہزار افراد ہلاک ہو گئے۔ اور اس سے کئی گنے زخمی ہوئے۔ عمارتوں اور جائداد کو آتشزنی سے اور دکانوں کو لوٹ مار سے جو نقصان پہنچا۔ اس کا اندازہ لاکھوں روپے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نقصان زیادہ تر صاحب جائداد فرقے ہی کو پہنچا ہوگا۔ فساد کے دوسرے دن فوج کی امداد طلب کی گئی۔ پھر بھی گلیوں اور کوچوں میں حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور چار دن کی سخت بدامنی کے بعد کلکتہ کے حالات معمول پر آگئے۔

۳۸۔ عبوری حکومت کے مورچے کیلئے سیاسی داؤ پیچ

جب لارڈ ویول نے ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو اپنی چٹھی پنڈت جواہر لال نہرو اور قائد اعظم جناح کو بھیجی اور اس میں عبوری حکومت قائم کرنے کی تجویز کا اعادہ کیا۔ تو کانگریسی لیڈر اس تجویز کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار نہ تھے۔ یہ وہی تجویز تھی جسے وہ ۱۵ جون کو مسترد کر چکے تھے اور اس کے وہی پہلو جن پر انہیں اعتراض تھا بدستور موجود تھے۔ پنڈت نہرو نے ۲۳ جولائی کو وائسرائے کی چٹھی کا جواب دیتے ہوئے اس تجویز کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب مسلم لیگ نے ۲۷ جولائی کو "ڈائرکٹ ایکشن" کا راستہ اختیار کر لیا اور آئین سازی کی پلان کو مسترد کرنے کا اعلان کر دیا۔ تو کانگریسی لیڈروں کا رویہ یک لخت بدل گیا۔ اگر مسلم لیگ حکومت سے باہر رہے اور کانگریس کو حکومتی اقتدار پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنے کا موقعہ مل سکے تو کانگریسی لیڈر وائسرائے کی شرائط ہی پہ عبوری حکومت کا چارج سنبھالنے کو آمادہ تھے۔ وائسرائے نے پنڈت نہرو کو بلا کر ان سے زبانی گفتگو کی تو وہ راضی ہو گئے کہ اگر انہیں رسمی دعوت دی جائے تو وہ نئی ایگزیکٹو کونسل کے قیام میں امداد دینے کو تیار ہونگے۔ وزیر ہند کو یہ رپورٹ ملی تو انہوں نے اس صورت حال کو غنیمت سمجھا اور وائسرائے کو مشورہ دیا کہ مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے رہو۔ لیکن کانگریس کو ہاتھ سے نہ نکلنے دو۔ وائسرائے کی یہ انتہائی خواہش تھی کہ پنڈت جی مسٹر جناح کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں اور انہیں کانگریس۔ لیگ کولیشن قائم کرنے پر آمادہ کر لیں۔ پنڈت جی نے اس کوشش کے لئے بھی آمادگی ظاہر کی۔ ۸ اگست ۱۹۴۶ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے اپنے صدر کو اس بات کا اختیار دے دیا کہ اگر انہیں عبوری وزارت مرتب کرنے کی دعوت ملے تو اسے قبول کر لیں۔ پنڈت نہرو نے وائسرائے کو اس بات کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ وزارت سازی کی رسمی دعوت کے بعد میرا سب سے پہلا قدم لازماً یہی ہو گا کہ مسٹر جناح کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن کسی شخص کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے میری کوئی حیثیت اور بنیاد قائم ہونی چاہیئے۔ اس کا مناسب طریقہ یہی ہے کہ اس بات کا سرکاری

اعلان کردیا جائے کہ مجھے وزارت سازی کے لئے مشورہ دینے کی دعوت دی گئی ہے اور میں نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ ۱۲؍ اگست کو وائسرائے نے اس مضمون کا اعلان شائع کردیا۔ اس کے بعد پنڈت جی نے پہلے مسٹر جناح کو ایک چٹھی لکھی۔ جس کا انہیں روکھا پھیکا جواب ملا۔ پھر پنڈت جی مسٹر جناح کے ساتھ گفتگو کے لئے بمبئی پہونچے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا۔ (پنڈت جی کا مقصد بھی غالباً یہی تھا) کہ مسٹر جناح نے ان کے ساتھ تعاون کرنے سے قطعی انکار کردیا۔ اتفاق سے یہ وہی دن تھا (۱۶؍ اگست) جو مسلم لیگ نے "ڈائرکٹ ایکشن" کے لئے مقرر کیا تھا۔ پنڈت نہرو مسٹر جناح کی کوٹھی سے باہر نکل کر اپنی کار میں روانہ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ بازاروں میں اکثر دکانیں بند تھیں اور مسلمانوں کے گھروں پر سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے۔

اگلے ہی دن (۱۷؍ اگست کو) ادھر کلکتہ کے فساد کی خبریں آرہی تھیں۔ ادھر پنڈت نہرو مجوزہ کابینہ کے ارکان کی فہرست جیب میں لے کر وائسریگل لاج پہونچ گئے۔ وائسرائے نے ان کی توجہ کلکتہ کے واقعات کی جانب دلائی اور کہا کہ مسلم لیگ کو کابینہ میں شامل کرنے کے لئے ایک کوشش اور کرنی چاہیئے۔ پنڈت جی کا نقطۂ نگاہ اب یہ تھا کہ ایسی کوشش فسادیوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مسٹر جناح کو جو کچھ پیش کیا جا سکتا تھا پیش کیا گیا لیکن وہ نہیں مانے۔ لہٰذا مزید کوشش لاحاصل ہے۔ وائسرائے حالات پر مزید غور اور وزیر ہند سے صلاح و مشورہ کے لئے مہلت چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ بہر صورت آپ اس بارے میں کم از کم اپنی مجلس عاملہ سے مشورہ کرلیں۔ پنڈت جی نے اگلے ہی دن وائسرائے کو خط لکھ دیا کہ میں نے مجلس عاملہ سے مشورہ کرلیا ہے۔ وہ میرے نقطۂ نگاہ کے ساتھ متفق ہے۔ اس خط میں پنڈت جی نے وائسرائے پر ایک نئے رخ سے حملہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کی دعوت پر کانگریس نے عبوری حکومت مرتب کرنے کی ذمہ داری سنبھالی ہے۔ اب اگر آپ کا منشا یہ ہے کہ مسٹر جناح کے تعاون کے بغیر عبوری حکومت نہیں بن سکتی تو آپ ایک ہاتھ سے کانگریس کو ذمہ داری سونپ کر دوسرے ہاتھ سے اسے واپس لے رہے ہیں اور پبلک کے سامنے اس جماعت کی پوزیشن کو مضحکہ خیز بنا رہے ہیں۔ آپ جو ذمہ داری ہمیں دے چکے ہیں۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کا کام ہمارا ہے۔ کلکتہ کے واقعات کے بعد مسٹر جناح کو راضی کرنے کی کوشش بہت ہی مشکل ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کی پانچ نشستوں کو خالی رکھنا بھی

مناسب نہ ہوگا۔ اس سے عوام کے اندر یہ تاثر پیدا ہوگا کہ یہ حکومت غیر مکمل اور غیر مستحکم ہے۔ ان نشستوں پر غیر لیگی مسلمانوں کا تقرر کر دینا چاہیئے۔

وائسرائے نے اس کا جواب دینے میں ایک دن کی دیر لگائی تو مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے پاس بھیجا گیا۔ مولانا نے وائسرائے کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں مسلمانوں کے صحیح مفاد کے نقطۂ نگاہ سے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اب ایک مضبوط "قومی حکومت" قائم کرنے میں دیر نہ لگانا چاہیئے ملک کے اندر امن کا تقاضا یہی ہے۔ ۲۲ر اگست کو پھر پنڈت جواہر لال نہرو نے وائسرائے کو ایک خط لکھا اور پوچھا کہ اب تاخیر کے کیا معنی ہیں۔ کیا آپ ملک کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ہر چیز مسٹر جناح کے انتظار میں رکی ہوئی ہے۔

وائسرائے ان حملوں کے آگے تو شائد ہتھیار نہ ڈالتا۔ لیکن برطانیہ کی لیبر حکومت کی اسے صاف ہدایت تھی کہ مسٹر جناح کو راضی کرنے کی کوشش ضرور کرو۔ لیکن یہ خطرہ مول نہ لو کہ اس کوشش میں کانگریس کا تعاون بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ لہٰذا وائسرائے نے ۲۴ر اگست کو سرکاری اعلان کر دیا کہ حکومت برطانیہ نے ایگزیکٹو کونسل کے موجودہ ممبروں کے استعفے منظور کرنے اور ان کی جگہ مندرجہ ذیل اصحاب کو مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ مسٹر راجہ گوپال اچاریہ۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ مسٹر سرت چندر بوس۔ مسٹر آصف علی۔ مسٹر جگجیون رام۔ سردار بلدیو سنگھ۔ ڈاکٹر جان متھائی۔ سر شفاعت احمد خان۔ سید علی ظہیر۔ اور مسٹر سی۔ ایچ بھابا۔ اعلان میں کہا گیا کہ ان کے علاوہ دو مسلمان ابھی اور مقرر کیے جائیں گے۔

نئے ایگزیکٹو کونسلروں کے صرف تقرر کا اعلان کیا گیا تھا۔ عہدے کا حلف اٹھوانے کی رسم ابھی باقی تھی۔ ۲۴ر اگست ۱۹۴۶ء کو یہ اعلان کر لینے کے بعد وائسرائے کلکتے کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے چلا گیا۔ وہاں اس نے اس فساد زدہ شہر کی ہولناک کیفیت دیکھی تو اسے احساس ہوا کہ نہ صرف کانگریس کی ایک صریح دھاندلی کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے بلکہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی حکومت ایک فرقے کے قبضے میں دے کر ہندوستان کو خانہ جنگی کی آگ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ کلکتہ میں لارڈ ویول کی بات چیت دوسرے لوگوں کے علاوہ خواجہ ناظم الدین کے ساتھ بھی ہوئی۔ خواجہ صاحب بہت تیز طرار گفتگو کرنے والے نہ تھے۔ لیکن بعض مرتبہ دیانتداری

کی صاف اور سیدھی بات چیت بہت موثر ثابت ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب نے لارڈ ویول سے کہا کہ مسلم لیگ کے ساتھ تعطل کی کیفیت محض اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ کانگریس کابینہ مشن پلان سے انحراف کرنے پر اصرار کر رہی ہے۔ پلان کے مصنف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے جو ضابطہ کار مقرر کیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ مختلف گروپوں میں شامل صوبے لازماً اپنے گروپوں میں بیٹھ کر کام شروع کریں گے۔ اور نئے آئین کی تکمیل اور نفاذ تک انہیں اپنے گروپوں سے نکلنے کا اختیار نہ ہوگا۔ کانگریس کہہ رہی ہے کہ صوبے اس گروپ بندی کے پابند نہیں۔ اب اگر کانگریس یہ حتمی یقین دلائے کہ وہ پلان سے انحراف نہ کرے گی۔ یا آپ یہ یقین دلائیں کہ آپ کانگریس کو پلان کے منشا سے (جو اس کے مصنفوں کا منشا ہے) انحراف نہ کرنے دیں گے تو ممکن ہے کہ مسٹر جناح اپنے عدم تعاون کے فیصلے پر نظرثانی کرنے پر آمادہ ہو جائیں اور ایسی عبوری حکومت بن سکے جس کے خلاف ملک میں بے چینی پیدا نہ ہو۔

لارڈ ویول کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ دہلی واپس پہنچ کر وائسرائے نے پنڈت نہرو اور گاندھی جی کو گفتگو کے لئے بلایا۔ یہ گفتگو ہندوستان کی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ کسی وائسرائے اور سیاسی لیڈروں کے درمیان دو بدو ایسی جھڑپ کبھی نہیں ہوئی۔ جیسی اس گفتگو میں ہوئی۔ اس گفتگو کا جو ۲۷/اگست کو ہوئی سرکاری ریکارڈ بہت دلچسپ ہے۔

وائسرائے یہ چاہتا تھا کہ کانگریسی لیڈر اس بات کا غیر مبہم اعلان کر دیں کہ وہ کابینہ مشن پلان کو (اپنی من مانی تشریح کے مطابق نہیں بلکہ پلان کے مصنفوں کی تشریح کے مطابق) منظور کرتے ہیں۔ اگر ایسا اعلان ہو جائے تو شاید مسلم لیگ کو پلان کے ساتھ تعاون پر راضی کیا جا سکے اور عبوری حکومت میں کانگریس لیگ کولیشن کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ جس کے بغیر ملک میں امن و امان قائم رکھنا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ انصاف کی بات بھی یہی تھی کہ اگر پلان کی منظوری کے بغیر کوئی پارٹی عبوری حکومت میں شرکت کی مستحق نہ تھی تو کانگریس کی جانب سے بھی اس کی منظوری ایسے طریق پر ہونی چاہیئے جسے صحیح معنوں میں منظوری کہا جا سکے۔ چنانچہ وائسرائے نے اعلان کا ایک مسودہ تیار کر رکھا تھا۔ جس کے الفاظ یہ تھے: "فرقہ وارانہ اتحاد کی خاطر کانگریس کابینہ مشن پلان کا یہ منشا قبول کرنے کو تیار ہے۔ کہ صوبے اپنے مقرر کردہ گروپوں سے نکلنے کے مجاز اس فیصلے کی تکمیل تک نہ ہوں

گے جس کا ذکر پلان کے پیرا ۱۹ (۲) میں کیا گیا ہے۔" (یعنی آئین کی تکمیل اور نفاذ تک)
جب گفتگو شروع ہوئی تو لارڈ ویول نے گاندھی جی اور پنڈت جی سے پوچھا کہ کیا آپ صاحبان مجھے ان خطوط پر پلان کی منظوری کی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔

لارڈ ویول: "مجھے یہ صاف اور سادہ ضمانت دے دیجئے کہ آپ کابینہ مشن پلان کو منظور کرتے ہیں۔"

گاندھی جی: "ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہم اسے منظور کرتے ہیں۔ لیکن اس پلان کا جو عندیہ کابینہ مشن بیان کرتا ہے وہ ہمیں قبول نہیں۔ ہمارے ذہن میں ان تجاویز کی مختلف تشریح ہے۔"

لارڈ ویول: "خواہ یہ تشریح خود کابینہ مشن کے عندیہ سے مختلف ہو؟"

گاندھی جی: "بے شک۔ بہرحال کابینہ مشن پلان کے مستند معنی وہ نہیں جو مشن بتلائے۔ بلکہ مستند معنی وہی ہوں گے جو عبوری حکومت اسے پہنائے گی۔"

لارڈ ویول: "فی الحال عبوری حکومت کا مطلب اکیلی کانگریس ہے۔ کیوں کہ مسلم لیگ نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ کانگریس کی تشریح ایک جانبدارانہ تشریح ہو گی۔"

گاندھی جی: "اس وقت جانبدارانہ کا سوال نہیں ہے۔ قانونی پوزیشن کا سوال ہے۔ پلان پر عمل کرانا عبوری حکومت کی ذمہ داری ہے۔ جب عبوری حکومت بن جائے گی تو اختلافی مسائل طے کرنا اسی کا کام ہو گا۔"

لارڈ ویول: "آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ اس کا نقطۂ نگاہ غیر جانبدارانہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس مرحلے پر پنڈت نہرو نے دخل دیا۔

پنڈت جی: "حضور والا۔ آپ کانگریس پارٹی کی پوزیشن غلط سمجھ رہے ہیں اور یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ کانگریس ہندوؤں کی حامی یا مسلمانوں کی مخالف جماعت نہیں ہے۔ یہ جماعت سب کی ہے۔ یہ جماعت مسلمانوں کے مفاد کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔"

لارڈ ویول: "پنڈت جی۔ یہ کون سے مسلمانوں کی جماعت ہے؟ کانگریسی مسلمانوں کی؟ جنہیں کانگریس کے خیمہ بردار مسلمان کہا جاتا ہے؟ کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اس وقت مسلم لیگ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ آپ اسے شکست دینے کے درپے نہیں۔ شاید لیگ اور کانگریس کو

اکٹھا کرنے کا موقعہ پھر نہ آ سکے۔ میں صرف ایک ضمانت چاہتا ہوں۔ ایک اعلان کی صورت میں جو مسلم لیگ کو مطمئن کر سکے اور ایک پائندار اور متحدہ حکومت کے قیام کا راستہ صاف کر سکے۔ میرے ذہن میں اس قسم کا اعلان ہے۔"

یہ کہہ کر وائسرائے نے اپنے دراز سے مسودہ نکالا اور گاندھی جی کو دے دیا۔ انہوں نے پڑھ کر کاغذ پنڈت جی کو پکڑا دیا اور خود بولے۔

گاندھی جی: "اس کے معنی تو یہ ہیں کہ کانگریس اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لے۔"

لارڈ ویول: "جہاں تک کابینہ مشن پلان کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ صاحبان کو یہ اعلان کر دینا چاہیئے جب کانگریس نے اسے منظور کیا تو وہ اس کے منشاء سے بے خبر نہ تھی۔ پھر آپ نے اسے منظور کیوں کیا؟ اس میں ملک کو گروپوں میں تقسیم کرنے کی تجویز صریحاً شامل ہے۔ اب آپ صاحبان پلٹ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کو معلوم ہی نہ تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔"

گاندھی جی: "مشن کا اپنا عندیہ اور ہماری اپنی تشریح ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہیں۔"

لارڈ ویول: "یہ محض وکیلانہ موشگافی ہے۔ مجھ سے سیدھی سادی زبان میں گفتگو کریں۔ میں سیدھا سادا سپاہی ہوں۔ آپ مجھے قانونی حجت بازی میں الجھانا چاہتے ہیں۔"

پنڈت نہرو: "اس بات کا کیا علاج کہ ہم وکیل بھی ہیں۔"

لارڈ ویول: "نہیں۔ لیکن آپ ایماندار انسانوں کی طرح اور ہندوستان کے مستقبل اور بہبود کا خیال رکھتے ہوئے۔ صاف اور سیدھی بات تو کر سکتے ہیں۔ کابینہ مشن اپنے عندیہ کو روز روشن کی طرح عیاں کر چکا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے عدالتی مقدمہ بازی اور قانونی موشگافی قطعاً ضروری نہیں ہے۔ ایک سیدھے آدمی کی طرح مجھے حالات صاف نظر آتے ہیں۔ اگر کانگریس مجھے وہ ضمانت دے سکے جو میں چاہتا ہوں تو میں مسٹر جناح اور مسلم لیگ کو اس بات پر آمادہ کر سکتا ہوں کہ وہ عبوری حکومت کے بائیکاٹ کے متعلق اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ انہیں عبوری حکومت میں لایا جائے۔ ہندوستان کو اس بات کی ضرورت ہے اور اگر آپ کو خانہ جنگی کے اس خطرے کا احساس ہو جو موجود ہے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ کو بھی اس بات کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں صرف کانگریس کو حکومت بنانے کی اجازت دوں تو یہ دانشمندی

کے خلاف بلکہ خطرناک ہوگا۔"

گاندھی جی: "لیکن آپ پہلے ہی حکومت کا اعلان کر چکے ہیں۔ آپ اب اپنے وعدے سے منحرف نہیں ہو سکتے۔"

لارڈ ویول: "حالات بدل گئے ہیں۔ کلکتہ کے فسادات کے بعد ہندوستان خانہ جنگی کے دروازے تک جا پہنچا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اس خطرے کو روکوں۔ یہ خطرہ اس طرح نہیں رک سکتا کہ میں کانگریس کو ایسی حکومت قائم کرنے دوں جس میں مسلم لیگ شامل نہ ہو۔ اس کا نتیجہ مسلم لیگ کا ڈائرکٹ ایکشن اور بنگال کے فسادات کا اعادہ ہوگا۔"

پنڈت نہرو: "دوسرے الفاظ میں آپ مسلم لیگ کی بلیک میل کے سامنے ہار ماننے کو تیار ہیں۔"

لارڈ ویول: "بھلے آدمی۔ آپ بلیک میل کا ذکر کس منہ سے کرتے ہیں۔"

یہ گفتگو ختم ہوئی۔ گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال رخصت ہوگئے اور انھوں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس وائسرائے کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ دونوں نے الگ الگ لندن تار اور خطوط بھیجنے شروع کئے۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی میں پنڈت جواہر لال کے کئی دوست تھے جو مسٹر اٹیلی کے ساتھ بھی قریبی تعلق رکھتے تھے۔ پنڈت جی نے انھیں تاروں اور خطوں کا تانتا باندھ دیا۔ اٹیلی صاحب صرف ایک بات سمجھتے تھے۔ کانگریس کو ناراض نہ کرو۔ چنانچہ وزیر ہند نے وائسرائے کو لکھا کہ اب نئے ایگزیکٹو کونسلروں کے ناموں کا اعلان بھی ہو چکا ہے۔ اس اعلان کی تعمیل کو غیر معینہ عرصہ کے لئے ملتوی رکھنا مناسب نہ ہوگا۔ مسلم لیگ کو راضی کرنے اور عبوری حکومت میں شامل کرنے کی کوشش ضرور جاری رہنی چاہیئے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ کانگریس بھی ہاتھ سے نکل جائے۔

لارڈ ویول نے طوعاً وکرھاً ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو نئے کونسلروں سے عہدے کا حلف اٹھوا لیا۔ اس سے ایک دن پہلے نئی حکومت کے ایک مسلمان ممبر ڈاکٹر شفاعت احمد خان پر شملہ میں ایک قاتلانہ حملہ ہو گیا لیکن حملہ مہلک ثابت نہ ہوا۔ نئی حکومت کے حلف اٹھانے کے اعلان پر دو ایک جگہ فرقہ وارانہ فساد بھی ہوئے۔ ۷ ستمبر کو پنڈت جواہر لال نہرو نے عبوری حکومت کے لیڈر کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو پر تقریر کی۔ آپ نے فرمایا: "عبوری حکومت تو معرض وجود میں آگئی ہے۔ لیکن یہ حکومت پورے پلان کا ایک حصہ ہے۔ ابھی دستور ساز اسمبلی نے اپنا کام شروع نہیں کیا۔ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم اس

اسمبلی کو لڑائی کا اکھاڑہ بنائیں۔ وہاں متفقہ فیصلوں کی کوشش کی جائے گی۔ اور جو لوگ ابھی ہمارے نقطۂ نگاہ کے ساتھ متفق نہیں ہوئے۔ میں انہیں تعاون کی دعوت دیتا ہوں۔

لارڈ ویول نے دوبارہ وزیر ہند کے ساتھ بحث شروع کر رکھی تھی۔ کہ آخر یہ دھاندلی کہاں تک چلائی جائے گی۔ عبوری حکومت ایک پارٹی کے حوالے کر دی گئی ہے۔ کیا اب مسلم لیگ کی شرکت کے بغیر دستور اسمبلی پر بھی ایک پارٹی کا مکمل قبضہ کرا دیا جائے اور کانگریس کو ہندوستان کا نیا آئین اپنی مرضی کے مطابق بنانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ یہ بات ہمارے تمام وعدوں کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ وزیر ہند مان گئے کہ مسٹر جناح سے دوبارہ بات چیت شروع کی جائے اور دستور ساز اسمبلی کا اجلاس فی الحال طلب نہ کیا جائے۔ لارڈ ویول نے ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو قائد اعظم کے ساتھ پہلی ملاقات کی۔ اس کے بعد اور کئی ملاقاتیں ہوئیں اور پنڈت نہرو کو بھی اس بات چیت کا انتظار کرنا پڑا۔

اس مرحلے پر قائد اعظم محسوس کر رہے تھے کہ عبوری حکومت کا مورچہ کانگریس کے ہاتھ میں چھوڑ دینا مسلم لیگ کی سیاسی مہم کے نقطۂ نگاہ سے نقصان دہ ہوگا۔ وہ اپنی ٹیم عبوری حکومت میں داخل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے راستے میں کئی مشکلات تھیں۔ پہلی مشکل تو یہی تھی کہ مسلم لیگ نے دستور ساز اسمبلی کے ساتھ عدم تعاون کا اعلان کر رکھا تھا۔ کابینہ مشن پلان کے تحت کوئی پارٹی عبوری حکومت میں شرکت کی مستحق اس وقت تک نہ ٹھہرتی تھی جب تک وہ دستور ساز اسمبلی پروپوزل منظور نہ کرے۔ ایک اور بہت بڑی مشکل قائد اعظم کے اس اصول کی وجہ سے تھی کہ مسلم لیگیوں کے علاوہ کسی غیر مسلم لیگی مسلمان کو عبوری حکومت میں نہ لیا جائے۔ پنڈت نہرو اس بارے میں مسلم لیگی لیڈروں کی مشکل کو دور کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ اور ہر قیمت پر کانگریسی نمائندوں میں ایک مسلمان کو شامل کرنے پر اصرار کرتے تھے۔ تیسری رکاوٹ پنڈت جی ایک اور پیدا کر رہے تھے۔ وہ وائسرائے سے اصرار کر رہے تھے کہ مسلم لیگ سے یہ وعدہ لئے بغیر کہ وہ کانگریس کے ساتھ مل کر ایک ٹیم کی طرح کام کرے گی۔ اسے عبوری حکومت میں شامل نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کے قول کے مطابق اس طرح عبوری حکومت کوئی تعمیری کام کرنے کے بجائے جنگ کا اکھاڑہ بن جائے گی۔

قائد اعظم کے اس اصرار کی وجہ سے کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق رکھتی ہے۔ جو مشکل پیدا ہوتی تھی۔ وہ عجیب طرح رفع ہوئی۔ نواب بھوپال نے اس مرحلے پر اس مسئلے میں

دلچسپی لی اور گاندھی جی سے ساتھ گفتگو شروع کی۔ اور بالآخر انہیں ایک ایسا فارمولا ماننے پر راضی کر لیا جس سے قائداعظم کا اعتراض رفع ہو گیا۔ فارمولا یہ تھا۔ کانگریس اس بات کو چیلنج نہیں بلکہ قبول کرتی ہے کہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت کی مسلمہ نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہی ہے۔ لہذا جمہوری اصولوں کے مطابق مسلمانوں کی نمائندگی کا حق بلاشبہ اسے ہی حاصل ہے۔ لیکن کانگریس اس بات سے اتفاق نہیں رکھتی کہ کانگریس کے اس حق پر کوئی پابندی لگائی جائے کہ وہ اپنی نمائندگی کرنے کے لئے اپنے ممبروں میں سے جسے چاہے اپنا نمائندہ مقرر کر دے۔" یعنی مسلمانوں کی نمائندگی کا واحد حق مسلم لیگ کا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے حصے سے الگ اگر کانگریس اپنے کوٹے میں کسی مسلمان کو شامل کرے تو یہ اس کی مرضی۔ اس سے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ گاندھی جی نے اس پر دستخط کر دیئے۔ مسٹر جناح بھی اس پر راضی ہو گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جب یہ فارمولا دیکھا تو وہ بہت پیچ پا ہوئے اور کہنے لگے کہ گاندھی جی نے کسی غلط فہمی کی بنا پر اس فارمولے پر دستخط کئے ہیں۔ پھر یہ کہا کہ فارمولا کے اصل الفاظ میں ردوبدل کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا ایک پیرا حذف کر دیا گیا ہے۔ لیکن مہاتما جی کے اپنے اصول تھے۔ وہ غلط بیانی پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہوں نے پبلک طور پر اس فارمولے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اور مسلم لیگ کے راستے سے ایک بڑی رکاوٹ دور ہو گئی۔

جہاں تک اس مشکل کا تعلق تھا جو مسلم لیگ کی جانب سے آئین سازی کی پلان کے بائیکاٹ سے پیدا ہو رہی تھی۔ لارڈ ویول نے قائداعظم کو ایک چٹھی میں یہ لکھ دیا کہ مجھے امید ہے کہ آپ مستقبل قریب میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کر کے پلان کی نامنظوری کے فیصلے پر نظرثانی کرنے کا بندوبست کریں گے۔ قائداعظم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور وائسرائے نے ان کی خاموشی کو نیم رضا تصور کر لیا۔ جہاں تک کابینہ میں ایک ٹیم کی طرح کام کرنے کا تعلق تھا۔ پنڈت نہرو کے اصرار پر وائسرائے نے انہیں گول مول الفاظ میں کہہ دیا کہ کولیشن حکومت دونوں پارٹیوں کے تعاون ہی سے چل سکتی ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ عبوری حکومت ایک مضبوط کولیشن کی طرح کام کرے گی۔ ان حالات میں قائداعظم نے وائسرائے کو اطلاع دے دی کہ وہ وائسرائے کی دعوت کے مطابق عبوری حکومت کے لئے مسلم لیگ کے پانچ نمائندے نامزد کرنے کو تیار ہیں۔

قائداعظم نے پانچ افراد کی جو ٹیم منتخب کی۔ وہ اکثر لوگوں کی توقعات کے خلاف تھی۔ اس ٹیم میں خواجہ ناظم الدین اور نواب محمد اسماعیل خاں کی شمولیت تقریباً یقینی خیال کی جاتی تھی۔ لیکن قائداعظمؒ نے اپنا انتخاب کرتے وقت ان دونوں ناموں کو حذف کر دیا اور بنگال کے کسی اور نمائندے کو لینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ قائداعظمؒ نے جو پانچ نام ۱۴؍اکتوبر کو وائسرائے کے سامنے پیش کئے۔ وہ حسب ذیل تھے۔ مسٹر لیاقت علی خاں مسٹر چندریگر۔ سردار عبدالرب نشتر۔ راجہ غضنفر علی خاں اور ایک اچھوت مسٹر جوگندر ناتھ منڈل۔ ۱۵؍اکتوبر کو وائسرائے نے ان کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ ایگزیکٹو کونسل کے تین سابق ممبران نے پہلے جگہ خالی کرنے کی خاطر مستعفی ہو گئے۔ دو نشستیں پہلے ہی خالی تھیں۔ اس طرح نئی ایگزیکٹو کونسل کی مقررہ تعداد (چودہ) پوری ہو گئی۔ جب یہ اعلان ہوا تو راجہ غضنفر علی اپنے وطن پنڈ دادن خاں میں تھے۔ اور دہلی میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس سے بالکل بے خبر تھے۔ راجہ صاحب نے اپنے تقرر کی خبر سب سے پہلے ریڈیو پر سنی۔ اگلے دن انہیں وائسرائے کا سرکاری خط بھی مل گیا۔ اور انہوں نے دہلی کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔

پنڈت نہرو کو اب یہ غلط فہمی نہ ہو سکتی تھی کہ مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ تعاون یا خود ان کے زیر قیادت کام کرنے کے لئے عبوری حکومت میں شامل ہوئی ہے۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی وہ قرارداد بھی اس مرحلے پر شائع کر دی گئی جس میں صدر کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ عبوری حکومت میں شرکت کرنے کے لئے مسلم لیگ کے نمائندوں کو نامزد کر دیں۔ قرارداد کے الفاظ کا صاف مطلب یہ تھا کہ عبوری حکومت میں شرکت کا فیصلہ اس بناء پر کیا گیا ہے کہ مسلم لیگ کی رائے میں مرکزی حکومت کا میدان کانگریس کے لئے خالی چھوڑ دینا مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے درست نہ تھا۔

عبوری حکومت کے مسلم لیگی ممبروں نے ۲۶؍اکتوبر ۱۹۴۶ء کو عہدے کے حلف اٹھائے۔ اس سے پہلے محکموں کی تقسیم پر بحث ہو چکی تھی۔ وائسرائے نے قائداعظم سے کہا تھا کہ اگر انہوں نے خود کابینہ میں شامل ہونا منظور کیا تو وہ دفاع کا محکمہ انہیں سپرد کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ خود حکومت میں شامل نہ ہوئے تو اس صورت میں یہ محکمہ سکھ وزیر کو دیا جائے گا۔ قائداعظم نے اس بات کا ذکر اپنی مجلس عاملہ کے اجلاس میں کیا۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ ابھی وائسرائے اور حکومت برطانیہ کے

ساتھ کئی سیاسی معرکے باقی ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے عہدے کی ذمہ داری قبول کرنا درست نہ ہوگا۔ مجلس عاملہ کے ممبر بھی اس خیال سے اتفاق کرتے تھے۔

کانگریسی وزیر جن محکموں کو اپنی دانست میں اہم سمجھتے تھے۔ انہیں چھوڑنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ امور خارجہ کا محکمہ پنڈت نہرو کی خاص کمزوری تھا۔ وہ اُسے نہ چھوڑتے تھے۔ امور داخلہ (ہوم) اور اطلاعات کے محکمے سردار پٹیل کے پاس تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اصل سیاسی اہمیت کے محکمے یہی ہیں۔ انہوں نے ان محکموں پر اپنا حق شفع قائم کر رکھا تھا۔ لارڈ ویول بڑی مشکل سے مسلم لیگ کو "بچے کھچے" محکمے دے سکے۔ سردار عبدالرب نشتر کو ڈاک اور تار کا محکمہ سپرد کیا گیا۔ راجہ غضنفر علی کو صحت عامہ۔ اور مسٹر جوگندر ناتھ منڈل کو قانون کا محکمہ ملا۔ مسٹر چندریگر کے حصے میں کامرس (تجارت) کا محکمہ آیا۔ لیکن ان "بچے کھچے" محکموں میں ایک "محکمہ خزانہ" بھی تھا۔ چوہدری محمد علی اس زمانے میں محکمہ خزانہ کے سب سے سینئر مسلمان افسر تھے۔ انہوں نے نوابزادہ لیاقت علی خان اور قائدِاعظم کو مشورہ دیا کہ کانگریسی لیڈر اس محکمے کو محض حساب کتاب کا محکمہ سمجھ کر مسلم لیگ کے حصے میں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ کو اس سے انکار نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس محکمے کے ذریعے آپ ہر دوسرے محکمے میں دخیل ہو سکتے ہیں اور ہر محکمے کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ لیاقت علی خان "فنانس ممبر" مقرر ہو گئے۔

جلد ہی کانگریسی وزیروں کو یہ احساس ہونے لگا کہ انہوں نے "فنانس" کا محکمہ مسلم لیگ کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب کسی محکمے کو ایک چپراسی مقرر کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی تب بھی اسے محکمہ خزانہ کی منظوری حاصل کرنی پڑتی تھی۔ ہر محکمے کو اپنے ہر اقدام کے لئے جس میں خرچ کا کوئی سوال پیدا ہوتا تھا فنانس ڈیپارٹمنٹ کے سامنے جواز پیش کرنا پڑتا تھا۔

ایک طرف عبوری حکومت کے مورچے کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان یہ کشمکش ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ملک کے اندر فرقہ وارانہ فضا سخت مکدر ہو رہی تھی۔ اور خانہ جنگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ کلکتہ کے فساد کے ایک مہینے کے بعد یعنی ۱۵ اکتوبر کو مشرقی بنگال کے ضلع نواکھالی میں فساد ہو گیا۔ اس میں جان کا نقصان زیادہ نہ ہوا۔ لیکن وہاں سے کافی تعداد میں ہندوؤں کے بھاگنے کی وجہ سے ہندو اخباروں کو اس کے متعلق بے حد مبالغہ آرائی کا

موقعہ مل گیا جس سے ہندوؤں کے فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھے۔ اس کے بعد نواکھالی کے انتقام کے طور پر بہار میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر ایک بہت منظم اور وسیع پیمانے پر حملہ کیا اور ۲۴ گھنٹے کے اندر ہزاروں کو قتل کر دیا۔ بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ حملہ ایسی منظم تیاریوں کے بعد کیا گیا تھا۔ کہ کئی جگہ حملہ آوروں کے پاس ان سینکڑوں خاندانوں کے افراد کی مکمل فہرستیں موجود تھیں۔ جنہیں قتل کرنا مقصود تھا۔ حملہ آور لاشوں کو گننے کے بعد تعداد کا مقابلہ اپنی فہرستوں سے کرتے تھے۔ اور یہ اطمینان کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ فہرست میں درج کوئی فرد بچ کر کہیں چھپ تو نہیں گیا یا بھاگ تو نہیں سکا۔

اس فساد اور خون ریزی پر مہاتما گاندھی کے جذبات عالیہ حرکت میں آئے اور وہ دہلی کی سیاسی شطرنج سے منہ موڑ کر فساد زدہ علاقوں کے دورے پر چلے گئے۔ تین مہینے تک وہ نواکھالی اور ٹپرا کے اضلاع میں پھرتے رہے۔ پھر وہ بہار میں تشریف لے گئے اور مارچ کے آخر میں نئے وائسرائے لارڈ ماونٹ بیٹن کی دعوت پر واپس آئے۔

۳۹۔ بس میں بلا ٹکٹ مسافر کون تھا......؟

عبوری حکومت کے اندر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کشمکش تو بہت سے مسائل کے متعلق ہوئی۔ لیکن کشمکش کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ کانگریس کی وزارتی ٹیم نے وائسرائے پر زور دینا شروع کیا۔ کہ مسلم لیگ عبوری حکومت کی بس پر بلا ٹکٹ سفر کر رہی ہے۔ یعنی اس نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت کو قبول نہیں کیا۔ اسے دستور سازی کی پلان میں حصہ لینے پر راضی کرو یا بس سے اتار دو۔ قائد اعظمؒ کے پاس اس مطالبے کا محکم جواب موجود تھا۔ وہ پوچھتے تھے کہ خود کانگریس کون سے ٹکٹ کے بل پر عبوری حکومت کی بس میں سوار ہے؟ کیا وہ دستور ساز اسمبلی کے اندر اس ضابطے کے مطابق کام کرنا منظور کرتی ہے۔ جو کابینہ مشن پلان کے مصنفوں نے مقرر کیا ہے؟ جب تک کانگریس اس ضابطے کی منظوری کا غیر مبہم اعلان نہیں کرتی مسلم لیگ کے لیے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے بھی آگے قائد اعظمؒ کا جوابی مطالبہ یہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کے لیے جو تاریخ (۹ دسمبر ۱۹۴۶ء) وائسرائے کے ایک اعلان میں مقرر کر دی گئی تھی۔ اسے ملتوی کیا جائے اور جب تک کانگریس دستور سازی کی پلان کو اس کے مصنفوں کے منشا کے مطابق منظور کرنے کا اعلان نہیں کرتی۔ اسمبلی کا اجلاس طلب نہ کیا جائے۔

لارڈ ویول اور حکومت برطانیہ دونوں پارٹیوں کے ساتھ جزوی طور پر اتفاق کرتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ کابینہ مشن پلان کا منشاء وہی ہے جو اس کے مصنف بیان کرتے ہیں اور اس تشریح کے مطابق پلان میں جو ضابطۂ کار مقرر کیا گیا ہے۔ دستور ساز اسمبلی کو اس کے تحت کام کرنا چاہیئے۔ لیکن ہم اس

اسمبلی سے اس ضابطے کے مطابق کام کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ کیونکہ اس پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس ضابطے اور پلان کے اصولوں سے انحراف کر کے کوئی آئین بنایا جائے تو اسے پارلیمنٹ کے سامنے منظوری کے لئے پیش نہ کریں۔ قائداعظم پوچھتے تھے کہ اگر یہ بات ہے تو کانگریس کے علانیہ رویہ کے پیش نظر اس آئین کی تیاری میں حصہ لینے اور وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ جو بالآخر منظور ہی نہیں کیا جائے گا۔ اس کا جواب وائسرائے کے پاس کچھ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ اور امید کرنی چاہیئے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا۔

چنانچہ نومبر کے تیسرے ہفتے میں دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کو ۹ر دسمبر کے لئے دعوت نامے جاری کر دیئے گئے۔ قائداعظمؒ نے فوراً ایک اخباری بیان کے ذریعے مسلم لیگی ممبروں کو ہدایت کر دی کہ وہ اس اجلاس میں شرکت نہ کریں۔ اس بیان میں قائداعظمؒ نے یہ بھی کہا کہ وائسرائے نے بہت غلط قدم اٹھایا ہے۔ وہ ہر قیمت پر کانگریس کو راضی کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ خواہ اس طرح مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کے ساتھ بے انصافی کرنی پڑے۔

پنڈت نہرو وائسرائے کے سر پہ سوار ہو گئے "اب مسلم لیگ عبوری حکومت میں حصہ دار کیسے رہ سکتی ہے، مسلم لیگی وزیروں کو برخاست کر دو۔" لارڈ ویول نے مسٹر لیاقت علی خاں سے بات چیت کی۔ انہوں نے صاف گوئی کے ساتھ کہا کہ جب آپ چاہیں مسلم لیگی وزیر اپنے استعفے پیش کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب تک آپ ہمیں یقین نہ دلائیں کہ آپ کابینہ مشن پلان کے مقتدرہ کردہ ضابطوں اور اصولوں کی پابندی کرائیں گے۔ اس وقت تک ہم دستور ساز اسمبلی میں بیٹھنے کو تیار نہیں۔ اگر آپ کانگریس کی خفگی سے ڈر کر ہندوستان کے مسلمانوں پر کانگریس کا راج مسلط کرنے پر تل گئے ہیں تو بسم اللہ۔ مسلمان اپنے مستقبل کی خاطر جو کچھ خود کر سکیں گے، کریں گے۔

وائسرائے نے دیکھا کہ حالات اس خطرناک دوراہے پر پہونچ گئے ہیں۔ جس کی طرف سے حکومت برطانیہ اب تک آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اب کوئی فیصلہ کن قدم اٹھائے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے استفسار پر وزیر ہند نے جواب دیا کہ دونوں پارٹیوں کے نمائندوں کو لندن بھیجو۔ تاکہ ان کے درمیان کسی سمجھوتے کی ایک اور کوشش کی جائے۔ جب وائسرائے نے پنڈت نہرو کو دعوت دی تو وہ بدک گئے۔ ان کا تاثر یہ ہوا کہ اب پھر تمام معاملے پر از سر نو غور ہونے والا ہے اور جو سینہ زوری وہ کر رہے تھے، ممکن ہے لندن کے وزیروں کا فیصلہ اس کے خلاف ہو۔ انہوں نے لندن جانے سے انکار کر دیا۔ پھر وزیر اعظم ایٹلی نے ان سے ذاتی اپیل کی کہ وہ لندن آنے سے انکار نہ کریں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے اس دعوت کی اطلاع قائداعظمؒ کو دی جو کراچی میں تھے اور ایٹلی صاحب کی ذاتی اپیل کا ذکر بھی کیا۔ اس سے قائداعظمؒ کو گمان ہوا کہ ایٹلی، نہرو ملی بھگت کوئی نیک آثار ظاہر نہیں کرتی۔ وہ دعوت منظور کرنے سے انکاری ہوئے تو وزیر اعظم ایٹلی نے ان سے بھی ذاتی اپیل کی اور انہیں اس ذاتی پیغام کی نقل بھی بھیج دی جو پنڈت نہرو کو بھیجا گیا تھا۔ اس پر انہوں نے بھی دعوت مان لی۔

حکومت برطانیہ نے کانگریس اور مسلم لیگ کے دو دو نمائندوں اور ایک سکھ نمائندہ سردار بلدیو سنگھ کو لندن بلایا تھا۔ وائسرائے نے کانگریس کی نمائندگی کے لیئے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو دعوت دی۔ لیکن سردار پٹیل "کالا پانی" عبور کرنے پر رضامند نہ ہوئے۔ مسلم لیگ کی نمائندگی کے لیئے قائداعظمؒ اور لیاقت علیخاں کو دعوت دی گئی تھی۔ یہ دونوں پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ ۲ دسمبر کو لندن کے لیئے ہوائی جہاز پر سوار ہو گئے

لندن میں دونوں فریقوں کے ساتھ گفتگو کے بعد برطانوی حکومت نے ۶ دسمبر کو اپنے فیصلے کا سرکاری اعلان کر دیا۔ اس کے اہم نکات تین تھے۔

(۱) کابینہ مشن پلان کے جس نکتے کی تشریح کے متعلق اختلاف پیدا ہوا ہے۔ اس کی وہی تشریح درست ہے۔ جو کابینہ مشن کے ارکان پہلے سے کرتے رہے ہیں مسلم لیگ اسے مانتی ہے۔ لیکن کانگریس اس کی مختلف تشریح کرتی ہے۔ دستور ساز اسمبلی کو چاہیئے کہ کابینہ مشن نے جو تشریح کی ہے۔ اس کی پابندی قبول کر کے اپنا کام کرے تاکہ ایسا آئین بنایا جا سکے۔ جسے حکومت برطانیہ پارلیمنٹ کے سامنے منظوری کے لیئے پیش کر سکے۔

(۲) اگر اس کے بعد ضابطے کے کسی اور نکتے کے متعلق اختلاف پیدا ہو تو دونوں پارٹیوں کو چاہیئے۔ کہ اس قسم کے اختلاف کو فیڈرل کورٹ کے ذریعے رفع کرنے کا اصول منظور کر لیں۔

(۳) آئین بہرحال ہندوستان کی بڑی پارٹیوں کے اتفاق ہی سے بن سکتا ہے حکومت برطانیہ کسی ایسی دستور ساز اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کو جس میں ملک کے کسی بڑے طبقے کے نمائندے موجود ہی نہ ہوں۔ پارلیمنٹ سے پاس کرانے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔

یہ فیصلہ پنڈت نہرو کی توقعات کے بالکل خلاف تھا۔ اس کا اعلان کرنے سے پہلے یہ فیصلہ ہندوستان کے نمائندوں کو دکھایا گیا تھا۔ پنڈت جی نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ حکومت برطانیہ نے اپنا موقف بدل لیا ہے۔ اور کابینہ مشن پلان میں اضافے اور ترمیم کر دی ہے۔ لیکن انہوں نے آخری فیصلہ کانگریس کی مجلس عاملہ پر چھوڑ دیا۔ انہیں دستور ساز اسمبلی میں جس کے اجلاس کے لیئے ۹ دسمبر کی تاریخ مقرر تھی۔ شرکت کے لیئے واپس آنے کی جلدی تھی۔ وہ اور سردار بلدیو سنگھ فوراً ہی واپس چلے آئے۔ قائد اعظم اور مسٹر لیاقت علی خاں چند دن اور انگلستان میں ٹھہرے۔

۹ دسمبر کو دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کے نمائندے اس میں شریک نہ ہوئے۔ اسمبلی نے بابو راجندر پرشاد کو اپنا صدر منتخب کر لیا اور پنڈت نہرو نے آئین سازی کی آئندہ کارروائی کو خاص خطوط کے اندر محدود کرنے کی غرض

سے ایک قرارداد مقاصد پیش کر دی۔ اس پر تھوڑی سی بحث کے بعد ڈاکٹر جیکار نے یہ تحریک پیش کی کہ اس قرارداد پر مزید بحث ملتوی رکھی جائے اور اسمبلی کا اجلاس بھی فی الحال ملتوی کر دیا جائے تاکہ حکومت برطانیہ کے تازہ اعلان کی روشنی میں مختلف پارٹیاں اپنا رویہ متعین کر سکیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ اجلاس میں مسلم لیگ بھی شریک ہو جائے۔ چنانچہ اسمبلی کا اجلاس ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

حکومت برطانیہ کے تازہ اعلان پر غور کرنے کے لئے کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۲۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوا۔ اس نے ایک طویل قرارداد منظور کی جس کا مطلب یہ تھا کہ برطانوی حکومت خود کابینہ مشن پلان سے منحرف ہو گئی ہے۔ اور اس نے اپنا موقف بدل لیا ہے۔ لیکن کانگریس اسی پلان پر قائم ہے۔ اور اسے اپنی تشریح کے مطابق قبول کرتی ہے۔ مجلس عاملہ نے یہ سفارش بھی کی کہ نئی صورت حال پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس طلب کیا جائے۔ یہ اجلاس ۵ جنوری ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ہوا۔ اس نے ایک بہت ہی مبہم قرارداد پاس کی۔ جس میں برطانوی حکومت کے اعلان کے مطابق کام کرنے پر آمادگی بھی ظاہر کی گئی تھی۔ لیکن ہر صوبے بلکہ صوبوں کے حصوں کے اس حق پر بھی اصرار کیا گیا کہ اگر گروپوں میں ان کی مرضی کے مطابق کام ہو تو وہاں بیٹھیں۔ اگر چاہیں تو کوئی اور راستہ اختیار کر لیں۔ یعنی پرنالہ وہیں رہا۔

۵ جنوری ۱۹۴۷ء کو یہ قرارداد پاس کرنے کے بعد پنڈت نہرو مسلم لیگ کے ردعمل کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں امید تھی کہ ۲۰ جنوری کو جب دستور ساز اسمبلی کا ملتوی شدہ اجلاس پھر منعقد ہو گا۔ تو کوئی نہ کوئی دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ قائداعظمؒ نے اپنا جواب مرتب کرنے کے لئے اپنی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا۔ لیکن اس کی تاریخ ۲۹ جنوری مقرر کر دی یعنی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ سے نو دن بعد پھر جب ۲۹ جنوری کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو اس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ کانگریس کی قرارداد نے برطانوی حکومت کے مقرر کردہ ضابطے کی جانب ادھورا قدم بڑھایا ہے اور ساتھ ہی اس سے انحراف کا راستہ بھی کھول لیا ہے۔ لہٰذا

مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی کے متعلق اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں۔

۱۷ر جنوری کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ مسلم لیگی ممبروں کی کرسیاں پھر خالی تھیں۔ مسلم لیگ کا جواب سننے کے بعد پنڈت جواہر لال نے اپنے ساتھی کانگریسی وزیروں اور عبوری کابینہ کے دوسرے غیر مسلم لیگی ممبروں سے ایک چٹھی پر دستخط کرائے اور ۱۵ر فروری کو وائسرائے پر پھر حملہ کیا۔ ان کا مطالبہ وہی تھا کہ اب مسلم لیگی وزیروں کو مجبور کرو۔ کہ وہ دستور ساز اسمبلی کے متعلق اپنا فیصلہ بدلیں یا انہیں عبوری حکومت سے نکالو۔ لارڈ ویول نے مسٹر لیاقت علی خاں سے اس مطالبے کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس نے حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ ضابطے کی پابندی کو قبول کر لیا ہے تو ہم بے شک اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن پھر یہ آپ کی ذمہ داری ہو گی کہ اگر کانگریس اس ضابطے سے انحراف کرنے کی کوشش کرے تو اسے منحرف نہ ہونے دیں۔

مسٹر لیاقت علی نے کانگریس کے حملے پر ایک دہلا بھی مار دیا۔ آپ نے وائسرائے سے کہا کہ اگر آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس نے فی الحقیقت پلان کے مقرر کردہ ضابطے کی پابندی قبول نہیں کی۔ تو نہ صرف مسلم لیگ اس کا بائیکاٹ کرنے میں حق بجانب ہے۔ بلکہ وزیر خزانہ کے طور پر میرا فرض یہ ہے کہ اس دستور ساز اسمبلی کے بے سود منصوبے کے لئے بجٹ میں کوئی رقم ہی مہیا نہ کروں۔

وائسرائے کے ذریعے حکومت برطانیہ ہر روز کے واقعات سے باخبر رہتی تھی اب ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ کہ کس فریق کو کابینہ سے نکالے اور رکھے۔ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان اتفاق اور ہم آہنگی کا کوئی راستہ نکلتا ہی نہ تھا۔ لہٰذا برطانوی کابینہ نے ایک نہایت ڈرامائی فیصلہ کیا اور ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو اس کا اعلان کر دیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ کابینہ میں کون سا فریق رہے اور کون سا فریق نہ رہے۔۔ اس کے متعلق ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم خود جون ۱۹۴۸ء تک یعنی زیادہ سے زیادہ اٹھارہ ماہ کے اندر ہندوستان سے اپنا بوریا بستر لپیٹ

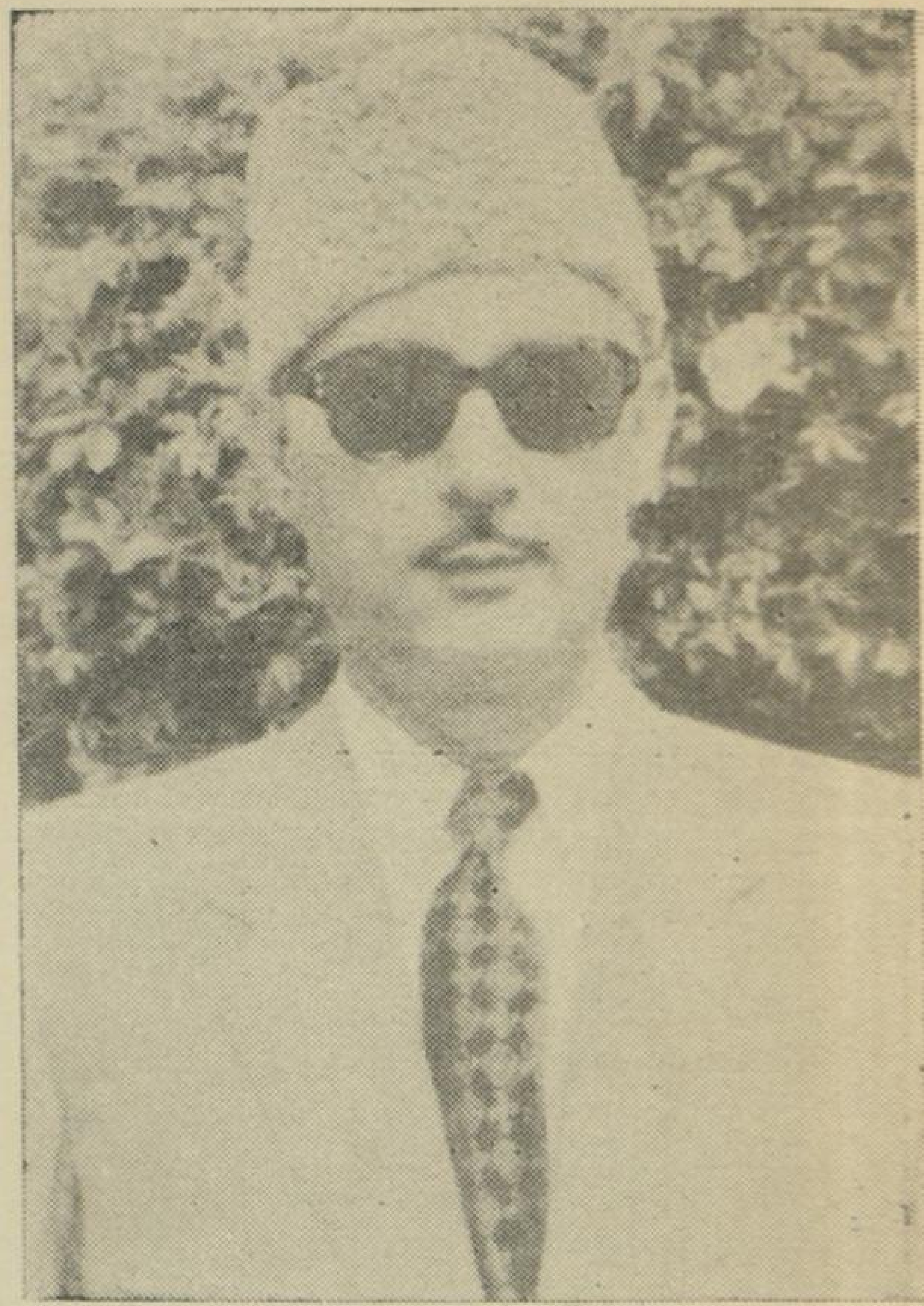
کر چلے جائیں گے۔ ہم اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہاں سے رخصت ہوتے وقت حکومت کسی ایسے ادارے کے سپرد کر سکیں جو کابینہ مشن پلان کے مطابق باہمی سمجھوتے سے قائم کیا گیا ہو۔ لیکن اگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو ہمیں سوچنا پڑے گا۔ کہ ہم حکومت کس کے سپرد کریں۔ پورے برطانوی ہند کی ذمہ داری کسی ایک ادارے کو دیں یا مختلف علاقوں کی حکومت مختلف اداروں کو مثلاً صوبائی حکومتوں کو سونپ دیں۔ یا کوئی اور مناسب طریقہ اختیار کریں۔

اسی اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ حکومت برطانیہ نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا آئندہ وائسرائے بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ وہ وہاں برطانوی اقتدار کی بساط کو وقت کے اندر لپیٹ دیں۔

برطانوی پارلیمنٹ میں اس اعلان پر بحث کے سلسلے میں سر سٹیفورڈ کرپس نے وضاحت کے طور پر کہا کہ اس بات کا فیصلہ ہمیں موقعہ پر کرنا پڑے گا۔ کہ حکومت کی ذمہ داری کسے سپرد کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ذمہ داری صوبائی حکومتوں کے سپرد کرنی پڑے کیونکہ صوبوں میں منتخب شدہ وزارتیں کام کر رہی ہیں یا صوبوں کے مختلف گروپوں (یعنی عملاً پاکستان اور ہندوستان) کو سپرد کرنی پڑے۔

۱۴۔ صوبائی محاذوں پر ہنگامے

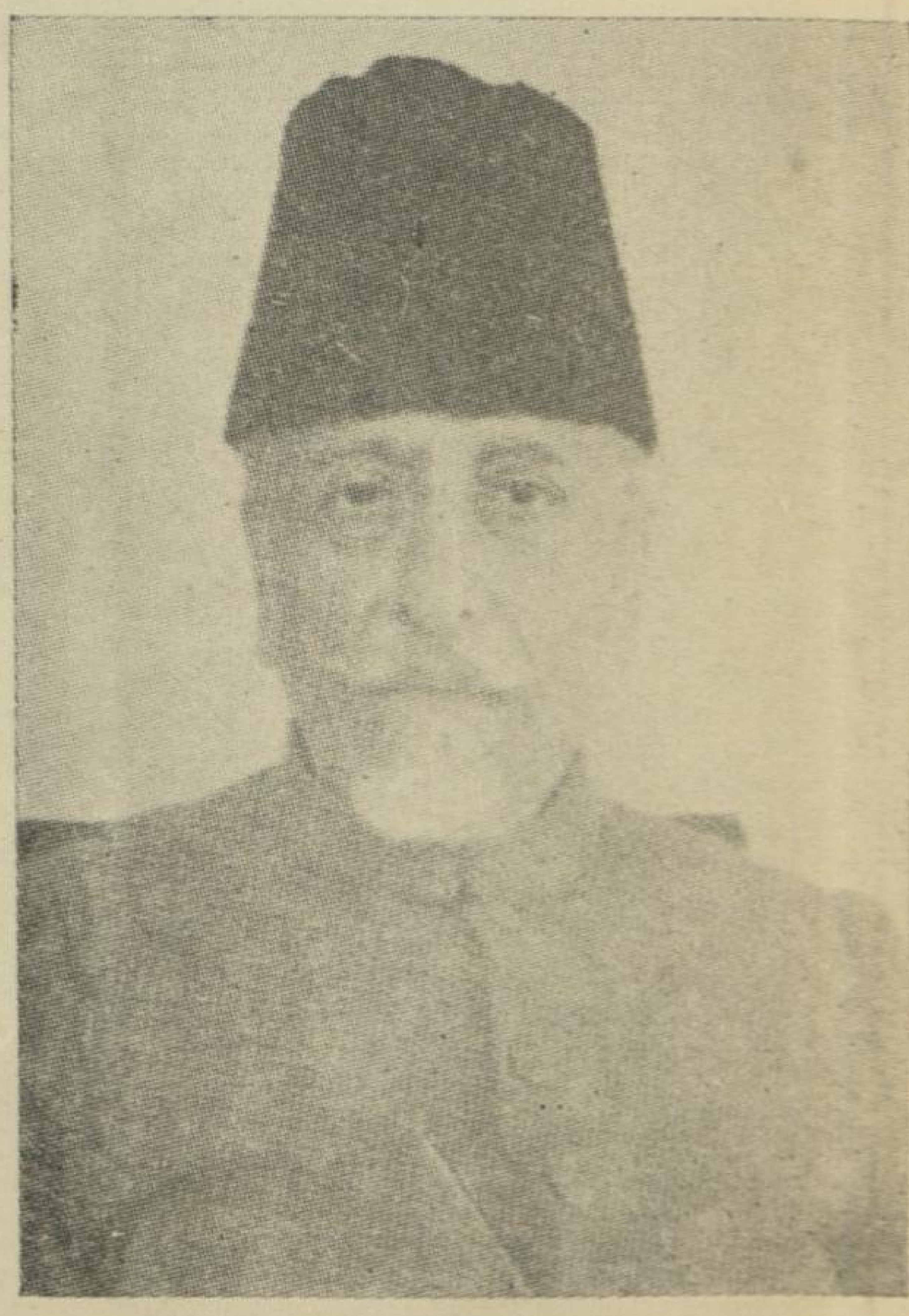
مرکز کی عبوری حکومت پاکستان کی جنگ کا سب سے اہم مورچہ بن گئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے آغاز میں مسلم لیگ کو چار صوبائی محاذوں پر بھی سیاسی جنگ لڑنی پڑی۔ ایک صوبے (سندھ) میں نئی انتخابی مہم کی صورت میں اور تین صوبوں (پنجاب۔ صوبۂ سرحد اور آسام) میں سول نافرمانی کی صورت میں سندھ کی انتخابی مہم کا (جو دسمبر ۱۹۴۶ء ہی میں شروع ہو گئی تھی) پس منظر بہت دلچسپ تھا۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں جب تمام صوبوں میں عام انتخابات ہوئے تھے تو مسلم لیگ نے دوسرے صوبوں کی طرح (صوبۂ سرحد کے سوا) سندھ میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن یہ کامیابی لامحالہ مسلم حلقہ ہائے انتخاب تک محدود تھی۔ سندھ کی صوبائی اسمبلی میں نشستوں کی کل تعداد ساٹھ تھی۔ جن میں صرف چونتیس مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں۔ ان چونتیس نشستوں میں مسلم لیگ اٹھائیس پر قابض ہو گئی تھی۔ باقی چھ مسلمان ممبروں نے مسٹر جی۔ ایم سید کے زیر قیادت کانگریس پارٹی کے ساتھ سازباز شروع کی۔ لیکن گورنر فرانسس موڈی نے مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت سازی کی دعوت دی۔ انہوں نے چند آزاد ہندو ممبروں کو ساتھ ملا کر لیگی وزارت بنائی۔ لیکن وزارتی پارٹی اور حزب مخالف کے درمیان تعداد کا فرق صرف تین چار کا تھا۔ وزارتی پارٹی نے ایک مسلم لیگی کو اسمبلی کا صدر منتخب کرا دیا تو یہ فرق اور بھی کم رہ گیا۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں سیشن سے پہلے ایک آدھ ممبر نے گڑبڑ کی تو دونوں پارٹیوں کی تعداد برابر ہو گئی۔ مسلم لیگ نے صدر سے استعفا دلا کر اپنی طاقت میں ایک کا اضافہ کر لیا۔ اب کوئی پارٹی اپنے کسی ممبر کو صدر بنانے پر تیار نہ تھی۔ کیونکہ اس طرح اس کی ووٹ کی طاقت میں ایک کی کمی ہو جاتی تھی۔ گورنر موڈی نے ان حالات میں اسمبلی کو توڑ دیا اور نئے انتخابات کا حکم دے دیا۔



نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ



مسٹر محمد ممتاز دولتانہ



مولانا ابوالکلام آزاد



ملک خضر حیات خاں ٹوانہ



پنجاب میں مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک میں مسلم خواتین نے بھی پیشقدمی کی
صفحہ (۲۸۲)

جب ان انتخابات کا وقت آیا تو قائد اعظم نے ان کی نگرانی کا کام مسلم لیگی وزیر راجہ غضنفر علی خاں کو سپرد کیا۔ اور راجہ صاحب پنجاب سے مقرروں۔ نظمیں پڑھنے والوں اور انتخابی کارکنوں کا ایک دستہ لے کر سندھ کی صوبائی لیگ پارٹی کی کمک کو پہنچ گئے۔ اس دوبارہ عام انتخاب میں مسلم لیگ نے مسلم عوام کے ووٹ سے سو فیصد فتح حاصل کر لی۔ یعنی تمام مسلم نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ مسٹر جی۔ ایم۔ سید کے حلقے میں مقابلہ بہت سخت تھا۔ لیکن یہ حلقہ بھی لیگ نے جیت لیا۔ پارٹی کی لیڈری کے سلسلے میں سر غلام حسین ہدایت اللہ اور مسٹر ایوب کھوڑو کے درمیان کشمکش تھی۔ لیکن قائد اعظم کے ثالثی فیصلے کے مطابق مسٹر کھوڑو مقابلے سے ہٹ گئے اور سر غلام حسین کی کابینہ میں وزیر لے لئے گئے۔ اس کے بعد قیام پاکستان تک اس صوبے میں کوئی وزارتی بحران پیدا نہ ہوا۔

سندھ کی انتخابی مہم ختم ہوئی تو دو تین ہفتوں کے بعد پنجاب میں سول نافرمانی کی مہم شروع ہو گئی۔ ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو پولیس کی ایک جمعیت لاہور میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے دفتر کی تلاشی لینے کے لئے آ گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک انگریز پولیس افسر نے نظم و نسق کی جانی بوجھی پالیسی سے انحراف کر کے بطور خود صوبائی وزیر اعظم کے علم اور منظوری کے بغیر ہی اس تلاشی کا حکم دے دیا تھا۔ اس کا مقصد وزیر اعظم کے گلے میں ایک سیاسی مصیبت ڈالنا تھا یا مسلم لیگ کو نشانۂ انتقام بنانا تھا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ وزیر اعظم خضر حیات ٹوانہ اس وقت دہلی گئے ہوئے تھے۔ بہر صورت صوبائی مسلم لیگی لیڈر موقعہ پر پہنچے۔ میاں افتخار الدین نے آگے بڑھ کر پولیس کا راستہ روک لیا اور تلاشی کرانے سے انکار کیا۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا تو نواب ممدوٹ۔ میاں محمد ممتاز دولتانہ سردار شوکت حیات وغیرہ سات آٹھ اصحاب نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا اور سول نافرمانی کی مہم شروع ہو گئی۔ ملک خضر حیات ٹوانہ نے لاہور واپس پہنچ کر ۲۸ جنوری کو گرفتار شدگان کی رہائی کا حکم دے دیا اور ۲۸ جنوری کو مسلم لیگ نیشنل گارڈ پر پابندیوں کا سرکاری حکم بھی منسوخ کر دیا۔ لیکن اس دوران میں مسلم عوام جلوسوں کی شکل میں مظاہرے کرتے رہے تھے جو پنجاب سیفٹی ایکٹ کے تحت

عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کی تھی اور اس خلاف ورزی کی بنا پر گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ مسلم لیگی لیڈروں نے ان پابندیوں کو شہری آزادی کے حقوق کے منافی قرار دے کر ان کے خلاف سول نافرمانی کی مہم جاری رکھی اور پھر گرفتار ہو گئے۔

لاہور کے مسلم عوام نے اس تحریک کو ایک ہفتے سے زیادہ جس منظم اور پرسکون طریق پر لیکن پوری عوامی قوت کے ساتھ چلایا وہ تحریک پاکستان کا ایک روشن باب تھا۔ اس تحریک کے ذریعے مسلمانوں کے سیاسی جوش کو جو یونینسٹ۔ اکالی۔ کانگریس کولیشن وزارت کے خلاف ان کے سینوں میں موجزن تھا۔ اپنے اظہار کا موقع ملا۔ لیکن اس کا اظہار حیرت انگیز ڈسپلن کے ساتھ کیا گیا۔ کئی مواقع ایسے آئے کہ مسلم ہجوم کو مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ہجوم صبر و استقلال کے ساتھ اور پر امن طریق پر بھاری تعداد میں ہر روز مظاہرے کرتے رہے۔ اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرتے رہے۔ سول نافرمانی کی تحریک پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی شروع ہو گئی۔ ایک مرتبہ پر عوام نے ریل گاڑی کے سامنے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن جو مسلم لیگی لیڈر ابھی جیلوں سے باہر تھے۔ ان کی اپیل پر یہ حرکت ترک کر دی۔ اس تحریک کا ایک قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ اس میں حصہ لینے کے لئے مسلم خواتین نے بھی پیش قدمی کی۔ پنجاب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ معزز گھرانوں کی خواتین نے جن میں برقعہ والیاں بھی تھیں اور برقعہ کے بغیر خواتین بھی تھیں۔ لاہور کی سڑکوں پر جلوس نکال کر قانون کی خلاف ورزی کی اور پولیس کی اشک آور گیس کا مقابلہ کیا۔ خواتین کے مظاہرے منظم کرنے میں مس ممتاز (بیگم جہاں آرا شاہنواز کی جواں مرگ صاحبزادی) بیگم فاطمہ، بیگم سلمیٰ تصدق حسین اور لیڈی فیروز خان نون پیش پیش تھیں۔ آخر ۲۶ر فروری کو حکومت نے مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ اس دن ہجوم نے "خضر حیات ہائے ہائے" کی جگہ "تازہ خبر آئی ہے۔ خضر ساڈا بھائی ہے" کا نعرہ لگایا۔ پھر ایک اور ڈرامائی واقعہ رونما ہو گیا۔

۲۰ر فروری کو حکومت برطانیہ کا یہ ڈرامائی اعلان آ گیا تھا کہ ہندوستان میں برطانیہ اپنی حکومت بہر صورت جون ۱۹۴۸ء تک ختم کر دے گا اور ممکن ہے کہ اسے ہندوستان

سے پہلے وقت اقتدار کی قانونی سپردگی صوبائی حکومتوں کو کرنی پڑے۔ اس اعلان نے پنجاب کے وزیر اعظم کے سامنے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ وہ اپنے صوبے کی مسلم اکثریت کی مرضی کے خلاف برسر عہدہ تھے۔ اب انگریزی حکومت واقعی ہندوستان سے رخصت ہونے کے لئے بستر باندھ رہی تھی۔ اگر اس نے قانونی انتقال اقتدار صوبائی وزارتوں کے حق میں کرنے کا فیصلہ کیا تو پنجاب میں حالات کیا صورت اختیار کریں گے؟ کیا اس صورت میں ملک خضر حیات حکومت اور نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالنے کو تیار تھے۔ اس مسئلے پر سوچ بچار کر کے ملک صاحب نے مستعفی ہونے اور میدان سے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی ملک کی یا صوبے کی تقسیم کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔

۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہونے والا تھا۔ ۲ مارچ کی شب کو ملک خضر حیات نے اپنا استعفا گورنر کو بھیج دیا۔ ان کا ایک بیان اگلے دن اخبارات میں چھپا جس میں کہا گیا تھا کہ اب انتقالِ اقتدار کا سوال حقیقی طور پر سامنے آگیا ہے۔ صوبے کی مسلم اکثریت کی جانب سے مسلم لیگ ہی کو اس حقیقت کا سامنا کرنا چاہئے اور اقلیتوں کے نمائندوں کے ساتھ جس طرح وہ چاہے مستقبل کے متعلق معاملہ کرنا چاہیئے۔ یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ میں درمیان سے ہٹ جاؤں۔ لیکن میں مسلم لیگ کو ہر ممکن امداد جو وہ طلب کرے دینے کو تیار ہوں گا۔ میری انتہائی خواہش ہے کہ پنجاب کی سالمیت برقرار رہے۔ اگر اس صوبے کے ٹکڑے ہوئے تو اس سے تمام پنجابیوں کو نقصان عظیم پہنچے گا۔

وزیر اعظم کے یکایک استعفے نے کانگریس اور اکالی پارٹی کے لیڈروں کو بہت مایوس کیا۔ وہ نہ معلوم یونینسٹ۔ کانگریس۔ اکالی کولیشن کے بل پر آئندہ کے لئے کیا خیالی قلعے تعمیر کر رہے تھے۔ وہ شاید یہ امید باندھ رہے تھے کہ برطانوی حکومت کے اعلان کے مطابق پنجاب پر ان کا قبضہ قائم ہو جائے گا۔ لیکن ان کی وزارت ہی ختم ہو گئی تھی۔ ۳ مارچ کی صبح کو کانگریس پارٹی کے وزیر خزانہ لالہ بھیم سین سچر اور اکالی پارٹی کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ چند دوستوں کے ساتھ پنجاب اسمبلی کے باہر تھڑے پر کھڑے

کچھ مایوسی کچھ غصّے کی حالت میں مسلمانوں کے ایک مختصر گروہ کو دیکھ رہے تھے جو وزیر اعظم کے استعفے کی خبر پڑھنے کے بعد اسمبلی کے سامنے جمع ہو گیا تھا اور "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے نیام سے کرپان نکالی اور اسے ہوا میں لہراتے ہوئے کہا کہ "پنجاب پر حکومت کس کی ہو گی۔ اس کا فیصلہ تلوار کرے گی۔" یہ نعرہ پنجاب کے شہروں میں اشتعال انگیز مظاہروں۔ تشدد اور فسادات کا پیش خیمہ بن گیا۔ لاہور۔ امرتسر۔ ملتان اور راولپنڈی میں فسادات ہوئے جو مغربی پنجاب کے دیہات میں بھی پھیل گئے۔ لیکن فوج کی مدد سے حکومت نے پنجاب کے فسادات کی اس پہلی لہر کو چند ہفتوں کے اندر دبا دیا۔ البتہ لاہور میں اکا دکا حملوں اور آتش زنی کے واقعات ہوتے رہے۔

پنجاب میں مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی مہم ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی منظم تحریک شروع ہو گئی۔ وہاں کچھ عرصے سے مسلم لیگ کو یہ شکایت پیدا ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت مسلم لیگ کے جلسوں پر بے جا پابندیاں لگا دیتی تھی اور لیگ کے کارکنوں کو سیاسی وجوہات کی بنا پر گرفتار کیا جا رہا تھا۔ فروری ۱۹۴۷ء میں خان عبدالقیوم خاں کو (جو اس وقت صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر تھے اور قیام پاکستان کے بعد اس صوبے کے وزیر اعلیٰ بنے) قانونی پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے کے الزام میں مردان میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری پر صوبائی مسلم لیگ نے جماعتی حیثیت سے سول نافرمانی کی مہم چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں بھی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پشاور کا چکر لگایا اور صوبائی حکومت کو گرفتار شدگان کی رہائی کا مشورہ دیا۔ لیکن سول نافرمانی کی تحریک پھر بھی چلتی رہی اور بالآخر ۴ جون کو قائد اعظم کی اپیل پر ختم کی گئی۔

آسام میں صوبائی حکومت نے مسلمان آباد کاروں کی بے دخلی کی ایک مہم شروع کر رکھی تھی۔ صوبائی مسلم لیگ اس کے خلاف احتجاج کرتی رہی اور جب احتجاج موثر ثابت نہ ہوا تو فروری ۱۹۴۷ء میں صوبائی مسلم لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی نے سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی۔ چند ہفتوں کے بعد آسام کی حکومت نے وہ احکام منسوخ کر دیئے جن پر مسلم لیگ اعتراض کر رہی تھی اور یہ مہم ختم ہو گئی۔

۴۱۔ تقسیم کا اُصول منظور کرنے کی جانب کانگریس کا پہلا قدم

مارچ ۱۹۴۷ء کے شروع میں سردار پٹیل نے کانگریس کیمپ میں ایک عجیب کارنامہ سرانجام دیا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان سے ایک قرارداد پاس کرادی جو ملک کی تقسیم کے اصول کو منظور کرنے کے مترادف تھی۔ یہ قرارداد خود سردار پٹیل کی تجویز پر کانگریس کی مجلس عاملہ نے ۸ر مارچ ۱۹۴۷ء کو پاس کی۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ پنجاب کی اقلیتوں کو اکثریت کے جبر سے محفوظ کرنے کے لئے اس صوبے کے "مسلم اکثریت والے علاقے" اور غیر مسلم اکثریت والے علاقے" کو دو الگ الگ صوبوں کی شکل دے دی جائے۔ اس مطالبے کی منطق واضح طور پر مطالبۂ پاکستان کی تائید کرتی تھی۔ اگر اقلیت کو اکثریت کے جبر سے محفوظ کرنے کے لئے پنجاب کی تقسیم جائز اور ضروری تھی تو اسی مقصد کے لئے اور اسی بنیاد پر پورے ملک کی تقسیم کیوں جائز اور ضروری نہ تھی؟

اس بات کی شہادت موجود ہے کہ دسمبر ۱۹۴۶ء کے آخر یا جنوری ۱۹۴۷ء کے شروع میں سردار پٹیل نے مسلم لیگ۔ کانگریس کشمکش کے متعلق اپنے کانگریسی ساتھیوں سے مختلف انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ مسٹر وی پی۔ مینن نے جو اس زمانے میں وائسرائے کے آئینی مشیر کے عہدے پر فائز تھے اور سردار پٹیل کے ساتھ قریبی تعلقات اور قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔ اپنی کتاب میں سردار پٹیل کی ذہنی تبدیلی کا باعث اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ مسٹر مینن کا بیان ہے۔ کہ میں نے سردار پٹیل کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ کانگریس جس راستے پر چلنے کے لئے اصرار کر رہی تھی۔ اس کی کوئی یقینی منزل نظر نہ آتی تھی۔ کانگریس آزادی کا مقصد کابینہ مشن پلان کے تحت قائم شدہ دستور ساز اسمبلی کے ذریعے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اور اس بات کے لئے لڑ رہی تھی۔ کہ مسلم لیگ کو اس اسمبلی میں بیٹھنے پر

مجبور کیا جائے یا اسے عبوری کابینہ سے نکال دیا جائے۔ اگر حکومت برطانیہ نے یہ مطالبہ منظور نہ کیا تو کیا ہوگا؟ کانگریس خود عبوری حکومت سے مستعفی ہوگی؟ اس سے اگلا قدم کیا ہوگا؟ سول نافرمانی اور فسادات؟ اور اگر بالفرض حکومت برطانیہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت سے نکال دے اور مسٹر جناح دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ جاری رکھیں۔ تو حکومت برطانیہ ایسی اسمبلی کے بناتے ہوئے آئین کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے کو تیار ہوگی؟ اس طویل اور مشکلات اور غیر یقینی امکانات والے راستے کے مقابلے میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ مسٹر جناح کا مطالبۂ تقسیم اس شرط کے ساتھ مان لیا جائے کہ پنجاب اور بنگال کے ہندو اکثریت کے علاقوں پر وہ دعوے نہ کریں۔ اگر یہ راستہ اختیار کیا جائے تو آزادی حاصل کرنے کے لئے نئے آئین کا طویل انتظار کرنے اور قدم قدم پر جھگڑے اور فساد کا خطرہ مول لینے کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں مختصر ترمیم کے ذریعے پاکستان اور ہندوستان کو فوراً ڈومی نین کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ڈومی نین کی صورت میں آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان اپنی مرضی کے مطابق اپنا نیا آئین بناتا رہے گا۔ پاکستان کیا کرے گا؟ صرف مسلم اکثریت کے مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کو علیحدہ کر کے، دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل پاکستان چل سکے گا یا نہیں؟ یہ مسٹر جناح کا درد سر ہوگا۔ باقی ماندہ ہندوستان کا مسئلہ بہر حال بہت سہولت کے ساتھ حل ہو جائے گا۔ مسٹر مینن کا بیان ہے کہ چند دنوں کی سوچ بچار کے بعد سردار پٹیل نے بصیغۂ راز انہیں کہا کہ میرا نام ہرگز ظاہر نہ کیا جائے لیکن وزیر ہند تک براہِ راست یہ بات پہنچا دی جائے کہ اگر ان خطوط پر کوئی تجویز مرتب کی گئی تو کانگریسی حلقے اسے قبول کر لیں گے۔

پھر ایسے واقعات پیش آئے جو سردار پٹیل کے ذہن میں اس خیال کو مضبوط کرنے والے تھے کہ کانگریس کے لئے متحدہ ہندوستان کی آزادی پر اصرار کرتے رہنا اپنے لئے نت نئی مشکلات پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ اور "کٹے پھٹے" پاکستان کا مطالبہ منظور کر لینے سے باقی ہندوستان کا اتحاد اور مستقبل بہ سہولت محفوظ کیا جا سکتا تھا۔ عبوری حکومت میں مسلم لیگ قدم قدم پر کانگریسی وزیروں کا راستہ روکتی تھی۔ یہ تجربہ بھی ان کے سامنے

تھا۔ ہندوستان کی حکومت جلد اور یقینی طور پر ہاتھ میں لینے کا تصور بھی دلکش تھا۔ دوسری باتوں کے علاوہ پہلے ہندوستانی وزیر خزانہ کی حیثیت سے مسٹر لیاقت علی خاں کے بجٹ نے سردار پٹیل کو بالکل بوکھلا دیا۔ اس بجٹ میں لیاقت علی نے گاندھی جی کا مطالبہ (جو وہ عرصے سے بار بار کر رہے تھے) پورا کرتے ہوئے نمک پر ٹیکس اڑا دیا اور اس طرح جو خسارہ ہوتا تھا۔ اسے پورا کرنے کے لئے ایک لاکھ سے زائد تجارتی منافع پر پچیس فیصد خاص ٹیکس لگا دیا اور ساتھ ہی جنگ کے زمانے میں حکومت کے ٹیکسوں سے بچ کر تجوریاں بھرنے والوں کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیشن کی تجویز پیش کر دی۔ ان تجاویز نے تجارتی طبقے میں تہلکہ مچا دیا۔ یہی طبقہ سردار پٹیل کی سیاسی پوزیشن کی پشت پناہ اور کانگریس کے لئے سرمایہ مہیا کرنے والا تھا۔ اسی کی ٹھوس حمایت کے بل پر وہ کانگریس کے "مرد آہن" بنے ہوئے تھے۔ کانگریس کا بایاں بازو ان تجاویز کی حمایت پر آمادہ ہو گیا اور کانگریس کے مرد آہن کے لئے کانگریس اسمبلی پارٹی کے اندر اتحاد اور ڈسپلن قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ ہندوستان کی سیاست سے مسلم لیگ کو خارج کرنے اور اس قسم کے خطروں سے نجات حاصل کرنے کا عزم سردار پٹیل کے دل میں زیادہ پختہ ہو گیا۔

سوال یہ تھا کہ وہ کانگریسی لیڈروں کو پاکستان کی کڑوی گولی نگلنے پر تیار کس طرح کریں۔ گاندھی جی بھارت کے ٹکڑے کرنے کا خیال بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ لیکن اس وقت گاندھی جی بہار میں تھے۔ پنڈت نہرو کی کمزوری سردار پٹیل کو معلوم تھی۔ پنڈت جی کو یقین تھا کہ مسٹر جناح "کٹے پھٹے" پاکستان کو کبھی قبول نہ کریں گے۔ لہٰذا سردار پٹیل نے انہیں سمجھایا کہ مسٹر جناح کو مطالبۂ پاکستان سے بھگانے کی صحیح تدبیر یہی ہے کہ ان پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ پاکستان کی حقیقی اور عملی صورت "کٹے پھٹے" پاکستان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ پنجاب اور بنگال کے غیر مسلم اکثریت والے علاقے ان کے پاکستان میں ہرگز شامل نہ ہوں گے۔ پنڈت نہرو ان کی تجویز کی حمایت پر آمادہ ہو گئے تو ان کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ انہوں نے مجلس عاملہ سے اپنے حسب منشا قرارداد پاس کرائی اور مواقعات کا انتظار کرتے رہے۔ گاندھی جی دور بین نگاہ رکھتے تھے۔ انہوں

نے اخبارات میں اس قرارداد کا متن پڑھا تو سردار پٹیل اور پنڈت نہرو دونوں کو الگ الگ خط لکھ کر ان سے باز پرس کی۔ دونوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیئے۔ پنڈت نہرو کے جواب کا مفہوم یہ تھا کہ ہم نے مطالبہ پاکستان منظور نہیں کیا بلکہ اس کا توڑ کیا ہے۔

سردار پٹیل نے اپنے مقصد کو سامنے لیکن اپنے ہی دل میں رکھا اور اگلے قدم نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے آنے کے بعد اٹھائے۔ یہ بات معلوم ہے کہ اس عرصے میں سردار پٹیل مختلف محکموں کے ماہرین سے یہ پوچھ گچھ کرتے رہے کہ کتنے پیچھے پاکستان کو جو وسائل فوری طور پر حاصل ہوں گے۔ ان کی بنا پر یہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو سکے گا یا نہیں۔ انہیں یہی رپورٹیں ملتی رہیں کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۴۲۔ ماؤنٹ بیٹن کی آمد اور منصوبہ پاکستان کی منظوری

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے۔ اگلے دن انہوں نے عہدے کا حلف اٹھایا۔ لیکن حلف اٹھانے سے پہلے ہی انہوں نے گاندھی جی اور قائد اعظمؒ کو ذاتی پیغام بھیج دیئے، جن میں ان سے جلد از جلد ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔

حکومت ہند کے ان مستقل ملازموں کے علاوہ جو وائسرائے کے سٹاف میں شامل تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن انگلستان سے اپنے ذاتی سٹاف کا ایک لشکر ساتھ لائے تھے۔ جو ہدایت نامہ وہ لے کر آئے تھے، اس میں انہیں اختیارات بھی بہت وسیع دیئے گئے تھے۔

ہدایت نامہ مختصراً یہ تھا کہ اوّل ان کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کابینہ مشن پلان کے مطابق متحدہ ہندوستان کا کوئی ایسا مشترکہ نظام قائم کرائیں جسے برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کی حکومت منتقل کی جاسکے۔ لیکن اگر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکے جو کابینہ مشن پلان کی کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔ اور وائسرائے یکم اکتوبر تک کوئی سمجھوتہ کرانے میں ناکام رہے تو پھر وہ اپنی طرف سے ضروری تجاویز حکومتِ برطانیہ کی منظوری کے لیے پیش کرے۔ تاکہ ان تجاویز کے مطابق مقررہ وقت کے اندر (جون ۱۹۴۸ء تک) انتقالِ اقتدار کی تکمیل کی جاسکے۔ جو تجاویز بھی مرتب کی جائیں ان میں بہر حال دفاع کے مسئلے کو پیش نظر رکھا جائے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کام کرنے کے جو طریقے اپنے ساتھ لائے وہ بھی نئے اور بہت عجیب تھے۔ وہ سیاسی گفتگو اور بحثوں کے ساتھ ساتھ متعلقہ افراد کے ساتھ ذاتی تعلقات اور بھائی چارہ کی فضا پیدا کرنے اور اس طرح انہیں متاثر کرنے کے بہت قائل تھے۔ اس کام میں ان کے خاندان کے افراد اور ان کے ذاتی سٹاف کے ممبر انہیں پوری مدد دیتے تھے۔ مثلاً لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی جی سے اپنی پہلی ملاقات اس طرح ختم کی کہ اپنی

صاحبزادی لیڈی پامیلا سے ان کا تعارف کرایا۔ اور کہا کہ میں اسے کبھی کبھی آپ کے مذہبی وعظ میں (گاندھی جی ہر شام کو ایک مجمع میں بیٹھ کر دعا کرتے تھے) بھیجنا چاہتا ہوں۔ کیا اسے شرکت کی اجازت ہوگی؟ گاندھی جی نے صاحبزادی کے سر پر دست شفقت رکھا اور کہا ضرور۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن بہت دلکش شخصیت اور شہزادیوں والی چال ڈھال کی خاتون تھیں۔ وائسرایگل لاج میں جو پارٹیاں ہوتی تھیں۔ ان پر میزبان کی حیثیت سے ان کی شخصیت چھائی رہتی تھی۔ جب انہوں نے پنڈت نہرو کو "پنڈت جی یہاں آیئے" اور "پنڈت جی یہاں تشریف رکھیے"۔ کہنا شروع کیا اور ان کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق ہمدردی کی باتیں کیں۔ اور انہیں "ہندوستان کا بے تاج بادشاہ" ظاہر کیا۔ تو پنڈت جی ان کے ایسے گرویدہ ہوگئے کہ دہلی کے سیاسی حلقوں میں یہ بات اکثر لوگوں نے نوٹ کی۔ دو ہفتوں کے اندر پنڈت نہرو ماؤنٹ بیٹن خاندان کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے کہ وائسرائے کے سامنے کسی بات پر اڑنا ان کے لیے مشکل ہوگیا۔

ماؤنٹ بیٹن مسائل طے کرنے اور کام کو نبٹانے میں تاخیر گوارا نہ کرتے تھے۔ لیکن ایک اچھے جرنیل کی طرح ہر قدم اٹھانے سے پہلے اپنے سٹاف سے مشورہ اور بحث ضرور کر لیتے تھے۔ ہر سیاسی لیڈر کے ساتھ گفتگو کے بعد وہ اس گفتگو کے خلاصے کی ایک نقل اپنی خاص مجلس شوریٰ کے ہر رکن کو بھیج دیتے تھے۔ تاکہ وہ حالات سے پوری طرح باخبر رہیں اور انہیں صحیح مشورہ دے سکیں۔

مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ اپنی ملاقاتوں میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے منشاء کے مطابق فضا قائم رکھی۔ لیکن جب ان کی پہلی ملاقات مسٹر جناح سے ہوئی تو انہیں اپنے بالمقابل ایک ایسا خشک انسان نظر آیا جس پر خوش گپیوں اور میٹھی میٹھی چکنی چپڑی باتوں کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔

پہلی ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہنا شروع کیا کہ مسٹر جناح سیاسی مسائل پر گفتگو تو ہوتی ہی رہے گی۔ لیکن میں نے آپ کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ سب سے پہلے میں آپ کے ساتھ دوستانہ تعارف کا خواہشمند ہوں۔ آپ کی زبان سے آپ کے متعلق

کچھ سننا چاہتا ہوں۔ مسٹر جناح نے مسکرا کر جواب دیا کہ جناب میں اپنا تعارف اس سے زیادہ کیا کرا سکتا ہوں کہ میں مسلم لیگ کا صدر ہوں۔ جو اس برّ صغیر میں مسلم قوم کے لیے حقِ خود اختیاری کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اور پوری قوم کی تائید اس مطالبے کی پشت پر ہے۔ مسلم لیگ کی جانب سے مجھے اس مطالبے کی تفصیلات طے کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اور میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ وائسرائے مجبور ہو گیا۔ کہ ادھر ادھر کی گپ شپ اور محض ذاتی باتیں کرنے کے بجائے متحدہ ہندوستان یا پاکستان کے مسئلے کی جانب متوجہ ہو۔ اس کے بعد قائد اعظم کے ساتھ اس کی کئی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

گاندھی جی اور پنڈت نہرو تقسیم کی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ گاندھی جی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنی پہلی ملاقات میں کہا کہ میرے نزدیک ہندوستان کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ آپ موجودہ کانگریس۔لیگ کولیشن حکومت کو توڑ دیں اور مسٹر جناح کو دعوت دیں کہ وہ اپنی مرضی کی حکومت بنالیں۔ انہیں اختیار ہو گا کہ وہ اپنی وزارت میں صرف مسلمانوں کو لیں یا اپنی پسند کے ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے نمائندوں کو شامل کر لیں۔ شرط صرف یہ ہو کہ وہ امن وامان کے ساتھ پورے ہندوستان کے باشندوں کے مفاد و بہبود کو سامنے رکھ کر حکومت چلانے کا وعدہ کر لیں۔ اگر وہ یہ وعدہ کرتے ہوں تو آپ حکومت کے اختیارات مسٹر جناح کی وزارت کو سونپ دیں گے۔ کانگریس ان پر اعتماد اور ان کے ساتھ تعاون کرے گی۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کریں تو آپ انہی شرائط پر کانگریس کو وزارت سازی کی دعوت دیں۔

جب ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات سردار پٹیل کے ساتھ ہوئی اور اس کے بعد وائسرائے ملاقات کے کمرے سے باہر نکلے تو ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے سٹاف سے کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے میدان مار لیا ہے۔ یہ شخص جو کانگریس کا مردِ آہن سمجھا جاتا ہے۔ تقسیم ملک پر راضی ہے۔" وائسرائے کے سٹاف نے شروع ہی سے ان کی توجہ کانگریس کی مجلس عاملہ کی اس قرار داد کی جانب مبذول کرائی تھی۔ جس میں پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ وائسرائے نے اس کے متعلق پنڈت نہرو اور گاندھی

جی سے بھی سوالات کئے تھے۔ لیکن وہ بہت شدت کے ساتھ اس بات پر اڑتے تھے کہ اس قرار داد سے ملک کی تقسیم کا اصول منظور کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ لیکن جب یہی سوال سردار پٹیل کے ساتھ اٹھایا گیا۔ تو سردار صاحب نے بہت بھولے پن کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ تسلیم کرنا شروع کر دیا کہ اگر پنجاب کے ایک حصے کو جہاں ہندو و سکھ اکثریت ہے۔ دوسرے حصے کی مسلم اکثریت کے غلبے اور تسلط سے بچانے کے لئے پنجاب کی تقسیم درست ہے۔ تو اسی اصول کے مطابق ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنا بھی درست قرار پاتا ہے۔ لارڈ ماونٹ بیٹن اپنی طرف سے سردار پٹیل کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس کے لئے سردار پٹیل خود بیتاب تھے۔ یعنی پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر کے مسلم اکثریت کے علاقے مسٹر جناح کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اور ان سے نجات حاصل کی جائے۔ سردار صاحب بظاہر یہ بات تامل اور نیم دلی کے ساتھ تسلیم کر رہے تھے۔ اور دراصل تامل میں ہنس رہے تھے۔

ماونٹ بیٹن کا تاثر مسٹر جناح کے ساتھ ملاقاتوں کے بعد یہ تھا۔ کہ یہ شخص مکمل علیحدگی کے مطالبے کو ترک کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوگا۔ لیکن ریفرنس کے سوال پر مفاہمت کے لیے تیار ہے۔ لہذا وائسرائے کو یہ نظر آیا کہ اگر کانگریس کا "مرد آہن" اور مسلم لیگ کا "مرد آہن" تقسیم کے اصول پر متفق ہیں تو پھر کانگریس اور مسلم لیگ کو اس اصول پر متفق کرنا مشکل نہ ہونا چاہیئے۔

دونوں طرف سے یہ اشارہ پانے کے بعد ماونٹ بیٹن نے کابینہ مشن پلان کو ردی کی ٹوکری میں پھینکا اور تقسیم کے اصول پر سمجھوتہ کرانے کی کوشش اپنے خاص طریقے سے شروع کر دی۔ کانگریس پارٹی کو راضی کرنے کے لیے پنڈت نہرو اور گاندھی جی کی مخالفت کو درمیان سے حذف کرنا ضروری تھا۔ گاندھی جی کا علاج ماونٹ بیٹن نے بہ آسانی کر لیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل سے اپنی اگلی ملاقاتوں میں اس نے کہنا شروع کیا کہ مشکل یہ ہے کہ کانگریس کئی زبانوں سے بولتی ہے۔ مثلاً ایک زبان گاندھی جی کی ہے جو پیچ در پیچ دیوتا معلوم ہوتے ہیں اور سیاسی سودے بازی کے قائل نہیں۔ بلکہ سب کچھ مسٹر جناح کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی تجویز آپ لوگوں نے سن ہی لی کہ موجودہ عبوری حکومت کو برخاست

کر کے مسلم لیگ کی مرضی کی حکومت بنا دی جائے۔ اگر آپ لوگوں کی بھی سنجیدگی کے ساتھ یہی رائے ہے تو اسی کے متعلق سوچ بچار کیا جائے۔ اگر نہیں تو مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ کانگریس کا صحیح ترجمان کون ہے۔

سردار پٹیل اور پنڈت نہرو واپس گئے۔ انہوں نے گاندھی جی سے کچھ باتیں کیں۔ اور گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھ بھیجا کہ میں نے جو تجویز آپ کے سامنے پیش کی تھی۔ اسے کانگریس منظور نہیں کرتی فی الحقیقت کانگریس کی طرف سے بات چیت کرنے کا صحیح اختیار مجلس عاملہ کو اور کانگریس کے صدر کو حاصل ہے میرے ذاتی مشورے کو اتنی اہمیت حاصل نہیں۔ کیونکہ میں کانگریس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ صرف انسانوں کا خیرخواہ ہوں۔ گاندھی جی کو اس طرح عضو معطل بنانے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے اپنی پوری توجہ پنڈت نہرو پر مبذول کی۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے کھانوں پر ان کی دعوتیں کیں اور انہیں اپنے پنجاب کے دورے کے روح فرسا انکشافات سنائے اور کہا کہ اعلیٰ مدبر وہی ہوتا ہے جو اپنی ذاتی خواہشات کو قربان کر کے سمجھوتے کی جانب قدم بڑھائے۔ کچھ سردار پٹیل نے ان پر اپنے طریقوں سے عمل کیا۔ کچھ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں تعطل اور بدامنی کے عواقب و نتائج سمجھائے۔ چند دنوں کے اندر پنڈت نہرو تقسیم کے اصول پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ تقسیم کی پیش کش کانگریس اپنی طرف سے نہیں کر سکتی۔ اگر وائسرائے تقسیم کے اصول پر اپنی پلان بنائے اور اسے نافذ کرنا چاہے تو ہم یہ امر مجبوری اسے منظور کر لیں گے۔

ابھی ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے کے عہدے کا چارج سنبھالے تین ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ اس نے کانگریس کو تقسیم کا اصول ماننے پر راضی کر لیا۔ وہ اس کامیابی پر بیحد خوش اور نازاں تھا۔ اور کانگریسی لیڈروں کو ان کی معقولیت پسندی کی داد دے رہا تھا۔ ۵ اپریل کو اس نے صوبائی گورنروں کی ایک کانفرنس بلائی اور ان کے سامنے تقسیم کی ایک پلان مشورہ طلبی کے لیئے پیش کر دی۔ گورنر بھی یہ سن کر حیران ہو گئے کہ وائسرائے نے تین ہفتوں کے اندر دونوں پارٹیوں کو سمجھوتے کے کسی نہ کسی اصول پر راضی

کر لیا ہے۔

گورنروں کی رائیں سننے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی پلان کی نوک پلک درست کی۔ اور ۲ مئی کو اپنے سٹاف کے دو آدمیوں لارڈ اسمے اور سر جارج ایبل کے ہاتھ یہ پلان منظوری کے لیئے لندن بھیج دی۔

وائسرائے کی پلان مختصراً یہ تھی کہ پنجاب اور بنگال کو دو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ پھر اقتدار مختلف صوبوں کو منتقل کر دیا جائے اور انہیں یہ اختیار دیا جائے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے اپنے گروپ بنا کر اپنی اپنی فیڈریشن کی وساطت سے منتقل ہونے والے اختیارات سنبھال لیں۔ صوبہ سرحد میں نیا انتخاب کرانے اور عوام کو اپنے نئے نمائندوں کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار دینے کی تجویز تھی۔ بنگال کی تقسیم کی صورت میں آسام کے ضلع سلہٹ کو مسلم بنگال کے ساتھ ملانے کی تجویز تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہ سمجھتے تھے کہ اگر انتقال اقتدار کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو پھر یہ مختلف صوبوں کی اپنی ذمہ داری ہوگی کہ اگر وہ چاہیں تو سب کے سب مل کر ہندوستان کی ایک فیڈریشن بنا لیں یا اگر چاہیں تو مسلم لیگی صوبے اپنی الگ آزاد فیڈریشن (پاکستان) بنا لیں اور کانگریسی صوبے اپنی الگ آزاد فیڈریشن قائم کر لیں۔ وائسرائے نے یہ فرض کر کے کہ تقسیم ملک کے اس طریق کو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں قبول کر لیں گی۔ برطانوی کابینہ کو یہ اطلاع دے دی کہ ان کی پلان کے اصولوں سے دونوں پارٹیوں کے لیڈر متفق ہیں۔ حالانکہ اس کی تفاصیل ابھی کسی لیڈر نے دیکھی ہی نہ تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یہ فرض کر کے کہ برطانوی کابینہ اسے فوراً منظور کرے گی۔ (اس نے کابینہ سے درخواست کی تھی کہ مجھے اپنی منظوری کی اطلاع ایک ہفتے کے اندر بھیج دیں) یہ اعلان بھی کر دیا کہ ۱۷ مئی کو کانگریس کے دو نمائندوں (پنڈت نہرو اور سردار پٹیل) اور مسلم لیگ کے دو نمائندوں (مسٹر جناح اور مسٹر لیاقت علی خاں) اور ایک سکھ نمائندے (سردار بلدیو سنگھ) کو وائسرائے کے ساتھ ملاقات کی دعوت دی گئی ہے تاکہ انتقال اقتدار کے متعلق حکومت برطانیہ کی منظور شدہ پلان ان کے سامنے پیش کر دی جائے۔ ماؤنٹ بیٹن چھٹی پر سرسوں

جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

برطانوی کابینہ نے تھوڑی بہت غیر اہم ترامیم کے ساتھ ماؤنٹ بیٹن کی پلان کو منظور کر لیا اور اسے تار کے ذریعے اس فیصلے سے مطلع بھی کر دیا۔ لیکن یہاں کچھ اور واقعات پیش آ چکے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن چند دن آرام کے لیے شملہ چلے گئے تھے۔ جہاں پنڈت جواہر لال ان کے مہمان تھے۔ وہاں وائسرائے کو اس کے منصوبے کی منظوری کی اطلاع مل گئی اور اس نے پنڈت نہرو کو اپنا منصوبہ دکھایا۔

وائسرائے نے جو منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا مطلب وہ یہی سمجھتا تھا کہ صوبوں کو آزادی کے جو اختیارات سپرد کیے جائیں گے۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلم صوبے مسلم لیگ کے زیر ہدایت اور ہندو صوبے کانگریس کے زیر ہدایت اپنے اپنے گروپوں کی الگ الگ ڈومی نین بن لیں گے۔

لیکن اس پلان کا بنیادی نقص یہ تھا کہ پہلے مرحلے پر ملک دو مملکتوں کے بجائے بیشمار خود مختار صوبوں اور ریاستوں میں تقسیم ہونا تھا۔ اور اس امکانی پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ ایک مرتبہ عملاً مکمل آزادی حاصل کر لینے کے بعد اگر یہ بے شمار یونٹ دو مملکتوں کی صورت میں اکٹھا نہ ہونا چاہیں۔ تو ان کے لیے کوئی آئینی یا عملی مجبوری نہ ہو گی۔

پنڈت نہرو نے وائسرائے کی توجہ ان کے منصوبے کے اس بنیادی نقص کی جانب دلائی اور کہا کہ یہ منصوبہ ہندوستان کو دو مملکتوں میں تقسیم کرنے کا نہیں۔ بلکہ بے شمار چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں تقسیم کرنے کا ہے۔ پاکستان کی کڑوی گولی نگلنے پر کانگریس راضی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ باقی ہندوستان کی وحدت قائم رہے۔ لیکن اگر باقی ہندوستان کی وحدت کی ضمانت بھی نہ دی جائے۔ تو کانگریس کسی ایسے اصول کو کس طرح منظور کر سکتی ہے؟ میں اسے نہ تو منظور کر سکتا ہوں نہ کانگریس سے منظور کرا سکتا ہوں۔ وائسرائے کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ یہی اعتراض شاید مسٹر جناح کی جانب سے بھی کیا جاتا۔

لہٰذا شملہ اور لندن کے درمیان فوراً تاروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا تار ماؤنٹ بیٹن نے دیا۔ ”جو منصوبہ میں نے بھیجا تھا جسے ترمیم کے ساتھ آپ نے منظور کیا ہے۔ اسے منسوخ سمجھا جائے۔ نیا منصوبہ عنقریب بھیجا جائے گا۔“ برطانوی وزیر اعظم خاصا پریشان

ہوا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ذاتی قاصد لارڈ اسمے اور سر جارج ایبل جو پہلا منصوبہ لے کر لندن گئے تھے، ابھی تک وہیں تھے۔ وہ برطانوی کابینہ کے ممبروں کو کچھ بتانے سے قاصر تھے کہ شملہ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ مسٹر اٹیلی نے ماؤنٹ بیٹن کو پیغام دیا کہ نیا منصوبہ بھیجنے کے علاوہ آپ خود یہاں آئیں تاکہ ہم بھی صورت حال سمجھ سکیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے جلدی جلدی ایک نئے منصوبے کا خاکہ تیار کرایا جس کا مقصد آئینی اقتدار صوبوں کے بجائے دو مرکزی حکومتوں کے سپرد کرنا تھا۔

پنڈت نہرو شملہ سے رخصت ہونے والے تھے۔ ان کی روانگی سے پہلے انہیں یہ خاکہ دکھایا گیا اور ان کی منظوری حاصل کر لی گئی۔ اور فیصلے کے اعلان کے لیے ۱۷ مئی کی جو تاریخ مقرر کی تھی۔ اسے ۲ جون تک ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ اب تک جو کچھ ہو رہا تھا اس سے مسلم لیگی لیڈر بے خبر تھے۔ انہیں وائسرائے کی تجاویز کے متعلق پہلی مرتبہ اس وقت علم ہوا جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن لندن جانے کے لئے شملہ سے روانہ ہو کر دہلی میں چار دن ٹھہرے اور دہلی میں انہوں نے اپنی تجاویز کا خاکہ قائداعظم اور مسٹر لیاقت علی کو دکھایا۔

یہ تجاویز جن کی بنیاد پر بالآخر اس برصغیر کی تقسیم عمل میں آنے والی تھی اور ہندوستان اور پاکستان کو دو الگ الگ مملکتوں کی صورت میں سیاسی آزادی ملنے والی تھی، مسلم لیگی لیڈروں کے سامنے عجیب بھاگ دوڑ کی حالت میں پیش ہوئیں۔

شملہ میں تقریباً دو ہفتے آرام کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن ۱۴ مئی کو دہلی واپس آئے۔ ۱۶ مئی کو انہوں نے "متفقہ نکات" کے عنوان سے ایک مسودہ آخری شکل میں تیار کرایا اور اپنے سٹاف کے ممبروں کے ہاتھ اس کی نقلیں الگ الگ کانگریسی اور مسلم لیگی لیڈروں کو بھیج دیں۔ تین نقلیں مسٹر وی پی مینن کے ہاتھ بھیجی گئیں جو انہوں نے ذاتی طور پر پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور سردار بلدیو سنگھ کو پہنچائیں۔ دو نقلیں سر ایرک میول مسلم لیگی لیڈروں کے پاس لے گئے۔ ایک قائداعظم کے لیے دوسری مسٹر لیاقت علی خاں کے لیے۔ یہ نقلیں قبل از دوپہر ان لیڈروں کو دی گئیں۔ اسی شام کو وائسرائے

نے انہیں ملاقات کا وقت دیا۔ اور ان سے درخواست کی کہ تینوں پارٹیاں (عملاً دو ہی پارٹیاں تھیں۔ کیونکہ سردار بلدیو سنگھ اور کانگریس ایک ہی پارٹی کی طرح کام کر رہے تھے) اپنا اپنا ردِ عمل انہیں لکھ کر بھیج دیں اور یہ تحریریں انہیں اگلے دن (۱۱ مئی کو) مل جائیں۔ تاکہ وہ انہیں اپنے ہمراہ لندن لے جائیں۔ ان کے لندن جانے کی تاریخ ۱۸ مئی مقرر تھی۔

"متفقہ نکات" کا مسوّدہ آٹھ شقوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سب سے اہم اور پورے، مسوّدے کی جان پہلی شق تھی جس میں وہ پروگرام درج تھا جس کے ذریعے عوام کی رائے معلوم کرنا مقصود تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان کی ایک مملکت چاہتے ہیں یا دو الگ الگ مملکتیں قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ پروگرام یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال کی رائے اس طرح معلوم کی جائے گی۔ کہ پورے پنجاب کی اسمبلی اور پورے بنگال کی اسمبلی اپنی اکثریت کی رائے سے یہ فیصلہ کریں گی کہ وہ متحدہ ہندوستان کا حصہ رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر انہوں نے علیحدگی کے حق میں فیصلہ کیا۔ تو پھر مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال میں غیر مسلم اکثریت کے ضلعوں کے نمائندے (مسلمان اور غیر مسلم) علیحدہ اجلاس میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ متحدہ ہندوستان سے علیحدگی پر رضامند ہیں۔ یا اپنے صوبوں سے کٹ کر ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں۔ صوبہ سرحد کے عوام کی رائے استصواب کے ذریعہ معلوم کی جائے گی۔ بلوچستان کی رائے شاہی جرگہ کے ممبروں اور میونسپل کمیٹیوں کے منتخب شدہ ممبروں کے مشترکہ اجلاس کے ذریعہ معلوم کی جائے گی۔ آسام کے ضلع سلہٹ کی رائے استصواب کے ذریعہ معلوم کی جائے گی کہ وہ آسام کا حصہ رہنا چاہتا ہے۔ یا تقسیم کی صورت میں بنگال کے ساتھ مدغم ہونا چاہتا ہے۔

ایک علیحدہ شق اس بات سے متعلق تھی کہ صوبوں کی تقسیم کی صورت میں ایک کمیشن حد بندی کے لیئے مقرر کیا جائے گا۔ ایک شق فوج کی تقسیم کے متعلق تھی۔ باقی شقیں تکنیکی اور اصطلاحی نوعیت کی تھیں۔ لیکن ان کے درمیان ایک شق یہ بھی تھی۔ کہ عارضی عبوری۔ عرصہ کے لیئے دونوں مملکتوں کا (دونوں کو فوری طور پر ڈومی نین کا درجہ دینا مقصود تھا) گورنر جنرل مشترک ہوگا۔ اور موجودہ گورنر جنرل کا اسی حیثیت سے تقرر کر دیا جائے گا۔ اس

شق کو بظاہر ایک رسمی چیز کی حیثیت سے مسوّدے میں شامل کر دیا گیا تھا۔ لیکن کیا یہ فی الحقیقت محض رسمی اور غیر اہم تھی؟ کیا تقسیم کے زمانے کے لیئے پاکستان کی شہ رگ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھ میں دے دینا مناسب رہے گا؟ قائد اعظمؒ کے نزدیک یہ سوال بہت غور طلب تھا۔ خاص کر اس گفت و شنید کے پیش نظر جو والسرائے علیحدہ طور پر پنڈت نہرو کے ساتھ کرتا رہا تھا۔ کہیں اس شق کے پس پردہ کوئی سازش تو نہیں تھی؟

کانگریسی لیڈروں کی جانب سے ماؤنٹ بیٹن کو تحریری منظوری اگلے دن موصول ہوگئی۔ ان کے جواب میں مشترکہ گورنر جنرل والی شق کے متعلق خاص ذکر کیا گیا تھا۔ اور کہا گیا تھا کہ کانگریس کو بہت مسرت ہوگی اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن مشترکہ گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے عہدے پر قائم رہیں اور اپنے تجربے سے ہماری رہنمائی کریں۔ قائد اعظمؒ نے احتیاط سے کام لیا۔ کوئی تحریری جواب بھیجنے کی بجائے وہ اور مسٹر لیاقت علیخاں ماؤنٹ بیٹن سے ملے۔ اور انہیں زبانی طور پر یہ کہہ کر چلے آئے کہ ہم اس مسوّدے کے عام اصولوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن اتنے مختصر سے عرصے میں اس پر شق وار تفصیلی تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کیا کر سکتے تھے؟ مسلم لیگ کی اس زبانی اور اصولی یقین دہانی کو اپنے ساتھ لے کر لندن چلے گئے۔ لیکن قائد اعظمؒ سے یہ کہہ گئے کہ آپ جو تفصیلی جواب دینا چاہیں وہ میرے سیکرٹری آپ سے لے کر مجھے لندن بھیج دیں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حسب عادت اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھا کہ وہ مشترکہ گورنر جنرل کے سوال پر بالآخر مسٹر جناح سے اپنی بات منوا لیں گے۔ انہوں نے "متفقہ نکات" کا مسوّدہ برطانوی کابینہ کے ممبروں کے سامنے پیش کر دیا اور انہیں کہا کہ یہ تازہ مسوّدہ فی الواقعہ "متفقہ نکات" پر مشتمل ہے۔

لندن میں اس پلان کی نوک پلک درست کی گئی اور اس مسوّدے کو آخری شکل دی گئی۔ اس کی رسمی منظوری برطانوی کابینہ نے بھی دے دی۔ اور برطانوی حزب اختلاف کے لیڈر مسٹر ونسٹن چرچل نے بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یقین دلا دیا کہ اگر ہندوستان کی دونوں پارٹیاں کانگریس اور مسلم لیگ اس پلان سے اتفاق کرتی ہیں تو اس کے مطابق ایک یا دو ڈومی نین قائم کرنے کے لیئے بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ حزب اختلاف اس کے راستے

میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کرے گی۔

لندن کی منظوری حاصل کرنے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ان کا سٹاف ۱۷ مئی ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے۔ لندن میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ پروگرام طے کیا تھا۔ کہ وہ دہلی میں ہندوستانی لیڈروں کے سامنے منظور شدہ پلان کا متن پیش کریں گے۔ اور ان کی رسمی منظوری حاصل کرنے کے بعد لندن کو ۳ جون کی صبح تک مطلع کر دیں گے۔ اور اس پلان کا سرکاری اور پبلک اعلان سب سے پہلے برطانوی وزیر اعظم اپنی پارلیمنٹ میں ۳ جون کی سہ پہر کو کریں گے۔ یعنی عالمی پریس کو یہ سرکاری اعلان سب سے پہلے لندن سے دیا جائے گا۔ اس پروگرام کے مطابق وائسرائے نے کانگریس کے دو نمائندوں (پنڈت نہرو اور سردار پٹیل) مسلم لیگ کے دو نمائندوں (قائد اعظمؒ اور مسٹر لیاقت علی خاں) اور سکھوں کے نمائندے سردار بلدیو سنگھ کو کانفرنس کی دعوت دے دی۔ پنڈت نہرو نے جواب میں کہا کہ کانگریس کے نمائندوں میں اس کے نئے صدر مسٹر کرپلانی کو ضرور شامل کرنا چاہیئے۔ وائسرائے نے منظور کر لیا۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ مسٹر جناح اس پر برا نہ منائیں۔ انہیں بھی مسلم لیگ کی جانب سے ایک زائد نمائندے کو ہمراہ لانے کی دعوت دے دی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں میں سردار عبدالرب نشتر کو شامل کر لیا۔

۲ جون کو دہلی کی وائسریگل لاج میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ سات لیڈروں کی یہ تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں سب کی رضامندی سے پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔ وائسرائے نے ایک مختصر اور رچی تلی تقریر سے کارروائی کا آغاز کیا۔ آپ نے کہا کہ مجھے گزشتہ پانچ برسوں میں کئی اہم کانفرنسوں سے خطاب کرنے کا موقع ملا ہے جو عالمی جنگ کا دور اس کے ذریعے دنیا کی تاریخ کا رخ موڑنے والی ثابت ہوئیں۔ لیکن عالمی تاریخ پر اثر انداز ہونے کے اعتبار سے یہ کانفرنس ان سب سے زیادہ اہم ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ میں نے لیڈروں کی کم از کم تعداد کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ کانفرنس کے اندر دوستانہ فضا قائم رہے۔ دوسری یہ کہ کل ۳ جون سہ پہر تک برطانوی حکومت کی منظور کردہ پلان صیغہ راز میں رہے اور برطانوی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم اس بارے میں

جو اعلان کرنے والے ہیں۔ اس سے پہلے ہندوستان میں اس کی اشاعت نہ ہونے پائے۔
اس کانفرنس کا مقصد اس پلان کے لئے آپ صاحبان کی منظوری حاصل کرنا ہے۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ رسمی منظوری دینے سے پہلے آپ اپنی اپنی جماعتوں سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو اجازت ہے کہ آپ اپنی اپنی مجلس عاملہ سے مشورہ کر لیں۔ لیکن آپ دو باتوں کا خیال رکھیں۔ ایک یہ کہ پلان کا راز افشا نہ ہونے پائے۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنی آخری منظوری کی اطلاع مجھے آج ہی رات کے بارہ بجے تک دے دیں۔ تاکہ میں برطانوی وزیراعظم کو اشارہ دے سکوں کہ معاملہ ٹھیک ہے۔ آپ پارلیمنٹ میں اپنا اعلان کر دیں۔ اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پلان کے مختلف پیروں کے متعلق چند وضاحتی باتیں کیں۔ اور کہا کہ پلان وہی ہے جس کی غیر رسمی اور اصولی منظوری آپ پہلے ہی مجھے دے چکے ہیں۔ اگر کہیں کوئی لفظی ردّ و بدل کیا گیا ہے تو وہ صرف مطلب اور معنی کو زیادہ واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے
قائداعظمؒ نے اس اجلاس میں صرف اتنا کہا کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اس پلان کے متعلق جو ردّ و عمل ظاہر کرے گی۔ وہ بہر حال صرف مجلس عاملہ کی رائے ہوگی۔ وہ پوری مسلم قوم کی جانب سے منظوری یا نامنظوری کی ضمانت نہ ہوگی۔ اس پلان کے ایسے پہلو بھی ہیں جن کی قوم کے سامنے وضاحت کرنی پڑے گی اور پوری قوم کو اس پر راضی کرنا پڑے گا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا مسٹر جناح اگر آپ ذاتی طور پر اس پلان کے متعلق ہاں کر دیں تو میں مسلمانوں کی منظوری یا نامنظوری کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ بلکہ آپ کا صرف یہ کہنا بھی کافی ہوگا کہ آپ مسلمانوں کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔
اس کے بعد وائسرائے نے پلان کی کاپیاں لیڈروں میں تقسیم کر دیں اور انہیں کہا کہ آپ یہ نقلیں ہمراہ لے جائیں۔ اس کے مندرجات پر خود بھی غور کر لیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو اپنی مجالس عاملہ کو بھی دکھا لیں۔ لیکن بہر حال آپ کے جواب مجھے آج رات کے بارہ بجے تک مل جانے چاہئیں۔
پلان وہی تھا۔ جس کا علم لیڈروں کو پہلے سے تھا۔ ملک کے مختلف حصوں کو اتحاد ہندوستان یا تقسیم ہندوستان کے سوال پر اپنی خواہش کے اظہار کا موقعہ جس ضابطے کے

مطابق دیا جانے والا تھا۔ اور تقسیم کی صورت میں وہ الگ الگ مملکتوں کو معرض وجود میں لانے کے لئے جس پروگرام پر عمل کرنا مقصود تھا۔ وہ اس پلان کے پیروں کی صورت میں دہرائے گئے تھے۔ بہر حال قائد اعظم نے یہ دیکھ لیا کہ اس کے متن میں دونوں مملکتوں کے مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز موج نہ تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے ذہن میں اس تجویز کو ترک نہ کیا تھا۔ برطانوی کابینہ کا تاثر بھی یہی تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دونوں مملکتوں کا (اگر دو مملکتیں قائم ہوئیں) مشترک گورنر جنرل بنانے پر راضی ہیں۔ لیکن یہ سوال بہر حال دو مملکتوں کے قیام کی لازمی شرائط میں شامل نہ کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا بعد میں طے ہونے والی تفصیلات کی طرح پلان سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔

کانگریس نے اپنا تحریری جواب وائسرائے کو بھیج دیا۔ قائد اعظم نے پھر کوئی تحریری جواب نہ دیا اور رات کو وائسرائے سے مل کر زبانی کہا کہ میری مجلس عاملہ مفاہمت کی خاطر اس پلان کو منظور کرتی ہے۔ لیکن میں مسلم لیگ کونسل کی منظوری کے بغیر مسلم لیگ کی جانب سے کوئی حتمی وعدہ نہیں کر سکتا۔ آخری وقت اس بات نے وائسرائے کو خاصا پریشان کیا۔ لیکن اس نے کہا آپ مجھے کم از کم اس بات کی اجازت دیں کہ وزیر اعظم برطانیہ کو یہ یقین دلا سکوں کہ آپ ذاتی طور پر اسے قبول کرتے ہیں اور مسلم لیگ سے اسے منظور کرانے کی کوشش کریں گے۔ کل صبح میں کانفرنس میں اپنی طرف سے آپ کا یہی نقطہ بیان کر دوں گا۔ آپ صرف سر ہلا کر میرے بیان کی تائید کر دیں تو میں اسے کافی سمجھوں گا۔ قائد اعظم نے یہ بات مان لی۔ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جان میں جان آئی۔

اگلی صبح (۳ جون کو) سات لیڈر پھر وائسرائے کے ساتھ کانفرنس میں جمع ہوئے۔ کانگریس نے اپنے تحریری جواب میں ایک عجیب سوال اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ یہ تجویز پیش کی کہ صوبہ سرحد سے استصواب کے ذریعے دو کے بجائے تین سوال پوچھے جائیں۔ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ یا ہندوستان کا حصہ بننا چاہتا ہے یا دونوں سے الگ ایک آزاد مملکت کی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ کانگریس کے جواب کی نقلیں کانفرنس کے ممبروں کو مہیا کی گئی تھیں۔ ان پر نظر ڈال کر قائد اعظم نے صرف ایک سوال

پوچھا کہ کانگریس ہندوستان اور پاکستان سے الگ ہونے کا موقعہ صرف صوبہ سرحد کو دینا چاہتی ہے یا ہندوستان کے باقی صوبوں کو بھی اس قسم کا موقعہ دینے پر راضی ہے؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جلدی سے کہا "میں کانگریسی لیڈروں کی توجہ اس بات کی جانب دلا چکا ہوں۔ انہوں نے یہ تجویز ترک کر دی ہے"۔ اس کے بعد وائسرائے نے کہا کہ مجھے کانگریس اور سکھوں کی جانب سے تحریری جواب مل گئے ہیں۔ انہیں اس پلان کے ساتھ اتفاق ہے۔ مسلم لیگ کی جانب سے مجھے کوئی تحریری جواب نہیں ملا۔ لیکن مسٹر جناح نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ اس پلان کو کامیاب کرانے کی کوشش کریں گے۔ یہ کہہ کر وائسرائے نے مسٹر جناح کی جانب دیکھا۔ اور انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پختونستان" کا سٹنٹ پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جلدی جلدی کانفرنس کو ختم کیا اور برطانوی وزیر اعظم کو "لائن کلیئر" کا سگنل بھیج دیا۔

اسی دن اس فیصلے کا سرکاری اعلان کر دیا گیا۔ سب سے پہلے لندن میں برطانوی وزیر اعظم نے دارالعوام میں اس کا اعلان کیا۔ اس کے بعد شام کو دہلی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ قائد اعظم جناح اور سردار بلدیو سنگھ نے یکے بعد دیگرے آل انڈیا ریڈیو پر بیان دیئے۔

پنڈت نہرو نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں پرمسرت جذبات کے بجائے بجھے ہوئے دل سے ملک کو یہ دعوت دے رہا ہوں۔ کہ اس پلان کو منظور کر لیا جائے۔ اس پلان میں ہندوستان کی تقسیم کا امکان موجود ہے۔ اس پر ہمیں کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ یہ آزاد ہندوستان کے اس خواب کی جو ہم کئی پشتوں سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی دل خوش کن تعبیر نہیں ہے۔ لیکن اگر بعض علاقے ہندوستان سے علیحدگی پر مصر ہوں تو کانگریس اپنے اصولوں کے مطابق ان پر جبر کس طرح کر سکتی ہے؟ بہر حال اس تقسیم کا روشن پہلو یہ ہے کہ اس طرح آزادی ہمارے قریب آگئی ہے اور ہندوستان اندرونی وحدت کے لحاظ سے زیادہ مضبوط بن جائے گا۔

قائد اعظم جناح کے لیے یہ وقت اپنی فتح اور کامیابی کے اعلان کا تھا۔ حکومت

برطانیہ اور کانگریس کو ہندوستان کی تقسیم اور آزاد پاکستان کے قیام پر راضی کر لینا ایک کارنامہ عظیم تھا جس کی توفیق خدائے تعالیٰ نے انہیں بخشی تھی۔ لیکن اپنی نشری تقریر میں قائداعظمؒ نے بہت محتاط الفاظ استعمال کئے۔ آپ نے فرمایا کہ اس پلان کے ایسے پہلو بھی ہیں جو پورے طور پر مسلم لیگ کے نقطہ نگاہ کے مطابق نہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا مسلم لیگ کا کام ہے کہ مفاہمت کے طور پر اسے منظور کیا جائے۔ یا نہ کیا جائے۔ میں اس بارے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی رائے پر اثر انداز ہونا نہیں چاہتا۔ لیکن میں نے دہلی میں مسلم لیگی حلقوں کا جو ردّعمل معلوم کیا ہے وہ اسے منظور کرنے کے حق میں ہے۔ وائسرائے نے امن و امان کے ساتھ اور آئینی ضابطوں کے مطابق برطانیہ کی جانب سے اس برصغیر کے باشندوں کو اقتدار منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے یہ کوشش ایسی ہے کہ ہر شخص کو اس کے ساتھ تعاون کرکے ان کے کام میں آسانی پیدا کرنی چاہیئے۔

آپ نے ملک کے مختلف فرقوں بالخصوص مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ امن و امان قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ اور صوبہ سرحد کی صوبائی مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ وہ وزارت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک بند کردے۔ تقریر کے آخر میں قائداعظمؒ نے اپنے جذبات کا اظہار صرف ایک جملے کی صورت میں کیا۔ یہ جملہ تھا "پاکستان زندہ باد" جو تاریخ میں پہلی مرتبہ ریڈیو پر نشر ہوا۔

اس سے اگلے دن (۴ جون کو) لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں ملکی اور غیر ملکی صحافیوں کا غیر معمولی ہجوم تھا۔ محکمہ اطلاعات کے وزیر کی حیثیت سے سردار پٹیل نے اس کانفرنس کی صدارت کی۔ اور وائسرائے نے اخبار نویسوں کے سوالوں کے جواب دیئے۔

ایک اخبار نویس نے پوچھا "اگر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اس پلان کو نامنظور کر دیا تو کیا راستہ اختیار کیا جائے گا"۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ یہ سوال "اگر" سے شروع ہوتا ہے۔ اور ایک مفروضے پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔

پلان کے ایک پیرے میں جو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی صورت میں حد بندی

کمیشن کے تقرر کے متعلق تھا۔ یہ لکھا تھا کہ حد بندی میں مسلم اور غیر مسلم اکثریت کے علاقوں اور "دوسری باتوں" کا خیال رکھا جائے گا۔ "دوسری باتوں" سے کیا مراد تھی اور ان میں کیا باتیں شامل تھیں، یہ اس موضوع پر جو واقعی بہت اہم تھا، متعدد سوال پوچھے گئے۔ بعض سوال پوچھنے والے وائسرائے سے یہ کہلوانے کی کوشش کرتے رہے کہ ان دوسری باتوں میں مختلف فرقوں کی جائیداد اور املاک کا اندازہ بھی شامل ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پہلے سے طے شدہ اصول کے مطابق یہ واضح کر دیا کہ جائیداد اور املاک کا اندازہ حد بندی کے اصول پر اثر انداز نہ ہوگا۔ اصل بنیاد آبادی کی اکثریت ہی ہوگی۔ "دوسری باتوں" کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ کمیشن کو امکانی عملی دقتوں کے رفع کرنے کا اختیار حاصل رہے۔

اسی کانفرنس میں ماؤنٹ بیٹن نے اس امکان کی جانب بھی اشارہ کر دیا، کہ ایک یا دو ملکوں کی صورت میں برصغیر کی آزادی کی تکمیل توقعات سے بہت پہلے "غالباً ۱۵ اگست تک" کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

ابھی پارٹیوں کی جانب سے پلان کی رسمی منظوری کا مرحلہ باقی تھا — مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۱۰ جون ۱۹۴۷ء کو دہلی کے امپیریل ہوٹل کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں ہوا۔ اس کی کارروائی شروع ہوتے ہی خاکسار رضاکاروں کے ایک جتھے نے زبردستی اجلاس کے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ سیڑھیوں میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے رضاکاروں نے انہیں روکا۔ انہوں نے نیشنل گارڈ کے والنٹیروں کو دھکے مار کر راستہ صاف کرنا چاہا۔ ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ اور شور مچ گیا۔ بعض لوگوں کو چوٹیں بھی لگیں۔ اتنے میں پولیس آگئی۔ خاکسار رضاکاروں نے پولیس کی بھی مزاحمت کی۔ لیکن نیشنل گارڈ اور پولیس نے ان پر جلد ہی قابو پا لیا۔ اور انہیں ہوٹل سے باہر نکال دیا۔ یہ رضاکار کیا چاہتے تھے؟ لیگ کونسل کے اجلاس میں خلل ڈالنے سے ان کا مقصد کیا تھا؟ پولیس کی پوچھ گچھ پر ان کے سالار نے صرف اتنا بتایا کہ ہم اپنے امیر کے حکم سے اس جلسے کے حاضرین کو یہ بتانے آئے تھے کہ مسلمان اس پلان کو منظور نہیں کرتے۔



مہاجرین کی ایک سپیشل ٹرین



جسٹس دین محمد



جسٹس محمد منیر



سر سرل ریڈ کلف



جسٹس مہر چند مہاجن



جسٹس تیجا سنگھ

اجلاس میں امن و امان قائم ہونے کے بعد قائداعظمؒ نے اور ان کے بعد چند دوسرے مقررین نے تقریریں کیں۔ اور اتفاق رائے سے ایک قرارداد منظور کر لی جس میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے اصول پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ حکومت برطانیہ کی پلان کے تمام پہلوؤں کا بہ حیثیت مجموعی جائزہ لینا چاہیئے۔ اس تمہید کے ساتھ قائداعظمؒ کو اس بات کا اختیار دے دیا گیا کہ وہ تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر اس پلان کے متعلق جو کارروائی ضروری سمجھیں کریں۔
بعد میں پنڈت جواہر لال نہرو نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی توجہ ایک باضابطہ چٹھی کے ذریعے اس قرارداد کے متن کی جانب دلائی اور کہا کہ مسلم لیگ نے پلان کو منظور نہیں کیا۔ بلکہ صرف مسٹر جناح کو ضروری کارروائی (جس میں پلان کو منظور کرنا۔ نامنظور کرنا یا اس میں ترمیم کی کوشش کرنا شامل ہے) کا اختیار دیا ہے۔
لہٰذا منظوری کی شرط پوری کرنے کے لیئے اب کم از کم مسٹر جناح کو اس پلان کی منظوری کا حتمی اور غیر مبہم اعلان کرنا چاہیئے۔ کانگریس نے اس پلان کو آخری تصفیے کے طور پر منظور کیا ہے۔ یہ صورت ہمیں قبول نہیں کہ مسٹر جناح اپنے نقطۂ نگاہ سے اس میں ترمیم کرانے یا مزید مطالبات منوانے کی کوشش کے لیئے دروازہ کھلا رکھیں۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن جس حد تک مسٹر جناح کا تعاون حاصل کر چکے تھے۔ وہ اسے کافی سمجھتے تھے۔ انہوں نے دم دلاسا دے کر پنڈت نہرو کو خاموش کر دیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ۱۴ جون کو دہلی میں ہوا۔ اس میں پلان کی مخالفت زیادہ تر کانگریسی مسلمانوں نے کی۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ کانگریس نے مسلم لیگ کے سامنے ہتھیار ڈال کر عملاً "دو قومی" نظریہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور کانگریسی مسلمانوں کے لیئے "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کی کیفیت پیدا کر دی ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریر میں کہا کہ سب سے بہتر راستہ تو وہی تھا۔ جو کابینہ مشن پلان میں اختیار کیا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ اس پر سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اب حصولِ

آزادی کے لیئے موجودہ پلان کو مان لینے کے سوا چارہ نہیں۔ سردار پٹیل نے اپنے دل کی بات کہی وہ فرمانے لگے کہ "تولبی صاحب خواہ مخواہ مشن پلان کو یاد کر رہے ہیں۔ اگر مسلم لیگ اور کانگریس ایک ہی نظام میں ایک دوسرے کے ساتھ نتھی رہتیں تو وہی آئے دن کی رکاوٹ اور فضیحتی پیش آتی رہتی۔ جس کا تلخ تجربہ ہمیں عبوری حکومت میں ہو چکا ہے۔ مجھے کابینہ مشن پلان کو ردی کی ٹوکری میں پھینکے جانے پر قطعاً افسوس نہیں ہے۔" "اب ۳/۴ بلکہ ۴/۵ ہندوستان کانگریس کے زیر اقتدار ہوگا اور ہم اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ کسی اندرونی مخالفت کے بغیر اپنے ملک کی تعمیر کا کام سر انجام دے سکیں گے۔" جو قرارداد کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا۔ کہ پہاڑوں اور سمندروں نے ہندوستان کو ایک جغرافیائی وحدت بنا دیا ہے ہمارے دلوں میں ہمیشہ متحدہ ہندوستان کا تصور قائم رہے گا اور امید ہے کہ جب عوام کے جذبات مائل بہ سکون ہونگے تو وہ خود بخود دو قوموں کے غلط نظریہ کو ترک کر دیں گے۔ اس تمہید کے ساتھ پلان کی منظوری کی قرارداد پاس ہو گئی اور اس کے مطابق مختلف صوبوں کی رائے معلوم کرنے کا عملی پروگرام شروع ہو گیا۔

۴۳۔ گورنر جنرل عہدے کے لئے ماؤنٹ بیٹن کی تگ و دو

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل مقرر کئے جانے کا اس قدر خواہشمند کیوں تھا؟ اس کے متعلق قیاسات ہی کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جس شدت کے ساتھ اس نے اس مقصد کا تعاقب کیا۔ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی حیثیت کے انسان کے لئے خودداری کے تقاضوں کے بھی منافی تھا۔ قائد اعظم کے لئے اس کی پے درپے درخواستوں سے دامن چھڑانا مشکل ہو گیا۔ وہ ایک حملہ قائد اعظم پر اسی وقت کر چکا تھا۔ جب ۱۷ مئی ۱۹۴۷ء کو مسٹر جناح نے اس کے "مختصر نکات" کے مسودے کے "بنیادی اصولوں" کے ساتھ زبانی اتفاق ظاہر کیا تھا۔ اسی گفتگو میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز کے متعلق قائد اعظم کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ٹالنا چاہا۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اصرار کیا اور کہا کہ میں آپ کا ذاتی ردعمل معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ قائد اعظم نے کہا کہ اب تک اس سوال پر جو تھوڑا بہت غور کرنے کا موقعہ مجھے ملا ہے۔ اس کی بناء پر میری رائے ہے کہ دونوں مملکتوں کے گورنر جنرل الگ الگ ہونے چاہئیں لیکن ان دونوں سے اونچے درجے کا ایک عہدہ دار بھی ہو جو بادشاہ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے تقسیم کی تفصیلات کے متعلق دونوں مملکتوں کو مشورے دے سکے اور میری خواہش ہے کہ یہ عہدہ آپ کے پاس ہو۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔ معلوم نہیں حکومت برطانیہ اس قسم کی تجویز منظور کرے یا نہ کرے۔ کیا میں یہ خیال کر سکتا ہوں کہ اگر حکومت برطانیہ نے اس تجویز کو منظور نہ کیا تو پھر آپ اس متبادل صورت کو قبول کر لیں گے کہ عارضی مدت کے لئے ایک ہی شخص کو دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل مقرر کر دیا جائے۔ قائد اعظم نے کہا اس سوال کا جواب دینے کے لئے مجھے مزید غور کی ضرورت ہے۔

وائسرائے: "لیکن میں تو کل ہی لندن جا رہا ہوں۔" قائد اعظم: "میں کوشش کروں گا۔

کہ اپنی رائے آپ کے سٹاف کے کسی آدمی کو دے دوں۔ وہ آپ کو لندن اطلاع بھیج دے گا۔" وائسرائے مجبور ہو گیا اور قائد اعظم اس طرح دامن چھڑا کر چلے آئے۔

وائسرائے اپنے سیکرٹری سر ایرک میول کو دہلی میں چھوڑ گیا تھا۔ لندن سے اس نے سر ایرک کو پیغام بھیجا کہ مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز کے متعلق مسٹر جناح کا جواب لے کر بھیجو۔ مسٹر جناح اسے یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ جواب ابھی تیار نہیں اور سوچتے رہے کہ میں "ہاں" کہوں "یا نہ" کہہ دوں۔۔ وہ اپنے ذہن میں دونوں صورتوں کے فوائد اور خطرات کا موازنہ کر رہے تھے۔ ایک طرف یہ خطرہ تھا۔ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی درخواست کو مسترد کرنا اس کی ناراضگی مول لینا ہے۔ اور اگر وہ ناراض ہوا تو ممکن ہے کہ اپنی موجودہ حیثیت کو پاکستان کے خلاف استعمال کرے۔ لیکن دوسری طرف یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر تقسیم کے زمانے میں دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بنا دیا جائے تو نہ معلوم اس نے کانگریس کے ساتھ کیا ساز باز اور وعدے وعید کر رکھے ہیں۔ کانگریسی لیڈر جو تقسیم کے اصول کو مانتے ہی نہ تھے۔ اس کے کہنے پر مان گئے ہیں۔ اس کے پس پشت کوئی سازش تو نہیں؟

ماؤنٹ بیٹن بھی ہٹ کا پکا تھا اور یہ اعتماد رکھتا تھا کہ وہ ہر مزاحمت پر قابو پا سکتا ہے۔ جب تک وہ لندن میں رہا قائد اعظم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور ماؤنٹ بیٹن وہاں یہ تاثر دے آیا کہ دونوں مملکتیں اسے مشترکہ گورنر جنرل بنانے پر راضی ہو جائیں گی۔ دونوں مملکتوں کے پہلے گورنر جنرل کا نام اس بل میں درج کرنا ضروری تھا۔ جسے پاس کر کے پارلیمنٹ کی جانب سے انتقال اقتدار کا عمل آئینی لحاظ سے مکمل کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ جب بل تیار کیا گیا تو دونوں فریقوں کی رسمی منظوری حاصل ہونے تک اس میں گورنر جنرل کے ناموں کی جگہ خالی رکھی گئی۔

لندن سے واپس آ کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن چند دن سرکاری پلان کو منظور کرانے اور اس کا اعلان کرنے میں مصروف رہا۔ اس سے فارغ ہوتے ہی اس نے قائد اعظم پر نیا حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ ریاست حیدر آباد کے آئینی مشیر سر والٹر مانکٹن کو بیچ میں ڈالے اور اسے کہے کہ مسٹر جناح کو سمجھا بجھا کر راضی کرے۔ لیکن جب

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس تجویز کا ذکر اپنے سٹاف کے خاص آدمیوں سے کیا تو لارڈ اسمے اور سر ایرک میول نے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم خود مسٹر جناح سے ملیں گے اور مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز سے جو آسانیاں پیدا ہوں گی وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ مسٹر جناح کو ہم واضح نہ کریں۔ انہوں نے مسٹر جناح سے ملاقات کی کوشش کی۔ لیکن کئی دن تک قائد اعظم نے اپنی مصروفیات کی بنا پر انہیں ملاقات کا موقعہ ہی نہ دیا۔ وہ صرف مسٹر لیاقت علی خاں سے مل سکے اور ان سے مفصل گفتگو کر کے یہ وعدہ لے آئے کہ وہ دو ایک دن کے اندر مسٹر جناح کا جواب لے کر انہیں بھیج دیں گے۔

دن گذرتے گئے۔ مسٹر جناح کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ ۲۳ جون کو خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناح کو ملاقات کی دعوت دی۔ اور ان پر بھرپور حملہ کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہنے لگے کہ میں کسی ذاتی خواہش کی وجہ سے اس بات پر اصرار نہیں کرتا۔ مجھے خوشی ہو گی اگر کسی اور شخص کو دونوں ملکوں کا مشترکہ گورنر جنرل بنایا جا سکے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک مشترکہ غیر جانبدارانہ گورنر جنرل کی وجہ سے تقسیم کی مشکلات میں بے حد آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ قائد اعظم نے بھی قدرے صاف گوئی سے کام لیا۔ وہ بولے کہ مجھے جو کچھ تامل ہے اس سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ مجھے آپ پر اعتماد نہیں۔ لیکن میرا پہلا فرض اپنی قوم کے مفاد کی حفاظت ہے۔ اور مجھے فرض کی خاطر کئی مرتبہ عزیز دوستوں کو مایوس کرنا پڑا ہے۔ بہرحال میں اپنے فیصلے سے آپ کو عنقریب مطلع کر دوں گا۔ وائسرائے نے کہا کہ آزادی کے بل کا مسودہ مجھے موصول ہو گیا ہے۔ اس میں ایک اندراج کی تکمیل آپ کے فیصلے کی منتظر ہے۔ قائد اعظم نے فوراً اُرونے سخن بل کے مسودے کی جانب پھیر دیا۔ مسودے کا متن دیکھنے کی خواہش کی۔ اسے دیکھا اور اصل معاملے کے متعلق جواب دینے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔

اس گفتگو سے پورے نو دن کے بعد یعنی ۲ جولائی کو مسٹر جناح نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ پیغام بھجوایا کہ کئی وجوہات کی بنا پر میں نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ

خود سنبھالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس پر بھی ہتھیار نہ ڈالے بلکہ نواب بھوپال کو بلوایا۔ وہ بھوپال سے بھاگے بھاگے آئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ مسٹر جناح ان کی بات مان لیں گے۔ وائسرائے کی ہدایت پر وہ قائد اعظم سے ملے۔ لیکن واپسی پر انہوں نے بھی اپنی ناکامی بیان کی۔ ۵ر جولائی کی صبح کو مسٹر لیاقت علی خان کا رسمی خط مسلم لیگی وزارت کی جانب سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پہنچ گیا۔ جس میں بادشاہ سلامت کے پاس یہ سفارش کی گئی تھی کہ پاکستان کا پہلا گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح کو نامزد کر دیا جائے۔ اس طرح یہ رسہ کشی ختم ہوئی اور آزادی کے بل میں جو پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہونے والا تھا ضروری اندراج کر دیا گیا۔

اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کسی خیر کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اس شر کا خطرہ بھی نہ رہا تھا جو پاکستان اور ہندوستان کا مشترکہ اور صاحب اختیار وائسرائے بن کر وہ اگر چاہتا تو کر سکتا تھا۔

۴۴۔ تقسیم کے مسائل

۳ جون کی پلان میں درج شدہ ضابطوں کے مطابق متعلقہ صوبوں اور علاقوں نے ہندوستان سے الگ ہو کر پاکستان کا حصہ بننا منظور کر لیا تو تقسیم کی تفصیلات پر عمل شروع ہوا۔ اس غرض کے لئے دو الگ الگ حکومتوں کا وجود فرض کر لیا گیا اور دونوں حکومتوں نے مختلف درجے کی کمیٹیوں پر جو محکموں کی املاک ریکارڈ وغیرہ کی تقسیم پر مامور ہوئیں۔ اپنے اپنے نمائندے مساوی تعداد میں نامزد کر دیئے۔ جن نکات پر ان کمیٹیوں کے ممبر آپس میں تصفیہ نہ کر سکتے تھے ان کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک ٹریبونل مقرر تھا۔ سب سے اوپر ایک پارٹیشن کونسل تھی جو پالیسی کے متعلق فیصلے کرتی تھی۔ اس کونسل میں وزارتی سطح پر دونوں حکومتوں کے دو دو نمائندے شامل تھے۔ پارٹیشن کونسل کا صدر کون ہو؟ یہ سب سے اہم اور مشکل سوال تھا اس فیصلے کے بعد کہ ماؤنٹ بیٹن آئندہ صرف حکومت ہند کا گورنر جنرل بنے گا۔ اس کی حیثیت حقیقی غیر جانب داری کی نہ رہی تھی۔ لیکن اس بات سے کوئی مفر نہ تھا کہ آئینی لحاظ سے تقسیم کی تکمیل کرانے کی ذمہ داری بالآخر حکومت برطانیہ کی تھی جو اپنے اختیارات دو جانشین حکومتوں کو منتقل کر رہی تھی اور ۱۵ اگست تک حکومت برطانیہ کی طرف سے متحدہ ہندوستان کا گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن ہی تھا۔ لہٰذا اسے پارٹیشن کونسل کے صدر کے طور پر قبول کرنا ناگزیر تھا۔ لیکن اگر ۱۵ اگست کے بعد تقسیم کے کام کا کچھ حصہ باقی رہا تو اس کی تکمیل کرانے والے ادارے کی شکل کیا ہوگی؟ اس صورت میں یہ مطالبہ غیر آئینی نہ ہوتا کہ ۱۵ اگست کے بعد ماؤنٹ بیٹن پارٹیشن کونسل میں صرف بھارت کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہو اور کونسل کی صدارت کے لئے حکومت برطانیہ اپنے کسی اور غیر جانبدار نمائندے کو نامزد کرے۔ لیکن اس سے عملی فائدہ کیا ہوتا سوائے اسکے کہ کونسل میں دو ماؤنٹ بیٹن ہو جاتے؟ ان سب پہلوؤں پر غور کر کے قائد اعظم نے ماؤنٹ بیٹن کی توجہ آئینی پوزیشن کی جانب دلائی اور اس سے

یہ ذاتی وعدہ لیا کہ وہ ۱۵ اگست کے بعد بھی کونسل کے صدر کی ذمہ داری بھارت کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حکومت برطانیہ کے غیر جانب دار نمائندے کی حیثیت سے نبھائے گا۔ اس نے وثوق کے ساتھ یہ وعدہ کر لیا اور قائداعظم نے یہ انتظام منظور کر لیا کہ ۱۵ اگست کے بعد بھی تقسیم کے باقی ماندہ کام کی تکمیل کے لئے پارٹیشن کونسل اور ڈیفنس کونسل کا (جس کے زیر نگرانی فوج اور فوجی سامان کی تقسیم مکمل کرانا مقصود تھا) "غیر جانب دار" صدر وہی رہے۔ لیکن فوری طور پر قائداعظم نے آنے والی حکومت پاکستان کے نمائندے کے طور پر خود پارٹیشن کونسل کا ممبر بن کر اور ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ بیٹھ کر کونسل کے فیصلوں میں توازن قائم رکھنے کی کوشش کی۔

فوج کی نفری اور فوجی سامان کی تقسیم کا کام کمانڈر ان چیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک کے سپرد تھا۔ اس سلسلے میں یہ فیصلہ ہو گیا کہ ۱۵ اگست کے بعد دونوں مملکتوں کے اپنے الگ الگ کمانڈر ان چیف مقرر ہو جائیں گے۔ لیکن تقسیم کی تکمیل کے لئے آکن لک حکومت برطانیہ کی جانب سے ایک نیا عہدہ سنبھال لے گا جس کا نام "سپریم کمانڈر" ہوگا اور ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ ڈیفنس کونسل کے مشورے سے تقسیم کا باقی ماندہ کام کرتا رہے گا۔ اس انتظام کی تعمیل کے سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے ساتھ بہت عجیب اور بہت کھلی بدعہدی کی۔ آکن لیک نے فوج کی نفری کی تقسیم ۱۵ اگست تک مکمل کر دی۔ (گو پاکستان کے حصے میں آنے والے افسروں اور سپاہیوں کو بھارت سے پاکستان پہنچنے میں کچھ مزید وقت لگا)۔ اس کے بعد اس فوجی سامان کی تقسیم کا سوال رہ گیا جو فوجی ڈپوؤں میں پڑا تھا۔ بھارت کے لیڈروں کو غالباً یہ توقع نہ تھی کہ فوج کی نفری کی تقسیم اتنی تیزی کے ساتھ مکمل کر دی جائے گی۔ ایک موقعہ پر دہلی میں اخبار نویسوں سے غیر رسمی گفتگو میں سردار پٹیل کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا تھا کہ فوج کی نفری کو الگ الگ کرنے میں دو سال لگ جائیں گے۔ لہٰذا دو سال تک پاکستان کے پاس کوئی فوج ہی نہ ہو گی۔

آکن لک کے کام کی رفتار کو دیکھ کر ۱۵ اگست کے بعد مشترکہ دفاعی کونسل میں کانگریسی وزیروں نے اور کونسل کے باہر ہندو اخباروں نے یکایک شور مچانا شروع کر دیا

کہ آکن لیک بددیانتی کر رہا ہے۔ وہ بھارت کا دشمن ہے۔ اور پاکستان کی رعایت کر رہا ہے۔ لہٰذا سپریم کمانڈر کے عہدے کو ختم کیا جائے۔ کانگریسی لیڈروں کی جانب سے اس قسم کا پراپیگنڈہ غیر متوقع نہ تھا۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور حکومت برطانیہ سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ بھی آکن لیک کی ٹانگ کھینچ لیں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ کمال کیا کہ آکن لیک کے علم کے بغیر اور اس سے بالا بالا برطانیہ کی لیبر حکومت سے یہ فیصلہ کروا لیا کہ آکن لیک کے ہیڈ کوارٹرز کو ختم کر دیا جائے اور اسے واپس بلا لیا جائے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے ایک طویل اور معذرت آمیز خط میں آکن لیک کو اس فیصلے کی اطلاع دی اور ظاہر یہ کیا کہ یہ فیصلہ آکن لیک کو غلط اور بے بنیاد الزامات سے بچانے کے لئے کیا گیا ہے۔ آکن لیک نے اس سازش کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نہ کر سکا اور اپنے عہدے سے مستعفی ہو گیا۔ لہٰذا فوجی سامان کی تقسیم ہی نہ ہو سکی۔

تقسیم ہونے والے صوبوں کی نئی سرحدیں قائم کرنے کے لئے دو باؤنڈری کمیشن قائم کئے گئے۔ ہر کمیشن کی ممبری کے لئے دو جج حکومت پاکستان کے اور دو جج بھارت کی جانب سے نامزد کر دیئے گئے۔ پنجاب کے کمیشن کے لئے پاکستانی نمائندے جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر تھے اور مشرقی پاکستان کے لئے جسٹس صالح محمد اکرم اور جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان تھے۔ دونوں کمیشنوں کے لئے "غیر جانب دار" صدر کے طور پر حکومت برطانیہ کے تجویز کردہ سرل ریڈ کلف کو قبول کر لیا گیا۔ ریڈ کلف کے کام میں ماؤنٹ بیٹن نے جس حد تک دخل اندازی کی اور اس "غیر جانبدار" برطانوی قانون دان نے جس حد تک ماؤنٹ بیٹن کے مشورے قبول کئے اس کی بہت واضح شہادت بعد کے واقعات نے دی۔ ان کا ذکر آئندہ آئے گا۔

۵۴۔ ریڈکلف کی قلم سے ماؤنٹ بیٹن کا ایوارڈ

ریڈ کلف ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچنے کے بعد دو تین روز وہیں مقیم رہا۔ پھر اس نے ایک چکر کلکتہ کا لگایا۔ وہاں سے دہلی واپس آیا اور پھر لاہور پہلی مرتبہ ۱۴ جولائی کو پہنچا۔ کیا اس دوران میں اسے کچھ پڑھایا سکھایا گیا تھا؟ اس کی خاصی واضح شہادت فوراً ہی مل گئی۔ لاہور پہنچ کر ریڈکلف نے کمیشن کے ممبروں کے ایک اجلاس میں ضابطہ کار کی چند تفصیل طے کیں اور پھر جسٹس دین محمد سے (جنہیں کمیشن کے ممبروں نے بہ اتفاق رائے کمیشن کے نائب صدر کا اعزازی عہدہ دے دیا تھا) کہا کہ وہ اگلے دن ہوائی جہاز میں ایک خاص علاقے پر پرواز کرنا چاہتا ہے۔ یہ علاقہ پٹھان کوٹ تحصیل میں مادھوپور ہیڈ ورکس اور تحصیل گورداسپور، بٹالہ، اور ضلع امرتسر کے مختلف علاقوں پر مشتمل تھا۔ ریڈکلف نے یہ خواہش ظاہر کی کہ جسٹس دین محمد اس کے ہمراہ چلیں۔ ریڈ کلف کے پاس وائسرائے کا ہوائی جہاز موجود تھا۔

دین محمد صاحب نے معذوری ظاہر کی کہ ڈاکٹروں نے انہیں فضائی پرواز سے منع کیا ہے۔ پلان کے مطابق انکی جگہ جسٹس منیر اگلے دن مقررہ وقت پر ہوائی اڈے پر پہونچے لیکن کسی وجہ سے ریڈکلف نے یہ پروگرام منسوخ کر دیا۔ منسوخی کی وجہ موسم کی خرابی بتائی گئی۔

بہر حال جسٹس دین محمد اور جسٹس منیر کو (جن کی ذہنی تربیت ججی کی کرسیوں پر ہوئی تھی) یہ ایک بات بہت کھٹکی۔ ابھی پارٹیوں کے عرضی دعوے بھی کمیشن کے سامنے نہ آئے تھے۔ (یہ عرضی دعوے ۱۸ جولائی کو داخل کئے گئے) ابھی یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اختلاف کون سے علاقے کے متعلق ہوگا اور کن علاقوں کے متعلق فیصلہ طلب نزاع کمیشن کے سامنے آئیں گے۔ پھر اس مرحلے پر ریڈ کلف کے لیے کسی خاص

علاقے میں دلچسپی کی وجہ کیا ہو سکتی تھی ؟ دونوں مسلمان ججوں نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ اتنی بات صاف ظاہر ہے کہ کسی ذریعے نے مقدمے کے نکات کمیشن کے سامنے آنے سے پہلے ہی ان کے متعلق ریڈ کلف کے ذہن کو ہموار کرنے کی کوشش کی ہے اور ریڈ کلف مقدمہ سننے سے پہلے ہی مقدمہ کے خاص نکات سے واقفیت اور دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت وہ نہیں ہے۔ جو جوڈیشل روایات کے مطابق ایک بے لاگ اور غیر جانبدار جج کی ہونی چاہیئے۔ یہ بات قائداعظم رح کے نوٹس میں لانی چاہیئے اور اگر کمیشن کے مسلمان ممبر اس سوال پر مستعفی ہونے کا قدم اٹھائیں۔ تو ماؤنٹ بیٹن کی لیپی پوتی کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ریڈ کلف کو کسی خاص علاقے کے متعلق پیشگی دلچسپی لینے پر آمادہ کرنے والا ماؤنٹ بیٹن کے سوا کون ہو سکتا تھا ؟

جسٹس دین محمد نے اس غرض کے لیئے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ اور قائداعظم رح سے ملاقات کی اور دونوں مسلمان ججوں کی جانب سے استعفیٰ دینے کی پیش کش کی۔ لیکن قائداعظم رح نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جو کچھ ہوا ہے۔ صرف اس کی بناء پر ریڈ کلف کے خلاف ثبوت طور پر جانبداری کا الزام لگانا درست نہ ہوگا۔ دونوں مسلمان ججوں نے قائداعظم رح کے مشورے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

حد بندی کے مسئلے کے ایک خاص نکتے میں ریڈ کلف کی پیشگی دلچسپی کو بعض دوسرے واقعات کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن غالباً ۳ جون کی پلان کی منظوری سے پہلے ہی پنڈت جواہر لال کے ساتھ کم از کم اس حد تک ایگریمنٹ کر چکا تھا کہ گورداسپور کے پورے ضلع کو (جو مسلم اکثریت کا ضلع تھا) پاکستانی پنجاب میں شامل کرنے کے بجائے اس طرح تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کہ کم از کم پٹھان کوٹ کی تحصیل بھارتی علاقے میں شامل ہو جائے۔ تحصیل پٹھانکوٹ کی خاص جغرافیائی اہمیت یہ تھی کہ اس کا ایک سرا ریاست جموں و کشمیر کے علاقے سے ملحق تھا۔ لہٰذا اگر یہ تحصیل بھارت کا حصہ بن جائے تو بھارت کی سرحد اس ریاست

سے جا ملتی تھی اور بھارت کو اس ریاست تک پہنچنے کا راستہ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھارت اور اس ریاست کے درمیان کوئی جغرافیائی تعلق نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ریاست کی باقی ماندہ سرحد پنجاب کے جن اضلاع (سیالکوٹ۔ گجرات۔ جہلم۔ راولپنڈی) کے ساتھ ملتی تھی۔ وہ بہت ہی ٹھوس مسلم اکثریت کے اضلاع تھے۔ انہیں بھارتی پنجاب میں لانے کا کوئی قابل توجہ بہانہ نہ بن سکتا تھا۔ ضلع گورداسپور کے متعلق صورت یہ تھی کہ اگر پورے ضلع کا حساب لگایا جائے۔ تو مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن اس کی تحصیل پٹھانکوٹ میں ہندو اکثریت تھی۔ لہٰذا اسے باقی ضلع سے الگ کر کے مشرقی پنجاب میں شامل کرنے کے لیے بھلا برا بہانہ موجود تھا۔ اس تحصیل کی جغرافیائی اہمیت کی دو اور وجوہ بھی تھیں۔ دریائے راوی سے نکلنے والی نہروں کی چابی یعنی مادھوپور ہیڈ ورکس اسی تحصیل میں تھا۔ اس کے علاوہ اگر تحصیل پٹھانکوٹ مشرقی پنجاب میں چلی جائے اور امرتسر کا ضلع بھی (جیسا کہ غالب قیاس تھا) مشرقی پنجاب کا حصہ بنے تو امرتسر اور پٹھانکوٹ کے درمیان سڑک۔ ریل وغیرہ کے موجودہ مواصلاتی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے ضلع گورداسپور کی دو اور تحصیلوں (گورداسپور اور بٹالہ) کو بھی مشرقی پنجاب کے حوالے کرنے کا بہانہ پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن تحصیل پٹھانکوٹ کی اصل اہمیت کشمیر ہی کی وجہ سے تھی۔

اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن ایک اشارہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو دے چکا تھا۔ ۳ جون کی پلان میں پنجاب کی عارضی تقسیم کا نقشہ شامل کیا گیا تھا۔ جس کی بنا پر اسمبلی کے ممبروں کے دو گروپ بنائے گئے تھے اور دونوں گروپوں کو الگ الگ فیصلوں کا حق دیا گیا تھا۔ اس کے مطابق مسلم اکثریت کے سترہ اضلاع (ضلع گورداسپور سمیت) مغربی پنجاب میں شامل تھے اور غیر مسلم اکثریت کے باقی تیرہ اضلاع مشرقی پنجاب میں شامل تھے۔ ۴ جون ۱۹۴۷ء کی شام کو ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا: "یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ وہ خط تقسیم جو باؤنڈری کمیشن کھینچے گا ہو بہو اس لائن کے مطابق نہ ہو گا جو عارضی تقسیم میں اختیار کی گئی ہے" یہ الفاظ بے ضرر

اور ناقابلِ اعتراض تھے۔ لیکن اگلے دن دہلی کی پریس کانفرنس میں اس نے اپنے فقرے کی توضیح کرتے ہوئے کہا " اس کی وجہ ظاہر ہے۔ پنجاب کے ضلع گورداسپور میں آبادی کا تناسب اس طرح ہے۔ مسلمان ۵۰٫۴ فیصد اور غیر مسلم ۴۹٫۶ فیصد۔ ان کے درمیان صرف ۸ء کا فرق ہے۔ آپ فوراً اندازہ لگا سکتے ہیں یہ بات غیر اغلب ہے کہ سرحدی کمیشن گورداسپور کے پورے ضلع کو مسلم اکثریت کے علاقے میں شامل کر دے گا۔"

آبادی کے جو اعداد ماؤنٹ بیٹن نے بتائے وہ بالکل غلط تھے۔ صحیح اعداد (جنہیں بعد میں ہر فریق نے تسلیم کر لیا) مردم شماری کی رو سے یہ تھے۔ اس ضلع میں مسلمان آبادی کا تناسب ۵۱٫۱۴ فیصد تھا اور غیر مسلم آبادی کا تناسب ۴۸٫۸۶ فیصد۔ یعنی ان کے درمیان فرق ۸ء فیصد کا نہ تھا۔ بلکہ ۲٫۲۸ فیصد تھا۔ اس کے علاوہ اصل نکتہ یہ تھا کہ اکثریت بہرحال اکثریت تھی۔ خواہ وہ تھوڑی تھی یا بہت۔ ۳ جون کی پلان میں (اور اس کے مطابق کمیشن کے ہدایت نامے میں) فقط "مسلم اکثریت کے علاقے" کا ذکر تھا۔ تھوڑی یا بہت اکثریت کی تخصیص نہ کی گئی تھی۔ ضلع گورداسپور کے متعلق ماؤنٹ بیٹن کے پیشگی اظہار رائے کے صاف معنی یہ تھے کہ وہ اسی وقت سے اس ضلع کو تقسیم کرانے کے لئے بے تاب تھا۔

ریڈکلف اپنے سامنے پیش ہونے والے مقدمے کے اسی خاص نکتے میں پیشگی دلچسپی لے رہا تھا۔ جس علاقے پر وہ پرواز کرنا چاہتا تھا۔ یہی علاقہ تھا جس کا ضلع گورداسپور کی تقسیم سے تعلق تھا۔ جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر اس خاص نکتے کی اہمیت سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ریڈکلف کا رویہ انہیں خاص طور پر معنی خیز معلوم ہوا تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی یہ تھی کہ کمیشن کے ان مسلمان ممبروں کو ابھی یہ علم نہ تھا کہ جس چیز (تحصیل پٹھانکوٹ اور اس کے ذریعے کشمیر میں بھارت کی مداخلت کے امکان) کو بچانے کے لئے وہ اتنی دور دراز کی باتیں سوچ رہے تھے اور راستے پیش کرنے کی تجویز کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کے مقدمے کی پیروی کرنے والے

حضرات اسے خود ہی چاندی کی طشتری میں رکھ کر بھارت کو پیش کر رہے تھے۔ ریڈ کلف کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کے مقدمہ کی پیروی ملوبائی لیڈروں کے ذمہ تھی جب ان کا مرتب کیا ہوا میمورنڈم جو عرضی دعوے کی حیثیت رکھتا تھا۔ کمیشن کے سامنے آیا تو مسلمان مچ اسے پڑھ کر حیران رہ گئے۔ اس میمورنڈم میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا اور اس پر بہت زور دیا گیا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم علاقے یا "مغربی پنجاب" اور "مشرقی پنجاب" کی اصولی حد ود متعین کرنے کے لئے "ضلع" کو یونٹ قرار دینا غلط ہے۔ اس کے لیے "تحصیل" کو یونٹ قرار دینا چاہیئے۔ پھر جو بنیادی نقشہ اس طرح قائم ہو۔ اسے آخری شکل دینے کے لیئے اس میں "دوسرے امور" کی بنا پر مناسب ردو بدل کر دیا جائے۔ ان اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے واضح الفاظ میں ایک طرف تحصیل پٹھانکوٹ کو مشرقی پنجاب کا حصہ اور دوسری طرف ضلع فیروزپور کی تحصیل فیروزپور اور زیرہ کو (اور پھر ان کے ساتھ ملحق ہونے والی تحصیل نکودر اور تحصیل جالندھر کو) مغربی پنجاب کا حصہ قرار دیا۔

اس طرزِ استدلال سے جو عملی نتائج مرتب ہو سکتے تھے وہ یہ تھے۔

(۱) تحصیل پٹھانکوٹ کی بنیادی حیثیت اتفاق رائے کے ساتھ طے ہو گئی۔ یعنی اس بات کا ایوارڈ سے پہلے ہی تصفیہ ہو گیا کہ یہ تحصیل بنیادی طور پر مشرقی پنجاب کا حصہ ہے۔ یہ نکتہ بحث اور اختلاف کے دائرے سے خارج ہو گیا۔ بحث صرف اس بات پر رہ گئی کہ "دوسرے امور" کی بنا پر اس تحصیل کو مشرقی پنجاب میں شامل کرتے وقت کوئی ردو بدل یا کتر بیونت کی جائے یا نہ کی جائے۔ (۲) جس چیز کو حاصل کرنے کی امید میں تحصیل پٹھانکوٹ سے دست برداری کر دی گئی۔ یعنی ضلع فیروزپور کی دو تحصیلیں اور ان سے ملحق ضلع جالندھر کی دو تحصیلیں وہ بدستور بحث و نزاع کا موضوع بنی رہیں۔ یعنی ایک امید موہوم (جالندھر کی تحصیلوں کے متعلق یہ امید بالخصوص موہوم تھی) کے بالعوض پٹھانکوٹ کی تحصیل کا تحفہ بھارت کو پیش کر دیا گیا۔

جسٹس دین محمد کو مسلم لیگ کے میمورنڈم کا مطالعہ کرنے کے تھوڑی دیر بعد کسی تقریب میں چودھری ظفر اللہ خاں سے (جو مسلم لیگ کے وکیل تھے) ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے علاحدگی میں چودھری صاحب کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ میمورنڈم میں مسلم لیگ مطالبات کو عجیب طرح پیش کیا گیا تھا جس کا نتیجہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چودھری صاحب نے جواب دیا کہ مسلم لیگ نے مجھے اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ مطالبات مرتب کرنا مسلم لیگ کا کام تھا۔ وکیل کا فرض موکل کے مطالبات کی وکالت کرنا ہے۔

ان مطالبات کی تفاصیل مرتب کرنے کی ذمہ داری کس نے کس کو سونپی تھی؟ مقامی طور پر مسلم لیگ کے کاموں کی ذمہ داری بہر حال صوبائی لیگ کے صدر نواب ممدوٹ پر عائد ہوتی تھی۔ کیا مسلم لیگ کے میمورنڈم کی تیاری کے سلسلے میں یہ نقطۂ نگاہ ان کی ذمہ داری پر اختیار کیا گیا تھا کہ ضلع گورداسپور کی تقسیم کا اصول خود ہی تسلیم کر لیا جائے۔ تاکہ ضلع فیروز پور کی تقسیم پر زور دیا جا سکے اور ممدوٹ اسٹیٹ کو پاکستان میں لایا جا سکے؟

بھارت کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر کا الحاق حاصل کرنے کے لیئے پہلی شرط یہ تھی کہ تحصیل پٹھانکوٹ بھارت میں شامل ہو جائے۔ اس کے بعد دوسری شرط یہ تھی کہ جب مہاراجہ کشمیر کے لیئے دونوں ملکوں (پاکستان اور ہندوستان) میں اپنی مرضی کے مطابق انتخاب کرنے کا امکان پیدا ہو جائے تو وہ بھارت کو پاکستان پر ترجیح دے۔ جب ریڈکلف کمیشن کے سامنے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو بھارتی لیڈروں کو یقین تھا کہ پہلی شرط پوری ہو جائے گی۔ کیا ریڈکلف کے ساتھ دہلی میں ماؤنٹ بیٹن کی بات چیت کے بعد انہیں یہ اشارہ مل گیا تھا؟ یا مسلم لیگ کے میمورنڈم نے انہیں یقین دلا دیا تھا؟ یا دونوں باتیں تھیں؟ بہر صورت وجہ خواہ کچھ تھی۔ کانگریسی لیڈروں نے جولائی ہی میں (ابھی مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تھی) مہاراجہ کو رام کرنے کی زبردست کوشش شروع کر دی۔ جولائی میں کانگریس کے صدر مسٹر

کرپلانی سرینگر گئے اور مہاراجہ سے ملے۔ اگست کے شروع میں مہاتما گاندھی وہاں تشریف لے گئے۔ اس حیثیت کے سفیروں کو زحمت دینے کا سوال اس یقین کے بغیر پیدا نہ ہوتا تھا کہ الحاق کے فیصلے کی پہلی شرط (تحصیل پٹھانکوٹ کی بھارت میں شمولیت) ایک طے شدہ بات تھی۔ ۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود بھی سرینگر پہنچ چکا اور تین دن وہاں ٹھہرا۔ اس زمانے میں ماؤنٹ بیٹن آنے والی آئینی تبدیلیوں کے پیش نظر والیان ریاست کو بہت زور شور سے یہ مشورہ دے رہا تھا کہ وہ اپنی اپنی پسند کی ڈومین (پاکستان یا ہندوستان) کے ساتھ جلد از جلد تقسیم کی تاریخ سے پہلے ہی الحاق کر لیں۔ ماؤنٹ بیٹن نام دونوں مملکتوں کا لیتا تھا۔ لیکن عملاً اس کی تمام کوشش زیادہ سے زیادہ ریاستوں کو جلد از جلد بھارت کے ساتھ ملحق کرنے کے لیے تھی۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی شخصیت کے رعب اور اپنی جادوگری کے تمام طریقوں سے پورا کام لے رہا تھا۔ اور والیان ریاست اور ان کے وزیروں کو ڈرانے دھمکانے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ سرینگر میں بھی وہ مہاراجہ کشمیر کو یہی مشورہ دینے گیا تھا۔ لیکن کیا پاکستان کے ساتھ الحاق کا مشورہ؟ اس نے قائد اعظم کو بھی تاثر دیا۔ سرینگر میں مہاراجہ کے ساتھ اس کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن دہلی واپس آکر اس نے قائد اعظم کو بتایا کہ مہاراجہ کے ساتھ اس کی ملاقاتوں میں دوسری غیر متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ الحاق کے مسئلے پر گفتگو کے لیے آخری دن کا وقت مقرر تھا۔ لیکن آخری دن مہاراجہ بیمار ہو گیا۔ اور ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ ماؤنٹ بیٹن کی یہ بات بظاہر لچر پوچ نظر آتی تھی۔ لیکن قائد اعظم یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ فی الحقیقت ماؤنٹ بیٹن مہاراجہ سے کیا کہہ آیا تھا۔ اسے کیا تاثر دے آیا تھا۔ اور کیا تاثر لے آیا تھا؟ اور کیا ماؤنٹ بیٹن کے تاثرات کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ مہاراجہ پر اثر ڈالنے کے لیے مہاتما گاندھی کی حیثیت کے سفیر سے کام لینے کی ضرورت تھی؟ کون کہہ سکتا ہے؟

ایک طرف بھارتی لیڈر اپنے چوٹی کے آدمیوں کو مہاراجہ کشمیر کے پاس بھیج رہے تھے۔ دوسری طرف ریڈکلف کمیشن کے سامنے فریقین (عملاً دو ہی فریق

تھے کیونکہ کانگریس اور سکھ ایک ہی فریق کی طرح کام کر رہے تھے) بحثوں میں مصروف تھے۔ اس بحث کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اس پورے مقدمے کی سماعت کے زمانے میں خود ریڈکلف ایک دن بھی کمیشن کے سامنے نہیں بیٹھا اور فریقین عملاً ایک دوسرے کے سامنے بحث کرتے رہے۔ ریڈکلف کو پہلے سے معلوم تھا کہ اسے کیا ایوارڈ دینا تھا۔ لاہور میں بحث جولائی کے آخر تک ختم ہو گئی۔ پھر ریڈکلف نے کمیشن کے ممبروں کو شملہ میں جمع کیا۔ وہاں اس نے ممبروں سے کہا کہ وہ وکلاء کی بحث کی روشنی میں اپنی اپنی رپورٹ لکھ کر چار دن کے اندر اسے دیں۔ ان رپورٹوں کی بناء پر اس نے ممبروں کے ساتھ فرداً فرداً بحث کی۔ جسٹس منیر نے ضلع فیروزپور کی تحصیل فیروزپور اور زیرہ کے متعلق بحث کرنی چاہی۔ تو ریڈکلف نے انہیں بہت واضح الفاظ میں کہا کہ اس نکتہ پر بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں تحصیلیں مغربی پاکستان میں شامل کی جا رہی ہیں۔ ریڈکلف پاکستان کے ساتھ یہ لنگڑا انصاف کرنا چاہتا تھا کہ جس اصول پر وہ ضلع گورداسپور کو تقسیم کر کے اس کی تین تحصیلیں (پٹھانکوٹ گورداسپور اور بٹالہ) بھارت کے حصے میں ڈال رہا تھا۔ اسی اصول پر ضلع فیروزپور کو تقسیم کر کے اس کی کم از کم دو تحصیلیں پاکستان کو دے دے۔ تو اسے حکومت کو اس فیصلے کی اطلاع اور اس کے ساتھ مبارکباد بھی مل گئیں۔ یہ مژدہ لیاقت علی خاں کو بھی پہنچا دیا گیا کہ ایوارڈ بحیثیت مجموعی عارضی تقسیم سے چنداں مختلف نہیں۔ اگر ضلع گورداسپور کی ایک دو تحصیلیں پاکستان کے حصے سے خارج ہوں گی تو ان کے معاوضہ میں ضلع فیروزپور کی دو تحصیلوں کا پاکستان کے رقبہ میں اضافہ ہو جائے گا۔ جسٹس دین محمد نے ایک مرتبہ پھر یہ بات قائداعظم کے گوش گزار کرنے کی کوشش کی کہ ضلع گورداسپور کا بیشتر حصہ ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اگر اسے بچانے کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے تو کر لیا جائے۔ لیکن زمانہ وہ تھا جب قائداعظم اور لیاقت علی اور دوسرے مسلم لیگی اکابر کراچی میں آزادی کے رسمی اعلان کی تیاریاں اور حکومت پاکستان کے دفاتر قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جسٹس دین محمد کی ملاقات صرف لیاقت علی خاں سے

ہو سکی۔ لیاقت علی نے ان کی بات سن کر کہا کہ ضلع گورداسپور کی تحصیلوں کے معاوضے میں غالباً ہمیں کچھ مل بھی رہا ہے۔ جسٹس دین محمد نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ہمیں یہ معاوضہ بھی نہ ملے گا۔ ممکن ہے لیاقت علی خان کو اس وقت تک تحصیل پٹھانکوٹ کی خاص اہمیت سے بے خبر رکھا گیا ہو۔ بہرحال اب آخری وقت جب پاکستان کا سلطہ ہاتھی تمام خطروں کے سیلاب کو عبور کر کے کنارے پہ آپہنچا تھا۔ اس ہاتھی کی دم کے ایک سرے کی خاطر کوئی نیا سوال اٹھانے کا موقع نہ رہا تھا۔ لیاقت علی خان کا یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ محض پٹھانکوٹ تحصیل کی وجہ سے نہ ہو جائے گا۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے (خود ماؤنٹ بیٹن کے پبلسٹی سیکرٹری کیمبل جانسن نے اسے اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے) کہ ماؤنٹ بیٹن کو ریڈ کلف کا ایوارڈ ۹ اگست کو مل گیا تھا۔ لیکن اس نے آٹھ دن کی تاخیر کے بعد اسے ۱۷ اگست کو شائع کیا۔ بعد میں ایک فائل کے ذریعے یہ راز طشت ازبام ہوا کہ ریڈ کلف کے پہلے ایوارڈ میں فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلوں کو فی الواقعہ مغربی پاکستان میں شامل کیا گیا تھا۔ لیکن ۹ اگست اور ۱۷ اگست کے درمیانی عرصے جب ایوارڈ کو بدلا گیا اور ان دو تحصیلوں کو بھی مشرقی پنجاب میں شامل کر دیا گیا۔ یہ فائل دوسرے کاغذات کے ساتھ لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں ایک خفیہ فائلوں کی الماری میں پڑی رہ گئی تھی۔ اس طرح یہ پاکستانی پنجاب کے پہلے گورنر فرانسس موڈی کے نوٹس میں آئی۔ جس نے اسے قائداعظمؒ کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ فائل گورنر جینکنز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک یادداشت پر مشتمل تھی جس سے قطعی طور پہ ثابت ہوتا تھا کہ ۸ اگست ۱۹۴۷ء کو جینکنز کی گفتگو ٹیلیفون پر گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کے سیکرٹری مسٹر جارج ایبل کے ساتھ ہوئی۔ گورنر جینکنز یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا ریڈ کلف ایوارڈ کی کوئی آخری شکل معین ہو گئی ہے اور اگر ہو گئی ہے تو کیا ہے۔ جینکنز کو یہ معلومات اپنے انتظامات کے سلسلہ میں جلد از جلد درکار تھیں۔ جارج ایبل نے کہا کہ ایوارڈ ابھی گورنر جنرل کو موصول نہیں ہوا۔ لیکن وہ خود ریڈ کلف یا اس کے عملے سے پوچھ کر بتا سکے گا۔ اس کے بعد اسی دن یعنی ۸ اگست کو جارج ایبل نے جینکنز کو اطلاع دی اور ایوارڈ کی آخری شکل کے

خطوط کھچائے جو کچھ اس نے بیان کیا۔ اس کی بنا پر جینکنز نے ایک خاکہ بنا لیا۔ اس خاکے میں فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلیں مغربی پنجاب میں شامل تھیں۔ اور یہ خاکہ بھی فائل میں موجود تھا۔ اس فائل کے مندرجات میں ۸ ر اگست کی تاریخ کا ذکر اہم تھا۔ اگر ریڈ کلف ایوارڈ گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کو ۹ ر اگست کی صبح کو موصول ہو گیا تھا۔ تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ دستاویز ۸ ر اگست کو تیار ہو چکی تھی اور جارج ایبل نے جو اطلاع جینکنز کو دی تھی۔ وہ اسی فیصلے کی بنیاد پر دی تھی۔ جو اس دستاویز میں درج تھا۔ فی الحقیقت یہ بات خارج از بحث تھی۔ کہ ریڈ کلف یا اس کے عملے کا کوئی آدمی قطعی فیصلے کے بغیر جارج ایبل کو یہ اطلاع دے سکتا تھا۔ ۱۷ ر اگست کو جو ایوارڈ شائع ہوا اس میں فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلوں کو مشرقی پنجاب کا حصہ دکھایا گیا تھا۔ ۹ ر اگست اور ۱۷ ر اگست کے درمیانی عرصے میں اس ردّ و بدل کے معنی ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کی ملی بھگت اور مشترکہ بے ایمانی کے سوا کیا ہو سکتے تھے۔

۲۶۔ آزادی کے راستے میں خون کی ندیاں

پنجاب کے گورنر جنکنز کی نیم سرکاری چٹھی مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۴۷ء لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام :-

"ڈیئر لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ سکھوں کے لیڈر گیانی کرتار سنگھ نے ابھی مجھ سے انٹرویو کیا ہے۔ اس انٹرویو کی روئیداد شاید آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گی"۔۔۔ انٹرویو کی حسب ذیل روئیداد اس چٹھی کے ساتھ منسلک تھی۔

"گیانی کرتار سنگھ مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ وہ آزادی ہندوستان اور حد بندی کمیشن کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے آیا تھا۔ وہ یہ بات صاف صاف کہنا چاہتا تھا کہ اگر تقسیم کے معاملے میں سکھوں کی حمایت کا خیال نہ رکھا گیا تو سکھ گوریلا جنگ لڑیں گے۔ اس نے کہا کہ انگریز ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اقلیتوں کا خیال رکھیں گے۔ لیکن اس کا عملی نتیجہ کیا ہوا ہے؟ سکھوں کے ساتھ انگریزوں نے بدعہدی کی ہے۔

"میں نے اسے بتایا کہ مجھے سکھوں کی بے اطمینانی کا احساس ہے۔ لیکن جب کسی ملک میں آزادی آتی ہے تو بعض طبقوں کو جو بیرونی حکومت کے ماتحت اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ صورت حال کے لئے سکھ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ سکھوں نے خود پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کرنے میں پہل کی تھی اور بلدیو سنگھ نے سکھوں کی جانب سے ۳ جون کی پلان کو قبول کیا ہے۔

"گیانی نے کہا کہ سکھوں کا یا بلدیو سنگھ کا یہ خیال نہ تھا کہ پنجاب کی تقسیم محض مسلم اور غیر مسلم آبادی کی تعداد کی بناء پر ہو گی۔ تقسیم کے سلسلے میں جائدادوں اور املاک کا بھی اسی طرح لحاظ کرنا ضروری ہے جس طرح آبادی کا۔ سکھوں کو ننکانہ صاحب لازماً ملنا چاہئے۔ اس کے علاوہ انہیں کم از کم ایک نہری سسٹم ملنا چاہئے۔ گیانی نے مزید کہا کہ اگر حکومت برطانیہ اور وائسرائے

نے اور پارٹی لیڈروں نے اس بات کا احساس دلایا کہ سکھوں کی قسمت کا سوال ایک اہم حل طلب مسئلہ ہے تو سکھ مرنے مارنے کو تیار ہیں۔ وہ ہر انقلابی طریقے سے لڑیں گے۔ افسروں کو قتل کریں گے۔ ریلوے لائنوں کو کاٹ دیں گے۔ نہروں کے ہیڈورکس کو تباہ کریں گے وغیرہ۔ وغیرہ۔

میں نے اسے سمجھایا کہ سکھوں کے لئے اس قسم کی پالیسی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس نے جواب دیا کہ اگر کوئی طاقت انگلستان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتی تو انگریز اپنے لئے اس قسم کی پالیسی اختیار کرنا غلط نہ سمجھتے۔ آخر میں گیانی نے مجھ سے اپیل کی کہ میں اس آڑے وقت میں سکھوں کی مدد کروں۔ ورنہ پنجاب خون اور آنسوؤں کی دنیا بن کر رہ جائے گا۔ گیانی یہ کہہ رہا تھا تو خود اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے"

اس انٹرویو کے متعلق گورنر جینکنز کی اپنی مرتب کی ہوئی روداد جو سرکاری ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کہ وہ فساد اور خون ریزی کی دھمکیاں سنتا تھا۔ لیکن جواب میں ایک لفظ بھی ایسا نہ کہتا تھا جس سے سکھ لیڈروں کو یہ خیال ہو کہ حکومت فساد کی تیاریوں کو روکنے کے لئے کوئی قدم اٹھائے گی۔ فی الحقیقت فساد کی منظم تیاریاں اس ملاقات کی تاریخ (۱۰ جولائی سنہ ۱۹۴۷ء) کے بعد شروع نہیں ہوئیں بلکہ اس سے کم از کم ایک مہینہ پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ صوبائی پولیس کے افسران تیاریوں کے متعلق گورنر کو (جس کی شخصی حکومت اس صوبے میں قائم تھی) رپورٹیں دیتے رہے اور انسدادی تجاویز بھی پیش کرتے رہے۔ لیکن گورنر اپنی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ ایک رپورٹ پر اس نے یہ حکم لکھ کر فائل واپس بھیج دی کہ اب ان لوگوں کو گرفتار کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ دو تین مہینوں کے بعد نئی حکومتیں انہیں رہا کر دیں گی۔

وسیع پیمانے پر منظم قتل و غارت کے لئے ان تیاریوں کا مقصد کیا تھا؟ ایک مقصد تو وہی تھا جو گیانی کرتار سنگھ نے گورنر جینکنز سے بیان کیا تھا۔ یعنی آئینی طریقوں سے مایوس ہو کر فساد اور خانہ جنگی کے حربوں سے مغربی اور مشرقی پنجاب کی سرحد کو اپنی مرضی کے مطابق متعین کرانے کی کوشش۔ دوسرا مقصد محض فساد برائے فساد یا فساد برائے انتقام تھا۔ پنجاب

میں فرقہ وارانہ فسادات کی ایک لہر مارچ ۱۹۴۷ء میں ابھر کر دب چکی تھی۔ اس کے بعد بعض سکھ لیڈروں نے اپنے ذہن پر شدید انتقامی جذبات حاوی کر لئے تھے اور اس دماغ کو جہاں کے خیال کے مطابق مارچ کے فسادات سکھوں کی روایتی بہادری پر لگ گئے تھے۔ مشرقی پنجاب کی مسلم اقلیت کے خون سے دھونے پر کمر باندھ لی تھی۔ اس مقصد کے لئے ہندوؤں کی ایک جماعت راشٹریہ سیوک سنگھ (جس نے مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت کو اپنے ہندو دھرم کا ایک مستقل جزو بنا لیا تھا اور آج تک بنا رکھا ہے) سکھوں کا ساتھ دینے اور ان کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کے لئے پہلے ہی میدان میں موجود تھی۔ ان دو مقاصد کے ساتھ ایک تیسرا مقصد بھی خلط ملط ہو رہا تھا اور اپنے شدید جذبات کے زیر اثر سکھ لیڈر اس مقصد کے لئے بھی نہ صرف آلۂ کار بلکہ ہراول کا دستہ بن گئے تھے۔ یہ پاکستان کی پیدائش کے وقت اس کا گلا گھونٹنے کا مقصد تھا۔ جس کی براہ راست یا بالواسطہ حوصلہ افزائی بعض بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے والے سیاست دان بھی کر رہے تھے۔ سکھ لیڈروں کی ذہنی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر وہ پاکستان پر دوہری ضرب لگانا چاہتے تھے۔ ایک لاکھوں (جن کی تعداد کروڑوں تک پہنچائی جا سکتی تھی) پناہ گزینوں کو پاکستان میں دھکیل کر اور دوسری پاکستان میں اقلیتوں (بالخصوص ہندو اقلیت) کے پاؤں فی الفور اکھاڑ کر جو پاکستان کی اقتصادی زندگی کو مفلوج کرنے کا یقینی طریقہ تھا۔ مشرقی پنجاب میں قتل و غارت کے ذریعے سے یہ دونوں نتیجے حاصل کئے جا سکتے تھے۔

اس تیسرے مقصد کو اس عجیب نعرے سے علیحدہ کرنا مشکل ہے جس پر خود کانگریسی لیڈروں نے پاکستان کے متعلق اپنی سرکاری اور سوچی سمجھی پالیسی کی بنیاد قائم کی تھی۔ تاریخ کا کوئی طالب علم جب اس سرکاری قرارداد کے الفاظ کا مطالعہ کرے گا، جس کے ذریعے ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تقسیم کی پلان کو منظور کیا تھا تو اسے اس قرارداد میں یہ الفاظ ملیں گے:۔ "جغرافیہ اور پہاڑوں اور سمندروں نے ہندوستان کو ایک بنایا ہے اور کوئی انسانی طاقت اس کی شکل کو نہیں بدل سکتی اور اس کی تقدیر کا راستہ نہیں روک سکتی۔ اقتصادی حالات اور بین الاقوامی معاملات اس سے بھی زیادہ ہندوستان کی وحدت کے متقاضی ہیں۔

ہندوستان کی جس تصویر کے ساتھ ہم نے محبت کرنا سیکھا ہے۔ وہ ہمارے دلوں اور دماغوں میں قائم رہے گی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو قوی امید ہے کہ جب موجودہ جذبات سکون پذیر ہوں گے تو لوگ ہندوستان کے مسائل کو صحیح روشنی میں دیکھنے لگیں گے اور ہندوستان کے اندر دو قوموں کا غلط نظریہ سب کے نزدیک غلط اور ترک کر دینے کے قابل قرار پائے گا۔ لیکن اس کے باوجود کہ ہندوستان سے بعض حصوں کی علیحدگی بہت ہی قابل افسوس ہے یہ کمیٹی موجودہ حالات میں اس امکان کو قبول کرتی ہے......" کیا اس کے صاف معنی یہ نہ تھے کہ تقسیم کے بعد تقسیم کی غلطی کی تلافی کے لئے کوشش جاری رہے گی؟ کہا جا سکتا ہے کہ قرارداد میں یہ الفاظ تقسیم کے مخالفوں کو راضی کرنے کے لئے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اندر ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے درج کر دیئے گئے تھے۔ ان کا سنجیدگی کے ساتھ نوٹس نہ لینا چاہیئے۔ لیکن کیا ہندو عوام پر اس قرارداد کا نفسیاتی اثر اس کے سوا کچھ اور ہو سکتا تھا کہ وہ آزادی کے دور میں داخل ہوں تو پاکستان کو ختم کرنا اپنا قومی مقصد سمجھ لیں؟ اگست ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی سندھ میں آئے۔ ان کا اصل وطن یہی تھا۔ یہاں ۱۳ اگست کو کراچی کی ایک پریس کانفرنس میں آپ نے کانگریس کی پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں کی: "کانگریس کا نصب العین متحدہ ہندوستان تھا اور اب بھی ہے۔ وہ پرامن طریقوں سے اس کے لئے کوشش جاری رکھے گی۔" یہ بیان ہندوستان کے دائمی ہندوستان ایک ہی ملک تھا) اخباروں میں چھپا۔ اس قسم کے اور بیان بھی تھے۔ جنہوں نے پاکستان کو ختم کرنا ہندوؤں کا قومی نصب العین قرار دے دیا۔ کانگریس کے صدر نے اس مقصد کے لئے "پرامن" (یعنی ڈپلومیٹک) طریقوں کی شرط لگا دی تھی۔ عوام نے اسی قومی مقصد کے لئے پھر اپنے جذبات کے زیر اثر اور پھر لیڈروں کی پس پردہ کھلی چھوٹ کے زیر اثر اپنے طریقوں سے جہاد شروع کر دیا۔

فساد اور کشت و خون کی تیاریاں جاری تھیں۔ پنجاب کے گورنر کو رپورٹیں ملتی رہیں۔ وہ کبھی کبھی ان رپورٹوں کو گورنر جنرل کے نوٹس میں بھی لاتا رہا۔ لیکن اس کی رپورٹوں کی تان اکثر اس بات پر ٹوٹتی تھی کہ وسیع پیمانے پر فساد اور قتل و غارت کے خطرے کے

پیش نظر سکھوں کو خاص مراعات دے کر کسی نہ کسی طرح مطمئن کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اس نے بعض عجیب تجاویز پیش کیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ اگر کسی نہ کسی طرح سکھوں کو ننکانہ صاحب دے دیا جائے تو ان کے مشتعل جذبات ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ ننکانہ صاحب انہیں دینے کے لئے پاکستان اور ہندوستان کی سرحد کہاں مقرر کی جائے؟ اس کے متعلق بحث کرنے کے بعد اس نے ایک رپورٹ میں لکھا کہ حد بندی کمیشن اپنی ہدایات کا پابند ہے۔ اس سے تو یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ سکھوں کے جذبات کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور مسلم لیگ بھی پاکستان میں آنے والا کوئی علاقہ چھوڑنے پر تیار نہ ہو گی۔ لیکن کیا ایک آخری کوشش اس بات کی نہیں کی جا سکتی کہ مسٹر جناح کو راضی کر کے ننکانہ صاحب کو وہی خود مختار حیثیت دلا دی جائے جو اٹلی کے اندر پوپ کے دار الحکومت کو حاصل ہے؟ ایک اور تجویز گورنر جینکنز نے یہ پیش کی کہ حد بندی کمیشن کا فیصلہ خواہ کچھ ہو۔ مصلحت اور امن کی خاطر مسلم لیگی لیڈروں کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کم از کم منٹگمری کے ضلع سے دست بردار ہو جائیں۔ لائلپور اور مغربی پنجاب کے دوسرے اضلاع کے سکھوں کو منٹگمری میں آباد کیا جا سکے گا اور منٹگمری کے مسلمانوں کو لائلپور کے ضلع سے نکلنے والے سکھوں کی زمینیں دی جا سکیں گی۔

پنجاب کی سی۔ آئی۔ ڈی کے سٹاف نے بعض سکھ لیڈروں کی لکھی ہوئی چٹھیاں روک کر ان کے فوٹو اور گوردواروں کو بھیجے جانے والے سرکلر بھی قبضے میں لے لئے اور ان دستاویزوں اور ناقابل انکار شہادتوں کے ساتھ ایک رپورٹ گورنر جینکنز کو دی۔ اس نے سی آئی۔ ڈی کے ایک افسر کے ہاتھ یہ پوری فائل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیج دی۔ ۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو وائسریگل لاج میں "پارٹیشن کونسل" کا ایک اجلاس ہو رہا تھا۔ اس اجلاس کے بعد وائسرائے نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل سے اور مسٹر جناح اور لیاقت علی خاں سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جائیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان کے سامنے وہ فائل بھی پیش کی اور اس افسر کو بھی پیش کیا جو دستی طور پر فائل لاہور سے لایا تھا۔ رپورٹ کے مندرجات کے متعلق کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا۔ بعض فوٹو اور اصل چٹھیاں اس رپورٹ کے ساتھ منسلک تھیں۔

ان سے معلوم ہوتا تھا کہ کئی قسم کی سازشیں کی گئی تھیں۔ ایک سازش ننکانہ صاحب میں اسلحہ جمع کر کے مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے کی تھی۔ ایک سازش مغربی پاکستان میں نہروں کے ہیڈ ورکس کو بموں سے تباہ کرنے کی تھی۔ ایک سازش یہ تھی کہ ۱۵ اگست کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے دیہات پر حملے کر کے آگ لگا دی جائے اور جب مسلمان اپنے گھروں سے بھاگیں تو انہیں راستے میں گھیر کر قتل کر دیا جائے۔ ایک اور سازش یہ تھی کہ پاکستان جانے والی ٹرینوں پر حملے کئے جائیں اور ایک سازش یہ بھی تھی کہ ۱۴ اگست کو کراچی میں جب قائد اعظم کا جلوس نکلے تو ان کی کار پر بم مارا جائے۔

ان چٹھیوں پر جن کے فوٹو یا اصل سی آئی ڈی نے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لئے تھے معروف سکھ لیڈروں کے دستخط تھے۔ بعض خطوں میں مکتوب الیہ کے نام بھی تھے اس فائل پر نظر ڈال کر اور پنجاب سی آئی ڈی کا جو افسر وہاں موجود تھا۔ اس سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد قائد اعظم اور مسٹر لیاقت علی نے مطالبہ کیا کہ کم از کم ان افراد کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے اس مطالبے کی مخالفت نہ کی۔ ماؤنٹ بیٹن نے ضروری کارروائی کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے پنجاب کے گورنر سے مشورہ کرنے کے سوا کچھ نہ کیا اور اس نے گرفتاریوں کے خلاف رائے دے دی۔ لہٰذا کوئی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔ پنجاب میں ۱۵ اگست سے پہلے مسلم لیگ کا کوئی سرکاری عمل دخل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن پنجاب کے مسلمان پولیس افسروں نے جن کے علم میں یہ سب سازشیں آ چکی تھیں۔ از خود ایسے انتظامات کر دیئے کہ ننکانہ صاحب میں فساد کی سازش بھی بروئے کار نہ آ سکی اور مغربی پنجاب کی نہروں کے ہیڈ ورکس کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچا۔ البتہ مشرقی پنجاب میں جو ہندوستان کے علاقے میں جانے والا تھا۔ مسلمان پولیس افسر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ وہاں مختلف محکموں کے جو مسلمان افسر تعینات تھے۔ وہ سب اپنی ملازمت کے لئے پاکستان کا انتخاب کر چکے تھے۔ اور ۱۵ اگست سے ایک ہفتہ پہلے ہی مغربی پاکستان کے مختلف مقامات پر اپنا نیا چارج سنبھالنے کے لئے منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے بھارت کے نئے لیڈروں

اور حاکموں پر بھروسہ کرنے کے سوا کیا چارہ ہو سکتا تھا۔ لیکن منظم تیاریوں کے بعد جب وسیع پیمانے پر قتل و غارت اور آتشزدگی کی مہم شروع ہوئی۔ اس پر قابو پانا ان لیڈروں کے لئے بھی محال ہو گیا جو اس پر قابو پانا چاہتے تھے۔ ابھی پاکستان اور بھارت کی آزادی کے سرکاری اعلان کی تاریخ میں ایک ہفتہ باقی تھا کہ مشرقی پنجاب میں مار دھاڑ قتل و غارت کا طوفان چل پڑا اور مشرقی پنجاب سے بے خانماں اور سراسیمہ مسلمان لاہور کی طرف بھاگنے لگے۔ پھر مغربی پاکستان میں بھی جوابی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ایک خود مختار ڈومینین بن گیا۔ اس کا سرکاری اعلان کرنے کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک دن کے لئے کراچی آیا۔ اس دن پروگرام کے مطابق قائد اعظم کا (جو ۷ اگست کو دہلی سے کراچی پہونچ چکے تھے) جلوس نکالا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے سپاہیانہ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لئے قائد اعظم کے ساتھ ایک ہی کار میں بیٹھنے پر اصرار کیا۔ پولیس نے حفاظتی انتظامات خاص احتیاط کے ساتھ کئے تھے۔ جلوس میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ جلوس کے اختتام پر قائد اعظم نے مسکرا کر ماؤنٹ بیٹن سے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میں آپ کو صحیح سلامت لے آیا ہوں۔ یہ میرا ملک ہے۔ اب آپ کی حفاظت کی ذمہ داری میری قوم پر تھی"۔ اگلے دن ماؤنٹ بیٹن نے دہلی میں بھارت کی آزادی کا سرکاری اعلان کیا۔ لیکن جب دہلی اور کراچی میں آزادی کی خوشی منائی جا رہی تھی تو مشرقی اور مغربی پنجاب سے پناہ گزین اور شرنارتھی قافلہ در قافلہ ہزاروں کی تعداد میں اور انتہائی دکھ اور مصیبت کے عالم میں سرحد کو پار کرنے کے لئے رواں دواں تھے اور سرحد کے دونوں طرف انسان اپنے بے گناہ پڑوسی انسانوں کی بےپناہ خون ریزی میں مصروف تھے۔ راجہ غضنفر علی کا بیان ہے کہ کراچی میں ماؤنٹ بیٹن کے مختصر قیام کے دوران میں انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ دونوں مملکتوں میں اس فساد اور خون ریزی کو روکنے کے لئے کوئی تدبیر مل کر کرنی چاہیئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے سرکاری لہجہ میں خشک جواب دیا کہ آپ کو اب جو کچھ کہنا ہو اپنے گورنر جنرل سے کہئے۔

۱۴ اگست تک حکومت پاکستان کا بمشکل ایک تہائی عملہ کراچی پہونچ سکا تھا۔ متحدہ

ہندوستان کی مرکزی حکومت کا وہ عملہ جو آئندہ حکومت پاکستان کا عملہ بننے والا تھا۔ اپنے خاندانوں سمیت تقریباً پچیس ہزار نفوس پر مشتمل تھا۔ ان کے ساتھ ہزاروں من سامان بھی تھا۔ ان پچیس ہزار جانوں کو سامان سمیت دہلی سے بروقت کراچی منتقل کرنے کے لئے دونوں حکومتوں کے مشورے سے سپیشل ٹرینوں کے پروگرام بنا لئے گئے تھے۔ لیکن جب اس پروگرام پر عمل شروع ہوا تو سپیشل ٹرینوں پر حملوں اور ان کے راستے میں ریل کی پٹڑی اکھاڑنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو گروہ عملے کے سفر میں یہ رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ انہیں ٹرینوں کے متعلق بروقت معلومات حاصل ہو جاتی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ریلوے کے محکمے یا بعض دوسرے محکموں کے ملازم بھی اس سازش میں شریک تھے۔ یہ رکاوٹ بجائے خود قیام پاکستان کے عملی پروگرام پر بہت کاری ضرب ثابت ہو سکتی تھی۔ بہر حال سپیشل ٹرینوں کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا اور ہوائی جہاز کرائے پر لینے کی کوشش کی گئی۔ بھارت کی نیم سرکاری کمپنیوں کو یہ عذر تھا کہ ان کے پاس جہاز خود اپنے ملک کی ضروریات کے لئے بھی کافی نہیں۔ برطانوی کمپنیوں سے چالیس ہوائی جہاز حاصل کئے گئے اور انہوں نے کافی مستعدی کے ساتھ تقریباً ایک تہائی عملے کو کراچی پہونچا دیا۔ باقی عملہ دیر کے بعد آہستہ آہستہ کراچی پہونچا۔

جو عملہ کراچی پہونچا اسے اپنے دفتر قائم کرنے کے لئے میز کرسیاں اور قلم دوائیں مانگنی یا خریدنی پڑیں۔ کسی افسر کو میز کرسی مل سکی۔ کسی نے لکڑی کے خالی بکسوں کو جن میں سامان آیا تھا۔ اوندھا کیا۔ ایک پر خود بیٹھ گیا اور دوسرے سے میز کا کام لینے لگا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی مرکزی سکرٹریٹ نے اس طرح کام شروع کیا۔ لیکن کام کرنے والوں کے پاس صرف ساز و سامان کی کمی تھی جو آہستہ آہستہ پوری ہوتی رہی۔ ان کے دلوں میں جذبۂ خدمت اور لگن کی کمی نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ جب ساز و سامان کی کمی پوری ہوئی تو اس جذبے اور لگن کی افراط میں کمی آنے لگی۔

پنجاب کی صوبائی حکومت کی تنظیم اس لحاظ سے بہتر تھی کہ ایک بنا بنایا سکرٹریٹ اس کے حصے میں آگیا تھا۔ لیکن اس صوبے کی زندگی میں ایک اور لحاظ سے سخت

ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں بازار اور کارخانے، بینک اور تجارتی ادارے سب یکایک بند ہو گئے تھے۔ اشیا کی رسد اور نقل و حمل کے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ غیر مسلم انجینیئر اور ڈاکٹر غائب تھے اور مسلم مہاجرین کا قافلہ در قافلہ ان گنت تعداد میں ہر روز اسی صوبے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کی بے سروسامان قوم نے اس مملکت کا کام کس طرح چلایا۔ انجینیئروں کے بغیر شہروں میں کس طرح پانی جاری رکھا، ڈاکٹروں کے بغیر مہاجرین کے کیمپوں میں زخمیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کا کام کس طرح سرانجام دیا۔ اشیا کی رسد کہاں سے آئی۔ یہ سب کچھ ایک معجزہ تھا۔ جس نے دنیا کو حیران کر دیا۔ اس زمانے میں جس طرح افراد نے کارگزاری کے معجزے دکھائے۔ اس کی ایک مثال لاہور میں بجلی کی سپلائی نے پیش کی۔ تقسیم سے پہلے اس شہر میں لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی بجلی سپلائی کرتی تھی۔ اس کے ملازمین میں صرف سب سے نچلے درجے کے لائن مینوں میں چند مسلمان تھے۔ ورنہ ہندوؤں کے دوسرے کاروباری اداروں کی طرح اس کمپنی کا تمام عملہ اوپر سے نیچے تک غیر مسلم تھا۔ ایک دن اس تمام عملے نے کام چھوڑ دیا۔ لیکن ایک مسلمان مستری نے ہمت کی۔ شہر سے چند معمولی کارکنوں کو اکٹھا کیا اور غیر تربیت یافتہ اور نیم تربیت یافتہ افراد کے ذریعے پاور سٹیشن اور بجلی کی تقسیم کے انتظام کو چالو رکھا۔ اور لاہور کے گھروں کو روشنی ملتی رہی۔ ڈاکٹروں کی امداد کے لئے میڈیکل کالج کے بیشتر طلباء نے کیمپوں کا چارج سنبھال لیا۔ نرسوں کا کام کرنے کے لئے لاہور کے اونچے گھرانوں کی بہو بیٹیاں کیمپوں میں پہنچ گئیں۔ شہروں کے پٹوال نویس اور اوورسیر اور بیلدار انجینیئروں کا کام کرتے رہے۔ ہر شخص نے تربیت کی کمی کو خدمت اور محنت کے جذبے سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اور پاکستان نہ صرف زندہ رہا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

۱۹۴۸ء کے آخر تک مغربی پاکستان میں مہاجرین کی آمد کا طوفانی دور ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت تک یہاں تقریباً ساٹھ لاکھ مہاجر پہنچ چکے تھے۔ مہاجر اس کے بعد بھی آتے رہے بلکہ یوپی کے بیشتر مہاجر اس زمانے کے بعد ہی آئے۔ لیکن یہ آمد تھوڑی تعداد میں

اور دقتوں کے ساتھ تھی۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے دسمبر ۱۹۴۷ء کے آخر تک یہاں سے ترک وطن کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد چالیس لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔ اسی زمانے میں سرحد کے دونوں طرف اقلیتوں پر حملے ہوئے۔ ان میں اتلافِ جان کتنا ہوا؟ اس کی صحیح تعداد کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جانی نقصان مسلمانوں کا غیر مسلموں کی نسبت کافی زیادہ ہوا۔ اس وقت عام اندازہ یہ تھا کہ مشرقی پنجاب دہلی اور سکھ ریاستوں اور جموں وغیرہ میں جو حملے ہوئے ان میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے کم نہ تھی۔

کتنی عظیم قربانی تھی جو پاکستان کی آزادی کی منزل تک پہنچنے کے لئے مسلمانوں کو دینی پڑی۔ لیکن یہ منصوبہ کہ پاکستان کے سفینے کو لنگر اٹھانے سے پہلے ہی خون اور آنسوؤں کے سیلاب میں غرق کر دیا جائے۔ کامیاب نہ ہو سکا۔ کیا وہ قیمت جو مسلمانوں کو پاکستان کے لئے ادا کرنی پڑی بہت مہنگی تھی؟ اس سوال کا جواب جو بعض لوگ اٹھانے لگے تھے۔ قائد اعظم نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کی یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک پبلک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے دیا۔ آپ نے فرمایا "بعض عناصر پاکستان کے مسلمانوں میں یہ کہہ کر بددلی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم لیگ نے ۳ جون کی پلان (تقسیم ملک) منظور کر کے غلطی کی اور پاکستان کے لئے اتنے بڑے مسائل پیدا کر دیئے۔ لیکن یاد رکھیئے پاکستان کے بغیر اس برصغیر میں مسلمانوں کا من حیث القوم کوئی مستقبل ہی نہ تھا۔ جہاں تک مسائل کا تعلق ہے۔ مسلمان قوم کی روایات یہ نہیں کہ وہ مسائل سے گھبرا جائیں۔ بلکہ یہ ہیں کہ مسائل جتنے بڑے ہوں۔ وہ اپنی ہمت اتنی ہی بلند رکھیں۔"

۴۷۔ دو انسانوں کا "باؤنڈری فورس"

تقسیم کے وقت جب اس برصغیر میں انسانوں کے سروں پر فساد اور جوابی فساد کشت و خون اور جوابی کشت و خون کا جنون سوار تھا اور ان کے دلوں میں عناد اور نفرت کے بہیمانہ جذبات کا سیلاب امنڈ رہا تھا تو ایسے افراد بھی تھے۔ جنہوں نے جان جوکھوں میں ڈال کر اس سیلاب کا مقابلہ کیا اور اپنے پڑوسیوں کی اور ان کے بال بچوں کی جانیں بچائیں۔ وزیر بحالیات کی حیثیت سے راجہ غضنفر علی خاں کے ذاتی علم میں بیسیوں ایسے واقعات آئے۔ ایسے لوگ بھارت میں بھی تھے جن کے متعلق مسلمان مہاجروں نے احسانمندی کے ساتھ راجہ صاحب کے سامنے شہادت دی اور پاکستان میں بھی تھے جن کے قصے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں نے انہیں سنائے۔ لیکن ایسے لوگوں کا دائرہ عمل بہر حال بہت محدود تھا۔ اس پر آشوب زمانے میں ایک پورے صوبے کو جہاں جذبات بہت مشتعل تھے۔ فساد سے بہت حد تک محفوظ رکھنے کا سہرا مہاتما گاندھی کے سر پر تھا۔ اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ان کے دوش بدوش اس کار عظیم میں حصہ لینے کا سہرا مسٹر حسین شہید سہروردی کے سر پر تھا۔ پچاس ہزار فوجیوں کا "باؤنڈری فورس" جو کام پنجاب میں نہ کر سکا وہ ان دو نہتے انسانوں نے بنگال میں کر دکھایا۔

گاندھی جی کی بھرپور سیاسی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ان کے کیرکٹر کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنی پاکیزہ زندگی، انسان دوستی اور بلند مقاصد کے لحاظ سے مہاتما بھی تھے۔ جنگ آزادی میں اپنی نہتی فوج کو اخلاقی قوت کے ہتھیار سے مسلح کرنے والے جرنیل۔ سیاسی شطرنج کے بہت بڑے شاطر اور پراپیگنڈہ کے فن کے بے مثال فن کار بھی تھے۔ وہ جس مقصد کو درست سمجھتے تھے اس کے لئے سیاسی شطرنج کی ہر چال اور پراپیگنڈے کے ہر حربے سے کام لیتے تھے۔ ہندوستان میں "دو قوموں" کی حقیقت کو ان کے ذہن نے کبھی قبول نہ کیا۔ شاید اس

لئے کہ وہ خود تمام ہندوستان کو مختلف مذاہب رکھنے والے انسانوں کا ایک ہی کنبہ اور خاندان سمجھتے تھے اور اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اس ملک میں بتیس کروڑ انسانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت بھی وہی تھی جو ان کی اپنی تھی۔ وہ مسلمانوں کے ایسے مطالبات کو جو دو قوموں کی حقیقت کی پیداوار تھے اور اسی حقیقت پر مبنی انداز فکر کی نشاندہی کرتے تھے ہمیشہ اپنی سیاسی شطرنج کی چالوں سے شکست دینے کی کوشش کرتے رہے۔ عملی نتائج کے لحاظ سے ان کی اور کسی متعصب ہندو کی سیاست میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ لیکن گاندھی جی نے اپنی زندگی کے آخری پانچ چھ مہینوں میں ثابت کر دیا کہ ان کی اس سیاست کا محرک مذہبی تعصب نہ تھا بلکہ شاید مذہبی بے تعصبی کا جذبہ تھا۔

گاندھی جی سے ان کے کانگریسی ساتھیوں نے آخر میں تقسیم ملک کے "طے شدہ فیصلے" پر ہاں کرائی تھی۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے ان سے کانگریسی لیڈروں اور مہاراجہ کشمیر کے درمیان صلح کرانے کا کام بھی لے لیا اور مہاتما گاندھی نے غالباً اسے ایک نیک مقصد سمجھتے ہوئے صلح کا ایلچی بننا منظور کر لیا۔ اگست کے پہلے ہفتے میں وہ سرینگر تشریف لے گئے۔ وہاں دو دن قیام اور مہاراجہ کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد آپ لاہور واپس آئے۔ یہاں انہوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے ایک جلسے سے خطاب کیا اور ان سے اپیل کی کہ وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر نہ بھاگیں۔ بلکہ آنے والے واقعات کا حوصلہ۔ جرأت اور شانتی کے ساتھ مقابلہ کریں۔ سکھوں سے انہوں نے بطور خاص کہا کہ کمزور کو مارنا اور زبردست کے آگے بھاگنا بہادری نہیں ہے۔ بہادری کمزور کی حفاظت کرنے اور زبردست کا اخلاقی جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنے کا نام ہے۔ یہاں سے مہاتما جی سیدھے بنگال چلے گئے۔ ان کی منزل مقصود مشرقی پاکستان کا ضلع نواکھالی تھا۔ لیکن جب وہ کلکتہ پہنچے تو مسلمانوں کے ایک وفد نے ان سے درخواست کی کہ وہ کلکتہ میں ٹھہر کر مسلمان اقلیت کی حفاظت کے لئے کچھ کریں۔ گاندھی جی نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ میں اس بات پر غور کرنے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ آپ لوگ نواکھالی میں ہندوؤں کی حفاظت کے متعلق مجھے یقین دلا سکیں۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے فوراً نواکھالی میں مسلم لیگی لیڈروں کے پاس پیغامبر روانہ کئے۔ ان سے یہ وعدہ حاصل کیا کہ وہ ہندو

اقلیت کی حفاظت کریں گے اور پھر گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اس اثنا میں متحدہ بنگال کے داعی تقسیم کی تاریخ میں دو چار دن باقی تھے، وزیر اعظم حسین شہید سہروردی بھی جو کراچی گئے ہوئے تھے، کلکتہ پہنچ گئے۔ وہ بھی گاندھی جی سے ملے تقسیم کے منصوبے نے سہروردی کو بھی مایوس کیا تھا۔ انہوں نے تقسیم کی پلان کی منظوری سے پہلے اس بات کی بہت کوشش کی تھی کہ متحدہ بنگال پاکستان اور ہندوستان سے الگ ایک تیسری ڈومینین بن سکے۔ اس کوشش میں مسٹر سرت چندر بوس ان کے ساتھ تھے۔ لیکن یہ تجویز مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے مسترد کر دی تھی۔ سہروردی صاحب نے اس کے بعد وفاداری کے ساتھ لیگ کے مقصد کو کامیاب کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں دوسری مایوسی یہ ہوئی کہ تقسیم کے اصول کی منظوری کے بعد جب مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کا انتخاب ہوا تو ان کے بجائے خواجہ ناظم الدین کو منتخب کر لیا گیا۔ سہروردی تقسیم کی تاریخ سے چند دن پہلے کراچی یہ دیکھنے گئے تھے کہ پاکستان کی نئی انتظامیہ مشنری میں ان کے لئے بھی کوئی گنجائش ہے یا نہیں۔ اس مرحلے پر انہیں پھر ناکامی ہوئی۔ واپسی پر انہوں نے بھی گاندھی جی سے مل کر یہ درخواست کی کہ وہ کلکتے میں ٹھہریں۔ گاندھی جی نے کہا کہ مجھے منظور ہے لیکن اسی شرط پر کہ آپ بھی میرا ساتھ دیں۔ سہروردی نے بلا تامل کہا "بیشک"۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کے وفد کو یقین دلایا کہ وہ کلکتہ میں ٹھہریں گے۔ اور دوبارہ وفد کے ممبروں کو تنبیہہ کی کہ اگر آپ نے نواکھالی کے ہندوؤں کی حفاظت کا وعدہ پورا نہ کیا تو پھر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ میں مرن برت رکھ کر یہیں آپ کے شہر میں پران تیاگ دوں۔ آپ کو میری موت کی ذمہ داری قبول کرنی پڑے گی۔

مسٹر سہروردی کے ساتھ گاندھی جی نے طے کیا کہ ہم مفلس اور بے آسرا مسلمانوں کی بستی ہی چل کر رہیں گے۔ اپنی حفاظت کے لئے نہ پولیس کو بلائیں گے۔ نہ فوج کو دعوت دیں گے۔ دونوں ایک ہی مکان میں ایک ہی چھت کے نیچے رہیں گے۔ اگر آپ کو میرے ساتھ کھانا پسند ہو تو ہم دونوں اکٹھا کھائیں گے۔ اگر آپ چاہیں تو اپنا کھانا الگ کھائیں۔ اور اگر ہم پر کسی نے حملہ کیا تو ہم ہنستے ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ کلکتے میں ہندوؤں کی اکثریت

تھی۔ اپنے قیام کے لئے گاندھی جی نے جو بستی منتخب کی وہ بیلیا گھاٹ میں بہت ہی غریب مسلمانوں کی تھی جو چاروں طرف سے ہندوؤں کی بستیوں میں گھری ہوئی تھی۔

گاندھی جی پر ہندوؤں کی جانب سے کوئی حملہ بہت غیر اغلب تھا۔ لیکن حملہ آوروں کے لئے سہروردی کو (بنگال کے ہندو انہیں ستمبر ۱۹۴۶ء کے فساد کلکتہ کا بانی سمجھتے تھے اور ان کے خون کے پیاسے تھے) الگ کر لینا اور نشانۂ انتقام بنانا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ وہ گاندھی جی کے ساتھ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جا رہے تھے۔ تاہم انہوں نے بلا تامل یہ پروگرام منظور کر لیا۔ اسی دن شام کو گاندھی جی نے اپنے دعا مانگنے کے بعد جلسے میں اس پروگرام کا اعلان کر دیا۔ جلسے میں ہزاروں ہندو مرد اور عورتیں بیٹھے تھے۔ ان میں ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ سہروردی ہندوؤں کا دشمن ہے۔ اس پر ہم اعتماد نہیں کر سکتے۔ گاندھی جی نے جواب میں کہا۔ "بعض مسلمان میرے متعلق بھی یہی کہتے ہیں"۔

اگلے دن کے لئے گاندھی جی نے مسٹر سہروردی کے ساتھ یہ پروگرام طے کیا تھا۔ کہ وہ ٹھیک اڑھائی بجے بعد دوپہر گاندھی جی کی موجودہ قیام گاہ سے روانہ ہو کر بیلیا گھاٹ کی طرف روانہ ہوں گے۔ وہاں صرف ایک پختہ مکان تھا۔ جس کے مکین کئی دن پہلے اسے خالی کر کے پناہ کی خاطر کہیں اور چلے گئے تھے۔ اس مکان کا نام حیدری منزل تھا۔ گاندھی جی نے بیلیا گھاٹ میں اپنے اور اپنے ساتھیوں (سابرمتی آشرم کا سٹاف جس میں دو لڑکیاں بھی شامل تھیں) کی رہائش کے لئے اس مکان کو منتخب کیا تھا۔ مسٹر سہروردی کو پہنچنے میں دیر لگی تو گاندھی جی یہ سمجھ کر کہ شائد انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ پابندئ وقت کے ساتھ اپنی قیام گاہ سے روانہ ہو گئے۔ بیلیا گھاٹ میں ان کی سیوکاؤں نے پہلے ہی پہنچ کر حیدری منزل کے دو تین کمروں کی صفائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ افواہ پھیل چکی تھی کہ گاندھی جی یہاں آنے والے ہیں۔ ان کی آمد سے پہلے ہندوؤں کا ایک ہجوم آس پاس کی بستیوں سے آ کر وہاں جمع ہو گیا تھا۔ بیلیا گھاٹ کے مزدور پیشہ مسلمان اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ہندوؤں کا جو ہجوم جمع تھا ان میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ بعض گاندھی جی کے درشن کرنے اور ان کی اشیرواد لینے آئے تھے۔ بعض گڑبڑ پیدا کرنے اور فساد کا کوئی بہانہ بنانے کی غرض سے آئے تھے۔ جب گاندھی جی

پہنچے تو فسادی ذہنیت کے لوگوں نے شور مچانا شروع کیا۔ "آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟
"آپ نواکھالی میں جاکر ہندوؤں کی خبر گیری کیوں نہیں کرتے؟" وغیرہ وغیرہ۔ گاندھی جی۔
ہجوم کو دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہوئے مکان کے اندر چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد مسٹر
سہروردی کی کار بھی وہاں پہنچ گئی اور ہندوؤں کے ہجوم میں گھر گئی۔

سہروردی کو دیکھتے ہی اشتعال انگیز نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ "ہندوؤں کا قاتل
مردہ باد۔ خون کا بدلہ خون سے لیں گے۔" سہروردی چپ چاپ کار کے اندر بیٹھے رہے۔
گاندھی جی کو خبر پہنچی۔ ان کے دو چیلے باہر آئے اور ہجوم کو سمجھانے لگے۔ آخر ہجوم کے خود
ساختہ لیڈروں کے ساتھ یہ طے ہو گیا کہ سہروردی صاحب کو مکان کے اندر جانے دیا جائے
اس کے بعد مظاہرین کے ایک وفد کو گاندھی جی گفتگو کا موقع دیں گے۔ سہروردی کار سے
اترے اور مخالف ہجوم کے بیچ سے گذرتے ہوئے حیدری منزل میں داخل ہو گئے۔ ان
کی قسمت اچھی تھی کہ کسی نے ان پر خشمگین نگاہوں کے علاوہ کسی اور ہتھیار سے حملہ نہ کیا۔ ہجوم
میں کئی لوگوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے بھی تھے اور ہجوم کی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ جونہی چند
آدمیوں کا ایک وفد اندر مکان میں گاندھی جی کے ساتھ بحث کرنے گیا تو باہر سے مکان
کی کھڑکیوں پر اینٹوں کی بارش شروع ہو گئی۔ گاندھی جی نے وفد کے ساتھ چند منٹ بات
کی اور اس کے ممبروں سے کہا کہ پہلے آپ ان لوگوں کو جو اینٹیں پھینک رہے ہیں شانت
کرنے میں میری مدد کریں۔ پھر مزید گفتگو کے لئے کل میرے پاس آئیں۔

وفد کے ممبروں نے باہر نکل کر ہجوم کو سمجھایا۔ "گاندھی جی نے پکّا وعدہ کیا ہے کہ وہ اب
نواکھالی میں ہندوؤں کا بال بیکا نہ ہونے دیں گے۔ آپ لوگ شانتی کے ساتھ منتشر ہو جائیں۔
ہم اور گاندھی جی کل پھر دو دو باتیں کریں گے۔" بالآخر ہجوم منتشر ہو گیا۔ اگست کی گرمی اور
بارشوں کے دن۔ بوسیدہ حیدری منزل کے اندر کھٹملوں اور مچھروں کی بھرمار اور آس پاس
کے گلی کوچوں میں سخت تعفن۔ سہروردی صاحب بھی گاندھی جی کی طرح ان تکالیف کو برداشت
کرنے کا تہیہ کر کے آئے تھے۔ انہوں نے رات یوں توں کر کے گذاری۔ اگلے دن مشتعل
ہندوؤں کا ہجوم پھر مکان کے اردگرد جمع ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں پھر کھڑکیوں پر اینٹیں پڑنے

لگیں اور آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ "سہروردی کو باہر نکالو۔ اسے مکان میں کیوں چھپا رکھا ہے۔ سہروردی ہزاروں ہندوؤں کا قاتل ہے"۔

پہلے سے طے کئے ہوئے پروگرام کے مطابق سہروردی اور گاندھی جی دونوں کھڑکی میں آکر کھڑے ہو گئے۔ سہروردی کے کاندھے پر گاندھی جی کا ہاتھ تھا۔ اینٹیں بند ہو گئیں۔ سہروردی نے بنگالی میں کہا: "بنگال کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس وقت گاندھی جی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیا بنگال گاندھی جی کے اس احسان کا احساس نہیں کرے گا، اور بھائیوں بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی بند نہ کرے گا؟" مجمع میں ایک شخص چلایا: "پچھلے سال کلکتہ کے ہولناک فساد کا ذمہ دار کون تھا؟"

سہروردی: "ہم سب تھے"۔

وہی شخص: "نہیں۔ تم تھے"۔

سہروردی: "میں وزیر اعظم تھا اور اس حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا اعتراف کرتا ہوں"۔ سہروردی صاحب یہ کہہ کر کچھ دیر مجمع کی طرف دیکھتے رہے۔ مجمع بھی خاموش ہو گیا تھا۔ سہروردی کی تقریر میں پھر کسی نے مداخلت نہ کی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے مجمع کی جانب سے ایک وفد کو اندر آنے کی دعوت دی۔ لوگ اندر آئے۔ سوال و جواب ہوئے۔ گاندھی جی کی پر سحر شخصیت کا اثر بھی تھا اور وہ اور سہروردی دونوں منجھے ہوئے سیاستدان اور عوام کے نبض شناس بھی تھے۔ انہوں نے اپنے انکسار سے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کر دیا۔ اس کے بعد ان کے خلاف کوئی مظاہرہ نہ ہوا۔ شام کو دونوں اکٹھے گاندھی جی کے دعا کے جلسے میں بیٹھتے اور ہزاروں ہندو اور مسلمان ان کی تقریر سننے کے لئے آتے تھے۔ دو چار دن کے اندر ان دونوں نے یہ فضا پیدا کر دی کہ تقریباً پانچ ہزار ہندو اور مسلمانوں کا ایک مشترکہ جلوس کلکتے میں نکلا جو "ہندو مسلم ایک ہو۔ ہندو مسلم بھائی بھائی" کے نعرے لگا رہا تھا۔

تقسیم کے انتہائی نازک زمانے میں مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھ مسٹر سہروردی کلکتہ میں مقیم رہے اور دو انسانوں کے اس "باؤنڈری فورس" نے سرحد کے دونوں جانب مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کو فساد سے بہت حد تک محفوظ رکھا۔ اگست کے آخر میں گاندھی جی

دہلی واپس آئے۔ ۴ ستمبر کو دہلی میں مسلمانوں کے خلاف ہولناک قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس پر قابو پانے کے لئے سرکاری انتظامیہ مشینری نے بھی کوشش کی۔ لیکن یہاں بھی فساد کی آگ کو بجھانے کے لئے جو فائر بریگیڈ سب سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ وہ تنہا مہاتما جی کی ذات پر مشتمل تھا۔ آپ نے پہلے برت کی دھمکی دی اور پھر اس اعلان کے ساتھ برت رکھ لیا کہ جب تک فساد بند نہ ہوں گے اور مسلم اقلیت کی حفاظت کے سوال پر ہندو مہاتما جی کو مطمئن نہ کریں گے۔ وہ برت جاری رکھیں گے اور اپنی جان کے خطرے کی پرواہ نہ کریں گے

۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی نے اپنے دعا مانگنے کے جلسے میں ایک دکھ بھری تقریر کی۔ یہ گاندھی جی کا جنم دن تھا۔ آپ نے فرمایا کہ آج تمام دن لوگ مجھے تہنیت کے پیغام دینے کے لئے میرے پاس آتے رہے ہیں۔ ان میں میرے ہم وطن دوست بھی تھے اور غیر ملکی سفارت خانوں کے نمائندے بھی تھے۔ لیکن آج اگر مجھے تہنیت کے بجائے تعزیت کے پیغام دیئے جائیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔ ایک وقت تھا جب ہندو عام طور پر میری آواز پر کان دھرتے تھے۔ اور میری بات مانتے تھے۔ لیکن آج میری بار بار اپیلوں کے باوجود میں ہر طرف سے یہی آواز سنتا ہوں کہ مسلمانوں کو بھارت سے نکال دو اور پاکستان میں دھکیل دو۔ جس ملک میں انسانوں کو انسانوں سے اتنی نفرت ہو اور ظلم و ستم کے وہ منظر دیکھنے میں آئیں۔ جو میں دیکھتا ہوں۔ اس ملک میں رہنا میرے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔"

آپ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "میں امید کرتا تھا اور کئی دوست بھی مجھے یہ کہتے تھے کہ میں ایک سو پچیس سال کی عمر تک زندہ رہوں گا۔ لیکن اگر مجھے یہی حالات دیکھنے ہیں جو دیکھ رہا ہوں تو مجھے مزید زندگی کی خواہش نہیں ہے۔ اس صورت میں ایک سو پچیس سال کجا۔ میں اپنی زندگی کو تھوڑی سی طوالت بھی دینا نہیں چاہتا۔"

اس سے تقریباً ایک ہفتے کے بعد یعنی ۱۱ اکتوبر کو قائد اعظم جناح نے کراچی میں ایک تقریر کی جو ان کی یادگار تقریروں میں شامل ہے۔ آپ گورنر جنرل کی حیثیت سے پاکستان کی بری۔ بحری اور فضائی فوج کے تقریباً ایک ہزار افسروں سے خطاب کر رہے تھے اس تقریر میں آپ نے فرمایا کہ میں پبلک تقریروں میں اور پرائیویٹ گفتگو میں اس بات پر بار

بار بار دہرا رہا ہوں کہ ہمیں اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ لیکن افسوس ہے کہ مغربی پاکستان کی اقلیتوں نے ہمیں اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ یہاں کے اقلیتی فرقے ان سازشوں کے جال میں پھنس گئے جو بعض عناصر ہمارے نوزائیدہ ملک کو مشکلات میں مبتلا کر کے تباہ و برباد کرنے کے لئے کر رہے تھے اور پاکستان بننے سے پہلے ہی یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔" آپ نے مزید فرمایا: "جب میں اپنی پڑوسی ہندوستانی ڈومی نین کی جانب نظر اٹھاتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ وہاں مسلم اقلیت کے ساتھ بہت ظلم ہو رہا ہے۔ مشرقی پنجاب سے مسلم اقلیت کے پاؤں اکھاڑنے کے بعد ہندوستان کے بعض گروہ اب اس بات کے درپے معلوم ہوتے ہیں کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی مسلمانوں کے لئے زندگی دوبھر کر کے انہیں ہجرت پر مجبور کر دیا جائے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ حالات نے ایسا رخ اختیار کیا۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کا فیصلہ اس حتمی عہد نامے کی بنا پر ہوا تھا کہ دونوں طرف اقلیتوں کی حفاظت کی جائے گی اور جب تک کوئی اقلیت اپنے ملک کی وفادار ہے وہ بلا خوف و خطر اس ملک میں رہ سکے گی۔ اگر حکومت ہند کی پالیسی اب بھی یہی ہے جیسا کہ مجھے یقین ہے۔ تو اسے مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے کے رجحانات کو دبانا چاہیئے۔ اگر یہ رجحان جاری رہا تو یہ دونوں ملکوں کی تباہی کا باعث ہوگا۔" قائد اعظم نے اعلان کیا" کہ اگر اقلیتوں کے مسئلے کا آخری حل اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کا بحیثیت مجموعی بھارت سے انخلا کیا جائے تو ہم اس کے لئے حکومتی سطح پر بات چیت کرنے کو تیار ہیں۔ یہ فیصلہ حکومتوں کے درمیان ہونا چاہیئے۔ بھارت کی حکومت کو یہ فیصلہ وہاں کے شر پسند عناصر کی مرضی پر چھوڑ کر خود اپنی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگانا چاہیئے۔"

گاندھی جی اپنے روزانہ پرارتھنا کے جلسوں میں تقریریں کرتے رہے اور مذہبی رواداری اور انسان دوستی پر زور دیتے رہے۔ بھارت میں بہت سے لوگ یقیناً ان کی تبلیغ سے متاثر ہوئے۔ لیکن بھارت میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ جب گاندھی جی بھارت میں مسلم اقلیت کی حفاظت پر زور دیتے ہیں یا پاکستان کے پڑوسی ملک کے ساتھ انصاف شرافت اور دوستی کے سلوک کی تلقین کرتے ہیں تو وہ ہندوؤں اور بھارت کے مفاد کو نقصان

پہونچاتے ہیں۔ انہیں ایسی چٹھیاں آنے لگ گئیں جن میں انہیں ہندوؤں کا دشمن اور بھارت کو نقصان پہونچانے والا ظاہر کیا جاتا تھا۔ یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جن لوگوں نے گاندھی جی کو اس مضمون کی چٹھیاں لکھیں۔ ان میں مہاتما جی کا اپنا بیٹا رام داس گاندھی بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے بزرگ باپ کو لکھا کہ جب کہیں فساد ہوتا ہے تو آپ مسلمانوں کی حفاظت کے لئے وہاں پہونچ جاتے ہیں اور ہندوؤں کے نقطہ نگاہ اور مفاد سے بے اعتنائی اختیار کر لیتے ہیں۔" آپ کا وجود ہندو جنتا کے لئے ایک بدبختی بن گیا ہے" گاندھی جی نے اس خط کو اپنی ڈاک سے علیحدہ کر کے اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیا اور بعض دوستوں کو پرائیویٹ طور پہ دکھایا۔ لیکن اپنا کام جاری رکھا۔

دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ تقسیم کے وقت ریزرو بنک آف انڈیا کے پاس متحدہ ہندوستان کی حکومت کا کیش بیلنس چار ارب تھا۔ جس میں ۵ء کروڑ روپیہ پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ فوری طور پر بیس کروڑ روپیہ کام چلانے کے لئے حکومت پاکستان کے حساب میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ باقی ۵۵ کروڑ روپیہ حساب کتاب کی تکمیل تک روک لیا گیا۔ ۵ ار دسمبر تک دونوں ملکوں کے درمیان مالی حساب کتاب مکمل ہو گیا۔ اور یہ طے ہو گیا کہ باقی ۵۵ کروڑ روپیہ بھی پاکستان کو منتقل ہو جانا چاہیئے لیکن اسی وقت بھارتی اخباروں میں یہ پراپیگنڈہ شروع ہو گیا کہ اگر پاکستان کے حصے کا روپیہ ادا کر دیا گیا تو یہ روپیہ گولہ بارود کی صورت میں منتقل ہو کر محاذ کشمیر پر بھارت کے شہریوں اور فوجیوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ لہٰذا بھارتی حکومت کو اس روپیہ کی ادائیگی کی حماقت نہ کرنی چاہیئے۔ بھارتی حکومت نے بھی ادائیگی کے متعلق ٹال مٹول شروع کر دی۔ گاندھی جی نے اس بات کا نوٹس لیا اور کانگرسی لیڈروں پہ دباؤ ڈالا کہ وہ ایسی صریح بے ایمانی اور بدعہدی کا ارتکاب نہ کریں۔ چنانچہ اس روپیہ کی ادائیگی ہو گئی۔ لیکن بھارت کا جو طبقہ گاندھی جی کو اپنے عزائم کے راستے میں رکاوٹ سمجھنے لگا تھا۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اور ایک سازش کے تحت جس میں نمایاں ہاتھ راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے بعض عناصر کا تھا ایک شخص نتھو رام گاڈسے ۳۰ جنوری کی شام کو ایک بھرا ہوا پستول

لے کر اس مجمع میں شامل ہو گیا جو حسب معمول برلا ہاؤس میں گاندھی جی کی پرارتھنا کے لئے اکٹھا ہوا تھا۔ گاندھی جی اس جلسے میں شرکت کے لئے آئے تو گاڈسے نے ان پر بہت قریب سے تین فائر کر کے انہیں ہلاک کر دیا۔ گاڈسے کے خلاف مقدمہ کی سماعت کے سلسلے میں جو باتیں منظر عام پر آئیں ان میں سب سے عجیب حقیقت یہ تھی کہ جب گاندھی جی نے تقسیم ملک کے بعد بھارت میں اخلاقی قدروں کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تو سردار پٹیل کے ماتحت محکمے نے ان کی جان کی حفاظت سے اس طرح ہاتھ کھینچ لیا کہ اسے بالارادہ فعل کے سوا کوئی نام نہ دیا جا سکتا تھا۔

۴۸- کشمیر کا الحاق

مہاراجہ کشمیر کے ساتھ بھارتی لیڈروں کی خفیہ سچنت و بز غالباً باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کے اعلان سے پہلے ہی ہو چکی تھی کیونکہ اس اعلان کے فوراً بعد دریائے راوی کے اس حصے پر جو تحصیل پٹھانکوٹ اور ریاست جموں کے درمیان حدفاصل تھا۔ ایک نئے پل کی تعمیر کا کام بہت تیزی کے ساتھ شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے وہاں بھاری گاڑیوں کے استعمال کے قابل کوئی ذریعہ مواصلات موجود نہ تھا۔ الحاق کی رسمی کارروائی کے لیے اس پل کی تعمیر کا بھی انتظار تھا۔ لیکن شاید اس سے بھی زیادہ ایک اور چیز کا انتظار تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس کوشش میں مصروف تھے کہ شیخ محمد عبداللہ سے بھی الحاق کے منصوبے پر صاد کرالیں۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو الحاق کے لیے عوامی تائید کا بہانہ بن سکتا تھا۔ اور جوناگڑھ کے واقعہ کے بعد اس قسم کا کوئی بہانہ ضروری معلوم ہوتا تھا۔ شیخ صاحب اس وقت جیل میں تھے اور ریاست میں دو سیاسی پارٹیوں (نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس) کی سول نافرمانی کی تحریک جاری تھی۔

مہاراجہ کا اس زمانے کا کشمیری وزیر اعظم پنڈت کاک اسے پاکستان کے ساتھ الحاق کا مشورہ دے رہا تھا۔ اقتصادی اور جغرافیائی وجوہات اسی بات کے حق میں تھیں۔ لیکن وزیر اعظم خواہ کچھ کہے مہاراجہ کو یہ خود بھی نظر آتا تھا کہ مسلم عوام کے مفاد کے خلاف ڈوگرہ شاہی کے مفاد کی حمایت مذہبی رشتے کی بناء پر ہندوؤں ہی سے کی جا سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جو وعدے وعید کئے گئے۔ وہ ان پر راضی ہو گیا۔ لیکن ان وعدوں کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ کو فوری طور پر جو کچھ دینے کی گنجائش تھی۔ شیخ صاحب اس پر راضی نہ تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ پہلے ریاست میں عوام کی نمائندہ حکومت قائم کرو۔ پھر وہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق الحاق کا فیصلہ کرے گی۔

ستمبر میں شیخ محمد عبداللہ کو اس شرط پر جیل سے رہا کر دیا گیا کہ وہ مزید گفت و شنید کی ضرورت کے پیش نظر اپنی پارٹی کی تحریک کو فی الحال روک دیں۔ شیخ صاحب نے اپنی سول نافرمانی کی تحریک روک دی۔ دوسری پارٹی کے کارکن جیلوں میں رہے اور ان کی تحریک جاری رہی اور عوام کے اضطراب کے اظہار کا واحد ذریعہ بن گئی۔

اسی زمانے میں ایک اہم تبدیلی یہ کی گئی کہ پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی پنڈت کاک کو کشمیر کے وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا کر ان کی کرسی پر مشرقی پنجاب کے جسٹس مہر چند مہاجن کو بٹھا دیا گیا۔ جو حال ہی میں پنجاب باؤنڈری کمیشن کی ممبری سے فارغ ہوئے تھے۔

شیخ عبداللہ اپنے مطالبے پر اصرار کرتے رہے۔ مسلم کانفرنس کی تحریک روز بروز زور پکڑتی رہی۔ "الحاق کا فیصلہ کرنا عوام کا حق ہے" یہ نعرہ وادیٔ کشمیر میں گونج رہا تھا۔ پولیس اور فوج اس تحریک کو کچلنے کے لیے انتہائی سختی پر اتر آئی تھی۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے کارکن اس تحریک کو فرقہ وارانہ فساد میں الجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور ریاست جموں و کشمیر نے "سٹینڈ سٹل"[1] (تجارتی اور انتظامی سہولتوں کے لیے سابقہ انتظامات کو بدستور قائم رکھنے) کے وقتی معاہدے بھارت اور پاکستان دونوں سے کر لیے تھے۔ اگست کے آخر میں ریاست کے اندر (بالخصوص جموں میں) کہیں کہیں مسلمانوں پر حملے شروع ہو گئے۔ ستمبر میں مہاراجہ کی حکومت نے تحریک کو دبانے کی غرض سے فوج کو کھلی چھٹی دے دی۔ ستمبر کے آخر میں پونچھ سے بہت ہولناک خبریں آئیں۔ وہاں ڈوگرہ فوج مسلمانوں کے گاؤں جلا رہی تھی۔ اور قتل عام کر رہی تھی۔

اکتوبر کے شروع میں وہاں سے سینکڑوں مسلمان خاندان سخت سراسیمگی کی حالت میں پاکستان کی طرف بھاگے۔ حکومت پاکستان نے مہاراجہ کشمیر کی توجہ اس طرف دلائی۔ اور اسے کہا کہ ان واقعات کو روکے۔ جواب میں مہاراجہ کے وزیر اعظم نے یہ الزام لگایا کہ پاکستان کے علاقے سے لوگ پونچھ میں داخل ہو کر گڑبڑ پیدا کر رہے ہیں اور کہا کہ اس بات

---

[1] "STAND STILL"

کی موقع پر تحقیقات کرائی جائے۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے ایک طویل تار میں کشمیر کے وزیر اعظم کے الزامات کا جواب بھی دیا۔ اور تحقیقات کی تجویز منظور کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ تحقیقاتی کمیٹی کے لیے کشمیر کے نمائندے فوراً نامزد کر دو تاکہ تحقیقات کا کام جلد از جلد شروع کیا جائے۔ اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ البتہ مسٹر مہر چند مہاجن یک طرفہ بیان بازی کرتے رہے۔

اکتوبر کے وسط میں پنڈت جواہر لال نہرو نے شیخ محمد عبداللہ کو گفتگو کے لیے دہلی بلایا وہ وہاں ۱۷ اکتوبر کو پہنچے۔ خود بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ہوائی اڈے پر ان کے استقبال کو موجود تھے۔ وہ انہیں اپنے مکان پر لے گئے۔ اور اپنے پاس مہمان رکھا۔ ۲۱ اکتوبر کو شیخ صاحب کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دعوت دی گئی۔ یہاں تقریر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے ان واقعات کا ذکر کیا۔ جو پونچھ میں پیش آرہے تھے۔ آپ کے الفاظ یہ تھے "پونچھ ریاست کشمیر کے اندر ایک ذیلی ریاست ہے وہاں کے لوگ دوہری غلامی اور دوہرے استبداد کے ظلم سہتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لیے تحریک شروع کی ہے جو ہرگز فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ کشمیر دربار نے وہاں حال ہی میں اپنی فوج بھیج دی۔ جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں میں ہراس پھیل گیا۔ پونچھ کے اکثر بالغ مرد ہندوستان کی فوج کے پرانے سپاہی ہیں۔ ان کے تعلقات جہلم اور راولپنڈی کے دیہات میں بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو پاکستانی دیہات میں بھیج دیا۔ اور خود کشمیر کے فوجیوں کے مقابلے پر اتر آئے۔ انہوں نے پاکستانی دیہات سے کچھ اسلحہ بھی ضرور حاصل کیا ہوگا۔ اب پوزیشن یہ ہے کہ وہاں مہاراجہ کی فوج کو کئی جگہ پسپا ہونا پڑا ہے"۔ ہندوستانی خبر رساں ایجنسی اے پی۔ آئی نے اس تقریر کی رپورٹ کو ان الفاظ پر ختم کیا۔ "شیخ صاحب نے ان واقعات پر افسوس ظاہر کیا۔ اور کہا کہ ان کا صحیح علاج یہ ہے کہ عوام پر اعتماد کیا جائے۔ اور ریاست میں ذمہ دار حکومت قائم کر دی جائے"۔

فی الحقیقت اس وقت ڈوگرہ فوج نہ صرف کئی مقامات پر پسپا ہوئی تھی۔ بلکہ مکمل شکست کھا چکی تھی۔ یہ فوج صرف مزاحمت نہ کرنے والوں پر گولیاں چلا سکتی تھی۔ جب شیخ صاحب دہلی میں تقریر کر رہے تھے تو پونچھ میں مجاہدین آزادی کو ڈوگرہ فوج کے

مقابلے میں اس حد تک کامیابی حاصل ہو چکی تھی کہ وہ آزاد شدہ علاقے میں کشمیر کی متوازی حکومت قائم کرنے کی تجویز کر رہے تھے دو، تین دن کے اندر آزاد کشمیر حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کا سربراہ سردار محمد ابراہیم کو نامزد کیا گیا اور صدر مقام پلندری قرار دیا گیا۔ اس اعلان میں کہا گیا کہ وادی کشمیر کا بہت بڑا حصہ ڈوگرہ راج سے آزاد کرا لیا گیا ہے اور کشمیر کا راجہ اور وزیر اعظم سرینگر سے فرار ہو چکے ہیں۔ اور ریاست کا باقی حصہ آزاد ہونے والا ہے۔ سردار محمد ابراہیم نے آزاد حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے پہلے بیان میں شیخ عبداللہ سے تعاون کی اپیل کی اور کہا کہ "ہم کشمیر کو ظالم ڈوگرہ راج سے آزاد کرانے کی وہی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جو آپ نے شروع کی تھی۔ اس جنگ میں جو فتح ہم نے حاصل کی ہے۔ وہ آپ کے مقصد کی فتح ہے۔ آیئے اور جنگ کی قیادت سنبھالیے" لیکن شیخ عبداللہ کو پنڈت نہرو دوسری طرف کھینچ رہے تھے۔

چند دنوں کی گوریلا جنگ نے ریاست کے اندرونی حالات بالکل بدل دیئے تھے۔ اب وادی کشمیر میں مہاراجہ کی حکومت بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے دارالحکومت سے بھاگ کر جموں میں پناہ لی تھی۔ اس بات کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی کہ اسے راضی رکھنے کے لیے شیخ عبداللہ کے ساتھ ٹال مٹول کی جائے۔ وہ سراسیمگی کی حالت میں جموں سے دہلی پیغام بھیج رہا تھا۔ "میری گدی بچاؤ۔ وادی کشمیر ہاتھ سے نکلنے والی ہے مجھے سب شرطیں منظور ہیں۔ فوجی امداد اور الحاق نامے کا نام فوراً بھیجو۔ میں شیخ عبداللہ کے ساتھ تعاون منظور کرتا ہوں"۔ شیخ صاحب ابھی دہلی ہی میں تھے۔ پنڈت نہرو نے انہیں حتمی یقین دلایا کہ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیئے الحاق کی رسمی کارروائی کی جائے گی اور مہاراجہ کی حکومت کو فوجی امداد بھیجی جائے گی۔ لیکن یہ سب کارروائی عارضی ہے۔ الحاق کا مستقل فیصلہ کرنے کا حق ریاست کے عوام ہی کو دیا جائے گا۔ شیخ صاحب دھوکے میں آ گئے اور کشمیر پر بھارتی فوج کے "عارضی قبضے" کے منصوبے کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو گئے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی سے کشمیر کا "الحاق" منظور کرنے کا سرکاری اعلان کیا

گیا۔ منظوری ایک خط کی صورت میں تھی۔ جو مہاراجہ کی درخواست کے جواب میں اسے بھیجا گیا تھا۔ اس خط پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دستخط تھے۔ اس کی عبارت حسب ذیل تھی۔

"مائی ڈیر راجہ صاحب مسٹر وی۔ پی مینن نے آپ کا خط مورخہ ۲۶ اکتوبر مجھے دیا جن خاص حالات کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انہیں مدنظر رکھتے ہوئے میری حکومت بھارتی ڈومی نین کے ساتھ ریاست کشمیر کا الحاق اپنی اس پالیسی کے ماتحت منظور کرتی ہے کہ ان پاکستون سے الحاق کا سوال جہاں عوام کی اکثریت اور والی ریاست مختلف مذہبی فرقوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ عوام کی رائے کے مطابق طے ہونا چاہیئے۔ لہٰذا میری حکومت چاہتی ہے کہ جونہی ریاست میں امن و امان قائم ہو اور ریاست کی سرزمین بیرونی حملہ آوروں سے خالی ہو جائے تو ریاست کشمیر کے الحاق پر عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ اندریں اثناء آپ کی اپیل کے مطابق ہندوستانی فوج کے سپاہی آپ کی فوج کی مدد کرنے اور آپ کی رعایا کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے لیئے روانہ کیئے جا رہے ہیں۔ میری حکومت کو اور خود مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا ہے۔ کہ آپ نے شیخ عبداللہ کو یہ دعوت دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ وہ عارضی طور پر وزارت مرتب کریں۔ اور آپ کے وزیر اعظم کے ساتھ مل کر کام کریں۔ آپ کا مخلص ماؤنٹ بیٹن آف برما۔"

بھارت کے اعلان کے جواب میں حکومت پاکستان نے اپنے سرکاری اعلان میں کہا کہ پاکستان اس "الحاق" کو تسلیم نہیں کر سکتا یہ فریب اور فوجی طاقت سے کشمیر کے مسلم عوام کو ان کی مرضی کے خلاف بھارت کا غلام بنانے کی کوشش ہے۔ قائد اعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو تار کے ذریعہ کشمیر کے سوال کے متعلق دونوں حکومتوں کے درمیان بات چیت کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے پاکستان کے کمانڈر انچیف اور صوبہ سرحد کے گورنر کو لاہور گورنمنٹ ہاؤس میں مشورے کے لیئے طلب کیا۔ دونوں کانفرنسوں کے لیئے ۲۹ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی گئی۔ ۲۸ اکتوبر کو ہندوستان کی خبر رساں ایجنسی اے۔ پی۔ آئی نے دہلی سے ایک خبر اخباروں کو بھیجی اور چند گھنٹے کے بعد ایک اور خبر بھیجی۔ پہلی خبر یہ تھی "ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا ہے۔ کہ پاکستان کے گورنر جنرل کی دعوت پر بھارت کے گورنر جنرل اور وزیر اعظم ہوائی جہاز کے ذریعے ۲۹ اکتوبر

اکتوبر کو لاہور میں پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیراعظم کے ساتھ کانفرنس کی غرض سے جانے والے ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مشیر اعلیٰ لارڈ اسمے اور محکمہ برائے ریاستی امور کے سیکرٹری مسٹر وی پی مینن بھی ان کے ساتھ جائیں گے۔ توقع ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو اسی شام کو دہلی واپس پہنچ جائیں گے" چند گھنٹوں کے بعد دوسری خبر اسی ذریعہ نے ذیل کے الفاظ میں دی۔ "آج رات گئے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہر لال نہرو پروگرام کے مطابق قائداعظمؒ جناح اور مسٹر لیاقت علی خاں سے ملنے کے لیئے لاہور نہ جاسکیں گے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ فیصلہ پنڈت نہرو کی علالت طبع کے باعث کیا گیا ہے"۔

بھارتی حکومت کے سربراہ گفتگو کے لیئے نہ آئے۔ لیکن پروگرام کے مطابق دوسری کانفرنس لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں ہوئی۔ جس میں قائداعظمؒ مسٹر لیاقت علیخاں پنجاب اور صوبہ سرحد کے گورنر اور پاکستان کا انگریز کمانڈر انچیف موجود تھے۔ قائداعظمؒ کا خیال تھا کہ بھارتی حکومت محض فوجی طاقت سے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس کا استصواب رائے کا وعدہ محض فریب ہے۔ پاکستان کو پہلے ہی بہت مشکل مسائل درپیش ہیں۔ تاہم کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ پاکستان کے لیئے دوسرے سب مسائل سے زیادہ اہم ہے۔ پاکستان کو جس طرح ممکن ہو اس کی مزاحمت کرنی چاہیئے۔ انگریز کمانڈر انچیف اس سے پہلے ہی قائداعظمؒ کے ساتھ نجی گفتگو میں یہ کہہ چکا تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی فوجی نفری نہیں ہے۔ جسے کشمیر میں ہندوستانی فوج کے مقابلے میں بھیجا جاسکے۔ فوجی یونٹ جہاں جہاں متعین ہیں۔ وہاں سے انہیں ہٹانا ممکن نہیں ہے۔ ان حالات میں جو تجاویز ممکن العمل تھیں۔ ان پر غور کیا گیا۔

ایک مرتبہ پھر سرکاری مشینری کی عدم موجودگی میں پاکستانی عوام نے اس خلا کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اور پاکستانی عوام کی کافی تعداد میں اس "بین الاقوامی بریگیڈ" میں شامل ہونے کے لیئے پہنچ گئے۔ جو آزاد کشمیر حکومت کے سربراہ سردار محمد ابراہیم نے قائم کی تھی۔ انہوں نے بیرونی دنیا کے لوگوں سے اپیل کی کہ ایک ظالم راجہ کے مقابلے میں عوام کی آزادی کے اصول کے حامی اس بریگیڈ میں شامل ہو کر کشمیر کو آزاد کرانے کے

لئے ان کی امداد کریں۔

یہ بات تاریخ کے صفحات پر نقش ہے کہ کشمیر کے مجاہدین آزادی اور ان کے معاونوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے معمولی ہتھیاروں کی مدد سے ہندوستانی فوج کا مقابلہ کیا جسے ہوائی جہازوں کے ذریعے لمحہ بہ لمحہ کمک اور جدید قسم کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور ایسا مقابلہ کیا کہ ہندوستانی فوج کو ان کے ہوائی جہازوں اور ان کی مشین گنوں کے باوجود ناکوں چنے چبوا دیئے۔ آہستہ آہستہ پاکستان کی حکومت نے اپنے پہلے کمانڈر انچیف کو سبکدوش کیا۔ اس کی جگہ ایک ایسے شخص نے لی جو انگریز اور غیر ملکی بے شک تھا۔ لیکن اس نے پاکستانی فوج کی نئی تنظیم بہت تیزی کے ساتھ کی۔ مختلف ذرائع سے حاصل کئے ہوئے اسلحہ سے اسے مسلح کیا۔ اور اس قابل بنا دیا کہ آہستہ آہستہ چھ سات مہینوں کے اندر اس فوج نے تمام ضروری مورچے سنبھال لیے اور بتدریج کشمیر کے محاذ کا چارج بھی لے لیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ذاتی طور پر "الحاق" کشمیر کے متعلق ۲/ نومبر ۱۹۴۷ء کو یعنی "الحاق" کی منظوری کے تقریباً ایک ہفتہ کے بعد لب کشائی کی۔ آپ نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کی۔ جس میں کشمیر کے متعلق بھارتی حکومت کی پالیسی پر روشنی ڈالی۔ اس تقریر میں آپ نے فرمایا "۲۴/ اکتوبر[1] کو الحاق کی درخواست موصول ہونے پر ہم نے ۲۵/ اکتوبر کو کابینہ کی دفاعی کمیٹی میں اس درخواست پر غور کیا۔ لیکن اس وقت کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ فوجی امداد کی ذمہ داری قبول کرنے کے راستے میں دشواریاں تھیں۔ ۲۶/ اکتوبر کی صبح کو ہم نے اس معاملہ پر دوبارہ غور کیا۔ اس وقت کشمیر کے حالات اور بھی نازک ہو گئے تھے اور سرینگر اور پوری وادی کشمیر کی تقدیر کا فیصلہ ہونے ہی والا تھا۔ ہمیں امداد کے لیے سخت تاکیدی پیغامات موصول ہوئے یہ پیغامات صرف مہاراجہ کشمیر کی جانب سے نہ تھے۔ بلکہ عوام کے نمائندوں کی طرف سے بھی تھے۔ بالخصوص کشمیر کے عظیم قائد شیخ محمد عبداللہ کی جانب سے جو کشمیر نیشنل کانفرنس کے صدر ہیں۔ مہاراجہ کی حکومت نے بھی ہم پر زور دیا کہ ہم کشمیر کے

---

[1] ماؤنٹ بیٹن نے جس چھٹی کے ذریعے الحاق منظور کیا۔ اس پر ۲۷ اکتوبر کی تاریخ درج تھی اور اس میں کہا گیا تھا کہ آپ کی درخواست مورخہ ۲۶ اکتوبر موصول ہوئی۔

الحاق کو منظور کر لیں اور ہوائی راستہ سے فوجی امداد بھیج دیں۔ لیکن ہماری یہ شرط تھی کہ الحاق کے سوال کو بعد میں عوام کی رائے سے طے کرنا ضروری ہوگا۔ ہم ہنگامی حالات میں کوئی آخری فیصلہ کرنا نہ چاہتے تھے۔"

ان الفاظ سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ الحاق کی درخواست پیش کی جا رہی تھی۔ لیکن بھارتی حکومت اسے منظور کرنے میں تامل کر رہی تھی۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ تھا کہ جنہوں سے بھارتی حکومت کے نمائندے اور کانگریسی لیڈر مہاراجہ کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اپنی ریاست کو بھارت کے ساتھ ملحق کر دے۔

بہرحال پنڈت جی نے اپنی تقریر میں مزید فرمایا "میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری پالیسی شروع سے یہ رہی ہے۔ کہ جہاں الحاق کے سوال پر اختلاف ہو۔ وہاں فیصلہ عوام کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس پالیسی کے مطابق ہم نے الحاق کی منظوری کے ساتھ یہ ضروری شرط لگادی۔ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ آخر کار کشمیر کے عوام کی رائے کے مطابق ہوگا۔ ہم یہ قول دے چکے ہیں اور مہاراجہ اس وعدے کی تائید کرتا ہے۔ ہمارا یہ وعدہ صرف کشمیری عوام سے نہیں بلکہ پوری دنیا سے ہے۔ ہم اس سے منحرف نہ ہوں گے۔ نہ ہو سکتے ہیں۔ جب ریاست میں امن قائم ہو جائے گا تو ہم اس بات کے لیئے تیار ہوں گے کہ کسی بین الاقوامی ادارے مثلاً اقوام متحدہ کے زیر اہتمام استصواب رائے کرایا جائے۔ اس طرح جو فیصلہ ہوگا۔ ہم اس کے پابند ہوں گے۔ کیا اس سے زیادہ منصفانہ پیشکش کوئی اور ہو سکتی ہے؟"

تاریخ کے صفحات میں یہ اعلان بھی موجود ہے اور جس طرح اس پر عمل کیا گیا وہ بھی موجود ہے ۱۹۴۸ء کے شروع میں پنڈت جی کی حکومت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے سامنے لے گئی۔ وہاں اس نے اس اعلان کی پابندی کا اقرار کر کے سلامتی کونسل اور پاکستان کے ساتھ استصواب رائے کے ایک پروگرام پر اتفاق کر لیا جس کے مطابق یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس جنگ بندی کی رو سے ریاست کے بیشتر حصے پر اپنا عارضی فوجی قبضہ قائم رکھنے کے بعد بھارتی حکومت آہستہ آہستہ استصواب کے اصول اور مقصد سے صاف منکر ہو گئی اور آج تک صرف فوجی طاقت کے ذریعے کشمیر کے عوام کا حق خود اختیاری غصب کئے بیٹھی ہے۔

۴۹۔ پاکستان میں مسلم لیگ کی تنظیم نو

پاکستان کے متعلق قائد اعظمؒ دو بنیادی نکتوں پر ہمیشہ بہت اصرار کے ساتھ غیر مبہم الفاظ میں زور دیتے رہے۔ (۱) پاکستان ایک جمہوری مملکت ہو گا۔ یعنی اس ملک کے نظام میں "سیاسی حاکمیت" اس ملک کے جمہور کو حاصل ہو گی۔ (۲) پاکستان کے جمہور میں اس مملکت کا ہر شہری بلا لحاظ مذہب و ملت یکساں حیثیت سے شامل ہو گا۔ یعنی پاکستان ان معنوں میں مذہبی مملکت نہ ہو گا۔ کہ یہاں سیاسی حاکمیت رکھنے والے جمہور میں یا نظم و نسق کی مشینری میں صرف ایک مذہب کے پیروؤں کی جگہ ہو گی۔ البتہ ان معنوں میں یقیناً اسلامی مملکت ہو گا کہ اس ملک کے مسلمانوں کو جمہور کی بھاری اکثریت کی حیثیت سے اس بات کا پورا موقعہ حاصل ہو گا کہ وہ مملکت کی پالیسیوں کو اسلام کے ان اصولوں کے مطابق ڈھال سکیں۔ جو ان کے نزدیک دائمی سچائی اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا صحیح ذریعہ ہیں۔ ان دونوں نکات کے متعلق قائد اعظمؒ کے بہت سے بیان موجود ہیں۔ جن میں وہ تقریر بہت مشہور ہے۔ جس کے ساتھ آپ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کا آغاز کیا تھا۔ آپ نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ اس مملکت کے شہریوں کی حیثیت سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کوئی فرق اور امتیاز نہ ہونا چاہیے۔ فرمایا تھا۔ "ہمیں اس نصب العین کو سامنے رکھنا چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ ایسا وقت آئے گا جب ہندو اور مسلمان مذہب کے لحاظ سے بیشک ہندو اور مسلمان رہیں گے۔ کیونکہ مذہب ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے۔ لیکن سیاسی اعتبار سے اور اس مملکت کے شہریوں کی حیثیت سے ہندو اور مسلمان کی تمیز باقی نہ رہے گی۔"

ان فقروں میں "ایسا وقت آئے گا" کے الفاظ معنی خیز تھے۔ کیونکہ جس طرح اس نصب العین

کا تصوّر ان کے ذہن میں واضح تھا۔ ان کی محکم رائے یہ بھی تھی کہ یہ مفروضہ اور اس مفروضے پر عمل کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ نصب العین پاکستان بنتے ہی حاصل ہو گیا ہے۔ عملی حالات کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور عملی حالات یہ تھے کہ کل تک پوری ہندو قوم پاکستان کے تصوّر اور قیام کے خلاف لڑ رہی تھی۔ آج ہندوؤں کا وہ حصّہ جو پاکستان میں رہ گیا تھا۔ اس نئی مملکت کا شہری اور آئینی اور قانونی طور پر پاکستانی قوم کا ایک حصّہ بن گیا تھا۔ پاکستان کے غیر مسلم عنصر کی اس پوزیشن کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت تھی۔۔ اسے ذہنی اور جذباتی طور پر پاکستان کو اپنانے اور اپنی وفاداری کا مرکز بدلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ لہٰذا قائد اعظمؒ یہ سمجھتے تھے کہ فی الحال پاکستان کی حفاظت اور اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر تھی۔ جنہوں نے جانیں لڑا کر اس ملک کو حاصل کیا تھا۔ اور مسلمانوں کے لیے محفوظ پالیسی یہی تھی کہ اپنی پرانی تنظیم کے خطوط پر اپنے آپ کو منظم رکھیں۔ غیر فرقہ وارانہ پارٹیاں بنانے کے لیے حالات میں تبدیلی اور زمانۂ مستقبل کا انتظار کرنا پڑے گا۔

قائد اعظمؒ مملکت کے گورنر جنرل بھی تھے۔ لیکن قوم کے قائد بھی تھے۔ آپ اس مملکت کے کاروبار اور اس کی تعمیر میں قوم کو سرگرم حصّہ دار بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے تنظیم کی ضرورت تھی۔ لہٰذا جو تنظیم پہلے ہی موجود تھی۔ جس کے ذریعے مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ اس کی آئینی شکل درست کرنے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی جانشین کے طور پر پاکستان مسلم لیگ کے قیام کے لیے آپ نے اپنی اوّلین فرصت میں قدم اٹھایا۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں آپ ہی کے حکم سے لیاقت علی خاں نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل (جس کا آئینی وجود ابھی ختم نہ ہوا تھا) کے اجلاس کے لیے نوٹس جاری کیے۔ یہ اجلاس ۱۴ اور ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ اجلاس کے سامنے یہ تجویز تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو ختم کر کے اس کی جگہ پاکستان اور ہندوستان کی دو الگ الگ مسلم لیگیں قائم کی جائیں۔

اس موقعہ پر مسٹر حسین شہید سہروردی نے (جو ابھی تک بھارت ہی میں قیام کا ارادہ رکھتے تھے اور بھارت میں رہنے والے کئی دوسرے مسلم لیگی کونسلروں کے ہمراہ کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے کراچی آئے تھے) ایک سوال بہت شدومد کے ساتھ اٹھایا۔

کیا بدلے ہوئے حالات میں پاکستان کے مسلمانوں کے لئے اپنی سیاسی تنظیم فرقہ وارانہ خطوط پر قائم رکھنا درست تھا؟ وہ کہتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ صرف مسلم اقلیت کے حقوق اور مفاد کی وکیل اور ترجمان تھی۔ لہٰذا اس کی رکنیت بجا طور پر مسلمانوں تک محدود تھی۔ لیکن اب جو جماعت پاکستان کے جمہوری ملک کی حکمران سیاسی پارٹی بننے کی مدعی ہے وہ اپنے فرائض کو صرف مسلمانوں کے مفاد تک کیسے محدود کر سکتی ہے؟ اب اس پر مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے مفاد کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ہو گی۔ لہٰذا پاکستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کی جانشین پارٹی کو اپنا نام پاکستان لیگ رکھنا چاہیئے۔ اور اپنی رکنیت کا دروازہ غیر مسلموں کے لئے بھی کھول دینا چاہیئے۔ لیکن قائد اعظمؒ کا مشورہ اس کے خلاف تھا۔ کافی زور دار بحث کے بعد کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ (۱) آل انڈیا مسلم لیگ کی جگہ پاکستان اور بھارت کے لئے الگ الگ مسلم لیگیں قائم کی جائیں (۲) آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے وہ تمام ممبر جو پاکستان کے شہری بن گئے ہیں۔ آئندہ پاکستان مسلم لیگ کونسل کے ممبر تصور کیے جائیں اور وہ تمام ممبر جو بھارت کے شہری ہیں۔ بھارتی مسلم لیگ کونسل کے ممبر تصور کئے جائیں ۔
(۳) پاکستان مسلم لیگ اور بھارتی مسلم لیگ کے لیئے الگ الگ کنوینر مقرر کیے جائیں تاکہ وہ اپنی اپنی مسلم لیگ کونسلوں کے اجلاس طلب کریں۔ اپنی اپنی جماعتوں کی تنظیم کریں اور ان کے عہدہ دار منتخب کریں اور اس سلسلے میں باقی ضروری کارروائیاں کریں۔ (۴) پاکستان مسلم لیگ کے کنوینر مسٹر لیاقت علی خاں ہوں گے۔ اور بھارتی مسلم لیگ کے کنوینر مسٹر محمد اسمٰعیل (صدر مسلم لیگ مدراس) ہوں گے (۵) ان دونوں جماعتوں کے اجلاس اپنی اپنی طرف سے نمائندے مقرر کریں گے جو باہم مشورے سے آل انڈیا مسلم لیگ کی املاک وغیرہ کو دونوں جانشین جماعتوں کے درمیان تقسیم کرنے کا انتظام کریں گے اگر ان کے درمیان کسی شئے پر اختلاف پیدا ہو تو اس کا ثالثی فیصلہ قائد اعظمؒ سے کرایا جائے گا۔

اس کے بعد بی۔بی۔سی کے ایک نمائندے رابرٹ سٹمس نے جو اس موقعہ پر کراچی آیا ہوا تھا۔ اس موضوع پر قائد اعظمؒ سے انٹرویو کیا۔ اس کی روداد پاکستانی اخباروں میں ۲۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو چھپی) سٹمس نے قائد اعظمؒ سے پوچھا کہ کیا پاکستان مسلم لیگ اپنے آپ

کو ایک ایسی قومی جماعت میں تبدیل کرے گی۔ جس کی رکنیت کا دروازہ ہر پاکستانی کے لیئے بلا لحاظ مذہب کھلا ہو؟ قائداعظمؒ کا جواب ان الفاظ میں تھا "ابھی اس قسم کی قومی تنظیم قائم کرنے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی مسلمانوں کی رائے عامہ اس کے لیئے تیار نہیں ہے۔ ہمیں جمہوریت کے ایسے نعروں سے مسحور نہ ہونا چاہیئے۔ جو ٹھوس حقائق پر مبنی نہ ہوں۔ مسلمانوں نے حال ہی میں اپنا آزاد وطن حاصل کیا ہے۔ ابھی انہوں نے اس بنیاد پر ایسی عمارت قائم کرنی ہے۔ جو پیش آنے والے حالات کی ضرورت کے مطابق ہو۔ لیکن پاکستان میں ایک خالص مسلم تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ ناقابل تبدیل نہیں ہے۔ اگر بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تو اسے بدلا جا سکتا ہے۔ سیاست میں کوئی چیز جامد اور آخری نہیں ہوتی یہ سب کچھ آئندہ حالات اور ہماری ترقی کی منازل پر منحصر ہے۔"

اس سوال سے ملتا جلتا (بلکہ اس سے وابستہ) ایک سوال اور بھی تھا۔ جو اس وقت زیر بحث آنے لگ گیا تھا۔ کیا قیام پاکستان کے بعد بھی مسلم لیگ کو مسلمانوں کی "واحد نمائندہ سیاسی پارٹی" بننے پر اصرار کرنا چاہیئے۔ کیا جمہوریت کے عام تقاضوں کے پیش نظر نئے حالات میں مسلم لیگ کو اپنے بالمقابل دوسری پارٹیوں کا مساوی حق اور درجہ تسلیم کر لینا چاہیئے؟ لیکن اس وقت دوسری پارٹیاں کون سی تھیں؟ مشرقی پاکستان میں کانگریس پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی۔ صوبہ سرحد میں سرخپوش جماعت اور اسی قسم کے بعض گروپ جو قیام پاکستان کے خلاف لڑتے رہے تھے۔ لہٰذا قائداعظمؒ کا مشورہ یہی تھا کہ فی الحال مسلم لیگ ہی کو مضبوط رکھا جائے۔ اور دوسری پارٹیوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ حالات بہتر ہو جائیں گے تو جمہوری طریق پر ایک دوسرے کے بالمقابل "صحت مند" سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کی گنجائش پیدا ہو گی۔ آپ نے دوسری پارٹیوں پر کوئی قانونی بندش نہ لگائی۔ لیکن ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں ایک پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ "ہم نے دس سال کی مسلسل کوشش اور جد وجہد کے بعد پاکستان حاصل کیا ہے یہ مسلم لیگ ہی کی کارگزاری تھی۔ کئی مسلمان ایسے بھی تھے جو اس جد وجہد سے الگ تھلگ رہے۔ بعض اپنے مفاد پر زد پڑنے کی وجہ سے ڈرتے رہے۔ لیکن ہم کوشش کرتے رہے اور لڑتے رہے۔ اور بالآخر ہم نے پاکستان

قائم کرا لیا جو دنیا کے لیئے ایک حیران کن واقعہ تھا۔ اب اگر آپ پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو میں کہوں گا کہ ہر مسلمان کے لیئے اس کا سیدھا راستہ یہی ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اپنی لہجا کے مطابق ملک کی خدمت کرے۔ آج جو دوسری پارٹیاں ہیں ان کے ماضی کی وجہ سے ان پر شک و شبہ کیا جائے گا ہمیں کسی سے دشمنی نہیں ہے نہ ہم کسی کے خلاف انتقامی کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔ دیانتدارانہ تبدیلی رائے خیر مقدم کی مستحق ہے۔ لیکن موجودہ ہنگامی حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے آجائے جو پاکستان کی اصل محافظ ہے۔ وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ ہم دوسری پارٹیاں بنائیں۔ گو کچھ عرصے کے بعد اس بات کی گنجائش ہوگی کہ سچے اور صحت مند خطوط پر پارٹیاں بنائی جائیں۔

۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کے فیصلے کے مطابق مسٹر لیاقت علی خاں نے پاکستان مسلم لیگ کے کنوینر کی حیثیت سے ان لوگوں کا کنونشن بلا لیا جو آل انڈیا مسلم لیگ کے کونسلر رہ چکے تھے اور اب پاکستان میں مقیم تھے۔ اس کنونشن نے جو فروری ۱۹۴۸ء میں منعقد ہوا۔ پاکستان مسلم لیگ کی نئی تنظیم کا پروگرام بنایا اور اس پروگرام کو مکمل کرانے کے لیئے چودھری خلیق الزماں کو چیف آرگنائزر مقرر کر دیا۔ چودھری صاحب نے صوبوں کے لیئے آرگنائزنگ کمیٹیاں مقرر کیں۔ پھر صوبوں میں مسلم لیگ کے ابتدائی ممبروں کی بھرتی کا کام شروع ہوا۔ اضلاع اور صوبوں کی مسلم لیگیں منتخب ہوئیں۔ اس طرح جو پاکستان مسلم لیگ کونسل بنی۔ اس کا اجلاس اپریل ۱۹۴۹ء میں کراچی میں ہوا۔ اس اجلاس میں چودھری صاحب کو صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نئی مسلم لیگ کے آئین میں ایک اہم دفعہ شامل کی گئی۔ جس کی رو سے لیگ کے عہدہ داروں پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ کوئی وزارتی عہدہ قبول نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے ہی مسلم لیگ کی نئی تنظیم میں بحران شروع ہو گئے تھے۔ ان کا ذکر آئندہ آئیگا۔

۵۰۔ ۱۹۴۸ء کی جھلکیاں ۔ ۔ ۔ لوں میں خلفشار

پاکستان کی زندگی کا پہلا سال عجیب طرح گزرا۔ اس ملک کی نیم منظم حکومت مسائل کے سیلاب کا مقابلہ بھی کرتی رہی اور مملکت کی مشینری میں جو عظیم خلا موجود تھے۔ انہیں پر کرنے کی ہمت کلاہ کی کوشش بھی کرتی رہی۔ فوج کی تنظیم کا سوال بہت اہم اور فوری نوعیت کا تھا۔ جب فوج کی تنظیم ادھوری تھی تو ملک کے عوام ہی بالخصوص قبائلی علاقے کے پاکستانی اس کی بے ضابطہ فوج بنے رہے اور بطور خود کشمیر کے محاذ پر بھارتی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء کا موسم گرما شروع ہوا تو بھارتی فوجوں نے جنہیں کمک پر کمک پہنچ رہی تھی۔ سخت حملے شروع کئے۔ وہ وادی کشمیر کو عبور کر کے پاکستان کے ضلع ہزارہ کی سرحد پر پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن مئی ۱۹۴۸ء تک پاکستان کی فوجی تنظیم اس قابل ہو گئی تھی کہ باضابطہ فوج نے وادی کشمیر میں داخل ہو کر اس محاذ کا چارج سنبھال لیا اور بھارتی فوج کی پیش قدمی روک دی۔ بھارتی فوج اس کے بعد بھی آگے بڑھنے کے لیئے حملے کرتی رہی۔ لیکن بار بار پسپا ہوتی رہی۔ اگر بھارت کی اس پیش قدمی کی پشت پر کوئی ایسا منصوبہ تھا جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے تھے کہ صوبہ سرحد میں تخریبی کارروائیوں کے لیئے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیئے اس کی سرحدوں پر ایک طرف بھارتی فوج اور دوسری طرف افغان فوج موجود ہو۔ اور ان کے درمیان خان عبدالغفار خان "آزاد پختونستان" کا نعرہ بلند کریں تو اس منصوبے کے تینوں اجزا کسی مقام اتصال تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنی اپنی جگہ ناکام ہو گئے۔

مملکت پاکستان کی مشینری میں ایک اور بہت بڑا خلا یہ تھا کہ جب یہ مملکت معرض وجود میں آئی تو بینکنگ اور کرنسی کے لیئے اس کا اپنا کوئی نظام موجود نہ تھا اور ہو بھی نہ سکتا تھا۔ اس انتظام کے لیئے ملک کے وجود میں آنے کے بعد ہی قدم اٹھایا جا سکتا

تھا۔ لہٰذا التقسیم کے وقت ریزرو بنک آف انڈیا ہی کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک معاہدے کے ذریعے ۳۰ ستمبر ۱۹۴۸ء تک کے لیے حکومت پاکستان کا خزانہ اور پاکستان کے لیے کرنسی فراہم کرنے اور اس کی مقدار پر کنٹرول رکھنے کی ذمہ داری اس کی تحویل میں دے دی گئی تھی۔ یہ صورت حال بہت عجیب تھی۔ بھارت کے ساتھ تجارتی معاہدے بھی تھے۔ غیر متوقع طور پر اس کے ساتھ جنگ بھی شروع ہو گئی تھی اور پاکستان کے خزانے اور کرنسی پر بھارت کا بالواسطہ کنٹرول بھی تھا۔ پھر پاکستان کے پاس سٹیٹ بنک اور کرنسی کا انتظام قائم کرنے کے لیے آدمی کہاں تھے؟ جو تھے وہ دوسرے فوری مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں قائد اعظم رح نے مسٹر زاہد حسین کی دوسری ذمہ داریوں کو ہلکا کر کے پاکستان سٹیٹ بنک کی تنظیم کی ذمہ داری انہیں سپرد کی اور انہوں نے ہمت سے کام لے کر ٹائم ٹیبل سے تین مہینے پہلے سٹیٹ بنک اور کرنسی کے نظام کی تکمیل کر دی۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو سٹیٹ بنک کا افتتاح قائد اعظم رح نے کیا۔ سابقہ معاہدے میں ترمیم کے ذریعے اسی دن حکومت پاکستان کا کیش بیلنس (اس دن یہ رقم صرف ۶۵ کروڑ روپیہ تھی۔) اور کرنسی کی ذمہ داری بھارتی بنک سے پاکستانی بنک کو منتقل ہو گئی۔ سٹیٹ بنک پاکستان کی اقتصادی خود مختاری کی تکمیل کا نشان تھا۔ اس کے افتتاح کی تقریب آخری پبلک تقریب ثابت ہوئی جس میں قائد اعظم رح ذاتی طور پر شرکت کر سکے۔

قائد اعظم رح نے مارچ ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان کا آٹھ نو دن کا دورہ کیا۔ اس صوبے کے متعلق ان کا تاثر یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کے زیر قیادت صوبائی وزارت یک جہتی کے ساتھ قومی مقاصد کے لیے کام کر رہی تھی اور مرکزی حکومت اور اپنے صوبے کے عوام دونوں کی حمایت اور تائید کی مستحق تھی۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں عوام کو یہی مشورہ دیا کہ وہ متحد رہیں اور صوبائی وزارت کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ ایک خاص مسئلے کے متعلق جو اس صوبے میں کسی حد تک بحث کا موضوع بن گیا تھا قائد اعظم رح نے دو ٹوک فیصلہ کیا کہ مشرقی پاکستان کی صوبائی زبان بنگالی ہے۔ اس سے کسی کو تعرض نہیں ہو سکتا۔ لیکن پورے پاکستان کی قومی زبان کا درجہ صرف اردو کو ملے گا۔ پارٹیوں کی تنظیم کے متعلق آپ

نے اس صوبے کے عوام کو یہ تلقین کی کہ وہ فی الحال مسلم لیگ پارٹی ہی کو مضبوط بنائیں دوسری متقابل پارٹیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔

اپریل میں آپ نے صوبۂ سرحد کا دورہ کیا۔ یہاں وہ دوسرے مسائل کے علاوہ سرخپوش جماعت کے آئندہ رویہ اور عزائم کو سمجھنا چاہتے تھے۔ قائداعظمؒ کی عام پالیسی یہ تھی کہ وہ گذشتہ سیاسی اختلاف کو بھلا کر پاکستان کے ہر شہری کو اپنا مستقبل ذہنی طور پر اس ملک کی تعمیر و ترقی کے ساتھ وابستہ کرنے اور اپنی صلاحیت کے مطابق اس ملک کی خدمت کرنے کا موقعہ دینا چاہتے تھے۔ سرخپوش لیڈروں نے آخری دن تک قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ قائداعظمؒ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اب وہ پاکستان کی حقیقت کو تسلیم کر کے اپنا سابقہ رویہ ترک کرنے اور پاکستان کی تعمیر میں تعاون کرنے کو تیار ہیں یا نہیں۔ آپ نے پشاور میں خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ ملاقات اور تفصیلی گفتگو کے لیے وقت نکالا۔ اور ان کا نقطۂ نگاہ سمجھنے کی کوشش کی۔ سرخپوش لیڈر اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم علی حالہ قائم رکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ کیونکہ جہاں تک "حزب مخالف" کی دلیل کا تعلق تھا۔ حزب مخالف کسی متبادل پروگرام پر مبنی ہوا کرتی ہے۔ پاکستان کے ابتدائی حالات میں مخالفت برائے مخالفت کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ قائداعظمؒ ان سے پوچھتے رہے کہ اب ان کے اور مسلم لیگ کے پروگرام میں کون سا فرق تھا۔ جو انہیں اپنی علیحدہ جماعت قائم رکھنے پر (جس کا پروگرام کل تک پاکستان کی مخالفت تھا) مجبور کرتا تھا۔ عبدالغفار خاں اس بات کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دیتے تھے۔ بلکہ اپنا تعمیری پروگرام وہی بتاتے تھے جو مسلم لیگ کے پیش نظر تھا۔ لیکن مسلم لیگ کے کیمپ میں آنے کے بجائے اپنی علیحدہ جماعت کو حزب مخالف کی حیثیت سے قائم رکھنے پر مصر تھے۔ طویل گفتگو کے بعد قائداعظمؒ اس نتیجے پر پہنچے کہ خان عبدالغفار خاں کا مقصد پاکستان کی مخالفت اور تخریب کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور ڈاکٹر خان صاحب اپنے طور پر کچھ سوچنے سمجھنے کی اہلیت ہی نہ رکھتے تھے۔

قائداعظمؒ ابھی پشاور ہی میں تھے کہ سندھ کی کابینہ میں وزیروں کے باہمی اختلاف

نے ایک مینڈل کی صورت اختیار کرلی یہ مذیر صاحبان پبلک طور پر اخباری بیانوں کے ذریعے ایک دوسرے کے خلاف الزام لگا رہے تھے۔ قائداعظمؒ نے اس کا فوری نوٹس لیا۔ گورنر سے رپورٹ مانگی۔ یہ رپورٹ انہیں کراچی میں واپسی پر ملی۔ اس کا مطالعہ کرنے اور صوبائی وزیر اعلیٰ کھوڑو کا جواب سننے کے بعد آپ نے گورنر کو ہدایت بھیج دی کہ کھوڑو کو فوراً عہدے سے برطرف کر دیا جائے۔ ان کے خلاف الزامات کی تحقیقات کے لیئے ایک خاص ٹربیونل مقرر کر دیا جائے اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کو اپنا نیا لیڈر منتخب کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ سندھ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے پیرالٰہی بخش کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ اور ان کی نئی وزارت نے ۳ مئی ۱۹۴۸ء کو عہدے کا حلف اٹھا لیا۔

پنجاب کے مسلم لیگی وزیروں میں بھی کچھ عرصے سے رسہ کشی ہو رہی تھی۔ اور وزیر خزانہ میاں ممتاز دولتانہ اور وزیر مال سردار شوکت حیات خاں دونوں وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کے خلاف شکایات کی بنا پر استعفیٰ دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ صوبہ سرحد کے دورے سے واپسی کے بعد قائداعظمؒ نے ان نوجوانوں کو بھی کراچی بلایا۔ وہ کس بات پر لڑ رہے تھے، قائداعظمؒ ان تینوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور یہ بات بھولے نہ تھے کہ حصولِ پاکستان کی جنگ کے زمانے میں ان نوجوانوں کی متحدہ ٹیم نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ کیا اب ان کے درمیان جھگڑے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ممتاز دولتانہ کا ذہن ایک کمتر قابلیت کے (ان دونوں کی قابلیت کا قائداعظمؒ کو اندازہ تھا) وزیر اعلیٰ کی قیادت کو گوارا کرتا تھا، اگر یہی وجہ تھی تو قائداعظمؒ کو اس کا حل صاف نظر آتا تھا۔ نواب ممدوٹ کو مرکزی کابینہ میں وزیر لیا جا سکتا تھا اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ دولتانہ کو سپرد کیا جا سکتا تھا تاکہ وہ اپنی قابلیت کا جوہر دکھا سکے۔ قائداعظمؒ جو بھی انتظام کرنا چاہیں اسے منظور کرنے میں نواب ممدوٹ کو کیا عذر ہو سکتا تھا؟ قائداعظمؒ پنجاب کے تینوں وزیروں کو اپنے فرمانبردار بچے سمجھتے تھے۔ اور اسی نقطۂ نگاہ سے ان کے باہمی اختلافات کو رفع کرانا چاہتے تھے۔ لیکن اس اختلاف کی نوعیت بہت عجیب تھی۔ دولتانہ نواب ممدوٹ کی قیادت پر مطمئن نہ تھے اور خود ان کی جگہ وزیر اعلیٰ بننے کو تیار نہ تھے۔ قائداعظمؒ نے

تینوں وزیروں سے اکٹھی ملاقات بھی کی اور دولتانہ اور سردار شوکت حیات سے علیحدہ گفتگو بھی کی۔ لیکن اس گفتگو میں دولتانہ کا موقف یہی رہا کہ وہ وزیر اعلیٰ بننے کے خواہشمند ہرگز نہیں۔ اور جو اختلاف انہیں نواب ممدوٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں کسی ذاتی غرض یا عہدہ طلبی کا ہرگز کوئی دخل نہیں۔ بد اعتمادی کی فضا اور شکایت خود نواب صاحب نے پیدا کی ہے۔ انہوں نے کابینہ سے الگ اپنی ایک ذاتی اور نجی کابینہ بنا رکھی ہے۔ جس سے وہ ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے رویہ میں اصلاح کر لیں اور کابینہ کے ساتھیوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے پر آمادہ ہوں تو ہمیں ان کے ساتھ تعاون کرنے میں کیا انکار ہو سکتا ہے؟ ممدوٹ سیاسی گفتگو کے مرد میدان نہ تھے۔ وہ قائد اعظم کو اپنی طرف سے ہر قسم کا یقین دلاتے رہے اور قائد اعظم نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر گزشتہ راہ صلوات آئندہ را احتیاط۔ لاہور واپس جاؤ۔ پچھلی باتیں بھلا دو۔ پاکستان کے اس نازک دور میں پنجاب کی صوبائی حکومت پر جو عظیم ذمہ داریاں عائد ہیں۔ ان کا احساس کرو اور ایک ٹیم کی طرح کام کرو۔

پنجاب کے تینوں وزیر قائد اعظم کے پند و نصائح سن کر واپس چلے آئے اور لاہور پہنچ کر تینوں نے ایک مشترکہ بیان دے دیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ "پاکستان کے لوگ اس وقت بہت نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عزم اور اتحاد کو مضبوط اور حوصلے بلند رکھیں۔ ہم مغربی پنجاب کابینہ کے ارکان کا تہیہ ہے کہ ہم ایک ٹیم کی طرح حالات کا مقابلہ کریں گے۔ ان مذاکرات میں جو ہم کراچی میں کرتے رہے ہیں۔ بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی ہمیں یہی ہدایت دی ہے۔ دولتانہ صاحب نے ذاتی طور پر یہ اعلان بھی کر دیا کہ انہوں نے وزارت سے مستعفی ہونے کا خیال ترک کر دیا ہے۔ لیکن ان اعلانوں کو دس دن بھی نہ گزرے تھے کہ پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ قائد اعظم کو پھر انہیں کراچی میں طلب کرنا پڑا۔ صوبے کے گورنر موڈی کو بھی ان کے ساتھ کراچی بلا لیا گیا۔ اس مرتبہ قائد اعظم نے اپنی طرف سے ان کے جھگڑے کا مثبت حل تجویز کیا۔ پنجاب کے تمام وزیر اپنے استعفے گورنر کو پیش کر دیں اور صوبائی وزارت کو از سر نو مرتب کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دولتانہ سے کہا کہ وہ وزیر اعلیٰ کے عہدے کی ذمہ داری

اٹھانے کے لیئے تیار ہو جائیں۔ لیکن دولتانہ صاحب اس ذمہ داری کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ وزیروں نے اپنے استعفے لکھ کر گورنر کے حوالے کر دیئے۔ لیکن دولتانہ نئی وزارت مرتب کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ ان کا عذر یہ تھا کہ میں اس وقت تک ہاں نہیں کر سکتا۔ جب تک اسمبلی کی لیگ پارٹی بھاری اکثریت سے مجھے لیڈر منتخب نہ کرے۔ قائداعظم رح نے انہیں بہت سمجھایا۔ لیکن وہ نہ مانے۔ آخر قائداعظم رح نے خفگی کے انداز میں بات چیت ختم کر دی اور کہا آپ لوگ واپس جا سکتے ہیں۔ آپ کا گورنر ضروری ہدایات آپ تک پہنچا دیگا۔ چنانچہ اگلی صبح تینوں وزیر لاہور کے لیئے روانہ ہو گئے۔

جو تجویز قائداعظم رح کو مناسب معلوم ہوتی تھی اگر اسے دولتانہ کے انکار کی وجہ سے نافذ نہیں کیا جا سکتا تو پھر اور کیا تدبیر تھی؟ قائداعظم رح اپنے آپ کو اس پوزیشن میں نہ پاتے تھے کہ اس سوال کا کوئی دو ٹوک جواب دے سکیں۔ اور پنجاب کے وزارتی جھگڑے کے متعلق کوئی واضح ہدایت جاری کر سکیں۔ آپ نے یہ ذمہ داری گورنر موڈی کو سونپ دی کہ وہ موقع اور محل کے مطابق جو قدم مناسب سمجھے اٹھائے۔ اسی مضمون کا ایک مختصر سرکاری اعلان گورنر جنرل کے دفتر سے جاری کر دیا گیا۔ وزیروں کے استعفے جیب میں لیکر گورنر موڈی لاہور واپس آیا۔ اور یہاں مختلف افراد سے ساتھ گفتگو کے ذریعے حالات کا مزید جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کی اکثریت نواب ممدوٹ کے ساتھ تھی۔ نواب صاحب کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا۔ کہ اس سے پیشتر کہ گورنر موڈی کوئی پیشقدمی کرے۔ اس کے ہاتھ اس طرح باندھے جا سکتے ہیں کہ آپ پارٹی کا اجلاس طلب کر کے اپنے حق میں اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیں۔ چنانچہ پارٹی کا اجلاس ہنگامی نوٹس کے ذریعہ ۱۰ مئی، ۱۹۴۸ء کے لیئے طلب کر لیا گیا۔ گورنر نے ٹیلیفون پر قائداعظم رح سے مزید ہدایات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ قائداعظم رح نے اپنے جواب میں فرمایا کہ مجھے ان لڑکوں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔ گورنر موڈی نے بھی اپنی آئینی پوزیشن کا سہارا لیا۔ اور اپنے آپ کو مزید دخل اندازی سے بری الذمہ سمجھتے ہوئے وزیروں کو بلا کر ان کے استعفے واپس کر دیئے۔

اس کش مکش میں دولتانہ اور شوکت حیات ۲۷ مئی ۱۹۴۸ء کو استعفے دیکر کابینہ سے الگ ہوگئے اور نواب ممدوٹ نے فوراً ان کی جگہ تین نئے وزیر کابینہ میں لے لیے۔ میاں نوراللہ، میجر مبارک علی اور سردار عبدالحمید دستی۔ پنجاب میں سیاسی کشمکش وقتی طور پر ختم ہوگئی۔ لیکن سندھ میں مسٹر کھوڑو اور صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خاں پاکستان کی مرکزی حکومت کے خلاف اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے نئے طوفان برپا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مسٹر کھوڑو نے ایک عجیب سوال پر "صوبائی مفاد" کا شور مچانا شروع کیا۔ ان کی عہدے سے برطرفی کے چند دن بعد مئی ۱۹۴۸ء میں پاکستان دستور ساز اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ کراچی شہر کو مرکز کے دارالحکومت کی حیثیت سے "وفاقی" علاقہ قرار دیا جائے اور مرکزی حکومت اسے اپنی تحویل میں لے لے۔ مسٹر کھوڑو نے اسے سندھ کے صوبائی مفاد کا مسئلہ بنا لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی سندھیوں کے "مفاد" کے ایک اور "مسئلہ" کو بھی وابستہ کر دیا۔ یہ مسئلہ سندھ میں مہاجرین کی آبادکاری کا تھا۔ شکایت یہ پیدا کی گئی کہ "پاکستان۔ سندھ مشترکہ ریفیوجی کونسل" سندھ میں مہاجرین کو بھاری تعداد میں آباد کر کے مقامی لوگوں کے مفاد کے لیئے خطرہ پیدا کر رہی ہے اور سندھ کی معاشی زندگی پر غیر سندھی عناصر کے غلبے کا امکان پیدا ہو رہا ہے۔ مسٹر کھوڑو سندھ کی وزارت سے الگ ہو چکے تھے۔ لیکن سندھ کی مسلم لیگ کونسل پر ان کا قبضہ تھا۔ اس کونسل کی آئینی حیثیت بہت مشتبہ تھی۔ چودھری خلیق الزماں کہتے تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ ختم ہو چکی ہے اور پاکستان مسلم لیگ جس کی تنظیم وہ ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کر رہے تھے۔ ابھی معرض وجود میں نہیں آئی۔ لہٰذا اس درمیانی عرصے میں "آرگنائزنگ کمیٹیوں" کے سوا کوئی مسلم لیگ موجود نہیں ہے۔ لیکن مسٹر کھوڑو کا دعویٰ تھا کہ وہ صوبائی لیگ کے صدر ہیں اور پرانی صوبائی کونسل موجود ہے۔ اسی کے ذریعے انہوں نے کراچی کی علیحدگی کے خلاف قراردادیں پاس کرائیں اور ایجی ٹیشن کا پروگرام مرتب کیا۔ اسی کے ذریعے انہوں نے وزیروں کے نام ہدایات جاری کرنا شروع کیا۔ جب صوبائی لیگ کونسل کے پلیٹ فارم سے وزیروں کے خلاف یہ تنقید کی گئی کہ وہ کراچی کو مرکزی حکومت کے حوالے کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں اور سندھی عوام کے مفاد سے غداری کر رہے ہیں تو وزیر اعلیٰ پیر

الٰہی بخش نے بھی ایک جلسے میں تقریر کر دی اور کہا کہ یہ الزام بے بنیاد ہے ہم کراچی کو ہرگز مرکزی حکومت کے حوالے نہ کریں گے۔ مسٹر کھوڑو یہی چاہتے تھے۔ صوبائی لیگ کونسل نے جھٹ ایک مجلس عمل مقرر کر دی اور اسے ہدایت کی کہ "ہر قابل عمل آئینی طریقے سے مرکز کے فیصلے کے خلاف احتجاج اور مظاہرے شروع کرے" مجلس عمل نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ "یوم کراچی" منانے کا فیصلہ کر لیا۔

قائد اعظمؒ ۲۵ مئی ۱۹۴۸ء کو کراچی سے کوئٹہ تشریف لے گئے تھے یہ سب کچھ ان کی غیر حاضری میں ہو رہا تھا۔ جب صوبائی لیگ کونسل کی مقرر کردہ "مجلسِ عمل" کا ایک اجلاس "یوم کراچی" کا پروگرام مرتب کرنے کے لیئے منعقد ہوا تو مجلسِ عمل کے ایک رکن مسٹر ہاشم گزدر نے تجویز پیش کی کہ کوئی اور قدم اٹھانے سے پیشتر قائد اعظمؒ سے درخواست کی جائے کہ وہ مجلس عمل کی جانب سے ایک وفد کو شرف ملاقات بخشیں۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ قائد اعظمؒ نے وفد سے ملاقات کرنا منظور کر لیا اور پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد زیارت کے مقام پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

قائد اعظمؒ نے وفد کی درخواست کو غور سے سنا اور اس کے بعد وفد کے ممبروں کو سمجھایا کہ مفسدہ پردازوں کی باتوں میں مت آؤ۔ پاکستان کی مرکزی حکومت جس شہر میں اپنا دارالحکومت بنائے گی اسے لازماً مرکزی نظم ونسق کی تحویل میں آنا پڑے گا۔ اگر حکومت پاکستان کراچی کو دارالحکومت کے لیئے منتخب کرتی ہے تو اس سے سندھ کے لوگوں کو نقصان پہونچے گا یا فائدہ؟ سندھ کی حکومت کو فوری طور پر اس شہر سے نکلنا نہیں پڑے گا۔ مرکزی حکومت آہستہ آہستہ اپنے دفاتر یہاں بنائے گی اور سندھ کی صوبائی حکومت آہستہ آہستہ کسی اور شہر میں منتقل ہو گی۔ اس عمل کی تکمیل میں کئی سال لگ جائیں گے۔ کوئی فوری دقت پیدا نہ ہو گی۔ صوبائی حکومت کی جو عمارتیں یا املاک مرکزی حکومت لے گی۔ ان کا پورا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ کراچی میں جو تعمیری کام ہو گا اور جو نئی سہولتیں میسر آئیں گی۔ ان کا سب سے زیادہ فائدہ قرب کی وجہ سے سندھ کے لوگوں کو ہی پہنچے گا۔ قائد اعظمؒ نے اس گفتگو کے بعد وفد کی درخواست کو دو ٹوک طریق پر مسترد کر دیا اور سندھ کے لوگوں کو مشورہ

دیا کہ وہ مرکز کے فیصلے کو بخوشی قبول کر لیں۔ قائد اعظمؒ نے وفد کے ساتھ گفتگو کی روداد اور اپنے مشورے کو ایک سرکاری کمیونک کے ذریعے شائع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر کھوڑو اور ان کے ساتھیوں کی مخالفت کے باوجود سندھ کی لیگ اسمبلی پارٹی نے ۵ جولائی کو بھاری اکثریت سے (۵ کے مقابلے میں ۲۶ ووٹوں سے) قائد اعظمؒ کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہ صرف قائد اعظمؒ ہی تھے جو اس قسم کے فساد انگیز ملو قانون کو ایک اشارے سے ختم کر سکتے تھے۔

خان عبدالغفار خان نے اسی زمانے میں عجیب نوعیت کی سرگرمیاں شروع کیں۔ مئی ۱۹۴۸ء کے شروع میں آپ نے ایک آدھ مرتبہ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی اور پاکستان کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔ قیام کراچی کے زمانہ میں آپ نے سندھ کے مسٹر جی ایم سید اور دستور ساز اسمبلی کے کانگریس پارٹی کے چند ہندو ممبروں کے ساتھ مل کر ایک نئی پارٹی "پیپلز پارٹی" کے نام سے قائم کی جس کے وہ خود صدر اور مسٹر سید سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس پارٹی کے متعلق کہا گیا کہ یہ پاکستان میں آئینی حزب مخالف کا کردار ادا کرے گی اور سرخپوش جماعت (خان عبدالغفار کے الفاظ کے مطابق) اپنا علیحدہ وجود قائم رکھتے ہوئے پیپلز پارٹی کی "فوج" کی حیثیت سے کام کرے گی۔ دو چار دن کراچی ٹھہر کر خان عبدالغفار خان اپنے صوبے میں واپس چلے گئے۔ جہاں انہوں نے بظاہر اپنی آئینی حزب مخالف کے خیالات کی تبلیغ کے لیے دیہات کا طوفانی دورہ اور تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان تقریروں کی سرکاری رپورٹوں کے مطابق جو باتیں انہوں نے لوگوں کو بتائیں۔ ان میں چند یہ تھیں۔

(۱) پاکستان ایک ریت کا پل ہے۔ جو ایک ٹھوکر کی ضرب برداشت کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔

(۲) قائد اعظمؒ انگریزی حکومت کا مقرر کیا ہوا گورنر جنرل ہے۔ ان کا عہدہ عوامی نمائندگی کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ انگریزی حکومت کے ملازم ہیں۔ ان کے ذریعے آج بھی ہم پر انگریزی حکومت کر رہا ہے۔

(۳) قائد اعظمؒ، بھارت کے وزیروں کی نسبت دگنی تنخواہ لیتے ہیں۔ حالانکہ پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ (ایک جگہ خان عبدالغفار خاں نے یہ بھی کہا کہ قائد اعظمؒ کی تنخواہ بھارت کے انگریز گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے)

(۴) بھارتی حکومت نے جن انگریز افسروں کو ملازمت سے فارغ کر دیا تھا۔ انہیں پاکستان میں بھرتی کر لیا گیا ہے۔

(۵) پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اس ملک کے غریبوں پر خرچ کا بوجھ بنی ہوئی ہے۔ وہ فضول باتوں میں وقت ضائع کرتی رہتی ہے۔ اور کوئی مفید کام نہیں کرتی۔ اسی لیئے میں اس کے تضیع اوقات سے تنگ آکر واپس چلا آیا ہوں تاکہ اپنے بھائیوں کی کچھ خدمت کر سکوں۔

(۶) پاکستان اور ہندوستان دونوں مملکتیں ایک ہی دن قائم ہوئی تھیں۔ لیکن ہندوستان نے اپنا آئین بنا لیا اور پاکستان نے اپنا آئین بنانا ابھی شروع ہی نہیں کیا۔

(۷) پاکستان کی حکومت اصل پاکستان کی نمائیندہ نہیں ہے۔ اس پر باہر سے آئے ہوئے مہاجروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ پاکستانی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ وہ آئندہ انتخاب مہاجروں کی مدد سے جیت لے گی۔ لہٰذا وہ مقامی لوگوں کے مقابلے میں مہاجروں کو ہر قسم کی بے جا امداد دے کر مقامی لوگوں کو ان کے اپنے وطن میں مہاجر بنا رہی ہے۔

(۸) میں مسلم لیگ سے کہتا رہا کہ ملک کو تقسیم مت کراؤ۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ عوام کے لیئے روٹی کپڑا مہیا کرنے کا بندوبست کرو۔ لیکن انہوں نے میری بات نہ سنی۔

کیا سرکاری رپورٹوں میں خان عبدالغفار خاں سے غلط باتیں منسوب کی جاتی تھیں؟ یا خان موصوف یہ سمجھتے تھے کہ "حزب مخالف" کے لیئے ہر قسم کا پروپیگنڈہ جائز ہے؟ کیونکہ انگریز کے عہد حکومت میں حکومت کے خلاف ہر قسم کی صحیح یا غلط دلائل سے کام لیکر حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنا "حزب اختلاف" کا جائز حق سمجھا جاتا تھا۔ بہر صورت ان رپورٹوں کی روشنی میں صوبہ سرحد کی حکومت نے ایک پبلک سیفٹی آرڈیننس کا مسودہ

تیار کر کے مرکزی حکومت کی منظوری کے لیئے کراچی بھیج دیا۔ اسے قائدِ اعظم کی منظوری کے لیئے کوئٹہ بھیجنا پڑا۔ لہٰذا اس منظوری کی اطلاع پشاور پہنچنے میں دیر لگی۔ لیکن صوبائی حکومت نے منظوری کا انتظار کیئے بغیر ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کو فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت خان عبدالغفار خاں کو گرفتار کر لیا اور ان کی تقریروں کی بنا پر ان کا چالان ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں کر دیا جس نے انہیں تین سال کی قید کی سزا دے دی۔ قید کی میعاد پوری کرنے کے لیئے انہیں پنجاب کے ایک جیل خانہ میں بھیج دیا گیا۔ جب صوبائی حکومت کو نئے آرڈیننس کی منظوری کی اطلاع موصول ہوئی تو اس کے تحت خان عبدالغفار خاں کے چند اور ساتھیوں کو نظر بند کر دیا گیا اور وقتی طور پر سرخپوش جماعت کی سرگرمیاں معطل ہو گئیں۔ "پیپلز پارٹی" کے نام سے بھی اس کے بعد کوئی سیاسی سرگرمی دیکھنے میں نہ آئی۔

---

۵۱ - زیارت میں آخری زیارت

مئی ۱۹۴۸ء میں راجہ غضنفر علی خاں کو وزیر اعظم لیاقت علی کی ایک ذاتی چٹھی ملی جس میں لکھا تھا کہ قائد اعظم کو ایران میں پاکستان کی سفارت کے فرائض سر انجام دینے کے لئے کسی موزوں شخص کی تلاش ہے۔ وہ اس عہدے کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور ان کی نگاہ انتخاب آپ پر پڑی ہے۔ کیا آپ ان کی خواہش کے مطابق یہ عہدہ قبول کرنے کو تیار ہیں؟ قائد اعظم ان کے سپرد یہ خدمت کرنا چاہتے تھے تو راجہ صاحب کو کیا عذر ہو سکتا تھا، لیکن انہوں نے یہ کہا کہ مجھے ایران کے سفر کی تیاری میں کچھ دیر لگے گی کیونکہ میری اہلیہ بیمار ہیں۔ اور میرے لئے ان کے علاج کی دیکھ بھال کرنا ضروری ہے۔ راجہ صاحب نے اس زمانے میں اپنا صدر مقام لاہور میں بنا رکھا تھا۔ قائد اعظم کو جلدی تو بہت تھی لیکن انہوں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ راجہ صاحب کی اہلیہ کی صحت بحال نہ ہو سکی۔ ان کا مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ اس وجہ سے کچھ مزید تاخیر ہوئی اور راجہ صاحب جولائی کے آخر تک لاہور سے روانہ ہونے کے قابل ہو سکے۔

اس وقت تک پاکستان کئی ملکوں کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر چکا تھا۔ جن میں بھارت، برطانیہ، امریکہ، برما، ٹرکی، فرانس، افغانستان شامل تھے۔ لیکن ہر ملک کے ساتھ رسمی تعلقات کے علاوہ حقیقی تعلقات کی نوعیت الگ تھی۔ اسلامی ممالک میں ایران سب سے پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کی انتہائی مشکلات کے زمانے میں اس کے متعلق خیر سگالی کا ثبوت دیا تھا۔ جب پاکستان میں مہاجروں کا سیلاب آ رہا تھا اور مہاجرین کے کیمپوں میں ہر قسم کے سامان کی شدید قلت محسوس ہو رہی تھی تو نومبر ۱۹۴۷ء میں شہنشاہ ایران نے خاص طور پر اپنے وزیروں کو حکم دیا تھا کہ ایران سے جس قسم کی امداد ممکن ہو پاکستان کے مصیبت زدہ مہاجرین کو آرام پہنچانے کے لئے بھیجی جائے۔ اس وقت ایران کے وزیر اعظم آقائے

قوام السلطنت تھے۔ اس مرحلہ پہ بین الاقوامی ریڈ کراس اور برطانیہ اور امریکہ کے بعض رفاہی اداروں نے بھی پاکستان کو مختلف قسم کا سامان بھجوایا۔ ان کے مقابلے میں ایران سے جو سامان آیا وہ شاید بہت زیادہ نہ تھا لیکن جس جذبے کا اظہار ایران کی حکومت کی جانب سے کیا گیا۔ اس نے قائد اعظم کو خاص طور پہ متاثر کیا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ اسلامی اخوت کی بناء پہ پاکستان جن ملکوں سے دلی دوستی اور تعاون کی توقع کر سکتا ہے ان میں ایران سرفہرست ہے۔

۵ر جولائی ۱۹۴۸ء کو لاہور سے روانہ ہو کر راجہ صاحب کراچی پہنچے۔ وہاں محکمہ خارجہ سے ضروری گفتگو کرنے کے بعد وہ کوئٹہ اور وہاں سے زیارت گئے۔ جہاں قائد اعظم آرام فرما رہے تھے۔ وہاں راجہ صاحب نے قائد اعظم کی زندگی میں ان سے آخری ملاقات کی۔ وہ تقریباً ایک چوتھائی صدی تک سیاست کے میدان میں قائد اعظم کے پیروکار اور ان کے بہت قریبی ساتھی رہ چکے تھے۔ قائد اعظم نے راجہ سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ باتیں کیں اور دو نکات پر زور دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ (۱) پاکستان ایک نیا ملک ہے۔ لیکن ایک وقت آئے گا کہ پاکستان تمام دنیا کے مسلمانوں کی پشت پناہی کرنے کے قابل ہو۔ حکومت ایران نے دنیائے اسلام کے نقطۂ نگاہ سے پاکستان کی اہمیت کو سمجھنے میں پہل کی ہے۔ ہمیں بھی ایران کے اس حقیقی جذبے کی اہمیت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ایران اور پاکستان کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم اور مضبوط کرنے کی ہر تدبیر سوچی جائے (۲) اس اہم اصول کے علاوہ آپ نے فرمایا کہ ایک خاص مسئلہ ایسا ہے جس کی وقتی اہمیت ہمارے لئے بہت زیادہ ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ مناسب طریقے سے اس مسئلہ کو حکومت ایران کے ساتھ چھیڑا جائے۔ ہم اپنی فوج کو منظم اور مسلح کرنے اور ملک کے دفاع کے قابل بنانے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے برطانیہ کے ایک کارخانے کو فیوری (FURY) لڑاکا ہوائی جہازوں کے لئے آرڈر دیا ہے لیکن وہ ہر ملک کے آرڈر کی باری باری تعمیل کر سکتے ہیں۔ ہماری باری کافی دیر کے بعد آئے گی۔ ایران کا ایک آرڈر دیا ہوا تھا۔ ان کا مال عنقریب انہیں ملنے والا ہے۔ اگر وہ ہمیں یہ سہولت دے سکیں کہ جو جہاز ان کے لئے تیار ہو رہے ہیں وہ ہمیں مل جائیں اور ہمارے آرڈر کے جہاز وہ لے لیں تو ہماری ایک اشد ضرورت پوری ہو جائے گی۔

پہ معلوم کرنا چاہیئے کہ کیا کسی رعایت کے عوض ان سے یہ رعایت حاصل کرنے کے لئے کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔

راجہ صاحب قائد اعظم سے ہدایت لے کر عازم طہران ہو گئے۔ وہاں انہوں نے حکومت ایران سے بات کی تو وہ بخوشی کسی جوابی رعایت کے بغیر اپنے آرڈر کے جہاز پاکستان کو منتقل کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ بعد میں پاکستان کے آرڈر کے اتنے ہی جہاز ایران نے لے لئے۔ اس لحاظ سے ایران پہلا ملک تھا جس نے کسی اپنی سیاسی مصلحت کی بناء پر یا جوابی رعایت کی خاطر نہیں بلکہ محض دوستی اور اخوت کے جذبے کے تحت فوجی سامان کے معاملے میں اپنی ضرورت پر پاکستان کی زیادہ شدید ضرورت کو ترجیح دی۔ اس کے بعد بیرونی دنیا کے جس سربراہ مملکت نے سب سے پہلے خیر سگالی کے دورے پر پاکستان آنا منظور کیا وہ شہنشاہ ایران ہی تھے۔

راجہ غضنفر علی کے ساتھ قائد اعظم کی آخری گفتگو سے خارجہ پالیسی کے اس خاکے کا کچھ دھندلا سا اندازہ کیا جا سکتا تھا جو اس وقت قائد اعظم کے ذہن میں تیار ہو رہا تھا۔ اس سے پورے ایک مہینے کے بعد ۲۷ اگست ۱۹۴۷ء کو عید الفطر کے موقعہ پر ان کی ایک تقریر ریڈیو پاکستان پر نشر ہوئی۔ یہ اپنی قوم کے اور تمام عالم اسلام کے نام عید کی تہنیت کا پیغام تھا۔ اپنے ملک کے حالات کے متعلق آپ نے اس تقریر میں فرمایا: "ایک سال کے عرصے میں ہم نے سخت مشکلات کا سامنا کیا ہے جو بظاہر ناقابل عبور نظر آتی تھیں۔ جن طوفانوں میں ہم گھر گئے تھے وہ ابھی ختم نہیں ہوئے لیکن ان کا شدید ترین دور گزر گیا ہے۔ ابھی سلامتی کا ساحل دور ہے لیکن یہ ساحل ہمیں صاف نظر آنے لگا ہے۔ اگر ہماری صفوں میں اتحاد اور ڈسپلن قائم رہا تو انشاء اللہ ہم باقی ماندہ مشکلات کا بھی کامیابی سے سامنا کر سکیں گے۔" ساتھ ہی آپ نے دوسری مسلم مملکتوں سے خطاب کرتے ہوئے چند فقرے کہے جن میں آپ کی خارجہ پالیسی کے ایک پہلو کی جانب واضح اشارہ موجود تھا۔ آپ نے فرمایا: "ہم سب اپنی اپنی جگہ خطروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ فلسطین میں انڈونیشیا میں اور کشمیر میں انصاف کے مقابلے پر فوجی طاقت کے جو مظاہرے کئے جا رہے ہیں۔ ان سے ہم سب کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ اور ہمیں جان لینا چاہیئے کہ اگر ہم متحد ہوں تو دنیا میں ہماری

آواز بہت موثر ہو سکتی ہے۔"

قائداعظم کی صحت اس وقت بھی بہت کمزور تھی جب راجہ غضنفر علی نے ۲۰ جولائی کو انہیں زیارت میں دیکھا تھا۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ۱۴ اگست کو جب ان کی تقریر ریڈیو پر نشر ہوئی تو وہ صاحب فراش ہو چکے تھے۔ ۱۱ ستمبر کی رات کو انہوں نے پہلے ایک غیر ملکی ریڈیو پر یہ دل ہلا دینے والی خبر سنی اور پھر انہیں کراچی سے سرکاری تار پہنچ گیا کہ پاکستان کا زندہ جاوید قائد دس کروڑ مسلمانوں کو سیاسی آزادی دلا کر اور ان کی نوزائیدہ مملکت کو ایک سال کے اندر اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے اپنی قوم کو یتیم چھوڑ گیا ہے۔

۵۲۔ لیاقت علی کا زمانہ۔

مضبوط مرکز لیکن صوبوں میں ابتری

قائد اعظم کی وفات کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدے پر خواجہ ناظم الدین فائز ہوئے۔ لیکن اس ملک کی حکومت اور قوم کی قیادت کی اصل ذمہ داری وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے سنبھالی۔ وہ پہلے بھی آئینی لحاظ سے ایک پارلیمانی کابینہ کے وزیر اعظم تھے۔ لیکن قائد اعظم کی زندگی میں پاکستان کی کابینہ عملاً ایک صدارتی کابینہ تھی جس میں لیاقت علی سب سے سینئر اور قائد اعظم کے سب سے زیادہ معتمد وزیر تھے۔ یہ صورت اس منفرد مقام کی وجہ سے تھی جو قائد اعظم کو پاکستان کی قومی زندگی میں حاصل تھا۔ اس کا عہدے یا آئین سے کوئی تعلق نہ تھا۔

لیاقت علی خاں نے اپنی نئی ذمہ داریوں کو لگن، تندہی اور خود اعتمادی کے ساتھ نبھایا۔ ان کی بعض پالیسیوں سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ قائد اعظم کی طرح لیاقت علی خان نے بھی پاکستان ہی کو اپنا سرمایہ، اپنا خاندان اور اپنا سب کچھ سمجھا۔ انہوں نے نہ کوئی بینک بیلنس جمع کیا۔ نہ اپنے لئے یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے لئے کوئی منفعت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اقتدار کو قوم کی امانت ہی سمجھتے رہے۔ قائد اعظم کے بعد ملک کی قیادت اور خدمت کے لئے ان کی موجودگی بلاشبہ عوام کا حوصلہ بلند رکھنے کا باعث ثابت ہوئی انہوں نے مرکزی وزارت میں محلاتی سازشوں کو پنپنے نہ دیا اور عوام پر بھروسہ اور ان کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھا۔ صوبائی سطح پر لیڈروں کے لڑائی جھگڑوں میں شدت آتی رہی اور صوبوں میں خلفشار پیدا ہوتے رہے۔ لیکن ان کے زمانے میں مرکزی وزارت ایک مضبوط اور بہ حیثیت مجموعی فرض شناس ٹیم کی طرح کام کرتی رہی۔ اس وجہ سے ملک کے اندر بھی مرکزی حکومت کی ساکھ قائم رہی اور بیرونی دنیا میں بھی پاکستان کی ساکھ نہ صرف قائم رہی بلکہ اس میں نمایاں

اضافہ ہوا۔

اقتصادی لحاظ سے پاکستان شروع ہی سے ہر شخص کی توقعات سے بڑھ کر مستحکم ثابت ہوا۔ اس ملک کا پہلا بجٹ بچت کا تھا۔ پہلے ہی سال بیرونی تجارت کا "بیلنس" اس کے حق میں تھا۔ یہ لیاقت علی کی اور ملک کی خوش قسمتی تھی کہ جب ملک کی پوری ذمہ داری ان پر آئی تو کوریا کی جنگ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ بیرونی منڈیوں میں پاکستان کی خام اجناس (اس وقت اس ملک کی اقتصادیات کی بنیاد یہی تھیں) کی مانگ اور قیمتیں بڑھتی رہیں۔ لیاقت علی مرحوم کے ہاتھوں میں غیر متوقع مالی وسائل آتے رہے۔ ممکن ہے کہ ان وسائل کو خرچ کرنے میں ضرورتوں کی جو تقدیم و تاخیر متعین کی گئی، اس میں کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہوں۔ لیکن بڑی بات یہ تھی کہ لیاقت علی نے ان وسائل کو دوست نوازی یا سیاسی رشوتوں کی نذر نہ ہونے دیا۔ اسی زمانے میں پاکستان کے حالات نے ہندوستان سے (بلکہ بعض دوسرے ملکوں سے بھی) مسلمان سرمایہ کاروں کو اپنی طرف کھینچا اور وہ اپنا سرمایہ اور اپنا تجارتی اور صنعتی تجربہ ساتھ لے کر اس ملک میں آباد ہونے لگے۔ پاکستان کو ان دونوں چیزوں کی سخت ضرورت تھی۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں برطانیہ نے اپنے سکے کی قیمت میں ایک تہائی کے قریب کمی کر دی۔ بھارت کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔ اس کے بغیر اس کی بیرونی تجارت میں توازن قائم نہ رہ سکتا تھا۔ پاکستان اور بھارت دونوں کی کرنسی کی قیمتیں برطانوی پاؤنڈ سٹرلنگ ہی کی قیمت کے حساب سے مقرر تھیں۔ لیکن پاکستان کی پوزیشن اس وقت بیرونی تجارت کے لحاظ سے مضبوط تھی۔ اس نے اپنے روپیہ کی قیمت میں متناسب کمی کرنا منظور نہ کیا اور برطانیہ کے پاؤنڈ کے ساتھ نئی شرح تبادلہ پر اصرار کیا۔ عالمی بنک نے پاکستان کے متعلق اعداد و شمار کا جائزہ لے کر پاکستان کے اس حق کو تسلیم کر لیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے سکے کی سابقہ قیمت برقرار رکھے۔ بھارتی حکومت کو پاکستان کے ساتھ نئی شرح مبادلہ پر تجارت کرنا پسند نہ تھا۔ اس نے پاکستان کے خلاف تجارتی بائیکاٹ کی جنگ شروع کر دی۔ یہ بہت حد تک وقار کی جنگ تھی کیونکہ بھارت خود بھی نقصان اٹھا رہا تھا اور پاکستان کو بھی نقصان پہونچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ جنگ ڈیڑھ سال کے قریب جاری رہی۔ اس کے بعد بھارت نے پاکستان کے سکے کی سرکاری شرح منظور کر لی۔ پھر ایسا

وقت بھی آیا کہ پاکستان کو اپنے سکے کی قیمت میں کمی کرنی پڑی۔ لیکن بہت دیر تک بھارت کے ساتھ پاکستان کی یہ دلچسپ کیفیت قائم رہی کہ سرکاری سطح پر پاکستان کے روپیہ کی قیمت بھارتی روپیہ سے تقریباً ڈیوڑھی تھی اور سرحد پر پرائیویٹ تبادلے میں بھارتی سکے کی مانگ زیادہ تھی۔ اور اس کی قیمت پاکستانی سکے سے زیادہ تھی۔ اس کی وجوہات ایک الگ مسئلہ تھا۔

پاکستان کے دفاع کے مسئلے پر لیاقت علی خاں نے خاص توجہ دی۔ اور فوج کی تنظیم پر پاکستان کی بساط کے مطابق فراخدلی سے روپیہ خرچ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں جب شہنشاہ ایران یہاں تشریف لائے اور آپ نے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں اور بری فوجوں کی پریڈیں دیکھیں تو آپ اس ملک کے دفاعی انتظامات سے خاصے متاثر ہوئے جس نے دو سال پہلے ایران سے ہوائی جہازوں کے لئے درخواست کی تھی۔

جہاں تک صوبوں کا تعلق تھا۔ لیاقت علی خاں نے قائد اعظم کی وفات کے فوراً بعد صوبائی لیڈروں کے جھگڑے ختم کرانے اور ان کے درمیان یک جہتی پیدا کرنے کی خاص کوشش کی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق تھا کہ ان کوششوں کا الٹا اثر ہوا۔ اس کی وجہ مختلف افراد کی الگ الگ طبیعت اور ذہنی کیفیت تھی۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو لیاقت علی نے عوام کے حوصلے اور ہمت قائم رکھنے کی غرض سے مغربی پاکستان کے صوبوں کا طویل دورہ شروع کیا اس دورے میں لاہور۔ راولپنڈی پشاور اور کوئٹہ شامل تھے۔ ان شہروں میں آپ نے چند کمروں میں سرکاری افسروں سے بھی خطاب کیا۔ چیدہ شہریوں سے بھی گفتگو کی۔ سیاسی لیڈروں سے بھی ملاقاتیں کیں اور پبلک کے بڑے بڑے جلسوں سے بھی خطاب کئے۔ پبلک جلسوں اور پرائیویٹ ملاقاتوں میں ان کا موضوع سخن یہی تھا کہ قائد اعظم کے انتقال کی وجہ سے قوم کی زندگی میں جو عظیم خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ اسے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اپنی فرض شناسی اور اپنے حب وطن کے جذبے سے پر کر سکتا ہے۔ اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھو ملک کے مستقبل پر یقین رکھو اور اعتماد اور دیانتداری کے ساتھ کام کرتے رہو۔

لاہور میں انہوں نے ممدوٹ دولتانہ اور ملک فیروز خاں نون پر زور دیا کہ اب ذاتی جھگڑوں اور شکایتوں کو طول دینے کا وقت نہیں۔ مل جل کر ایک ٹیم کی طرح کام کرنے کا

کوئی راستہ نکالو۔ پشاور میں انہوں نے پیر مانکی شریف اور وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کے درمیان صلح صفائی کرانے کی کوشش کی۔ لیاقت علی خاں کے دورے اور تقریروں کا اثر پورے ملک کے عوام پر بہت اچھا ہوا۔ وقتی طور پر سیاسی لیڈروں نے بھی انہیں یقین دلائے۔ پشاور میں پیر مانکی نے قیوم وزارت کی غیر مشروط حمائت کا اعلان کر دیا۔ لاہور میں نواب ممدوٹ بھی اس بات پر راضی تھے (وہ لیاقت علی کے دورے پر روانہ ہونے سے پہلے کراچی ہی میں ان سے یہ وعدہ کر آئے تھے) کہ وہ ممتاز دولتانہ اور ملک فیروز خان کو اپنی کابینہ میں شمولیت کی دعوت دیں گے۔ دولتانہ اور نون بھی اس دعوت کو قبول کرنے پر رضامند تھے۔ لیکن پنجاب اور صوبہ سرحد کے لیڈروں میں یہ میل ملاپ اور "گذشتہ را صلوات" کی فضا بہت ہی عارضی ثابت ہوئی۔

سب سے پہلے یہ فضا لاہور میں خراب ہوئی۔ نواب ممدوٹ کا ذہن ان کے پرائیویٹ مشیروں کے قبضے میں تھا۔ جنہوں نے فوراً نواب صاحب کو ڈرانا شروع کر دیا۔ اگر دولتانہ کابینہ میں واپس آگیا تو پھر آپ کے لئے خیریت نہ ہوگی۔ وہ کراچی میں لیاقت علی خاں سے وعدہ کر آئے تھے۔ لاہور میں پھر اسی بنیاد پر ان سے باتیں کرتے رہے تھے۔ اس مفاہمت کی خبریں اخباروں میں چھپتی رہیں۔ یہ توقع عام تھی کہ دولتانہ اور نون عنقریب ممدوٹ کابینہ میں شامل ہونے والے ہیں۔ لیکن نواب صاحب کشمکش و پیچ میں پڑ گئے اور جو کچھ کہہ چکے تھے اس سے فرار کی تدبیر سوچنے لگے۔ پورا ایک مہینہ گومگو میں گذار کر اور بلا ضرورت اخباری شور و غل اور بحثوں کے بعد نواب صاحب کراچی پہنچے اور دولتانہ اور نون کو کابینہ میں بیٹھنے سے صاف انکار کر آئے۔ جو ہنگامہ اس سوال پر کیا گیا اسے دولتانہ نے اپنی بے عزتی سمجھا۔ رہی سہی کسر نواب صاحب کے دوستوں نے اس تمام واقعہ کو "دولتانہ" کی شکست فاش" قرار دے کر پوری کر دی۔ وہ پوری قوت اور شاید انتقامی جذبے کے ساتھ نواب صاحب کے مقابلے پر آگئے۔ دولتانہ کی "شکست" کا واقعہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ مسلم لیگ کی نئی تنظیم کی بنا پر صوبائی لیگ کے صدر کا انتخاب ۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو ہونے والا تھا۔ اس دن دولتانہ (نواب ممدوٹ کی جانب سے دوسرے

امیدوار کے لئے انتہائی کوشش کے باوجود صدر منتخب ہو گئے۔ انہوں نے فوراً صوبائی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے اندر اپنے حامیوں کو جمع کر کے نواب صاحب کو پارٹی کی قیادت سے برطرف کرانے کی کوشش شروع کر دی۔

پنجاب کی صوبائی لیگ کے صدر کے انتخاب سے چند دن بعد ۵ دسمبر ۱۹۴۸ء کو سندھ کی صوبائی لیگ کے صدر کا انتخاب ہوا۔ وہاں مسٹر کھوڑو کے خلاف ایک مقدمہ سپیشل ٹریبونل کے سامنے اور ایک مقدمہ سرکاری مال کے بیجا تصرف کے الزام کی بنا پر ایک فوجداری عدالت میں چل رہا تھا۔ لیکن ان الزامات کے باوجود وہاں مسٹر کھوڑو بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں ممبروں کی ابتدائی بھرتی اور ڈسٹرکٹ اور سٹی لیگوں کے انتخاب اپنی مرضی کے مطابق کراتے رہے تھے اور اب صوبائی لیگ کی تنظیم پر ان کا مکمل قبضہ تھا۔ مسٹر کھوڑو نے منتخب ہونے کے بعد یہ کہہ کر صدارت سے استعفا دے دیا کہ جب تک میرے خلاف الزام عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔ میں صوبائی مسلم لیگ کی صدارت کی کرسی پر بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن آپ نے اپنے ایک فرمانبردار خادم کو نائب صدر منتخب کرا دیا اور ساتھ ہی لیگ کے عہدہ داروں کو یہ بھی سمجھا دیا کہ ان کے استعفے کو زیر غور پڑا رہنے دیا جائے۔ اس پر کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ بہر صورت اہم بات یہ تھی کہ صوبائی لیگ کی تنظیم پر قبضہ کرنے کے بعد مسٹر کھوڑو نے بھی اپنی کوششیں پیر الٰہی بخش وزارت کو توڑ ڈالنے پر مرکوز کر دیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ پنجاب اور سندھ میں دونوں جگہ صوبائی لیگ میں برسراقتدار گروہ صوبائی وزارتوں (جو آئینی لحاظ سے مسلم لیگی وزارتیں ہی تھیں) کو عہدے سے برطرف کرانے کے لئے کوشاں تھے۔

دولتانہ ممدوٹ جنگ کا پنجاب کو بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایم۔ ایل۔ اے صاحبان کو یکایک اپنی طاقت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ نواب ممدوٹ کو آنکھیں دکھانے لگے۔ صبح کو دو تین ایم۔ ایل۔ اے جتھہ بنا کر نواب صاحب سے ملتے اور مطالبہ کرتے کہ ہمارے ضلع کا ڈپٹی کمشنر یا سپرنٹنڈنٹ ہمارا مخالف ہے۔ اس کا تبادلہ کر دیا جائے ورنہ ہم آپ کے مخالف کیمپ میں جا رہے ہیں۔ چنانچہ تار کے ذریعے تبادلہ کا حکم جاری ہو جاتا۔ شام کو چار

پانچ دوسرے ایم۔ایل۔اے نواب صاحب کو پکڑ لیتے اور مطالبہ کرتے کہ تبادلے کے احکام کو منسوخ کرو ورنہ ہم مخالف کیمپ میں جاتے ہیں۔ پھر تبادلے کی منسوخی کے احکام جاری ہوتے۔ اس طرح حالات میں عجیب ابتری پیدا ہو گئی۔ اس پر چیف سیکرٹری حافظ عبدالمجید نے احتجاج کیا تو نواب صاحب کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ چیف سیکرٹری دولتانہ سے ملا ہوا ہے۔ سب سے پہلے اس کا تبادلہ کرو۔ سرکاری افسر بھاگے بھاگے نواب ممدوٹ کے نجی دوستوں کے پاس سفارشیں کرانے کے لئے آتے تھے اور ایم۔ایل۔اے صاحبان کو "ٹھیک رکھنے" کی ذمہ داری اٹھاتے تھے۔ پنجاب کے نظم و نسق کا معیار اور افسروں کا مورال اس سے پہلے کبھی اس حد تک تباہ نہ ہوئے تھے جیسے نومبر اور دسمبر ۱۹۴۸ء کی شدید سیاسی کھینچ تان کے زمانے میں ہوئے۔ لیاقت علی خاں نے لاہور آکر یہ حالات دیکھے اور بعض لوگوں سے مشورے کئے۔ راجہ غضنفر علی بھی اتفاق سے اس زمانے میں چند دنوں کے لئے لاہور آئے ہوئے تھے۔ لیاقت علی خاں کی باتیں ان سے بھی ہوئیں۔ حالات کا جائزہ لے کر وزیر اعظم کو نئے انتخابات کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۴۹ء میں آپ نے آئین کی دفعہ ۹۲ (الف) کے تحت وزارت اور اسمبلی کو منسوخ کر کے صوبائی نظم و نسق گورنر موڈی کے سپرد کر دیا اور نئے انتخاب کے لئے تیاری کا حکم دے دیا۔

پنجاب میں ممدوٹ وزارت اس طرح ختم ہوئی۔ سندھ میں پیر الٰہی بخش کی وزارت اگلے مہینے (فروری ۱۹۴۹ء میں) ایک اور طریقے سے ختم ہو گئی۔ اس وزارت پر ایک طرف صوبائی لیگ کے صدر کھوڑو حملے کر رہے تھے۔ دوسری طرف اخبارات میں اس کے ارکان کے خلاف سنگین الزامات لگائے جا رہے تھے۔ جن کی تحقیقات کا حکم وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے صوبائی گورنر شیخ دین محمد کو (شیخ صاحب کو اکتوبر ۱۹۴۸ء میں سندھ کے پہلے گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وفات کے بعد سندھ کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا) دے چکے تھے۔ اس اثناء میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سندھ میں اسمبلی کے ایک ممبر قاضی محمد اکبر کے خلاف کئی سال سے (قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۷ء انتخاب کے سلسلے میں) ایک انتخابی عذر داری کی درخواست زیر سماعت تھی۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں اس کا فیصلہ ہوا۔ قاضی محمد اکبر

کے انتخابی ایجنٹ کے طور پر پیر الٰہی بخش نے بھی کام کیا تھا۔ انتخابی ٹریبونل نے عذرداری کی درخواست منظور کرتے ہوئے قاضی محمد اکبر کو اور ان کے ساتھ پیر الٰہی بخش کو بھی چھ سال کے لئے اسمبلی کی ممبری کے نااہل قرار دینے کی سفارش کر دی۔ پیر صاحب کو اسمبلی کی ممبری کے ساتھ وزیر اعلیٰ کا عہدہ بھی چھوڑنا پڑا۔ ان کی وزارت ۱۸ فروری ۱۹۴۹ء کو مستعفی ہو گئی۔ مسٹر کھوڑو اپنے مقدمات کی وجہ سے خود وزارت کے امیدوار نہ بن سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنے امیدوار کے طور پر کراچی کے مسٹر یوسف ہارون کو میدان میں لے آئے۔ مسٹر ہارون اس وقت اسمبلی کے ممبر بھی نہ تھے۔ لیکن کھوڑو صاحب کی مدد سے وہ چند ووٹوں کی اکثریت سے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر منتخب ہو گئے۔ مسٹر ہارون وزیر اعلیٰ بنے اور کھوڑو کے نامزد کردہ تین ممبران کے ساتھ وزیر بن گئے۔ گویا وزارت پر بھی بالواسطہ کھوڑو صاحب کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں سپیشل ٹریبونل نے مسٹر کھوڑو کے خلاف مقدمے میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ جس کی بنا پر انہیں تین سال کے لئے کسی سرکاری یا انتخابی عہدے کے نااہل قرار دے دیا گیا۔ وہ اسمبلی کے ممبر بھی نہ رہے۔ اس کے بعد جلد ہی اس مقدمے کا بھی فیصلہ ہو گیا جو فوجداری عدالت میں ان کے خلاف چل رہا تھا۔ اس میں انہیں دو سال قید کی سزا ہو گئی۔ لیکن وہ مسلم لیگ اور صوبائی وزارت دونوں پر بالواسطہ قابض تھے۔ اس بات کا کوئی کچھ علاج نہ کر سکتا تھا۔ انہوں نے مجسٹریٹ کے حکم کے خلاف اپیل اور سپیشل ٹریبونل کے فیصلے کے خلاف آئینی عذر کی بنا پر ایک درخواست سندھ چیف کورٹ میں دائر کر دی اور سیاست اور وزارت پر حکم چلاتے رہے۔

اس کے بعد مرکز میں یا دوسرے صوبوں میں جو کچھ ہوتا رہا اس سے قطع نظر سندھ کی اندرونی سیاست میں مسٹر کھوڑو صوبائی وزارت کو عجیب طرح تہ و بالا کرتے رہے۔ مجسٹریٹ کی عدالت سے جو سزا انہیں ملی تھی۔ اس کے خلاف ان کی اپیل منظور ہو گئی۔ اس مقدمے سے بری ہونے کے بعد مسٹر کھوڑو نے پہلا کام یہ کیا کہ صوبائی لیگ کی صدارت سے اپنا استعفا (جو آٹھ مہینوں سے زیر غور پڑا تھا) واپس لے لیا۔ صدارت کی کرسی پر خود بیٹھ گئے اور وزیر اعلیٰ پر پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ حکم چلانے لگے۔ بے چارہ وزیر اعلیٰ اپنی پوزیشن

سے تنگ آگیا۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں اس نے کھوڑو صاحب کی آمریت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور ایک مرتبہ مستعفی ہو کر نئی وزارت بنالی جس سے کھوڑو کے تینوں آدمیوں کو خارج کر دیا۔ اب علانیہ جنگ شروع ہو گئی۔ کھوڑو صاحب نے ہارون کو نوٹس دلوایا۔ کہ اسمبلی پارٹی کا اجلاس طلب کرو اور قرارداد عدم اعتماد کا سامنا کرو۔ اس مرحلے پر مرکزی حکومت کے ایک سندھی رکن پیرزادہ عبد الستار حرکت میں آئے اور کھوڑو اور ہارون کے درمیان صلح کرانے لگے۔ ہارون صاحب مسٹر کھوڑو کی طاقت دیکھ کر ڈھیلے پڑ گئے اور آخر یہ فیصلہ مان گئے کہ پیرزادہ عبد الستار۔ ہارون اور کھوڑو تینوں سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور آپس میں فیصلہ کر لیں۔ اسمبلی پارٹی نے اسی فیصلے پر صاد کر دیا۔

ان تینوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کابینہ کی چھ وزارتیں آپس میں بانٹ لیں۔ یعنی اپنی اپنی طرف سے دو دو وزیر نامزد کر دیں پھر مسٹر کھوڑو نے ہارون سے علیحدہ بات کی اور کہا کہ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پیرزادہ کا پاؤں درمیان سے نکال دیا جائے۔ وہ کون ہوتا ہے؟ میں صدر آپ وزیر اعلیٰ۔ کیوں نہ ہم دونوں "نصف لکم ونصف لی" کے اصول پر آپس میں تمام وزارتیں بانٹ لیں۔ اس پر دونوں کا سمجھوتہ ہو گیا۔ چنانچہ اسمبلی پارٹی نے اتفاق رائے کے ساتھ یوسف ہارون کے حق میں اعتماد کی قرارداد پاس کر دی اور ہارون نے وعدے کے مطابق مستعفی ہو کر ایک نئی وزارت مرتب کر لی۔ جس میں کھوڑو کے تین نامزد وزیر شامل تھے۔ اور تین ان کی اپنی پسند کے وزیر تھے۔

ابھی اس نئی وزارت کو حلف اٹھائے چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ چیف کورٹ نے مسٹر کھوڑو کی درخواست منظور کرتے ہوئے یہ قرار دے دیا کہ جس سپیشل ٹربونل نے "پروڈا" کے تحت کھوڑو کے خلاف الزامات کی سماعت کی تھی۔ اس کی آئینی حیثیت درست نہ تھی۔ لہٰذا کھوڑو صاحب کے خلاف تمام کارروائی کالعدم ہو گئی۔ ان کی نااہلی بھی ختم ہو گئی۔ مسٹر کھوڑو نئی شان کے ساتھ اسمبلی میں جا بیٹھے۔ مسٹر یوسف ہارون نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ ایک سفارتی عہدہ قبول کر کے وزیر اعلیٰ کی گدی سے استعفا دے دیا۔ مسٹر کھوڑو لیگ کے آئین کی پابندی کی وجہ سے لیگ کی صدارت کے ساتھ وزارتی عہدہ نہ لے

سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے ایک نامزد وزیر قاضی فضل اللہ کو وزیر اعلیٰ بنا دیا اور خود دو سال کی طویل سیاسی اور قانونی جنگوں کے بعد کچھ عرصہ کے لئے آرام کی غرض سے پاکستان سے باہر چلے گئے۔ ان کی واپسی کے بعد ستمبر ۱۹۵۰ء میں صوبائی لیگ کے سالانہ انتخاب پھر ہوئے۔ اور کھوڑو صاحب اس شان سے دوبارہ بلا مقابلہ صدر منتخب ہوئے کہ لیگ کونسل نے باقی عہدہ داروں کو نامزد کرنے کا اختیار بھی انہیں دے دیا۔

پنجاب میں گورنری راج کے نفاذ کے بعد جو کچھ ہوتا رہا تھا وہ ایک علیحدہ داستان تھی۔ لیاقت علی خان نے صوبائی نظم و نسق کو سیاسی خلفشار کے اثرات سے بہت حد تک محفوظ کر دیا تھا لیکن ممدوٹ۔ دولتانہ کش مکش مختلف صورتوں میں جاری رہی۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی سے چند اہم فیصلے کرائے جن میں وزیروں اور سرکاری افسروں کے احتساب کے ایک قانون (پیروڈا)لہ کی منظوری اور آئین کے بنیادی اصول طے کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر شامل تھے۔ اس کے بعد وہ بیرون ملک دورے پر چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے تو پنجاب میں ایک نئی سیاسی جنگ جاری تھی جس کا پس منظر بہت دلچسپ تھا۔ اس صوبے میں گورنری راج کے بعد میاں ممتاز دولتانہ نے مصالحت کنندوں کی اپیلوں کے جواب میں صوبائی لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور یہ پیشکش کی کہ وہ کسی متفق علیہ غیر جانب دار شخص کو اس عہدے پر بٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ دونوں گروپوں (دولتانہ گروپ اور ممدوٹ گروپ) کا اتفاق میاں عبدالباری پر ہو گیا اور وہ اتفاق رائے سے صوبائی لیگ کے صدر چن لئے گئے۔ ادھر گورنر موڈی نے دفعہ ۹۲ کے تحت صوبائی نظم و نسق کا چارج سنبھالنے کے بعد سرکاری افسروں کو یہ ہدایات بھیج دی تھیں کہ اب وہ اپنے کام میں کسی سیاسی پارٹی کے ممبروں اور کارکنوں کا اثر قبول نہ کریں بلکہ اپنا کام بلا رو رعایت کریں۔ افسروں نے گورنر کا اشارہ پا کر مسلم لیگی لیڈروں کی سفارشوں کو ردی کی ٹوکریوں میں پھینکنا شروع کر دیا اور اپنے پچھلے زمانے کی طرح نوکریاں، مراعات

لہ PUBLIC & REPRESENTATIVE OFFICES DISQUALIFICATION ACT

لائسنس اور روٹ پرمٹ وغیرہ اپنی ذاتی صوابدید کے مطابق تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ میاں عبدالباری نے صوبے کا دورہ کیا تو ہر جگہ اضلاع کے مسلم لیگی لیڈروں نے ان سے شکایت کی کہ افسروں نے ہمارا اثر ورسوخ ختم کر دیا ہے۔ مسلم لیگ کے مقامی عہدہ داروں کی اب کوئی پرسش نہیں رہی۔ اور یہ سب کچھ گورنر موڈی کی ہدایت پر ہو رہا ہے۔ وہ اس صوبے میں لیگ کے وقار کو تباہ کر رہا ہے۔ میاں عبدالباری یہ سن کر گورنر کے خلاف جہاد پر تل گئے۔

گورنر نواب ممدوٹ کے خلاف "پیر وڈا" کے تحت مقدمہ قائم کر رہا تھا۔ اس مہم میں ممدوٹ اور ان کے ساتھی بھی میاں عبدالباری کے ہم نوا ہو گئے۔ جب لیاقت علی خاں پاکستان میں واپس آئے تو پنجاب مسلم لیگ کا صوبائی صدر گورنر کی برطرفی کا مطالبہ کر رہا تھا اور اس مطالبے کے حق میں سول نافرمانی کی دھمکی دے رہا تھا۔ سول نافرمانی فی الواقعہ خارج از بحث تھی۔ اس زمانے کے حالات میں کوئی ایسی تحریک دو دن بھی نہ چل سکتی تھی۔ الٹا صوبائی مسلم لیگ کا بھرم ختم ہو جاتا۔ لیکن صوبائی لیگ کا وقار اس طرح بھی ختم ہوتا تھا کہ اس کی بات سنی ہی نہ جائے۔ لیاقت علی خاں اس وقت مسلم لیگ میں کوئی عہدہ نہ رکھتے تھے۔ لیکن ظاہر تھا کہ وہ مسلم لیگیوں سے بڑھ کر مسلم لیگی تھے۔ انھوں نے محض لیگ کے وقار کو بچانے کے لئے مفاہمت کی راہ نکالی اور گورنر کے ساتھ صوبائی لیگ کے صدر کے نامزد کئے ہوئے "مشیر" مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

گورنر موڈی اس پراپیگنڈے کے بعد جو میاں عبدالباری اس کے خلاف کر رہے تھے۔ ان کے نامزد مشیروں کو اپنے ساتھ بٹھانا اپنی بے عزتی سمجھتا تھا۔ اس لئے لیاقت علی خاں کے سامنے اپنا استعفا پیش کر دیا جسے وزیر اعظم نے بلا تامل منظور کر لیا۔ اور اس کی جگہ مرکزی کابینہ کے وزیر سردار عبدالرب نشتر کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن اس کے بعد اس صوبے کی سیاست میں ایک اور تبدیلی آئی۔ گورنر موڈی کے خلاف ایجی ٹیشن کے ذریعے ممدوٹ گروپ اور میاں عبدالباری ایک ہو گئے تھے۔ دولتانہ کو آہستہ آہستہ یہ شکایت پیدا ہوئی کہ میاں صاحب غیر جانب دار نہیں رہے۔ اور صوبے میں مشیروں کے ذریعے عملاً ان کے مخالف دھڑے کی نیم حکومت قائم ہو گئی ہے۔ چنانچہ دولتانہ نے مشیروں کے تقرر کے خلاف

صوبائی لیگ کے اندر محاذ بنانا شروع کر دیا۔ ۲۴ر جولائی ۱۹۵۰ء کو صوبائی لیگ کونسل کے ایک ہنگامہ خیز اجلاس میں انہوں نے ایک مشیر کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پاس کرادی۔ یہ قرارداد بالواسطہ صدر عبدالباری کے خلاف تھی۔ لہٰذا صدر صاحب نے اگلے ہی دن اپنا استعفا پیش کر دیا۔ لیگ کونسل کے آئندہ اجلاس (منعقدہ ۲۰ر اگست ۱۹۵۰ء) نے ان کا استعفا منظور کر کے مسٹر دولتانہ کے نامزد امیدوار صوفی عبدالحمید کو صدر چن لیا اور گورنر کے مشیر یکے بعد دیگرے اپنے عہدوں سے مستعفی ہو کر چلے گئے۔ اب مسلم لیگ پر دولتانہ گروپ کا پھر قبضہ ہو گیا۔ لیکن نئے صدر صوفی عبدالحمید نے اپنی نئی مجلس عاملہ میں نواب ممدوٹ کو بھی جگہ دی اور نواب صاحب نے اس وقت اس سے انکار نہ کیا۔ ان لڑائی جھگڑوں میں ۱۹۵۱ء اور صوبائی اسمبلی کے نئے انتخابات کا زمانہ آگیا اور صوبے کے سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی توجہ اس طرف منعطف ہو گئی۔

اس سے پہلے ملک کی سیاست میں چند اور اہم تبدیلیاں آچکی تھیں۔ ان کا سلسلہ صوبۂ سرحد کے واقعات سے شروع ہوا۔ وہاں بھی قائد اعظم کی وفات کے بعد لیاقت علی خاں نے مانکی شریف کے پیر امین الحسنات اور خان عبدالقیوم کے درمیان صلح صفائی کرانے کی کوشش کی تھی۔ پیر صاحب نے غالباً صدق دل سے اتحاد کے راستے پر چلنے اور قیوم وزارت کے ساتھ تعاون کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی انہیں وزیر اعلیٰ کے خلاف سخت شکایات پیدا ہو گئیں۔ شکایات کی نوعیت یہ تھی کہ (۱) اتحاد کی خاطر خود پیر صاحب نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں اپنا کوئی دھڑا قائم کرنے سے اجتناب کیا تھا جس کا نتیجہ ان کے قول کے مطابق یہ ہوا کہ خان عبدالقیوم نے اپنی مرضی کے مطابق ڈسٹرکٹ اور سٹی لیگوں کا انتخاب کرا لیا اور صوبائی لیگ کی تنظیم پر اپنے دھڑے کا مکمل قبضہ کرا دیا۔ اور (۲) اس کے بعد خان موصوف نے حکومتی اختیارات سے کام لے کر جو انہیں پہلے ہی حاصل تھے یا صوبائی سیفٹی ایکٹ کے ذریعے حاصل ہو گئے تھے۔ آمریت کے طریقے اختیار کر لیے اور ان لوگوں پر جو ان کی ذاتی سیاست کے تابع فرمان نہ تھے عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔

پھر جب صوبائی لیگوں کی تنظیم مکمل ہونے کے بعد پاکستان مسلم لیگ کا پہلا اجلاس

۱۰ اپریل ۱۹۴۹ء میں کراچی میں منعقد ہوا اور مرکزی لیگ کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا تو وہاں ایک عجیب سیاسی گٹھ جوڑ کا رجحان پیدا ہو گیا۔ اس رجحان کو فی الواقعہ بہت سے لوگوں نے محسوس کیا اور اسے پاکستان کی آئندہ صوبائی سیاست کا رخ متعین کرنے والا قرار دیا۔ گٹھ جوڑ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے نمائندوں نے سرگرمی اور کنویسنگ کی ایک خاص مہم کے ذریعہ اپنے ووٹ اور صوبہ سرحد کے نمائندوں کے ووٹ جمع کر کے تمام عہدے اپنی مرضی کے مطابق تقسیم کر دیئے۔ پاکستان مسلم لیگ کا صدر چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزمان کو چن لیا (یہ سوال پوچھا جاتا رہا کہ کیا وہ بھی اس گٹھ جوڑ کے حامی تھے؟) نائب صدر کا عہدہ مشرقی پاکستان کے عبداللہ الباقی کو دے دیا۔ سکرٹری کا عہدہ صوبہ سرحد کے مسٹر یوسف خٹک کو بخش دیا۔ ایک جائنٹ سیکرٹری سندھ سے اور دوسرا مشرقی پاکستان سے لے لیا اور پنجاب کو کوئی عہدہ نہ دیا۔ پنجاب کے میاں عبدالباری سکرٹری کے عہدے کے لئے امیدوار تھے۔ پنجاب کے نمائندوں نے ان کے لئے متفقہ طور پر زور لگایا لیکن وہ مقابلے میں ہار گئے۔

دوسرے لوگوں پر اس گٹھ جوڑ کا جو رد عمل ہوا اس سے قطع نظر صوبہ سرحد کے پیر مانکی شریف نے اس سے یہ تاثر لیا کہ صوبہ سرحد کی لیگ کے معاملات میں خان عبدالقیوم کی من مانی کارروائیوں کے خلاف مرکزی لیگ سے کوئی موثر اپیل کرنے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔ اس صورت حال پر غور کرنے کے بعد پیر صاحب نے مسلم لیگ سے ترک تعلق کا فیصلہ کر لیا اور صوبہ سرحد کی لیگ کو "قیوم لیگ" کا نام دے کر اپنے صوبے میں ایک متوازی لیگ "عوامی مسلم لیگ" کے نام سے قائم کر لی۔ اس اقدام کا اعلان انہوں نے ستمبر ۱۹۴۹ء میں کیا۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں صوبائی گورنر کرنل خورشید نے خان عبدالقیوم کے ساتھ ان کی صلح کرانے کی کوشش کی۔ اور انہیں عوامی مسلم لیگ کو سرکاری مسلم لیگ میں مدغم کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ پیر صاحب ایک شرط پر اس کے لئے تیار تھے۔ ڈسٹرکٹ اور سٹی مسلم لیگوں اور صوبائی کونسل کے تمام انتخاب دوبارہ کرائے جائیں۔ ایک ضمنی شرط انہوں نے یہ بھی لگائی کہ یہ انتخاب چودھری خلیق الزمان اور مسٹر خٹک کے زیر نگرانی نہ ہوں۔

بلکہ کسی متفق علیہ غیر جانب دار شخص کے زیر اہتمام کرائے جائیں۔ یہ شرائط خان عبد القیوم خان کے لئے قابل قبول نہ تھیں۔

پیر صاحب کی عوامی مسلم لیگ پاکستان میں پہلی حزب اختلاف تھی جو ایک سابق مسلم لیگی اور قائد اعظم کے معتمد کارکن نے قائم کی۔ اس وقت یہ صرف ایک صوبائی جماعت تھی اور اگر صوبائی جماعت ہی رہتی تو شاید بعد کے حالات میں اسے اور سرکاری مسلم لیگ کو ایک کرنے کا کوئی راستہ نکل آتا۔ لیکن اس زمانے میں حزب اختلاف کے اصول کی علم بردار ایک اور نمایاں شخصیت میدان میں آ چکی تھی۔ یہ مسٹر حسین شہید سہروردی تھے جنہوں نے پیر صاحب کے ساتھ مل کر ان کی عوامی مسلم لیگ کو بین الصوبائی شکل دے دی۔ سہروردی نے بھارت میں ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد ۱۹۴۹ء کے شروع میں مستقل طور پر پاکستان کا شہری بننے کا فیصلہ کیا وہ مارچ ۱۹۴۹ء کے شروع میں کراچی پہنچے۔ پھر انہوں نے وکالت کی پریکٹس کے لئے لاہور شہر کو چن لیا۔

مسٹر سہروردی وکالت بھی کرتے رہے اور سیاسی واقعات و حالات کے متعلق اخبارں میں بیان بھی دینے لگے۔ ان بیانوں میں مسلم لیگی قیادت اور مسلم لیگی وزارتوں کے خلاف اکثر تنقید ہوتی تھی۔ خان عبد القیوم خاں کی وزارت ان کی تنقید کا بطور خاص نشانہ بنی۔ حکومت کے معتوبین نے مسٹر سہروردی کی قانونی خدمات کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نواب ممدوٹ کے خلاف "پروڈا" کے مقدمہ کے سلسلے میں ان کے مشیر وکیل مسٹر سہروردی ہی تھے۔ انہوں نے اپنی پارٹی بنانے کا قدم کچھ دیر بعد اٹھایا۔ اس سے پہلے وہ حکومت کے کاموں کے متعلق "رائے عامہ کو بیدار کرنے" کی ذاتی مہم چلاتے رہے۔ اخباری بیانوں کے علاوہ انہوں نے پبلک تقریروں کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ پنجاب کے کئی مقامات پر انہوں نے کئی جلسوں کا انتظام اس طرح کیا کہ وہ جلسے کے اعلان کا خرچ۔ لاؤڈ سپیکر اور دریوں وغیرہ کا کرایہ بھی اپنی جیب سے دیتے تھے۔ پھر جلسے میں تقریر کرنے کے بعد اس کی رپورٹ بھی خود ہی اخباروں کو بھجواتے تھے۔ کچھ دیر اس قسم کی مہم جاری رکھنے کے بعد مسٹر سہروردی اس قابل ہو گئے کہ انہوں نے پیر مانکی شریف کے ساتھ مل کر فروری ۱۹۵۰ء میں سیاسی کارکنوں کا ایک کنونشن لاہور میں منعقد کیا اور "پاکستان عوامی مسلم لیگ" کی بنیاد ڈال دی۔ جس کے وہ خود صدر منتخب ہو گئے۔

مسٹر سہروردی اصولاً فرقہ وارانہ نام کی پارٹی بنانے کے مخالف تھے۔ لیکن فی الحال انہوں نے عوامی "مسلم" لیگ ہی کے نام کو قبول کر لیا اور نام میں ترمیم کے لئے موقعہ کے منتظر رہے۔ صوبہ سرحد میں پیر مانکی شریف کی عوامی مسلم لیگ کے قیام کے بعد مشرقی پاکستان میں بھی مولانا بھاشانی کے ساتھیوں نے (جو نور الامین وزارت کے مخالف تھے) صوبائی مسلم لیگ سے الگ ہو کر ایک نئی علاقائی پارٹی بنائی تھی جس کا نام صرف عوامی لیگ رکھا گیا تھا۔ مسٹر سہروردی نے اس کی بھی سرپرستی قبول کر لی اور وہ کچھ عرصے پاکستان عوامی "مسلم" لیگ کے صدر اور مشرقی پاکستان کی صوبائی عوامی لیگ کے غیر رسمی مرکزی لیڈر بنے رہے۔ مسٹر سہروردی کے ساتھ مفاہمت کے بعد پیر مانکی شریف کی مسلم لیگ میں واپسی محال ہو گئی۔

اگست ۱۹۵۰ء میں پاکستان مسلم لیگ کو ایک عجیب حادثہ پیش آ گیا۔ ۱۲ر اگست کو کراچی کے مہاجروں کا ایک ہجوم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کی کوٹھی کے سامنے مخالفانہ مظاہرہ کرنے کے لئے جمع ہو گیا اور ان کے استعفے کا مطالبہ کرنے لگا۔ چودھری صاحب کی کوٹھی کی حفاظت کے لئے پولیس آ گئی اور کوٹھی اور مظاہرین کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ ہجوم نے کوئی پیش قدمی نہ کی لیکن نعروں کے ذریعے اپنا مطالبہ جاری رکھا اور اس وقت تک منتشر نہ ہوا جب تک اسے یہ یقین نہ دلایا گیا کہ چودھری صاحب نے استعفا دے دیا ہے۔ چودھری صاحب کا بیان تھا کہ یہ مظاہرہ مہاجروں کے بعض خود ساختہ لیڈروں نے محض اس لئے کرایا تھا کہ وہ چودھری صاحب سے بے جا مراعات کے لئے سفارش کی درخواستیں کرتے رہے تھے۔ اور آپ نے ان درخواستوں کو منظور نہ کیا تھا۔ یہ توجیہ شاید درست تھی۔ بہر حال مسلم لیگ کا سب سے بڑا عہدہ یکایک خالی ہو گیا۔ اور اسے پُر کرنے کا اہم سوال پیدا ہو گیا۔ یہ سوال فی الحقیقت عہدے کی خانہ پُری کا نہ تھا۔ بلکہ مسلم لیگ کو افراد کی گروہی سیاست کے دلدل سے نکال کر اس کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کا تھا۔ کون تھا۔ جسے یہ ذمہ داری سپرد کی جاتی؟ مسٹر لیاقت علی کا ذہن اس طرح کام کرتا تھا کہ پاکستان کو محفوظ رکھنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہ تھا کہ اس ملک میں زمام اقتدار مسلم لیگی وزارتوں ہی کے ہاتھوں میں رہے۔ وہ کسی حزب مخالف کو مرکز میں یا صوبوں میں "متبادل محب وطن حکومت" کا درجہ دینے کو تیار نہ تھے۔

یہ نقطہ نگاہ درست تھا یا غلط۔ بہرصورت وہ اس پر سختی سے قائم تھے۔ اور سہروردی کو جو حزب مخالف کے اصول کا سب سے نمایاں اور مجسم نشان بن گئے تھے۔ جلی کٹی سنانے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ اس مرحلے پر لیاقت علی نے خود مسلم لیگ کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوہدری خلیق الزماں کے استعفے پر غور کرنے کے لئے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس کراچی میں ۸ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس نے چوہدری صاحب کا استعفا منظور کیا۔ لیگ کے عہدہ داروں پر وزارتی عہدے قبول نہ کرنے کی پابندی اڑا دی۔ اور وزیراعظم لیاقت علی کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا۔ لیاقت علی ایک میعاد کے بعد اپنے متعلق اس دوہری ذمہ داری کے تجربے کو جاری رکھتے یا نہ رکھتے۔ اس کے امتحان کی نوبت ہی نہ آئی۔ لیکن فوری طور پر مرکز میں صدارت اور وزارت کی یکجائی کو صوبوں نے اپنے لئے قابل تقلید نمونہ بنا لیا۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں سندھ صوبائی لیگ کے صدر مسٹر کھوڑو نے قاضی فضل اللہ سے استعفا دلایا اور ان کی جگہ خود وزیراعلیٰ کا عہدہ سنبھال لیا۔ قاضی صاحب کو انہوں نے اپنے ساتھ وزیر مال بنا لیا۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں صوبۂ سرحد کی مسلم لیگ کے عہدہ داروں کے نئے انتخاب ہوئے تو وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم نے اپنے آپ کو صدر منتخب کرا لیا۔ پنجاب میں صوبائی اسمبلی کے نئے انتخاب کے بعد دولتانہ وزیراعلیٰ بنے تو وقت آنے پر انہوں نے بھی اکتوبر ۱۹۵۱ء میں وزارت کے ساتھ صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس کے بعد پاکستان میں اس رسم پر بہت پابندی کے ساتھ عمل ہوتا رہا کہ ہر وزیراعظم اور ہر وزیراعلیٰ اپنے وزارتی عہدے کے ساتھ مرکزی یا صوبائی لیگ کی صدارت کا تتمہ شامل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس رسم کو چودھری محمد علی نے ختم کیا۔

۱۹۵۰ء میں دو اور نئی سیاسی پارٹیاں معرض وجود میں آئیں۔ ایک میاں افتخار الدین نے (جنھیں کچھ عرصہ پہلے تادیبی کارروائی کے طور پر مسلم لیگ کی رکنیت سے خارج کر دیا گیا تھا) آزاد پاکستان پارٹی کے نام سے ستمبر ۱۹۵۰ء میں قائم کی۔ اس پارٹی کی پالیسی ان کے سوشلسٹ خیالات کی آئینہ دار تھی۔ دوسری پارٹی نواب ممدوٹ نے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں "جناح مسلم لیگ" کے نام سے بنائی۔ جب پنجاب اسمبلی کا نیا انتخاب قریب آیا تو

"جناح مسلم لیگ" نے مسٹر سہروردی اور پیر مانکی شریف کی "عوامی مسلم لیگ" کے ساتھ ادغام کا فیصلہ کر لیا۔ اور دسمبر ۱۹۵۰ء میں ان دونوں کے اتحاد سے "جناح عوامی مسلم لیگ" قائم ہوئی۔ پھر دو تین سال کے بعد ۱۹۵۳ء میں نواب ممدوٹ سہروردی کے ساتھ لڑ بھڑ کر مسلم لیگ میں واپس چلے گئے اور مسٹر سہروردی نے باقی ماندہ "عوامی مسلم لیگ" کو مشرقی پاکستان کی "عوامی لیگ" کے ساتھ آئینی طور پر متحد کر لیا اور متحدہ پارٹی کے نام سے "مسلم" کا لفظ حذف کر دیا۔ اور اس پارٹی نے "عوامی لیگ" کے نام سے پاکستان کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیے۔

۵۴۔ لیاقت علی کی خارجہ پالیسی۔ اُن کے قتل کے اسباب کیا تھے؟

عالمی مسائل کا مطالعہ کرنے اور اپنی خارجہ پالیسی میں تفاصیل کا رنگ بھرنے کے لئے پاکستان کے لیڈروں کو وقت درکار تھا۔ قائد اعظمؒ کو اپنی زندگی میں اس بات کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ ان کی خارجہ پالیسی دو سیدھے سادے رجحانات پر مبنی تھی۔ ان کا ایک بہت واضح رجحان یہ تھا کہ وہ دنیا کے مسلم ممالک کے ساتھ اخوت کے رشتے اور باہمی تعاون کی بنیاد کو حتی الوسع مضبوط کرنے کے خواہشمند تھے۔ اور دوسرا رجحان یہ تھا کہ وہ اپنی ذہنی جمہوریت پسندی کی بناء پر کمیونزم اور کمیونسٹ ممالک کے مقابلے میں اپنے آپ کو مغربی ممالک سے قریب تر سمجھتے تھے۔۔ لیاقت علی خاں نے ان دونوں رجحانات کا تتبع کیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں انہیں روس کی جانب سے دعوت ملی۔ امریکہ نے انہیں اس کے بعد دعوت دی۔ لیکن وہ امریکہ کے دورے پر چلے گئے۔ اور روس کی دعوت قبول کرنے کے بعد انھوں نے وہاں کے دورے کی کوئی تاریخ ہی مقرر نہ کی۔ لیکن اپنے غیر ملکی دوروں میں انہوں نے مسلم ممالک کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا۔ بلکہ ایران، مصر اور دوسرے مسلم ممالک کے لیڈروں کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا وقت نکالا۔ ان کے ساتھ ذاتی روابط قائم کئے اور ان کے مسائل کو سمجھنے اور اپنے مسائل انہیں سمجھانے کی بطور خاص کوشش کی جو نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

سنہ ۱۹۵۱ء کے آغاز میں لیاقت علی نے برطانوی دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے سلسلے میں پہلی مرتبہ ایک نئی قسم کا ڈیڈ لاک پیدا کرنے کی کوشش کی۔

آپ نے اس بات پر اصرار کیا کہ کشمیر کے مسئلے کو کانفرنس کے ایجنڈے پر رکھا جائے۔ ورنہ پاکستان کے لیے اس کانفرنس میں شرکت بے فائدہ ہو گی۔ باقی وزرائے اعظم کانفرنس کی اس روایت کو توڑنے کو تیار نہ تھے کہ کانفرنس میں ممبر ملکوں کے باہمی اختلافات کو زیر بحث نہیں لایا جاتا۔ تار دن کے ذریعے اسی نکتے پر بحث ہوتی رہی اور لیاقت علی یہ وعدہ لے کر کانفرنس میں شریک ہوئے کہ کانفرنس سے باہر غیر رسمی طور پر مختلف وزرائے اعظم پاکستان اور بھارت کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔ اس کا صرف یہ نتیجہ ہوا کہ دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم نے دونوں ملکوں کے درمیان بنیادی نکتۂ اختلاف کو رفع کرنے کے لیے اپنی طرف سے یکے بعد دیگرے تین چار متبادل مصالحتی تجاویز پیش کیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو انہیں مسترد کرتے رہے۔ اس طرح دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کے سامنے پنڈت نہرو کی ہیکڑی ہٹ دھرمی ثابت کرنے کا مقصد ضرور پورا ہو گیا۔ گو اس ثبوت کے باوجود مسئلہ کشمیر جوں کا توں موجود رہا۔

۱۵ جولائی ۱۹۵۱ء کو مسٹر لیاقت علی خاں نے کراچی میں ایک بیان دیا جس نے پورے پاکستان۔ بالخصوص مغربی پاکستان۔ میں ہلچل پیدا کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ بھارت کچھ دنوں سے اپنی فوجوں کو ان کے سابقہ مقامات سے منتقل کر کے بتدریج مغربی پاکستان کی سرحد کی جانب آگے بڑھاتا رہا ہے۔ اور اس وقت اس کے بھاری اسلحہ رکھنے والے ڈویژن پاکستان کی سرحد سے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ پاکستان کا سرحدی علاقہ ان کی توپوں کی زد میں ہے۔ لیاقت علی خاں نے یہ بھی کہا کہ بھارت کی تقریباً نوے فیصد افواج اس نقل و حرکت میں شامل ہے۔ جو پاکستان کی جانب کی جاتی رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک تار اور ایک خط بھیجا ہے اور اس صورت حال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ پاکستان کے لیے فوجی حملے کا خطرہ پیدا نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے پاکستان کے عوام سے اپیل کی کہ وہ اس خطرے کے مقابلہ کے لیے تیار رہیں۔ اگر بھارت نے پاکستان پر حملے کی حماقت کی تو پاکستان کی فوج اپنا فرض ادا کرے گی۔ اور عوام کو چاہیئے کہ وہ اعتماد ہمت اور تنظیم کے

ساتھ اپنا فرض ادا کریں۔

بیرون ملک سے لیاقت علی خان کو فوری طور پر دو پیغام موصول ہوئے۔ ایک آسٹریلیا کے وزیر اعظم رابرٹ مینزیز کی جانب سے تھا۔ جس میں بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر اور دوسرے اختلافی مسائل کے متعلق مصالحت کرانے کی پیش کش کی گئی تھی۔ دوسرا عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمان عظام پاشا کی جانب سے تھا۔ جنہوں نے لیاقت علی خاں کے نام ایک تار میں کہا تھا "پاکستان پر حملے کی صورت میں پوری دنیائے اسلام پاکستان کی مدافعت کرے گی۔"

پنڈت نہرو نے لیاقت علی خاں کے احتجاج کا جواب دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ مختلف مقامات پر متعین ہندوستانی افواج کی تعداد میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ لیکن یہ کہا کہ یہ تبدیلیاں ہندوستان کی سرحد کی حفاظت کی خاطر کی گئی ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی جارحانہ مقصد کارفرما نہیں ہے۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم کے جواب میں بھی پنڈت نہرو نے کہا کہ بھارت پاکستان پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ لہٰذا مصالحت کی پیشکش غیر ضروری اور بے محل ہے۔

اس سلسلے میں مسٹر لیاقت علی اور پنڈت نہرو کے درمیان کئی خطوں کا تبادلہ ہوا۔ پنڈت جی نے اپنے دوسرے یا تیسرے خط مورخہ ۲۴ جولائی سنہ ۱۹۵۱ء میں اپنی "امن پسندانہ" پالیسی کے ثبوت میں لیاقت علی خاں کو یہ پیش کش کر دی کہ بھارت اپنے ارادوں کے متعلق پاکستان کو اطمینان دلانے کی غرض سے باہم جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔ لیاقت علی خاں نے اس کا جواب ۲۶ جولائی کو دیا۔ اور پاکستان آج تک اسی جواب پر قائم ہے۔ جواب یہ تھا کہ پہلے کشمیر کا منصفانہ حل کرو۔ اس کے بعد جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ایک حقیقت پسندانہ اقدام بن سکے گا۔

۱۸ جولائی کو کراچی کے شہریوں نے مدافعت کی تیاری کے سلسلے میں ایک مظاہرے کا انتظام کیا۔ اور ایک دو میل لمبا جلوس نکالا۔ اس جلوس میں حصہ لینے والوں سے لیاقت علی خاں نے ایک مکان کی بالائی منزل سے خطاب کیا اور کہا کہ پاکستان

جنگ نہیں چاہتا — لیکن حملہ آور کے لیئے پاکستان کا نعرہ "تیار ہے" - یہ کہہ کر انھوں نے اپنا مکہ ہوا میں بلند کیا - اور بھارت کے لیئے پاکستان کا مکہ وقتی طور پر ایک قومی نعرہ بن گیا - اگر اس فوجی نقل وحرکت سے بھارت کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو ہراساں کر کے مسئلہ کشمیر کو ان عالمی مسائل کی فہرست سے خارج کرا دے - جو جنگ کے خطرے کا باعث بن سکتے تھے تو یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی -

اس بات کے باوجود کہ لیاقت علی کمیونسٹ ملکوں کے مقابلے میں مغربی ممالک کے ساتھی بنے رہے اور ان سے مسئلہ کشمیر کے متعلق انصاف پسندی کی امیدیں باندھتے رہے - ان کی خارجہ پالیسی میں خود اعتمادی کا ایک خاص رنگ موجود تھا - جسے ان کے جانشین وزرائے اعظم قائم نہ رکھ سکے - مسئلہ کشمیر کے متعلق پاکستان کے موقف کے لیئے انہوں نے مسلم ممالک کی تائید و حمایت جس حد تک حاصل کر لی تھی - وہ چند واقعات سے ظاہر ہوتی ہے -

(۱) جنوری ۱۹۵۱ء کے شروع میں جمعیتہ العلمائے اسلام نے کراچی میں مصر کے سفیر کے اعزاز میں ایک دعوت استقبالیہ دی - اس موقعہ پر مہمان خصوصی کا خیر مقدم سید سلیمان ندوی نے کیا اور مصری سفیر نے اپنی تقریر میں مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنی حکومت کا موقف ان دو ٹوک الفاظ میں بیان کیا کہ مصری حکومت کو کشمیر کی آزادی اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا اصول اتنا ہی عزیز ہے - جتنا وادی نیل کی آزادی کا مقصد - اس تقریب میں شام اور سعودی عرب کے سفیر بھی موجود تھے - انہوں نے بھی اس بارے میں مصری سفیر کے نقطہ نگاہ کی تائید کی -

(۲) ۵ جولائی ۱۹۵۱ء کو عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عظام پاشا نے حکومت ہند کو ایک سرکاری چٹھی لکھی - یہ چٹھی بھارتی حکومت کے ایک احتجاجی خط کے جواب میں لکھی گئی تھی - بھارت نے اس بات کے خلاف احتجاج کیا تھا کہ عرب ممالک میں کشمیر کے مسئلے پر اکثر بھارت کے خلاف غلط باتیں کہی جاتی ہیں - عظام پاشا نے اپنے جواب میں لکھا کہ عرب ممالک میں اکثر لوگ مسئلہ کشمیر کے متعلق بھارت کے رویہ کو غلط اور پاکستان کے موقف کو درست سمجھتے ہیں -

(۳) جولائی ۱۹۵۱ء میں حضرت آیت اللہ کاشانی کا ایک خط کراچی کے اخبار ڈان میں چھپا جس میں آپ نے فرمایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد آج مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ میں نے ان سے کہا کہ ایران کی پوری ملت اسلامی اس بات کی شدید خواہش رکھتی ہے کہ کشمیر کے لوگوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اظہار رائے کا موقعہ جلد از جلد دیا جائے۔ آپ میری طرف سے اپنے وزیر اعظم کو یہ درخواست پہنچا دیں کہ وہ اہل کشمیر کے اس حق میں رکاوٹ اور تاخیر پیدا نہ کریں۔

(۴) ۱۹ جولائی کو طاہر ریڈیو سے نشر شدہ ایک تبصرے میں کہا گیا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کشمیر میں استصواب رائے کے متعلق اقوام متحدہ کے فیصلوں کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس قسم کے بین الاقوامی تعلقات بہر حال یکطرفہ نہ ہو سکتے تھے۔ ان ملکوں کے اپنے مسائل بھی تھے۔ جن کے متعلق وہاں کے عوام شدید جذبات اور پاکستان سے تائید کی توقع رکھتے تھے۔ لیاقت علی خاں برطانیہ کی ناراضگی کی پروا کئے بغیر ان مسائل کے متعلق مسلم ممالک کے مؤقف کی حمایت کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس زمانے میں برطانیہ کا سامراجی مفاد مسلم ممالک کے قومی مفاد اور جذبات کے ساتھ متصادم تھا۔ ایک طرف ایران اور برطانیہ کے درمیان ایران کے تیل کے سوال پر سرد جنگ جاری تھی۔ ڈاکٹر مصدق کی حکومت نے اینگلو پرشین آئل کمپنی کے وسیع کاروبار کو قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ برطانیہ کے مفاد پر یہ اتنی بڑی ضرب تھی کہ اگر فوج کشی کی صورت میں روس کی فوجی دخل اندازی کا خطرہ نہ ہوتا تو برطانیہ اپنے مفاد کی حفاظت کی خاطر ڈاکٹر مصدق کے اقدام کے خلاف فوجی کارروائی سے بھی نہ چوکتا۔ تاہم نیم فوجی کارروائی برطانیہ اس صورت میں کر رہا تھا کہ اس کے بحری بیڑے نے آبادان کی بندرگاہ کی ناکہ بندی کر رکھی تھی اور وہ کسی دوسرے ملک کے تیل بردار جہازوں کو ایران کا تیل برآمد کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ایران کے قومی جذبات میں ہیجان کی کیفیت تھی۔ عوام ڈاکٹر مصدق کے اقدامات کے حق میں والہانہ مظاہرے کر رہے تھے۔ اسی طرح مصر کا وزیر اعظم اور وفد پارٹی کا لیڈر نحاس پاشا اس

معاہدے کو منسوخ کرنے پر تلا ہوا تھا جس کے تحت برطانیہ کو نہر سویز کی حفاظت کی خاطر ایک مخصوص علاقے کے اندر اپنی فوج متعین کرنے کی رعایت حاصل تھی۔ مصر میں بھی قومی جذبات کی وہی کیفیت تھی جو ایران میں تھی۔ نحاس پاشا کے مجوزہ اقدام کے حق میں زبردست مظاہرے ہو رہے تھے۔ ایران اور مصر کے مسائل نے نہ صرف ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا۔ بلکہ اس سلسلے میں ان دو ملکوں کی زبردست قومی تحریکوں نے دوسرے عرب ممالک کے عوام کے جذبات میں بھی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اور برطانوی سامراجیت کے خلاف ایک ہمہ گیر جذبے نے پوری عرب دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

روس اور چین اس سیاسی جنگ میں مصر اور ایران کی حکومتوں کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ اور جنگ کی صورت میں ان کی فوجی مدد کا وعدہ کر رہے تھے۔

اس آزمائش کے دور میں مصر اور ایران دونوں ملکوں کے قوم پرست حلقے پاکستان سے یہ توقع کرتے تھے کہ وہ ان کے موقف کی تائید کرے گا۔ اور صرف یہی ملک نہیں بلکہ دوسرے مسلم ملکوں میں بھی قوم پرست حلقوں کی نگاہیں پاکستان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پاکستان برطانوی دولت مشترکہ کے ممبر ملکوں میں شامل تھا۔ تاہم لیاقت علی خاں نے اس نازک مرحلے پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ مصر ایران اور عالم اسلام کی توقعات کو مایوس نہ کریں گے۔ وہ متعلقہ ملکوں کے ساتھ سفارتی روابط کے ذریعے سے بات چیت کرتے رہتے۔ ایرانی حکومت کے ساتھ پاکستان کے وزیر اعظم کا نامہ و پیام بہت حد تک راجہ غضنفر علی خاں کے ذریعے ہوتا تھا۔ لیاقت علی خاں کی تجویز یہ تھی کہ ایران، مصر اور پاکستان کے وزرائے اعظم (اگر ممکن ہو تو دوسرے ممالک کے سربراہوں کو ساتھ ملا کر) مشرق وسطیٰ کے ممالک کے مسائل کے متعلق ایک مشترکہ پالیسی کا اعلان کریں اور اس مشترکہ پالیسی کی بنا پر آئندہ عالمی سیاست میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ مشترکہ پالیسی میں چار مسئلے سرفہرست تھے۔ ایران کے تیل کا مسئلہ۔ سویز کے علاقے میں برطانوی فوج کا مسئلہ۔ کشمیر کا مسئلہ اور فلسطین کا مسئلہ۔ راجہ غضنفر علی کا بیان

ہے کہ اس گفت و شنید کے سلسلے میں جو ڈاکٹر مصدق کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے شروع میں انہیں وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی جانب سے یہ ہدایت موصول ہوئی کہ وہ مجوزہ اعلان کے نکات اور مسودے کے متعلق زبانی گفتگو اور صلاح مشورے کی غرض سے کراچی آنے کے لیئے تیار رہیں۔ یہ صلاح و مشورہ راولپنڈی کے دورہ سے لیاقت علی خاں کی واپسی کے بعد ہونے والا تھا۔ لیکن ۱۶ اکتوبر کو یہ تمام تجویز درہم برہم ہو گئیں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کی صبح کو مسٹر لیاقت علی خاں نے گورنر جنرل کے وائیکنگ طیارے میں کراچی سے راولپنڈی کا سفر کیا۔ اسی سہ پہر کو انہیں راولپنڈی کے کمپنی باغ میں ایک پبلک جلسے سے خطاب کرنا تھا۔ پونے چار بجے کے قریب لیاقت علی خاں جلسہ گاہ میں پہنچے۔ جہاں بیس چالیس ہزار کا مجمع ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس جلسے میں ایک شخص سید اکبر بھی تھا جو مجمع کی اگلی صف میں ڈائس سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر اپنی جیب میں ایک بھرا ہوا پستول لیئے بیٹھا تھا۔ اور لیاقت علی خاں پر گولی چلانے کے موقعہ کا انتظار کر رہا تھا۔

لیاقت علیخاں نے ایک گارڈ آف آنر کا معائنہ کیا پھر وہ ڈائس پر تشریف لے آئے۔ کلام پاک کی تلاوت کے بعد شیخ مسعود صادق نے راولپنڈی کے شہریوں کی طرف سے وزیر اعظم کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد لیاقت علی خاں تقریر کرنے کے لیئے کھڑے ہوئے۔ ان کی زبان سے صرف دو الفاظ نکلے تھے "برادران اسلام" کہ پستول کی فائر کی یکے بعد دیگرے دو مرتبہ آواز آئی اور لیاقت خاں لڑکھڑا کر گرتے نظر آئے۔ ان کے پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خاں اور ایک دو اور افراد نے انہیں سہارا دینے کی کوشش کی۔ لیاقت علی خاں نے پہلے کلمہ طیبہ پڑھا پھر کہا گولی لگ گئی ہے۔ پھر کلمہ طیبہ پڑھا۔ اور پھر کہا کہ "خدا پاکستان کی حفاظت کرے گا" آخری الفاظ بہت ہی نحیف الفاظ میں کہے گئے۔ اور ان الفاظ کے بعد لیاقت علی خاں بے ہوش ہو گئے۔ انہیں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں ان کے جسم میں خون داخل کیا گیا اور جسم

سے گولیاں نکلنے سے پہلے اپریشن کی تیاری کی گئی۔ لیکن پاکستان کا پہلا وزیر اعظم اسی بیہوشی کی حالت میں تھوڑی دیر بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

سید اکبر نے یہ ہولناک جرم کیوں کیا تھا؟ کیا اس کی پشت پر کوئی سیاسی سازش تھی؟ اگر تھی تو اس سازش میں کن لوگوں یا ملکوں کا ہاتھ تھا؟ یہ سب سوال تشنہ جواب رہ گئے۔ اور آج تک قیاسات کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ جب لوگ لیاقت علی خاں کے قاتل کو قابو میں لے رہے تھے۔ تو افراتفری کے عالم میں خود پولیس نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور لیاقت علی خاں کے قتل کے محرکات اور پس منظر پر ہمیشہ کے لیے پردہ ڈال دیا۔

لیاقت علی خاں کے قتل کے متعلق واقعات کی جو ڈیٹیل تحقیقات کے لیے جلد ہی ایک اعلیٰ سطح کا کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کی رپورٹ مرکزی حکومت نے اگست ۱۹۵۲ء میں یعنی واقعہ قتل کے تقریباً دس ماہ بعد شائع کی۔ اس کمیشن نے بعض شہادتیں بند کمرے میں قلم بند کی تھیں ان کے متعلق پبلک کو کوئی علم نہ ہو سکا۔ کمیشن کی جو رپورٹ پبلک کے سامنے آئی۔ وہ بھی فی الحقیقت ادھوری تھی۔ اس اہم سوال کے متعلق جو ہر شخص کے ذہن میں تھا۔ کمیشن نے صرف یہ رائے ظاہر کی کہ واقعات تین مختلف قسم کی سازشوں کے امکان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ "جن میں ممکنہ سازشوں کا ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلق ہو سکتا ہے" اسباب قتل کے متعلق مزید تحقیقات جاری تھیں۔ لہٰذا کمیشن نے ان کے متعلق وضاحت سے اجتناب کیا۔ کمیشن نے اس پولیس افسر کے متعلق جو مزید تحقیقات کی نگرانی کر رہا تھا۔ پورا اعتماد ظاہر کیا۔ یہ پولیس افسر نوابزادہ اعتزاز الدین تھے۔ جو سپیشل سٹاف کے انسپکٹر جنرل کا درجہ رکھتے تھے۔

کمیشن کی رپورٹ پر سب سے زیادہ برمحل اور قابل توجہ تبصرہ بیگم لیاقت علی خاں نے کیا۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ اس کمیشن کا تقرر ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ جو حکومت سے دانستہ یا نادانستہ طور پر سرزد ہوئی۔ اس تقرر کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب اور صوبہ سرحد کی پولیس کی توجہ قتل کی تفتیش کی طرف سے ہٹ گئی۔ اور پولیس افسر کمیشن کے سامنے اپنی اپنی صفائی پیش کرنے اور

غفلت اور بے پروائی کے الزام سے اپنی بریت ثابت کرنے یا اپنا قصور دوسروں پر ڈالنے میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ بہرحال کمیشن نے جن سازشوں کے امکان کی جانب اشارہ کیا ہے، انہیں بے نقاب کرنا حکومت کا کام ہے۔ قتل کے بعد کافی وقت گزر چکا ہے۔ اور جو سراغ قتل کے فوراً بعد مل سکتے تھے۔ وہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ تاہم اس بات کی ضرورت ہے کہ پاکستان اپنے وفادار وزیراعظم کے قتل کے محرکات کو بے نقاب کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے۔

تقدیر ان عناصر کی مدد کر رہی تھی جو اس سازش پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے یا ممکن ہے کہ سازش میں شریک عناصر اتنے با وسائل تھے کہ ان کے لئے ہوائی جہاز کا حادثہ کرانا بھی مشکل نہ تھا۔ اس رپورٹ کے شائع ہونے کے چند ہی دنوں کے اندر یہ ہولناک واقعہ رونما ہوا کہ نوابزادہ اعتزاز الدین جو اس مقدمہ کی تفتیش سے متعلق اہم کاغذات ساتھ لے کر وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی طلبی پر ان سے گفتگو کرنے کے لئے ہوائی جہاز سے جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ ہوائی جہاز کو یہ حادثہ جہلم کے قریب پیش آیا۔ جہاں کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے جہاز کو آگ لگ گئی۔ اور مسافر اور ان کا سامان (اور لیاقت علی خاں کے قتل کے مقدمہ کے متعلق اہم کاغذات) نذر آتش ہو گئے۔ لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد جو نئی کابینہ بنی تھی۔ اس میں نواب مشتاق احمد گورمانی کو جو اس سے پہلے وزیر برائے امور کشمیر تھے۔ وزیر داخلہ کا عہدہ مل گیا تھا۔ قتل کے متعلق تفتیش بے نتیجہ رہی۔ تو لامحالہ گورمانی صاحب کو اعتراضات کا نشانہ بننا پڑا۔ ان اعتراضات سے بچنے کے لئے انہوں نے بہت دیر کے بعد ایک مرحلے پر انگلستان کے سکاٹ لینڈ یارڈ کی مدد حاصل کی اور وہاں سے ایک ماہر سراغرساں کو بلا کر تفتیش پر مامور کیا۔ لیکن یہ اقدام بھی محض اتمام حجت ثابت ہوا۔ اس سے لیاقت علی خاں کے قتل کے اسباب پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی۔

اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں ایک عجیب انکشاف ہوا۔ فروری ۱۹۵۸ء میں جب ازالۂ حیثیت عرفی کا مشہور مقدمہ گورمانی بنام زیڈ اے سلہری وغیرہ۔ لاہور میں ہائی کورٹ کے ایک جج کے روبرو زیر سماعت تھا۔ ایک نکتے کی تصدیق کے لئے

عدالت نے لیاقت علی کے قتل کے متعلق پولیس کی تفتیشی کارروائیوں کی فائل کا ملاحظہ کرنا چاہا۔ اور اٹارنی جنرل پاکستان سے جو عدالت میں موجود تھے۔ دریافت کیا کہ کیا اس تفتیش کے متعلق سرکاری فائل عدالت کو مہیا کی جا سکتی ہے؟ اٹارنی جنرل نے ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء تک ضروری معلومات مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ وعدہ پورا نہ ہوا تو عدالت نے اٹارنی جنرل کو ایک چٹھی بھجوائی۔ اس نے جواب میں کہا کہ متعلقہ فائل حکومت مغربی پاکستان کے چیف سیکرٹری کی تحویل میں ہے۔ عدالت نے اس فائل کو منگوانے کے لئے سمن جاری کر دیئے۔ یکم مارچ ۱۹۵۸ء کو صوبائی حکومت کے ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت کے سامنے پیش ہو کر بیان کیا کہ متعلقہ فائل گم ہے۔ اس کی تلاش کی جا رہی ہے۔ اس تلاش کے لئے ایک ہفتے کی مہلت مانگی۔ ۸ مارچ کو سی۔آئی۔ڈی کے ایک افسر نے عدالت کو مطلع کیا کہ تلاش کے باوجود اس فائل کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ لہٰذا حکومت اسے پیش کرنے سے معذور ہے

عدالتی کارروائی کے سلسلے میں یہ سوال ختم ہو گیا۔ لیکن پبلک کے لئے یہ سوال ابھی تک تشنہ جواب ہے۔ کیا اس کے بعد وہ فائل ملی یا وہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی تھی؟ اور اگر یہ فائل ابھی تک گم ہے تو کیا اس کی گمشدگی محض غفلت اور بے پروائی کا نتیجہ تھی؟ یا کسی نے اسے جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر تلف کر دیا تھا؟ مسٹر لیاقت علی خاں کے قتل اور پھر قاتل کے قتل اور اس قتل کی تفتیش کے سلسلے میں کئی ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں جو انسان کے ذہن میں مختلف شکوک و شبہات پیدا کرنے والے ہیں۔

۵۴۔ وزیراعظم ناظم الدین اور گورنر جنرل غلام محمد۔

محلاتی سازشوں کے دور کا آغاز

پاکستان کے وزیراعظم کا عہدہ اچانک خالی ہوگیا۔ تو گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے (کابینہ کے ان ممبروں کے مشورے اور مرضی سے جو کراچی میں موجود تھے) اس عہدے پر خود اپنے آپ کو مقرر کر دیا۔ اور پھر اپنی جگہ گورنر جنرل کے عہدے کے لیے وزیر خزانہ ملک غلام محمد کے تقرر کی سفارش کر دی۔ ملک صاحب کی جگہ وزیر خزانہ چودھری محمد علی کو مقرر کیا گیا۔ جو اس وقت تک حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر کو بھی مرکزی کابینہ میں واپس بلا لیا گیا۔

راجہ غضنفر علی خاں کو سابق وزیراعظم لیاقت علیخاں کی جانب سے آخری ہدایت یہ ملی تھی کہ پاکستان، ایران اور مصر کے زیر تجویز مشترکہ اعلان کے امکانات کے متعلق زبانی گفتگو کی غرض سے کراچی آنے کے لیے تیار رہیں۔ حالات کی اس اچانک تبدیلی کے بعد راجہ صاحب نے ایک ہفتے کے قریب انتظار کیا۔ پھر نئے وزیراعظم سے تار کے ذریعے درخواست کی کہ وہ متعلقہ فائل کا ملاحظہ کر لیں اور اس کی روشنی میں انہیں کراچی کے سفر کے متعلق ہدایت بھیج دیں۔ جواب میں راجہ صاحب کو یہ تار ملا کہ وزیراعظم بہت مصروف ہیں۔ فرصت ملتے ہی موضوع معلومہ کی جانب توجہ دیں گے۔ اس اثناء میں کراچی سے بعض سرکاری بیانات کا انداز راجہ صاحب کو حیران کر رہا تھا۔ وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں لیاقت علی خاں کے قتل کے وقت ملک سے باہر تھے۔ ۲۰ اکتوبر کو وہ عہدے کا از سر نو حلف اٹھانے کے لیے کراچی پہنچ گئے۔ وہاں ایک اخباری انٹرویو میں انہوں نے مصر اور ایران کے حالات

کے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا کہ یہ حالات پاکستان کے لیئے پریشانی کا باعث ہیں کیونکہ پاکستان کے دوستانہ تعلقات دونوں طرف ہیں اور حکومت پاکستان کی یہ انتہائی خواہش ہے کہ جو تنازعات پیدا ہو گئے ہیں۔ انہیں فریقین پُرامن طریقوں سے حل کر لیں۔ اگلے دن خواجہ ناظم الدین نے ایک اخباری انٹرویو میں تقریباً یہی باتیں دہرائیں۔ اور تنازعات کے پُرامن حل کی خواہش پر زور دیا یہ انداز بیان اس پالیسی سے بالکل مختلف تھا جس پر لیاقت علی خاں چل رہے تھے "باہمی پُرامن تصفیہ" کی خواہش بہت نیک اور معصوم شے ہے۔ لیکن اس کا فائدہ ہمیشہ اس فریق کو پہنچتا ہے جو کسی متنازعہ حق یا شے پر قابض ہو۔ اگر حکومت پاکستان اپنا بیان برطانیہ کی مرضی سے مرتب کرتی تو وہ بیان بالکل انہی خطوط پر ہوتا۔

راجہ غضنفر علی خاں نئی حکومت کی پالیسی کو سمجھنے کے لیئے بے چین تھے۔ وہ کراچی آنا چاہتے تھے۔ لیکن وزیراعظم ان کی آمد کو ملتوی کرا رہے تھے۔ آخر راجہ صاحب نے انہیں لکھا کہ دوسری باتوں کے علاوہ انہیں ذاتی وجوہات کی بناء پر پاکستان آنے کی جلدی ہے لہٰذا اگر انہیں فی الحال سرکاری کام پر کراچی نہیں بلایا جا سکتا۔ تو انہیں چند دن کی چھٹی اور یہ اجازت دی جائے کہ وہ اپنے نجی خرچ پر پاکستان آ جائیں۔ اس پر خواجہ ناظم الدین نے انہیں سرکاری کام پر آنے کا حکم دے دیا۔ اور ان کے ساتھ گفتگو کی تاریخ مقرر کر دی۔

راجہ صاحب خواجہ ناظم الدین سے ملے اور انہیں لیاقت علی خاں کی مجوزہ پالیسی کا پس منظر سمجھایا۔ اور کہا کہ اگر پاکستان اس پالیسی کے مطابق آگے قدم نہیں بڑھاتا۔ اور اس نازک موقع پر مصر اور ایران کے مطالبات کی حمایت نہیں کرتا تو ان تمام باتوں کی نفی ہو جاتی ہے جنہیں پاکستان نے اپنی خارجہ پالیسی کا اہم جزو بنا رکھا ہے۔

گفتگو بہت حد تک یک طرفہ رہی۔ راجہ صاحب کا بیان ہے کہ ان کی باتوں کا خواجہ صاحب پر کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے گفتگو کا انداز بدلا اور وزیراعظم سے کہا کہ پاکستان برطانیہ کے کسی کام بھی اسی صورت میں آ سکتا ہے کہ مسلم ممالک کے کیمپ میں اس کی ساکھ قائم رہے۔ خود حکومت برطانیہ بھی اس بات کو ناپسند نہ کرے۔

گی کہ پاکستان اپنے متعلق مصر اور ایران کا اعتماد قائم رکھنے کے لیے ایک خاص حد تک ان کا ساتھ دے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو حکومت برطانیہ سے پوچھ لیں کہ اس نقطۂ نگاہ سے وہ آپ کو کس حد تک جانے کی اجازت دیتی ہے۔ اس تجویز پر خواجہ صاحب نے توجہ دی اور فرمایا کہ ”ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں اس پر غور کروں گا“

اس کے بعد حکومت پاکستان نے ایران اور مصر کے مطالبات کے متعلق کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالی جو برطانیہ کے موقف کے ساتھ ٹکراتی ہو۔ اس کے برعکس تقریباً ایک ماہ بعد بھارت نے (بھارت بھی برطانوی دولت مشترکہ کا رکن تھا) مصر کی حمایت میں پیش قدمی کی۔ پنڈت نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ مشرقی عوام کے اندر قومی آزادی کی لہر بھارت کی ہمدردی اور حمایت کی مستحق ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مصر اپنی سرزمین سے برطانوی فوج کے انخلاء کا مطالبہ نہ کرے۔ اس کے بعد بھارت مصر کے مطالبہ کی دو ٹوک حمایت کرتا رہا اور پاکستان صرف نجی اور غیر رسمی بات چیت میں اس مطالبہ کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتا رہا اور یہ توقع کرتا رہا کہ اسلامی اخوت کی بنا پر مصر کشمیر کے سوال پر بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا ساتھ دیتا رہے گا۔

ایک مہینے کے بعد ۲۰ نومبر کو خواجہ ناظم الدین پاکستان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ اس حیثیت میں انہیں فوراً ہی ایک اور مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت صوبہ سرحد کی اسمبلی کے نئے عام انتخابات کی آمد آمد تھی۔ اور ان انتخابات کے سلسلہ میں صوبائی وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان (جو صوبائی مسلم لیگ کے صدر بھی تھے) اور مرکزی مسلم لیگ کے سیکرٹری مسٹر یوسف خٹک کے درمیان خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے جن امیدواروں کو مسلم لیگ کے ٹکٹ دیئے۔ وہ صوبائی وزیر اعلیٰ کو پسند نہ تھے۔ انہوں نے پارلیمانی بورڈ کے نامزد امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار نامزد کر دیئے۔ آئینی لحاظ سے مسلم لیگ کے سرکاری امیدوار وہی تھے جنہیں پارلیمانی بورڈ نے نامزد کیا تھا لیکن عملی لحاظ سے سرکاری ”امیدوار وہ لوگ بن گئے جن کی پشت پر صوبے کی سرکار کی پوری امداد تھی۔ پارلیمانی بورڈ کی اپیل پر دوسرے صوبوں سے کچھ مسلم لیگی لیڈر آئینی امیدواروں کے حق میں

کرنے کے لیے صوبہ سرحد میں گئے۔ خان عبدالقیوم نے انہیں کہدیا کہ آپ لوگ چپ چاپ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں ورنہ میں آپ کو امن عامہ میں خلل اندازی کے جرم میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دوں گا۔

مسٹر سہروردی نے احتجاج "عوامی مسلم لیگ" کے امیدواروں کے حق میں پروپیگنڈہ کرنے کے لیے صوبہ سرحد کا رخ کیا تو صوبائی حکومت نے انہیں اپنے صوبے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ مسلم لیگ کے اندر گروہی سیاست کے اس سکینڈل کا اصلی علاج خواجہ ناظم الدین کو بھی نظر آیا کہ اس کی جانب آپ نے کوئی توجہ نہ دی۔ پھر جب عبدالقیوم خان نے سرکاری طاقت کی لاٹھی سے انتخاب کی بھینس کو اپنی طرف ہانک لیا تو خواجہ صاحب نے منتخب شدہ امیدواروں کو مسلم لیگ پارٹی تسلیم کر لیا۔ اسمبلی کی چار نشستیں کسی نہ کسی طرح بچا کر عوامی مسلم لیگ نے جیت لیں باقی سب پر خان عبدالقیوم خان کی پسند کے امیدواروں کا قبضہ ہو گیا۔ مرکزی مسلم لیگ کے سیکرٹری یوسف خٹک جو خود انتخابات میں امیدوار تھے۔ اور ان کے ساتھ خان ابراہیم آف جھگڑا (جو مرکزی مسلم لیگ کے ممبر تھے) ووٹنگ سے پہلے ہی احتجاجاً اپنے انتخابات سے دستبردار ہو گئے تھے وہ دھاندلیوں کے خلاف شور مچاتے رہے۔ لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ کیا صوبہ سرحد کے اس جھگڑے سے خواجہ ناظم الدین کی مکمل چشم پوشی خان عبدالقیوم خان کے ساتھ کسی ذہنی سمجھوتے کا نتیجہ تھی۔ جو آئندہ پاکستان کی بین الصوبائی سیاست پر اثر انداز ہونے والا تھا۔ کئی لوگوں نے یہی سمجھا۔

سن ۵۲-۱۹۵۱ء کا موسم سرما اپنے ساتھ کئی اور مسائل لے آیا۔ خواجہ ناظم الدین کے اپنے صوبے میں نمک کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ سمندری پانی سے نمک بنانے پر قانونی پابندیاں عائد تھیں۔ اس کام کی اجارہ داری لائسنس رکھنے والے پرائیویٹ اداروں کو حاصل تھی۔ انہوں نے سرکاری عملے کے ساتھ ملی بھگت کر کے اپنے منافع کی خاطر نمک کی مصنوعی قلت پیدا کر دی۔ اس بے جا نفع خوری کے لیے اسباب شاید لیاقت علی خان کی زندگی ہی میں جمع ہونے لگ گئے تھے۔ لیکن ان کا پورا اثر خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں ظاہر ہوا اور پھر اس کا علاج کرنے میں ٹال مٹول اور تاخیر سے کام لیا گیا۔

اس سلسلے میں یہ شکایت بھی سننے میں آئی کہ مشرقی پاکستان میں نورالامین وزارت کے بعض ارکان نفع خوروں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ اور مرکزی حکومت کوئی ایسا قدم اٹھانے سے احتراز کرتی تھی۔ جسے نورالامین اپنے لیے مشکلات پیدا کرنے والے سمجھتے ہوں۔ یہ شکایات درست تھیں یا غلط ملک کی مصنوعی قلت مشرقی پاکستان کی آبادی کے لیے بیحد تکلیف دہ تھی۔ اور کئی مہینے جاری رہی۔ اسی زمانے میں مغربی پاکستان سے (خاص طور سندھ اور بہاولپور سے) بھارت کی جانب گندم کی سمگلنگ وسیع پیمانے پر شروع ہو گئی۔ بھارت میں گندم کی سخت قلت اور گرانی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے سمگلر مصروف کار ہو گئے۔ مغربی پاکستان میں گندم کی قلت کے آثار پیدا ہونے لگے۔ نو پنجاب کے زمینداروں اور سندھ کے وڈیروں نے گندم کے ذخیرے روک لیے اور واقعی قلت پیدا کر دی۔ پنجاب کو اس سے پہلے کبھی گندم کی قلت کا سامنا کرنا نہ پڑا تھا۔ فروری ۱۹۵۲ء میں لاہور میں خوراک کی مہنگائی کیخلاف مظاہرہ کرنے کے لیے "آٹا ڈے" منایا گیا اور ایک "آٹا جلوس" نکلا۔

اسی زمانے میں مشرقی پاکستان میں ایک اور ایجی ٹیشن یکایک زور پکڑ گیا۔ اس کی بنیاد یہ مطالبہ تھا کہ پاکستان میں بین الصوبائی سرکاری زبان کا درجہ صرف اُردو کو نہیں بلکہ بنگلہ اور اردو دونوں کو مساوی طور پر دیا جانا چاہئے۔ اس مطالبے کا خطاب دستور ساز اسمبلی اور مرکزی حکومت سے تھا۔ لیکن اس ایجی ٹیشن نے ایسی صورت اختیار کی کہ امن اور قانون کی حفاظت کا مسئلہ مشرقی پاکستان کی وزارت کے لیے پیدا ہو گیا۔

زبان کے سوال پر ایجی ٹیشن کرانے والوں نے نوجوان طلبہ کو اپنی تحریک کا ہراول بنا لیا۔ طلباء کو مشتعل کرانے کے لیے یہ آسان دلیل موجود تھی کہ اگر مرکزی حکومت کی سرکاری زبان اردو قرار پا گئی تو مشرقی پاکستان کے طلبہ مقابلے کے امتحانوں میں گھاٹے میں رہیں گے۔ ۱۹۵۲ء کے موسم سرما میں زبان کے سوال پر کئی مرتبہ مظاہرے ہوئے۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ میں طلباء کا ایک جلوس پولیس کے ساتھ متصادم ہو گیا۔ مظاہرین نے وہی حرکتیں کیں جو شرارت پسند عناصر کے اکسانے پر ہر جگہ زندہ دلانہ وہ

کیا گیا تھا ہے۔ پولیس کو مظاہرین پر گولی چلانی پڑی۔ کچھ گرفتاریاں ہوئیں۔ اگلے دن گرفتار ہونے والوں کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لئے جلوس نکالا گیا۔ یہ جلوس پھر بے قابو ہو گیا اور ۲۲ فروری کو پھر گولی چلی۔ ۲۳ فروری کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں عام ہڑتال ہو گئی۔ ۲۴ فروری کو یونیورسٹی کے حکام نے یونیورسٹی کو غیر متعین عرصہ کے لئے بند کر دیا۔ ڈھاکہ میں معمولی فسادات پھر بھی ہوتے رہے۔ جب گرفتار شدگان کو عدالت میں لایا جاتا تھا تو ہجوم اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اور جلوس کی صورت اختیار کر کے پولیس کے ساتھ متصادم ہو جاتے تھے۔ صوبائی حکومت کی جانب سے جو بیان جاری کئے گئے۔ ان میں بار بار یہ کہا گیا کہ زبان کے سوال پر جو مطالبے کئے جا رہے ہیں۔ حکومت کا مقصد انہیں دبانا ہرگز نہیں ہے۔ لیکن بعض وطن دشمن عناصر اس مطالبے کی آڑ میں بدامنی اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ طلباء کو ان سے خبردار رہنا چاہیئے۔ لیکن ایجی ٹیشن اتنا طول پکڑ چکا تھا کہ مسٹر نور الامین کی وزارت کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ مشرقی پاکستان اسمبلی کی ایک قرارداد کی صورت میں مرکزی دستور ساز اسمبلی سے یہ سفارش کریں کہ اردو کے ساتھ بنگلہ زبان کو بھی پاکستان کے آئین میں سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ آئین کے بنیادی اصول طے کرنے والی کمیٹی کی ایک عبوری رپورٹ اس سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔ اس میں صرف اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے ان واقعات کے بعد جب اس کمیٹی کی مکمل رپورٹ چھپی تو اس میں قومی زبان کا ذکر حذف کر دیا گیا۔

سندھ میں گندم کی قلت نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ وہاں گورنر شیخ دین محمد نے دسمبر ۱۹۵۱ء میں وزیر اعلیٰ کھوڑو اور ان کے وزیر مال قاضی فضل اللہ کے خلاف پروڈا کے تحت مقدمہ قائم کر کے انہیں عہدے سے برطرف کر دیا تھا۔ (کھوڑو کے خلاف اس قسم کی کارروائی کا یہ دوسرا موقعہ تھا) اور پھر یہ دیکھ کر کہ کھوڑو کی مرضی کے بغیر اسمبلی کی اکثریت کسی متبادل وزارت کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھی اسمبلی کو بھی منسوخ کر کے نئے انتخابات کا حکم دے دیا تھا۔ اس کے بعد جب گورنر نے ذخیرہ

ماندوزی اور سمگلنگ کیخلاف انسدادی اقدامات شروع کیے اور ان کا ہاتھ سندھ کے ان وڈیروں تک پہنچا جو ان سماج دشمن حرکات کے ذمہ دار تھے تو وڈیروں نے مسلم لیگ کے نام پر گورنر کے خلاف شور مچانا شروع کر دیا۔ گورنر مسلم لیگیوں کا مخالف ہے۔ انہیں بدنام کر رہا ہے اور مسلم لیگ کا وقار ختم کر رہا ہے۔ مسلم لیگ انتخابات میں شکست کھا جائے گی۔ اس مسلم لیگ دشمن گورنر کو عہدے سے ہٹاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ مسٹر کھوڑو جو صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس غوغا آرائی میں ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین شش و پنج میں پڑ گئے۔ اپنی سیاسی جماعت کا مطالبہ مانیں یا گورنر کا ساتھ دیں۔ انہوں نے خاموشی اختیار کیے رکھی اور گورنر کے خلاف شور مچتا رہا۔ پھر نومبر ۱۹۵۲ء میں گورنر دین محمد کی خواجہ صاحب سے زبانی گفتگو ہوئی تو گورنر نے محسوس کیا کہ ان کے اقدامات کو وزیر اعظم کی پوری تائید و حمایت حاصل نہیں ہے۔ شیخ دین محمد نے خواہ مخواہ چھٹی کے لیے درخواست دے دی اور یہ لکھ کر کہ میں چھٹی کی میعاد پوری ہونے کے بعد واپس نہ آؤں گا۔ گورنری چھوڑ کر چلے گئے۔

ملک کے اندر قلت خوراک کی صورت کے پیش نظر باہر سے گندم درآمد کرنے کی تدابیر کرنی پڑیں۔ اس موقعہ پر امریکہ نے پاکستان کو امریکی گندم کی درآمد کے لیے ڈیڑھ کروڑ ڈالر کا قرض دینے کی پیش کش کر دی جو خواجہ کو بہت ہی غنیمت معلوم ہوئی۔ یہ پہلی بڑی امداد تھی جو پاکستان کو امریکہ سے ملی۔ اس قرضے کے معاہدے پر ستمبر ۱۹۵۲ء میں دستخط ہوئے۔ لیکن پاکستان کو کئی اور اقتصادی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ کوریا کی جنگ کی وجہ سے بیرونی منڈیوں میں پاکستان کی خاص اجناس کی مانگ میں تیزی کا جو دور آیا تھا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔ مانگ اور قیمتیں گر رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے ۱۹۵۲ء کی کپاس کی فصل کو بیرونی منڈیوں میں کھپانا مشکل ہو گیا۔ خواجہ صاحب کی وزارت کا زمانہ فی الحقیقت نئے اور مشکل مسائل کا زمانہ ثابت ہوا جن میں کئی مسائل خارجی حالات کی پیداوار تھے۔ لیکن خواجہ صاحب مسائل کے مقابلے میں قوت فیصلہ اور مضبوط رائے سے زیادہ صرف پریشانی کا ثبوت دیتے تھے۔ آپ بلاشبہ ایک نیک اور

شریف الطبع انسان تھے۔ لیکن مسائل کا سامنا تذبذب اور عدم مزاحمت کے طریقوں سے کرتے تھے اور دوسروں کے کئے ہوئے فیصلوں کو بہ آسانی مان لیتے تھے۔ ان کی نرم طبیعت نے گورنر جنرل ملک غلام محمد کے ذاتی عزائم کی حوصلہ افزائی کی۔ ملک صاحب طبعاً اپنے عہدے کی آئینی حیثیت پر قناعت کرنے والے انسان نہ تھے۔ انھوں نے حکومت کے اصل اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش نے جلد ہی یہ صورت اختیار کر لی کہ وزیر اعظم کی کابینہ میں گورنر جنرل کی ایک اندرونی کابینہ بن گئی۔ جس کے سینئر افسروں سے ساتھ براہ راست روابط تھے۔ خود گورنر جنرل غلام محمد سابق سرکاری افسر تھے۔ ان کی سرکردگی میں ان کے ہم خیال موجودہ یا سابق سرکاری افسروں کی ٹیم نے آہستہ آہستہ حکومت کا طریق کار بدل دیا۔ اور پالیسی کے فیصلوں کا عملی اختیار بہت حد تک پارلیمانی کابینہ کے بجائے اس کے ہاتھ میں آگیا۔

لیاقت علی خاں کو آئین سازی کے مشکل مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انھوں نے آئین کے بنیادی اصول طے کرنے کے لیے جو کمیٹی مارچ ۱۹۴۹ء میں بنوائی تھی۔ اس کی ایک غیر مکمل عبوری رپورٹ ان کی زندگی میں شائع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی رپورٹ خواجہ ناظم الدین کے زمانے میں مکمل ہوئی۔ اور آخری صورت میں دسمبر ۱۹۵۲ء میں پبلک کے سامنے آئی۔ اس رپورٹ کا ایک بنیادی نکتہ ایسا تھا جس پر مختلف صوبوں کے درمیان ہم آہنگی اور اتفاق رائے کی فضا پیدا کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ یہ کام بھی خواجہ ناظم الدین کی مشکل ذمہ داریوں میں شامل ہو گیا۔ یہ نکتہ پاکستان کے مجوزہ فیڈرل نظام میں مختلف صوبائی یونٹوں کے تناسب نمائندگی سے تعلق رکھتا تھا۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی تجویز یہ تھی (اس نکتے کے متعلق کئی اختلافی نوٹ بھی تھے) کہ مغربی پاکستان میں نو یونٹ قائم کئے جائیں۔ (۱) پنجاب (۲) سندھ۔ (۳) صوبہ سرحد (۴) صوبہ سرحد کا قبائلی علاقہ ریاستوں سمیت۔ (۵) بہاولپور۔ (۶) بلوچستان۔ (۷) بلوچستان کی ریاستیں (۸) خیرپور۔ (۹) کراچی) اور مجوزہ فیڈریشن کا دوسرا یونٹ مشرقی پاکستان کا صوبہ ہو۔ لیکن مشرقی پاکستان کے صوبے کا تناسب نمائندگی آبادی کے لحاظ سے نہ ہو

بلکہ اس میں کچھ تخفیف کر کے اسے مغربی پاکستان کے یونٹوں کی مجموعی نمائندگی کے برابر رکھا جائے۔ کمیٹی نے فیڈرل پارلیمنٹ کے لیئے دو ایوان تجویز کئے۔ اور دونوں میں صوبوں کے لیئے متناسب نمائندگی کی بنیاد اسی فارمولے پر رکھی۔ اس تجویز کا (دوسرے نقائص کے علاوہ) عملی مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان ہر چھوٹے سے چھوٹے یونٹ کو ساتھ ملا کر قطعی اکثریت حاصل کر سکتا تھا۔ اور اس کے مقابلے میں تمام یونٹ اکٹھے ہو جائیں۔ تب بھی انہیں پارلیمانی اکثریت حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ یعنی فیڈریشن کی کوئی ایسی وزارت بن ہی نہ سکتی تھی۔ جس میں مشرقی پاکستان جزو اعظم کی حیثیت سے شامل نہ ہو۔ لہٰذا یہ مقصد کہ مختلف صوبے ایک دوسرے کے محتاج ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور رہیں۔ اور کسی یونٹ کو باقی تمام پر حکم چلانے کا موقع نہ مل سکے۔ فی الحقیقت پورا نہ ہوتا تھا۔

پنجاب کی رائے عامہ اس فارمولے کو قبول نہ کرتی تھی۔ اس صوبے کے نمائندوں کو منانے کے لیئے خواجہ ناظم الدین نے جنوری ۱۹۵۳ء میں لاہور کے دو تین چکر کاٹے لیکن وہ پنجاب کے لیڈروں کو اس فارمولے پر متفق نہ کر سکے۔ اس بات چیت کے سلسلے میں انہیں پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ کے خلاف یہ شکایت بھی پیدا ہوئی۔ کہ وہ اپنے صوبے کو اس فارمولے کی مخالفت پر اکسا رہے تھے۔ اور خواجہ صاحب کے مقصد میں مدد دینے کے بجائے اس میں رکاوٹ ڈال رہے تھے۔

پنجاب کے مسلم لیگی لیڈروں کے ایک غیر رسمی اجتماع نے ایک متبادل تجویز پیش کی۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ مغربی پاکستان میں دو صوبائی یونٹ قائم کرنے کی صورت میں متناسب نمائندگی کا بندوبست اس طرح کیا جائے۔

(۱) ایوان زیریں میں عوام کی نمائندگی کے اصول پر ہر صوبائی یونٹ کی نمائندگی آبادی کے تناسب کے مطابق ہو۔ اور پورا ایوان تین سو ممبروں پر مشتمل ہو۔

(۲) ایوان بالا میں یونٹوں کی نمائندگی کے اصول پر ہر چھوٹے بڑے یونٹ کو یکساں نمائندگی دی جائے اور پورا ایوان ایک سو ممبروں پر مشتمل ہو۔

(۴) اہم امور کے متعلق فیصلوں کا اختیار دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو دیا جاتے

اس تجویز کے مطابق ایوان بالا میں مشرقی پاکستان کو ایک واحد یونٹ کی حیثیت سے صرف دس نشستیں ملتی تھیں اور دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاسوں میں مشرقی پاکستان کے نمائندوں کا تناسب ۴۴ فیصد بنتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے نمائندے اس صورت کو قبول نہ کرتے تھے۔ لہٰذا اس سوال پر ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے کمیٹی کی رپورٹ کو دستور ساز اسمبلی میں زیر بحث لانے کا کام تین مہینے کے لیے ملتوی کر دیا اور فرمایا کہ اس دوران میں وہ مختلف صوبوں کے درمیان اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس کوشش کی کامیابی کی کیا امید ہو سکتی تھی؟ اور اگر اتفاق نہ ہو سکے تو بالآخر کمیٹی کی رپورٹ کو دستور ساز اسمبلی میں زیر بحث لانا ناگزیر تھا۔ اور اگر دستور ساز اسمبلی میں مشرقی پاکستان کے نمائندوں نے کمیٹی کے مجوزہ فارمولے پر اصرار کیا (جو غیر اغلب نہ تھا) اور صوبہ سرحد کے نمائندوں کو ساتھ ملا کر اس تجویز کے حق میں محاذ قائم کرنے کی کوشش کی تو کیا ہو گا؟ خواجہ صاحب کا اپنا نقطۂ نگاہ صوبائی نہ تھا۔ لیکن کیا وہ مشرقی پاکستان کے نمائندوں کے اصرار کی مزاحمت کر سکتے تھے؟ اس کے علاوہ مناسب نمائندگی کی متبادل صورتوں سے قطع نظر کیا مغربی پاکستان کو دو یونٹوں میں تقسیم کرنے کی تجویز بجائے خود قابل اعتراض نہ تھی۔ اور اگر دو یونٹ نہ ہوں تو کتنے ہوں؟ یہ سب بحث طلب سوال تھے۔ جن کے متعلق گورنر جنرل اور ان کی اندرونی کابینہ کے بعض ارکان ذہنی منصوبے بنا رہے تھے۔ وزیر اعظم کو عملاً ایک بے اختیار عہدیدار بنانے کا عمل پہلے سے جاری تھا۔ حالات اور خود وزیر اعظم اس عمل میں مدد دے رہے تھے۔ اب اس عمل میں ایک نیا اور اہم مقصد شامل ہو گیا۔ اگر گورنر جنرل آئین سازی کے مسئلے میں مؤثر مداخلت کرنا چاہیں اور اس کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی کوشش کرنا چاہیں تو اس کے لیے سیاسی قوت اور رسوخ زیادہ مؤثر طریق پر ہاتھ میں لینے کی ضرورت تھی۔ اس طرح آئین سازی کا مسئلہ اور بعض اقتدار کی خاطر محلاتی سازشیں باہم خلط ملط ہو گئیں اور دیر تک خلط ملط ہوتی رہیں۔

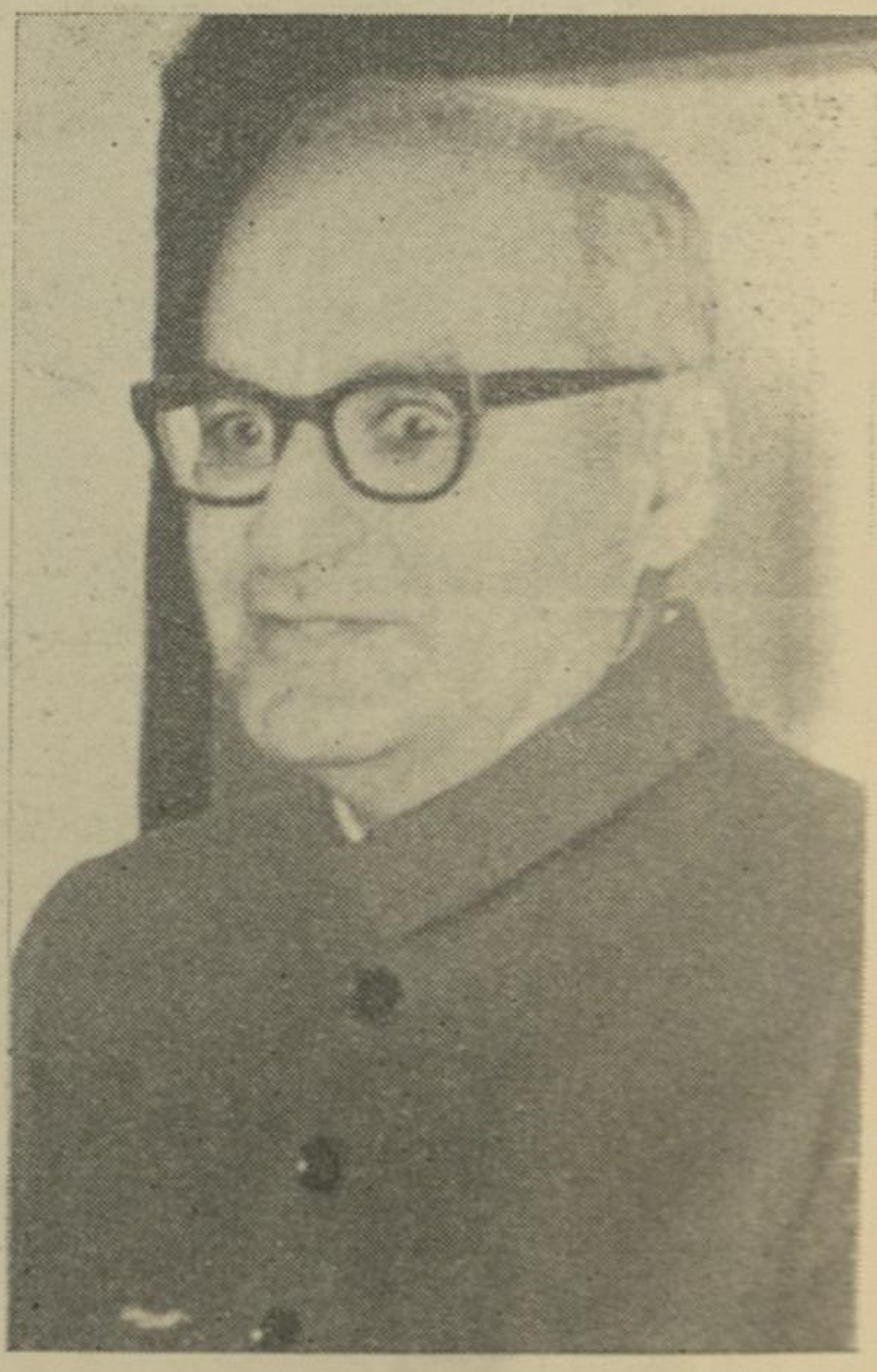
سنہ ۱۹۵۳ء کے شروع میں بعض اور واقعات پیش آئے جو خواجہ ناظم الدین کے خلاف گورنر جنرل اور ان کی اندرونی کابینہ کے ہاتھ مضبوط کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ ایک واقعہ کراچی میں طلباء کی ایجی ٹیشن کی صورت میں ہوا۔ ۸ جنوری سنہ ۱۹۵۳ء کو طلباء نے اپنی بعض شکایات کی بنا پر یوم مطالبات منانے کا پروگرام بنایا۔ اور ایک جلوس کی صورت میں وزیر تعلیم فضل الرحمٰن کے مکان کا رخ کیا۔ جب مظاہرین وزیر تعلیم کے مکان کے سامنے جمع تھے۔ اور نعرے لگا رہے تھے تو پولیس نے انہیں منتشر کرنے کی کوشش کی۔ مظاہرین نے پولیس پر خشت باری کی۔ پولیس نے اشک آور گیس استعمال کی۔ اور لاٹھی چارج کیا۔ اس دن مجمع منتشر ہو گیا۔ لیکن اگلے دن پھر ایک جلوس نکالا گیا جس میں شہر کے غنڈہ عناصر بھی شامل ہو گئے۔ اس جلوس نے زیادہ متشددانہ حرکات کیں۔ پولیس نے گولی چلا دی۔ سات آدمی ہلاک ہو گئے۔ اور بیسیوں زخمی ہوئے۔ اسی زمانے میں منسوخ شدہ سندھ اسمبلی کے نئے انتخاب کا (جس کا حکم گورنر جنرل دے چکے تھے) وقت قریب آ گیا تھا۔ اس موقع پر مسٹر کھوڑو نے خواجہ ناظم الدین کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے انتخاب کے لیے مسلم لیگ کے امیدوار نامزد کیے۔ کھوڑو صاحب خود پروڈا کے تحت نااہل تھے اور امیدوار نہ بن سکتے تھے۔ لیکن صوبائی مسلم لیگ کے صدر وہی تھے۔ آپ نے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے امیدواروں کی فہرست کو ردی کی ٹوکری میں پھینکا۔ اور اگلے دن صوبائی لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنے امیدوار نامزد کر دیئے۔ ایک سال پہلے خان عبدالقیوم خاں نے صوبہ سرحد میں یہی کیا تھا تو خواجہ صاحب نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن کھوڑو کی اس حرکت کا آپ نے سخت نوٹس لیا۔ اور نہ صرف اس حرکت کو خلاف آئین قرار دیا۔ بلکہ یہ رولنگ بھی دے دی کہ کھوڑو صوبائی لیگ کے صدر ہی نہیں رہے۔ خواجہ صاحب کی دلیل یہ تھی کہ کھوڑو اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے بلحاظ عہدہ صوبائی لیگ کونسل کے ممبر بنے تھے۔ جب اسمبلی منسوخ ہو گئی تو کھوڑو صاحب اسمبلی پارٹی کے ممبر نہ رہے۔ لہٰذا وہ لیگ کونسل کے ممبر بھی نہ رہے اور لیگ کونسل کے ممبر نہ رہے تو صدر بھی نہ رہے۔ اسی



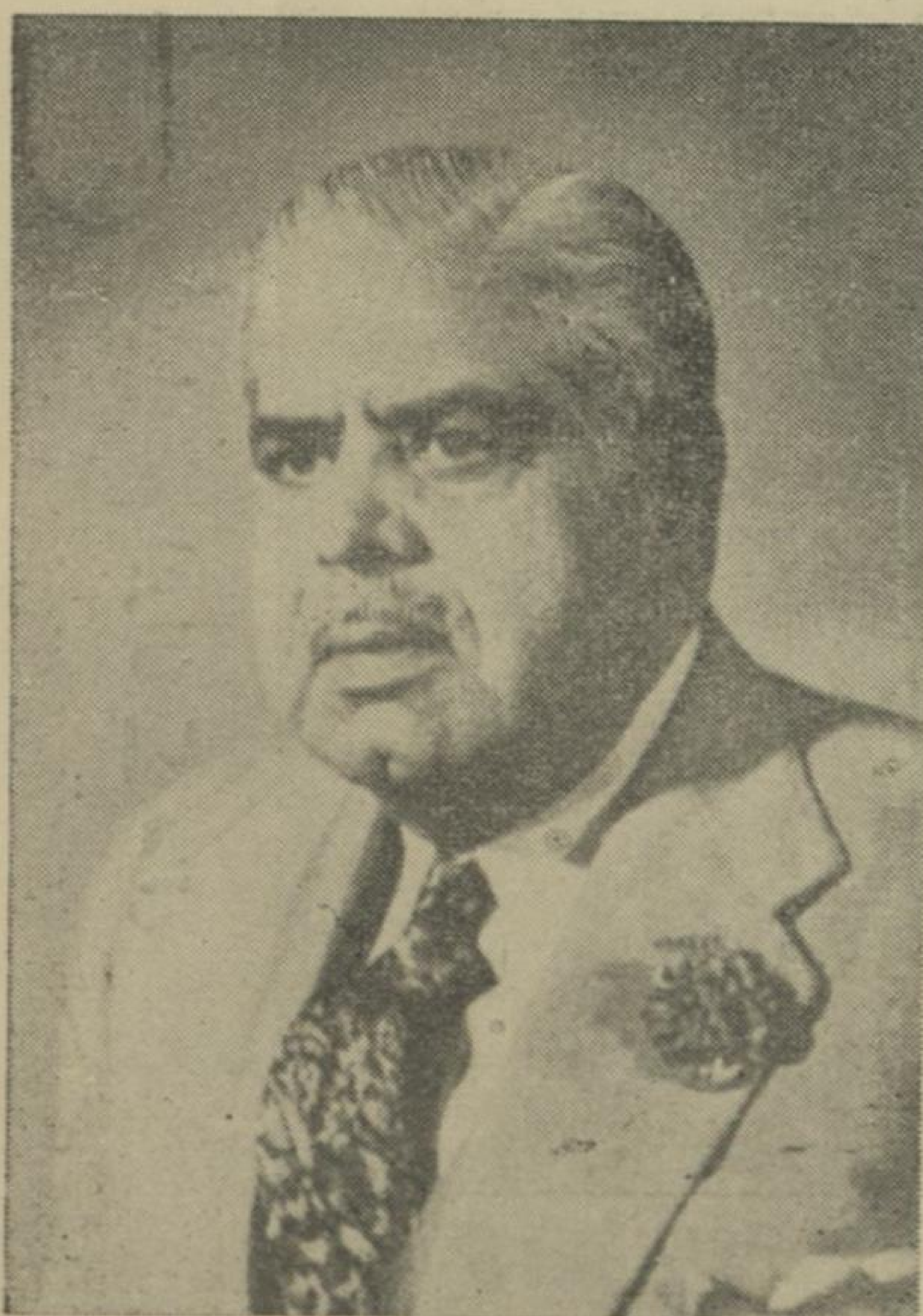
ملک غلام محمد



مسٹر محمد علی بوگرہ



چودھری محمد علی



نواب مشتاق احمد گرمانی



راجہ غضنفر علی خان طہران میں ڈاکٹر مصدق وزیر اعظم ایران کے ساتھ

بدانتظامی کی بنا پر آپ نے حکم دیا کہ وہ لیگ کا ریکارڈ اور فنڈ (امیدواروں سے وصول شدہ فیس کی رقموں سمیت) غیاث الدین پٹھان کے حوالے کر دیں۔ ورنہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ پٹھان نے پولیس کی مدد سے لیگ کے دفتر پر تو قبضہ کر لیا لیکن کھوڑو نے لیگ کا فنڈ انہیں دینے سے انکار کر دیا۔ اور اس سے پیشتر کہ خواجہ صاحب کوئی قانونی کارروائی کریں۔ خود پہل کر کے سندھ چیف کورٹ میں خواجہ صاحب کے خلاف حکم امتناعی کے لیے درخواست دے دی جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان مسلم لیگ کونسل کے جس اجلاس نے خواجہ صاحب کو صدر منتخب کیا تھا، وہ غیر آئینی تھا۔ لہٰذا خواجہ صاحب کے انتخاب کو ناجائز اور کالعدم قرار دیا جائے اور انہیں سندھ مسلم لیگ کے کاموں میں دخل دینے سے روکنے کے لیے دوامی حکم امتناعی جاری کر دیا جائے اس قانونی ہاتھا پائی نے خواجہ صاحب کے وقار کو بہرحال مجروح کیا۔

پھر تحریک تحفظ ختم نبوت کے واقعات نے گورنر جنرل کے لیے یہ موقعہ پیدا کر دیا کہ اختیارات اور سیاسی طاقت کے مرکز کو بتدریج اپنی طرف سرکانے کا عمل ایک ہی قدم میں مکمل کر لیں۔ فروری ۱۹۵۳ء میں اس تحریک نے وسیع پیمانے پر قانون شکنی کی صورت اختیار کر لی۔ لاہور میں ۸ مارچ کو مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔ قانون شکنی شروع ہونے کے بعد خواجہ ناظم الدین افسروں کے فیصلوں اور تجاویز پر صاد کرتے رہے۔ لیکن اس مرحلے سے پہلے خواجہ صاحب یہ کوشش کرتے رہے تھے کہ علماء کے ساتھ ان کا تصادم نہ ہو۔ اس سے بچنے کے لیے وہ مفاہمت کی بات چیت کرتے رہے۔ اور مصالحانہ رویہ سے کام لیتے رہے۔ اس بنا پر خواجہ صاحب کے خلاف چند بااختیار افسروں نے ذہنی بغاوت کر دی۔ اب گورنر جنرل کے لیے فیصلہ کن قدم اٹھانے کا وقت آگیا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک مہینے کے قریب انتظار کیا اور خواجہ ناظم الدین کو اس بات کی مہلت دی۔ کہ وہ چند سیاسی فیصلے اپنی قلم سے کر جائیں۔ فیصلے یہ تھے۔

(۱) دولتانہ سے کہا گیا کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے عہدے سے مستعفی ہو جائیں۔ اور صوبائی مسلم لیگ کی صدارت بھی خالی کر دیں۔ (۲) ان کی جگہ مشرقی پاکستان کے گورنر ملک

فیروز خاں نون کو پنجاب کا وزیراعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ (۳) ملک فیروز خاں کی جگہ مشرقی پاکستان کی گورنری پر چوہدری خلیق الزماں کو فائز کر دیا گیا۔ (۴) ان فیصلوں کی کامیابی کی ضمانت کے طور پر دولتانہ سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے سامنے خود تجویز پیش کر کے اپنے جانشین کو پارٹی لیڈر منتخب کرائیں۔ اور پھر طویل عرصہ کے لئے پاکستان سے باہر چلے جائیں۔ دولتانہ کو لاہور میں مارشل لا کا ڈنڈا نظر آتا تھا۔ انہوں نے تمام احکام کی تعمیل کر دی۔ اور اپنے بال بچوں کو لے کر یورپ کی سیر کو چلے گئے۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا اور خواجہ ناظم الدین نے شاید یہ سمجھا کہ انہوں نے پنجاب کو اپنے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ اور گورنر جنرل اور ان کی اندرونی کابینہ نے یہ دیکھ لیا کہ پنجاب ان کے نقطۂ نگاہ سے بھی محفوظ ہو گیا ہے۔ تو ۱۶ اپریل کی شب کو ضروری تیاریوں کے بعد (جن میں خواجہ ناظم الدین اور بعض دوسرے وزیروں کے مکانوں کے ٹیلیفون کنکشن کاٹنا بھی شامل تھا) ۱۷ اپریل کی صبح کو گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین کو عہدے سے برطرف کرنے کے احکام صادر کر دیئے اور سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق وزیروں کی ایک نئی فہرست مرتب کر لی۔ (جس میں سردار عبدالرب نشتر، مسٹر فضل الرحمٰن اور پیرزادہ عبدالستار شامل نہ تھے) اور مسٹر محمد علی بوگرہ کو جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔ نیویارک سے بلوا کر (انہیں ہوائی اڈے سے آدھی رات کے وقت سیدھا گورنر جنرل ہاؤس لے جایا گیا) اس نئی وزارت کا وزیراعظم بنا دیا۔

خواجہ ناظم الدین نے وزارت عظمیٰ کے عہدے سے اپنی برطرفی کا اعلان ریڈیو پہ سنا تو انہیں اس کی صحت پر بہت مشکل سے یقین آیا۔ ان کا خیال تھا کہ گورنر جنرل کو اس بات کا آئینی اور قانونی اختیار حاصل ہی نہ تھا کہ وہ وزیراعظم کو اس کے عہدے سے برطرف کر دے۔ ان کے خیال کے مطابق آئینی صورت اس کے برعکس تھی یعنی گورنر جنرل کے عزل و نصب کا اختیار وزیراعظم کو حاصل تھا۔ خود انہوں نے ملکہ معظمہ سے سفارش کر کے ملک غلام محمد کو گورنر جنرل کا عہدہ بخشا تھا۔ اور اب وہی گورنر جنرل انہیں عہدے سے برطرف کر رہا تھا۔ لیکن آئین کی سپرٹ خواہ کچھ ہو۔ آئین کے الفاظ ملک غلام محمد

کے موقف کی تائید کرتے تھے۔ اور عملی صورت حال یہ تھی کہ حکومت کے کلیدی عہدوں کے افسران اعلیٰ گورنر جنرل کے ساتھ تھے۔ اور حکومت کی مشینری کے کل پرزے (کراچی کی پولیس سمیت) ان کے ہاتھوں میں تھے۔ خواجہ ناظم الدین کے لئے چپ چاپ ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن ہتھیار ڈالنے سے پہلے خواجہ صاحب نے آخری کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ملکہ الزبتھ جو ابھی تک پاکستان کی ملکہ تھیں۔ گورنر جنرل کے حکم پر خط تنسیخ کھینچ سکتی ہیں۔ گورنر جنرل کے آئینی اختیارات بالآخر ملکہ ہی کے نمائندے کی حیثیت سے تھے۔ خواجہ صاحب ملکہ سے انصاف طلبی کی خاطر برطانوی ہائی کمشنر متعین پاکستان کے پاس پہنچے۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ ملکہ کو خواجہ صاحب کے حق میں دخل اندازی پر آمادہ کریں۔ یہ واقعہ بعد میں برطانوی سفارتخانے کے ایک ذمہ دار افسر نے راجہ غضنفر علی کو سنایا۔

برطانوی ہائی کمشنر خواجہ صاحب کے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آئے اور ان کی معروضات کو غور اور ہمدردی کے ساتھ سننے کے بعد بولے کہ ملکہ الزبتھ برطانیہ کی ملکہ بھی ہیں۔ اور پاکستان کی ملکہ بھی ہیں۔ لیکن ان کی ان دونوں حیثیتوں میں امتیاز ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اپنا معاملہ بحیثیت ملکہ پاکستان کے سامنے لے جائیں۔ لیکن میں صرف ملکہ برطانیہ کا نمائندہ ہوں۔ اور اسی حیثیت سے آپ کے ملک میں متعین ہوں۔ ملکہ پاکستان کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں آپ کے اور ملکہ پاکستان کے درمیان گفت و شنید کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہوں؟

اس نپے تلے جواب سے لاجواب اور مایوس ہو کر خواجہ صاحب واپس آ گئے۔ اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ لیکن پاکستان مسلم لیگ کے صدر ابھی تک وہی تھے۔ لہٰذا سیاسی جنگ کا ایک ہتھیار ابھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ہتھیار بھی زیادہ کارگر ثابت نہ ہوا۔ خواجہ صاحب نے وزارت عظمیٰ سے برطرفی کے بعد مسلم لیگ کی صدارت پر قابض رہنے کی کوشش کی تو ان کا ساتھ نہ مشرقی پاکستان کے نور الامین نے دیا۔ نہ پنجاب کے ملک فیروز خاں نون نے۔ خواجہ صاحب نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اعلان کیا۔ تو ان دونوں نے

اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس پر بھی خواجہ صاحب نے ہمت نہ ہاری تو انہیں صدارت سے خارج کرنے کے لیئے قرارداد مذمت کے کئی نوٹس آ گئے۔ انہوں نے ہوا کا رخ پہچان کر خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ اور سیاست کے میدان سے کنارہ کش ہو گئے۔

پاکستان کی حکومت اب بھی آئینی لحاظ سے ایک وزیر اعظم کی سربراہی میں کام کرنے والی پارلیمانی کابینہ تھی۔ لیکن اب اس بات میں کسی کو شک و شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ عملی لحاظ سے کابینہ کے اصل سربراہ کی حیثیت خود گورنر جنرل نے اختیار کر لی تھی۔ نئے وزیروں کی فہرست انہی کی مرتب کی ہوئی تھی۔ اور حکومت کے اصل اختیارات انہی کے ہاتھ میں تھے۔ پارلیمانی کابینہ کی ظاہری شرائط اس طرح پوری ہو گئیں کہ وقت آنے پر دستور ساز اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے محمد علی بوگرہ کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ اس طرح وہ اسمبلی کی اکثریت کے اعتماد کے حامل قرار پائے اور جب پاکستان مسلم لیگ کے صدر کا عہدہ خالی ہوا تو لیگ کونسل نے انہیں نیا صدر منتخب کر لیا۔

گورنر جنرل غلام محمد کو یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خاں شاید برطرف ہونے والے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی جانبداری کریں۔ اور ان کے صوبے میں نئے انتظامات کی کسی نہ کسی شکل میں مخالفت کی جائے۔ اس خطرے کا ایک فوری علاج ملک غلام محمد نے شروع ہی میں کر لیا تھا۔ انہوں نے خان عبدالقیوم کا نام مرکزی وزیروں کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ عبدالقیوم خاں اس سے انکار نہ کر سکے اور اپنا صوبائی مورچہ چھوڑ کر حیل و حجت کے بغیر مرکزی کابینہ میں شامل ہو گئے۔

مرکزی حکومت میں یہ صورت اب بھی موجود رہی۔ کہ کابینہ کے بعض وزیروں کا گورنر جنرل کے ساتھ خاص قریبی تعلق قائم تھا۔ ان کے علاوہ بعض سرکاری افسر گورنر جنرل کے خاص مشیروں میں شامل تھے۔ یہ وزیر اور سرکاری افسر گورنر جنرل کی اندرونی کابینہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ صوبوں میں برسر اقتدار گروہوں کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے علاوہ گورنر جنرل غلام محمد نے (غالباً اپنی اندرونی کابینہ کے رکن جنرل سکندر مرزا کے مشورے پر) ایک خاص کوشش صوبہ سرحد میں سرخپوش لیڈروں کے ساتھ سمجھوتے کے لیئے بھی کی۔ انکی

یہ کوشش اس حد تک کامیاب ثابت ہوئی کہ ڈاکٹر خان صاحب گورنر جنرل غلام محمد کی حکومت کے ساتھ مکمل تعاون پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن خان عبدالغفار خان اپنا سیاسی راستہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے۔ اس بات نے آگے چل کر یہ صورت اختیار کی کہ ایک بھائی برسر حکومت تھا۔ اور دوسرا بھائی حکومت کا سب سے بڑا سیاسی مخالف تھا۔

ملک غلام محمد سیاسی تائید و حمایت کے لحاظ سے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے۔ لیکن اگر انہیں یہ توقع تھی کہ وہ نئے حالات میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر دستور یہ سے نیا آئین اپنے منشا کے مطابق بنوا سکیں گے۔ تو یہ امید پوری نہ ہوئی۔ ملک غلام محمد نے اپنی اندرونی کابینہ کے مشورے سے یہ نقطۂ نگاہ اختیار کر لیا تھا کہ جہاں تک مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان توازن اقتدار کے بنیادی مسئلے کا تعلق تھا۔ اس کا صحیح حل اس صورت کے سوا نہ ہو سکتا تھا کہ مغربی پاکستان کے مختلف یونٹوں کو کسی نہ کسی شکل میں اکٹھا کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں نظر آتی تھیں (۱) مکمل ادغام کے ذریعے تمام یونٹوں کو صرف ایک یونٹ کی شکل دے دی جائے یا (۲) مختلف یونٹوں کو ایک ذیلی فیڈریشن کی صورت میں جمع کر دیا جائے اور اس ذیلی فیڈریشن اور مشرقی پاکستان کے صوبے کو ایک سطح پر رکھا جائے۔ مکمل ادغام پر صوبائی یونٹوں کو متفق کرنے کے راستے میں مشکلات نظر آتی تھیں گو مسئلے کا صحیح اور مثالی حل یہی تھا۔ لہٰذا ملک غلام محمد ذیلی فیڈریشن کی تجویز کے حق میں زور لگاتے رہے۔ لیکن دستور ساز اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی میں ایک مضبوط عنصر جس کی عملی قیادت مشرقی پاکستان کے مسٹر فضل الرحمٰن کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ کامیابی کے ساتھ اس کوشش کی مزاحمت کرتا رہا۔ خواجہ ناظم الدین بھی مسٹر فضل الرحمٰن کے ساتھ ہو گئے۔ ایک طرف فضل الرحمٰن ناظم الدین گروپ اور دوسری طرف گورنر جنرل کے درمیان آئین کے اس مسئلے پر بھی اختلاف تھا۔ اس کے ساتھ ہی فضل الرحمٰن گروپ جنگ اقتدار میں گورنر جنرل سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی تدبیر بھی سوچتا رہا اور آئین سازی کے مسائل اور طاقتی سازشیں پھر خلط ملط ہو گئیں۔

۵۵۔ مشرقی پاکستان میں انتخاب اور خونیں واقعات

مشرقی پاکستان میں صوبائی اسمبلی کا نیا انتخاب باقی تمام صوبوں کے بعد یعنی مارچ ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ اور خونیں واقعات کا ایک سلسلہ اپنے ساتھ لے آیا جن کی وجہ سے نئی اسمبلی اور وزارت قائم ہوتے ہی معطل ہو گئیں اور یہ صوبہ آئندہ ایک سال کے قریب گورنری راج کے ماتحت رہا۔ انتخاب کے وقت برسر اقتدار مسلم لیگ پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لئے وہاں کئی پارٹیاں موجود تھیں جن میں عوامی رسوخ کے لحاظ سے دو پارٹیاں عوامی لیگ، اور کرشک سرامک پارٹی سب سے اہم تھیں۔ عوامی لیگ کے صوبائی صدر مولانا عبد الحمید بھاشانی تھے۔ اور مرکزی لیڈر مسٹر سہروردی تھے۔ کرشک پارٹی صرف صوبائی پارٹی تھی جس کے لیڈر مولوی فضل الحق تھے انتخاب سے پہلے مشرقی پاکستان کے ان تین بڑوں (سہروردی۔ بھاشانی اور مولوی فضل الحق) نے متحدہ محاذ قائم کر کے مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس محاذ میں دو تین اور چھوٹے گروہ بھی شامل ہو گئے۔ امیدواروں کو ٹکٹوں کی تقسیم متحدہ محاذ نے کی۔ متحدہ محاذ کا انتخابی منشور اکیس نکات پر مشتمل تھا۔ جن میں ایک نمایاں شق صوبائی خودمختاری کے متعلق تھی۔ انتخاب میں متحدہ محاذ کے کارکنوں نے سب سے زیادہ زور صوبائی خودمختاری اور مسلم لیگی وزارت کی مخالفت کے نعروں پر دیا۔ انتخابی ہتھیار کے طور پر یہ دونوں نعرے بہت موثر ثابت ہوئے۔ کیونکہ فی الواقع مشرقی پاکستان کے عوام نورالامین وزارت سے سخت برگشتہ تھے۔ ایسے موقعوں پر کمیونسٹ کارکن ہمیشہ بھیس بدل کر اس کیمپ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جس کی کامیابی ان کے مقاصد کو ایک قدم آگے بڑھانے میں مدد دے سکے۔ مشرقی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے اڈے دیر سے معروف کار تھے۔ ان کی تنظیم تقسیم ملک کے بعد بھی کلکتہ کے ہیڈ کوارٹرز سے ہدایات حاصل کر لی تھی۔ اس موقعہ پر یہ تنظیم متحدہ محاذ کی انتخابی ایجنٹ بن گئی۔

مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں سے عوامی لیگ اور مسلم لیگ کے کارکن اپنی اپنی پارٹی کی انتخابی مہم میں مدد دینے کے لئے مشرقی پاکستان میں پہنچے۔ محترمہ فاطمہ جناح کو بھی اس موقعہ پر مسلم لیگ کی شکست ملکی مفاد کے لئے خطرناک نظر آئی۔ وہ بھی مسلم لیگ کی اخلاقی امداد کے لئے مشرقی پاکستان تشریف لے گئیں۔ لیکن اس انتخاب میں مسلم لیگ پارٹی کو ایسی عبرتناک شکست ہوئی کہ کچھ عرصے کے لئے مشرقی پاکستان کی صوبائی سیاست سے مسلم لیگ کا نام تقریباً خارج ہو گیا۔ صوبائی اسمبلی کی کل تین سو نشستوں میں دو سو اڑتیس مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں ان میں مسلم لیگ بمشکل دس نشستیں حاصل کر سکی۔ اور متحدہ محاذ نے ۲۱۲ مسلم حلقوں اور ۱۷ غیر مسلم حلقوں میں کامیابی حاصل کی۔ صوبے کے مسلم لیگی وزیر اعلیٰ مسٹر نور الامین ایک نوجوان طالب علم کے مقابلے میں ہار گئے۔

لیکن ابھی انتخاب کے پورے نتائج مکمل بھی نہ ہوئے تھے کہ یکے بعد دیگرے تین صنعتی اداروں میں فساد ہو گئے۔ پہلے آدم جی جوٹ مل میں اور اس کے بعد کھلنا کے ایک دیا سلائی بنانے کے کارخانے میں اور پھر تیسرا فساد ۲۲ مارچ کو کرنافلی کے کاغذ کے کارخانے میں۔ یہ فساد ایسا سخت تھا کہ اس میں ۱۳ انسان ہلاک ہو گئے اور چالیس کے قریب زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں کارخانے کے آپریٹنگ منیجر خورشید علی بھی شامل تھے جو اس وقت پاکستان میں کاغذ سازی کے فن کی اعلیٰ تربیت رکھنے والے واحد مسلمان تھے۔

انتخاب کے بعد وزارت کی تشکیل میں بہت عرصہ لگا۔ مولوی فضل الحق نے متحدہ محاذ کا لیڈر منتخب ہونے کے بعد ۳ اپریل کو اپنے تین ساتھیوں سمیت وزارت کا حلف اٹھایا۔ لیکن انہوں نے باقی وزیروں کا انتخاب چالیس دن کے بعد ۱۲ مئی کو کیا۔ لیکن ادھر ان وزیروں نے حلف اٹھائے اور ادھر آدم جی جوٹ مل میں پھر فساد ہو گیا اور اس شدت فساد ہوا کہ اس میں نو سو آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس فساد میں آتشیں اسلحہ کا بے محابا استعمال کیا گیا۔

ان فسادات کے دو نمایاں پہلو ہر شخص کو نظر آتے تھے۔ ایک یہ کہ فساد کی آگ بھڑکانے والوں نے خاص طور پر صنعتی کارخانوں کو اپنی تخریبی کارروائی کے لئے منتخب کیا تھا۔ اور ان کارخانوں کے مزدوروں کو آپس میں لڑوایا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ فسادات مقامی لوگوں اور مہاجرین

کے درمیان جنگ کی صورت میں رونما ہوئے۔ یعنی جو عنصر ان فسادات کی آگ بھڑکانے کا ذمہ دار تھا۔ اس نے سوچ سمجھ کر پاکستان کی نازک ترین رگوں پر خطرناک حملہ کیا تھا۔

اس آخری فساد سے چند دن پہلے مولوی فضل الحق صاحب کلکتہ تشریف لے گئے تھے جہاں آپ اپنے استقبال پر خوش ہو کر، اور مغربی بنگال کے ہندوؤں کے ساتھ بھائی چارے کے جوش میں ایک قابل اعتراض تقریر کر گئے تھے۔ اس تقریر پر پاکستانی اخباروں میں لے دے ہو رہی تھی۔ پھر فسادات کے فوراً بعد نئی وزارت کے ایک جوشیلے رکن مسٹر مجیب الرحمٰن کے متعلق سرکاری افسروں کو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ وہ فسادات کے اصل محرکات اور اصل مجرموں کی پردہ پوشی کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان واقعات کو سامنے رکھ کر گورنر جنرل غلام محمد کو طبعی طور پر مشرقی پاکستان کے نئے حالات سے نپٹنے کی تدبیر یہی نظر آئی کہ نئی اسمبلی اور نئی وزارت کو معطل کر کے آئین کی دفعہ ۹۲۔ الف کے تحت مشرقی پاکستان میں گورنری راج قائم کر دیں۔ انہوں نے ۳۰ مئی کو یہ قدم اٹھایا اور ساتھ ہی چوہدری خلیق الزماں کو گورنری کے عہدے سے ہٹا کر ان کی جگہ محکمہ دفاع کے سیکرٹری سکندر مرزا کو گورنر مقرر کر دیا۔ گویا متحدہ محاذ کے لیڈر مولوی فضل الحق صاحب کی وزارت عظمیٰ دو ماہ کے اندر ختم ہو گئی۔

فسادات کی وجوہ کیا تھیں؟ ان کے محرک کون سے عناصر تھے؟ ان سوالوں پر ٹھنڈے دل سے صورت حال کا تجزیہ کرنے اور تخریب پسند عنصر کو اپنی سیاست سے الگ کرنے کی تدبیر سوچنے کے بجائے متحدہ محاذ کے بعض لیڈروں نے دوسروں کو اور خود اپنے آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ اور فوراً یہ نعرہ بلند کر دیا کہ ان فسادات کا مقصد متحدہ محاذ کو بدنام کرنا اور اس کے وقار کو نقصان پہنچانا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے ان لوگوں نے سازش کی جو متحدہ محاذ کے دشمن تھے۔ لیکن وہ کون تھے؟ کیا مسلم لیگ کے لیڈر تھے؟ اس سلسلے میں سب سے دلچسپ اور لچر توجیہ مسٹر مجیب الرحمٰن نے پیش کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ یہ فساد خود کارخانوں کے منتظمین نے اس نیت سے کرائے ہیں کہ مزدوروں کو آپس میں لڑا کر مزدوروں کی یونین کا زور توڑ دیں۔ جس سے وہ خائف ہو رہے تھے۔ گویا کارخانہ دار خود ہی مزدوروں کی انجمنوں کا زور کم کرنے کے لئے اپنے کارخانوں اور کروڑوں روپیہ کی املاک کی تباہی کا خطرہ مول

لے رہے تھے۔

حکومت نے ان فسادات کی ذمہ داری براہ راست کمیونسٹ پارٹی پہ ڈالی۔ وزارت اور اسمبلی کے تعطل کے بعد سکندر مرزا نے صوبے کی گورنری کا چارج لیتے ہی صوبے کی کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا۔ اور اس جماعت کے کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ اس پارٹی کے بہت سے ہندو کارکن راتوں رات سرحد پار کر گئے۔ مولوی فضل الحق کو ان کے مکان میں نظر بند کر کے ان پہ پہرہ لگا دیا گیا۔ اور ایک ہفتے کے اندر سات سو کے قریب دوسرے افراد کو (جن میں بیشتر تعداد کمیونسٹ کارکنوں کی تھی) پبلک سیفٹی قوانین کے تحت جیلوں میں محبوس کر دیا گیا۔ کچھ عرصے کے لئے اخباروں پہ سنسر بھی لگا دیا گیا جن کارخانوں میں فساد ہوئے تھے وہاں پولیس کا سخت پہرہ لگا رہا۔ اور کارخانوں کے احاطوں میں آمد و رفت کے لئے پرمٹوں کا سسٹم نافذ کر دیا گیا۔ اس اثنا میں مولوی فضل الحق صاحب نے ایک اعلان گورنر کے حوالے کر دیا تھا جو عملاً معافی نامے کے مترادف تھا۔ گورنر نے غالباً ان پہ مقدمہ چلانے کی دھمکی دی تھی۔ ان کے خلاف کلکتے کی تقریر اور اس کے بعد ایک اخباری انٹرویو کا الزام موجود تھا جس میں انہوں نے صوبائی "خود مختاری" کے بجائے "آزادی" کا لفظ استعمال کیا تھا گو اس کی انہوں نے علحدہ تردید کر دی تھی۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۴ء کو مولوی صاحب کے دستخطوں کے ساتھ جو اعلان جاری ہوا۔ اس میں کہا گیا تھا۔ کہ "ایک غیر محتاط لمحے میں میری زبان سے غالباً کسی فوری جذبے کے تحت ایسے الفاظ نکل گئے جو میرے لئے مناسب نہ تھے۔ میں پاکستان کا وفادار اور بہی خواہ ہوں۔ مجھے ان الفاظ پہ افسوس ہے۔ میں نے بڑھاپے کی وجہ سے سیاست سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" اس اعلان کے جواب میں گورنر نے یہ اعلان کر دیا کہ اب حکومت مولوی فضل الحق کے خلاف کوئی مقدمہ چلانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اپنے مکان میں نظر بندی کی جو پابندی ان پہ عائد تھی وہ بھی ختم کر دی گئی۔ بعد میں مولوی صاحب کی سیاست سے دست برداری عارضی ثابت ہوئی اور وہ سیاست میں پھر واپس آ گئے۔

۵۶۔ پنڈت نہرو سراپا مصالحت بن گئے

۲ جون ۱۹۵۳ء کو لندن میں ملکہ الزبتھ کی تاج پوشی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ اس سلسلے میں بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم پنڈت نہرو اور مسٹر محمد علی بوگرہ دونوں لندن میں موجود تھے۔ وہاں دونوں کے درمیان غیر رسمی گفتگو کے مواقع پیدا ہوئے اور پنڈت نہرو نے محمد علی کو یہ تاثر دیا کہ وہ کشمیر کے عوام کو حق خود ارادیت کے استعمال کا موقع دینے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ محمد علی صاحب بہت خوش ہوئے۔ کراچی واپس آتے ہی انہوں نے دو کام کئے ایک پنڈت نہرو کو گفتگو کے لئے کراچی آنے کی رسمی دعوت بھیج دی اور دوسرے گورنر جنرل غلام محمد کو یہ مشورہ دیا کہ اس موقع پر راجہ غضنفر علی خاں کو بھارت میں پاکستان کی سفارت کے اہم فرائض سپرد کرنا مفید رہے گا۔ راجہ صاحب کو اکتوبر ۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین اور چوہدری ظفر اللہ خاں نے ایران سے (وہ اس وقت ایران اور عراق دونوں کے لئے پاکستان کے سفیر تھے) ترکی تبدیل کر دیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ راجہ صاحب کا مشورہ اپنی حکومت کو متحدہ مشرق وسطی کی دفاعی تنظیم میں شرکت کے سوال پر کچھ اور تھا اور خواجہ صاحب اور چوہدری صاحب کی پالیسی کچھ اور تھی۔ ترکی میں پاکستانی سفارت خانے کا کام مقابلتاً غیر اہم سمجھا جاتا تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے مسٹر محمد علی کا مشورہ مان لیا اور جولائی ۱۹۵۳ء کے وسط میں حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت کی منظوری حاصل کر کے راجہ صاحب کو نئی دہلی میں اپنا سفیر مقرر کر دیا۔ دس دن کے بعد ۲۵ جولائی کو پنڈت نہرو حکومت پاکستان کی دعوت پر کراچی تشریف لے آئے۔

پنڈت جی دو دن کراچی ٹھہرے۔ گفتگو میں ان کا انداز بہت ہی حوصلہ افزا اور اطمینان بخش تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے بہت تپاک کے ساتھ گلے مل کر انہیں کراچی سے رخصت کیا۔ گفتگو جاری رکھنے کے لئے مسٹر محمد علی کا نئی دہلی جانا طے ہو گیا۔ گو قطعی تاریخ ابھی مقرر نہ کی گئی۔ نئی

دہلی واپس پہنچ کر پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک بیان میں کہا کہ پاکستان نے جس گرم جوشی کے ساتھ میرا استقبال اور میری میزبانی کی۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ آپ نے پاکستان کے متعلق بہت پر تپاک الفاظ میں خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ کشمیر کے مسئلے کے اطمینان بخش تصفیہ کے لئے فضا بہت سازگار اور خوشگوار ہوتی جا رہی ہے۔

پنڈت جی نے پاکستان کے لئے یہ دل خوش کن بیان ۲۷ جولائی کو دیا تھا۔ اس کے بعد بمشکل دس بارہ دن گزرے تھے کہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو دنیا نے یہ خبر سنی کہ شیخ محمد عبداللہ کو کشمیر کے وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ہے اور ان کی جگہ بخشی غلام محمد نے وزارت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ اس خبر سے وادی کشمیر میں ہیجان پیدا ہوا اور پاکستان میں بھی لاہور، راولپنڈی، پشاور اور کئی اور شہروں میں ہڑتال ہو گئی۔ اگلے دن یعنی ۱۰ اگست کو مسٹر محمد علی نے پنڈت جی کو تار دیا کہ سرینگر کے واقعات کے پیش نظر ہماری گفتگو کا فوری انتظام ہونا چاہیئے۔ پنڈت جی کو کیا انکار تھا "کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست"۔ پنڈت جی نے شاعری تو نہ کی۔ لیکن جو کچھ انہوں نے جواب میں لکھا اس کا مفہوم یہی تھا۔ ۱۶ اگست کی تاریخ مسٹر محمد علی کے استقبال کے لئے مقرر ہو گئی۔

اس موقع پر پنڈت جی نے اپنی سیاسی شعبدہ بازی کا عجب کمال دکھایا۔ وادیٔ کشمیر میں مظاہرے ہو رہے تھے۔ اور بھارتی فوج بے تحاشا فائرنگ کے ذریعے مظاہروں کو کچل رہی تھی اور پنڈت جی لوک سبھا میں نیم حیرانی کے ساتھ بیان دے رہے تھے۔ کہ یہ مقامی لیڈروں کا کوئی آپس کا جھگڑا ہے۔ جس میں ہم دخل دینا نہیں چاہتے۔ سوائے اس کے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے سول حکام کو فوج کی امداد دی جا رہی ہے۔ پنڈت جی کے الفاظ یہ تھے۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے پرانے ساتھی محمد عبداللہ کا ہمارے بعض اور ساتھیوں کے ساتھ تصادم ہو گیا ہے۔ یہ تصادم مقامی اہمیت اور نوعیت کا ہے۔ جس سے ہماری پالیسی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہم ریاست میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے بخشی غلام محمد کو بھی اسی طرح پوری امداد دیں گے۔ جس طرح شیخ محمد عبداللہ کو دیتے رہے ہیں"۔ گویا کشمیر میں جو کچھ ہوا اس میں پنڈت جی کا کوئی ہاتھ ہی نہ تھا۔

۱۵ اگست کو پنڈت جی نے دہلی کے عوام سے اپیل کی کہ مسٹر محمد علی کی آمد پر ان کا شایانِ شان خیر مقدم کریں۔ ۱۶ اگست کو مسٹر محمد علی اپنی بیگم اور اپنے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان کے ہمراہ نئی دہلی پہنچ گئے۔ وادی کشمیر میں قتل عام جاری تھا۔ اور پنڈت نہرو مسٹر محمد علی کے سامنے سراپا مصالحت بن کر ان سے کہہ رہے تھے کہ اب کشمیر پر ناظم استصواب کے عہدہ سنبھالنے کی تاریخ مقرر کر لینی چاہیئے۔ شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے بعد تقریباً ڈیڑھ مہینے تک وادی کشمیر میں مظاہرے اور مظاہرین پر گولیوں کی بارش ہوتی رہی۔ ایک غیر جانبدار امریکی اخبار نویس کے اندازے کے مطابق ان مظاہروں میں پندرہ سو انسان بھارتی فوج کی گولیوں سے ہلاک ہوئے۔ کشمیر میں یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ لیکن پنڈت نہرو نے ۲۰ اگست کو مسٹر محمد علی کے ساتھ ایک مشترکہ سرکاری اعلان پر دستخط کر دیئے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ "دونوں وزرائے اعظم نے اس فیصلے پر اتفاق کیا ہے کہ ناظم استصواب زیادہ سے زیادہ آئندہ اپریل تک اپنا عہدہ سنبھال لے گا" اس اعلان سے بیرونی دنیا کو بھی یک گونہ اطمینان ہوا کہ تنازعہ کشمیر کے حل کی جانب ٹھوس قدم اٹھایا گیا ہے۔ اور مسٹر محمد علی بھی بہت ہی خوش ہو کر کراچی واپس آئے۔ آپ نے دہلی ہی سے یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا کہ کشمیر کے مسئلے کا حل اب سامنے نظر آ رہا ہے۔ کراچی پہنچ کر آپ نے اسی قسم کے حوصلہ افزا بیان دیئے۔ لیکن ادھر وادی کشمیر میں وہ خاموشی ہوئی جسے "قبرستان کی خاموشی" کہا جاتا ہے۔ ادھر پنڈت جی کا رویہ تبدیل ہونے لگا۔ اور مسئلہ کشمیر کے جلد حل کی امیدیں معدوم ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ دسمبر ۱۹۵۳ء تک پنڈت جی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اور پاکستان کے ساتھ مزید گفتگو کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

۵۷- دستوریہ اور گورنر جنرل - حملہ اور جوابی حملہ

نئے آئین کے متعلق جس شے پر خواجہ ناظم الدین کے زمانے میں ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا تھا اسے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے ہاتھ میں لیا۔ یہ مسئلہ پاکستان کے مجوزہ فیڈرل نظام میں صوبائی یونٹوں کے تناسب نمائندگی سے تعلق رکھتا تھا۔ مسٹر محمد علی نے صوبائی وزرائے اعلیٰ کے ساتھ تفصیلی باتیں کیں اور بالآخر ایک ایسا فارمولا تلاش کر لیا جس پر اکتوبر ۱۹۵۳ء میں دستور ساز اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے اتفاق رائے سے صاد کر دیا۔ فارمولا مختصراً یہ تھا کہ (۱) فیڈرل پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں نشستوں کی کل تعداد ۳۰۰ رکھی جائے جن میں مشرقی پاکستان کو ۱۶۵ اور مغربی پاکستان کے تمام یونٹوں کو مجموعی طور پر ۱۳۵ نشستیں دی جائیں (۲) ایوان بالا کی کل نشستیں پچاس ہوں۔ جن میں مشرقی پاکستان کو صرف دس اور مغربی پاکستان کے تمام یونٹوں کو مجموعی طور پر چالیس نشستیں دی جائیں (۳) بعض اہم امور کے متعلق فیصلوں کا اختیار دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو حاصل ہو (۴) لیکن سب سے اہم شرط یہ تھی کہ مشترکہ اجلاس کے فیصلوں کے لئے یہ شرط رکھی جائے کہ انہیں مشرقی پاکستان کے موجود اور ووٹ دینے والے ممبروں کی کم از کم ایک تہائی کی تائید حاصل ہو اور اسی طرح مغربی پاکستان کے ممبروں کی بھی کم از کم ایک تہائی کی تائید حاصل ہو۔ اس فارمولے پر عمل کے وقت مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ لیکن بڑی بات یہ تھی کہ اس پر اتفاق رائے ہو گیا۔

ایک اور اختلافی مسئلہ "قومی زبان" کا تھا۔ پاکستان کے آئین میں قومی زبان کا درجہ صرف ایک زبان کو دیا جائے یا دو زبانوں کو؟ بالآخر مفاہمت دو زبانوں (اردو اور بنگلہ) کے اصول پر ہوئی۔ ان دونوں نکات پر مفاہمت کے بعد جب بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر دستور ساز اسمبلی میں بحث شروع ہوئی (ہر نکتے پر اسمبلی میں بحث سے پہلے مسلم لیگ پارٹی کے اجلاس میں بحث اور فیصلہ ہو جاتا تھا) تو مسٹر بوگرہ کا فارمولا

منظور کر لیا گیا۔ اس فارمولے کے علاوہ یہ تجویز بار بار پیش ہوتی رہی کہ مغربی پاکستان کے مختلف یونٹوں کی تعداد چار مقرر کر کے انہیں ایک ذیلی فیڈریشن کی شکل میں اکٹھا کر دیا جائے۔ مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخاب کے بعد (جس میں صوبائی خود مختاری کے مطالبے کو بھاری عوامی تائید حاصل ہوئی تھی) اس قسم کی کوئی نہ کوئی تجویز زیادہ ضروری ہو گئی تھی۔ کیونکہ مغربی پاکستان کے چھوٹے چھوٹے صوبائی یونٹ الگ الگ ان ذمہ داریوں کے متحمل نہ ہو سکتے تھے جو صوبائی خود مختاری کے دائرے کو وسیع کرنے سے ان پر عائد ہوتی تھیں۔ لیکن مشرقی پاکستان کے بعض ممبر اس بنیادی نکتے کو یکسر نظر انداز کر کے مغربی پاکستان میں ایک یونٹ یا ذیلی فیڈریشن کی ہر تجویز کی مخالفت کرتے تھے۔ انہیں مغربی پاکستان کے اتحاد یا نیم اتحاد کی تجویز مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کے مقابلے میں اکٹھا اور مضبوط کرنے کی کوشش نظر آتی تھی۔ لہٰذا مسٹر فضل الرحمٰن کے زیر قیادت مشرقی پاکستان کے اکثر ممبر اس تجویز کی مزاحمت کرتے رہے اور سندھ کے پیرزادہ عبدالستار (جو خواجہ ناظم الدین کے ساتھ مرکزی وزارت سے برطرف ہونے کے بعد سندھ کے صوبائی وزیر اعلیٰ بن گئے تھے) اور بعض دوسرے ارکان ان کا ساتھ دیتے رہے اور یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔

ستمبر ۱۹۵۴ء کے وسط تک دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث مکمل ہو گئی۔ اور وزیر اعظم مسٹر محمد علی بوگرہ نے یہ خوش آئند اعلان کر دیا کہ اب اسمبلی کے فیصلوں کی روشنی میں نئے آئین کا مسودہ بہت جلد تیار کیا جائے گا اور یہ امید ظاہر کی کہ نیا آئین ۲۵ دسمبر تک اسمبلی کی منظوری کے تمام مرحلے طے کرے گا۔ لیکن جب یہ اعلان کیا جا رہا تھا تو دستور ساز اسمبلی میں مسٹر فضل الرحمٰن گورنر جنرل غلام محمد کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کر چکے تھے۔ ان کے منصوبے کا ساتھ دینے کے لئے ایوان کے ممبروں کی اتنی تعداد اپنے اپنے مختلف نقطۂ نگاہ سے جمع ہو گئی تھی۔ کہ ستمبر ۱۹۵۴ء کے وسط تک وہ ایک سوچی سمجھی پلان کے مطابق بہت تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے کے قابل ہو گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے گورنر جنرل کے ہاتھ سے "پروڈا" کا ڈنڈا چھینا۔ یہ قانون موجودہ آئین میں ترمیم کے ذریعہ شامل کیا گیا تھا۔ اس وقت اس آئینی مفروضے پر عمل ہوتا تھا (گو بعد میں فیڈرل کورٹ نے

اس مفروضے کو غلط قرار دے دیا کہ جب مرکزی اسمبلی دستور ساز ادارے کی حیثیت سے کام کرتی تھی تو اس کے فیصلوں کو گورنر جنرل کی توثیق کی حاجت نہ تھی۔ لیکن جب وہ پارلیمنٹ یا محض قانون ساز ادارے کی حیثیت سے کام کرتی تھی تو اس کا پاس کیا ہوا بل اس وقت تک قانون کی شکل اختیار نہ کر سکتا تھا جب تک گورنر جنرل اس کی توثیق نہ کرے۔ یہ فرق بہت اہم تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جہاں تک موجودہ آئین میں ترمیم یا آئندہ آئین مرتب کرنے کا سوال تھا۔ دستور ساز اسمبلی گورنر جنرل کے تعاون سے بے نیاز ایک خود مختار ادارہ تھی۔ اس کی دونوں حیثیتوں میں ایک اور اہم فرق بھی تھا۔ جب یہ اسمبلی پارلیمنٹ کی حیثیت سے کام کرتی تھی تو عام دستور کے مطابق قانون سازی میں سرکاری بل اور غیر سرکاری بل کا امتیاز کیا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ دستوریہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی تو اس کے ممبروں میں بھی سرکاری اور غیر سرکاری کا امتیاز نہ ہوتا تھا اور اس کے بلوں میں بھی یہ امتیاز نہ تھا۔

پیرودا ۱۹۴۹ء میں آئین کا حصہ بنا تھا۔ پھر دو سال بعد یعنی ۱۹۵۱ء میں کراچی کے مسٹر ہاشم گزدر نے دستوریہ میں ایک بل پیرودا کو منسوخ کرنے کی غرض سے پیش کر دیا تھا۔ لیکن دستوریہ کے ممبروں کی عام رائے اس منسوخی کے حق میں نہ تھی۔ لہٰذا گزدر صاحب نے اپنے بل کو محض انٹروڈیوس کرنے سے آگے کوئی قدم اٹھانے کی ہمت نہ کی۔ لیکن ان کا بل ایجنڈے پر موجود رہا۔ ۱۹۵۴ء میں گورنر جنرل کے اختیارات کو محدود کرنے کے لئے دستور ساز اسمبلی میں جو محاذ قائم ہوا۔ اس نے اسی بل سے فائدہ اٹھایا۔

۱۷ ستمبر ۱۹۵۴ء کو یہ بل مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں زیر بحث آیا۔ وہاں اس کی حمایت کرنے والوں میں ایک مرکزی وزیر بھی شامل تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کابینہ کے بعض ممبر بھی اس بلی بھگت میں شریک تھے۔ فی الحقیقت یہ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت کونسا وزیر گورنر جنرل کے ساتھ تھا اور کون مخالف محاذ کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ اگر گورنر جنرل کے اختیارات محدود کر دیئے جائیں تو یہ بات غالباً وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کے لئے بھی غیر خوش آئند نہ تھی۔

گزدر صاحب کے بل کا مفہوم یہ تھا کہ پیرودا کی منسوخی کو زمانہ گزشتہ پر بھی حاوی

کیا جائے۔ یعنی کھوڑو وغیرہ کے خلاف جو کارروائی ہو چکی تھی وہ بھی کالعدم قرار دی جائے۔ اور دولتانہ کے خلاف جو مقدمہ زیر سماعت تھا۔ وہ بھی ختم ہو جائے۔ پیرزادہ عبدالستار اور ملک فیروز خاں اس بات کے مخالف تھے۔ کافی بحث کے بعد اس بات پر سمجھوتہ ہو گیا کہ منسوخی کا اطلاق صرف زمانہ آئندہ پر ہوگا۔ اس شرط کے ساتھ اگلے دن یعنی ۲۰؍ستمبر کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے گزدر کے بل کی منظوری دیدی اور دو دن کے بعد یعنی ۲۱؍ستمبر کو دستور ساز اسمبلی نے یہ بل پاس کر دیا اور آئندہ کے لئے "پیروڈا" کا ڈنڈا گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں کے ہاتھ سے چھن گیا۔ کم از کم ممبروں نے یہی سمجھا۔

گورنر جنرل کے مخالف محاذ نے فوراً ہی ان کے اختیارات خصوصی پر ایک اور زبردست حملہ کیا۔ مسٹر ہاشم گزدر ہی کے نام سے ایک اور بل پیش کیا گیا۔ جس کا مقصد موجودہ آئین میں تین ترامیم شامل کرنا تھا۔

۱:۔ گورنر جنرل ہر صورت میں کابینہ کے مشورے کے مطابق عمل کرنے کا پابند ہوگا۔

۲:۔ آئندہ کوئی ایسا شخص وزیر اعظم یا وزیر مقرر نہ کیا جا سکے گا۔ جو پہلے ہی دستور ساز اسمبلی کا ممبر نہ ہو۔

۳:۔ کابینہ کی ذمہ داری مشترکہ ہوگی۔ یعنی کسی ایک وزیر کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پوری کابینہ کے خلاف عدم اعتماد کے مترادف ہوگا۔ اس بل نے اٹھارہ گھنٹوں کے اندر قانون سازی کے تمام مرحلے طے کر لئے اور بہت سے ممبروں کو یہ پتہ بھی نہ چلا کہ آئین میں کیا تبدیلی ہو گئی ہے۔ اور اس کی اہمیت کیا ہے۔

اس بل پر کارروائی جس برق رفتاری کے ساتھ کی گئی۔ وہ ذیل کے اوقات نامہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اوقات نامہ اگلے دن ایک اخبار میں شائع ہوا۔

۲۰؍ستمبر ۲ بجے سہ پہر مسٹر ہاشم گزدر نے اپنے ترمیمی بل کا نوٹس دستوریہ کے دفتر میں دیا۔

۲۰؍ستمبر ۵ بجے شام۔ دستوریہ کی رہبر سب کمیٹی کا جو دستوریہ کا ایجنڈا مرتب کرتی تھی، اجلاس ہوا۔ جس میں اگلے دن کے ایجنڈا کو تبدیل کر کے گزدر صاحب کے بل

کو اس میں سرفہرست رکھ دیا گیا۔

۲۰ ستمبر ۹ بجے شب۔ غیر معمولی گزٹ کی کاپیاں جس میں بل درج تھا۔ پریس سے چھپ کر آگئیں اور فوراً بذریعہ کاپیاں چپڑاسیوں کے ہاتھ ممبروں کے رہائشی پتوں پر بھیج دی گئیں۔ اور ان کے لیٹر بکسوں میں ڈال دی گئیں۔

۲۱ ستمبر۔ ۱۰ بجے صبح دستوریہ کا اجلاس شروع ہوا۔ کورم بمشکل پورا تھا۔ گورنر صاحب نے چند فقروں کے ساتھ اپنا بل پہلی خواندگی کے لئے پیش کیا۔ پہلی خواندگی پاس ہو گئی۔ تو اس کی تین یا چار دفعات برائے منظوری پیش ہوئیں اور اس کے بعد بل کی تیسری خواندگی کی تحریک پیش کی گئی۔ یہ تمام تحریکیں رائے شماری کے بغیر زبانی ووٹ سے پاس ہو گئیں۔

۱۰ بجکر [illegible] منٹ صبح کو پاس شدہ بل پر دستوریہ کے صدر مولوی تمیزالدین خاں کے دستخط ہو گئے۔ اور پاس شدہ بل گزٹ میں چھپنے کے لئے پریس کو بھیج دیا گیا۔ ابھی دستوریہ کے بہت سے ممبر اپنے گھروں میں تھے اور اجلاس میں شرکت کے لئے جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ انہوں نے نہ وہ گزٹ پڑھا تھا جو رات کے وقت ان کے لیٹر بکسوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ نہ انہیں یہ پتہ تھا کہ دستوریہ کے اندر کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن گورنر جنرل کو بے اختیار کرنے کی ترمیم آئین کا حصہ بن چکی تھی۔

دستوریہ کے صدر کی خاص اجازت کے بغیر کوئی بل کم از کم تین دن کے نوٹس کے بغیر زیر بحث نہ آسکتا تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ غیر معمولی عجلت کی یہ کارروائی صدر کے علم اور ان کی اجازت سے ہوئی۔ صدر غالباً یہ سمجھتے تھے کہ گورنر جنرل نے آئین کے الفاظ کا سہارا لے کر جمہوریت کی آڑ میں اپنی شخصی حکومت قائم کر لی ہے۔ لہٰذا صدر کے لئے دستور ساز اسمبلی کے وقار اور اختیارات کو بحال کرنے کے لئے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لینا اور ترمیمی بل کے لئے راستہ صاف کرنا جائز تھا۔ وہ اسمبلی کے حقوق کے محافظ تھے۔ اور اگر اسمبلی اور گورنر جنرل کے درمیان رسہ کشی ہو تو ان کی رائے میں ان کے لئے صحیح راستہ یہی تھا کہ وہ اسمبلی کے حقوق کی حفاظت اس حد تک کریں جس حد تک قواعد و ضوابط انہیں ایسا کرنے کا اختیار دیتے تھے۔ بہر حال ان کی اجازت اور منظوری کے بغیر گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی پر یہ

شب خون اتنی تیزی کے ساتھ مارنا ممکن نہ تھا۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ جب کراچی میں آئینی ترمیم کے اس منصوبے کو خاموشی اور تیزی کے ساتھ جامۂ عمل پہنایا جا رہا تھا تو گورنر جنرل غلام محمد پنجاب اور صوبہ سرحد کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ انہیں وہاں ٹیلی فون پہ اس ترمیم کی اطلاع اس وقت ملی جب یہ ترمیم مکمل ہو چکی تھی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ جس وزیر نے انہیں یہ اطلاع دی۔ اسے گورنر جنرل نے ٹھیٹھ پنجابی میں گالی دی اور پوچھا کہ جب اس شب خون کی تیاری ہو رہی تھی تو آپ کہاں سو رہے تھے۔

اسی دن وزیر اعظم محمد علی بوگرہ امریکہ کے دورے پر جانے والے تھے۔ وہ پروگرام کے مطابق رخصت ہو گئے۔ سیاسی حلقوں میں یہ سوال پوچھا جاتا رہا کہ انہوں نے اس ترمیم کی مزاحمت کیوں نہ کی؟ اس محلاتی سازش کا سب سے دلچسپ پہلو یہی تھا کہ بعض لوگوں کے پاؤں بیک وقت دونوں کیمپوں میں تھے۔ وہ توقع کرتے تھے کہ جو فریق اس جنگ میں کامیاب ہوگا وہ ان کی سرپرستی کرے گا۔

ہاشم گزدر صاحب نے پروڈا کو منسوخ کرانے اور پھر گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی سلب کرنے والی ترمیم پیش کرنے میں جو نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا صلہ انہیں فوراً ہی مل گیا۔ وہ دستور ساز اسمبلی کے نائب صدر تھے۔ ۲۱ ستمبر کو صبح نو بجے اسمبلی کا اجلاس دستوریہ کی حیثیت سے شروع ہوا تھا۔ آئین کے متعلق کارروائی کے بعد اس کا اجلاس پارلیمنٹ کی حیثیت سے جاری رہا۔ اور اس حیثیت سے اسمبلی نے سب سے پہلی کارروائی یہ کی کہ نائب صدر کے مراعات کے متعلق ایک ترمیمی بل پاس کر دیا۔ اس بل کی رو سے نائب صدر کو اس تنخواہ (پانچ سو روپیہ ماہوار) کے علاوہ جو پہلے سے اس عہدے کے لئے مقرر تھی۔ رہائشی الاؤنس دینا منظور کیا گیا۔ صرف آئندہ کے لئے نہیں۔ بلکہ اس دن سے جب گزدر صاحب کو یہ عہدہ ملا تھا۔ گویا گزدر صاحب اٹھارہ ماہ کے الاؤنس کا بقایا یکمشت وصول کرنے کے مستحق ہو گئے۔ یہ بل مشرقی پاکستان کے ایک وزیر (مسٹر غیاث الدین پٹھان) نے سرکاری بل کی حیثیت سے پیش کیا۔ پھر ایک اور ممبر نے اس میں دو ترامیم پیش کیں۔ جن کا مقصد نائب صدر کے زائد

مراجبات کی شرح میں اضافہ کرنا تھا۔ یہ ترامیم منظور کر لی گئیں۔

اس ڈرامے کے بعد تقریباً ایک ماہ تک سیاسی محاذ پر خاموشی رہی۔ سوائے اس کے کہ گورنر جنرل غلام محمد نے "پیروڈا" کے سوال پر اسمبلی کے فیصلے پر دہلا مار دیا۔ اسمبلی نے اسے صرف آئندہ کے لئے منسوخ کیا تھا۔ گورنر جنرل نے اپنے اختیارات سے کام لے کر ان لوگوں کو بھی دھولڑو، قاضی فضل اللہ، حمید الحق چودھری وغیرہ۔ معافی دے دی جنہیں زمانۂ گذشتہ میں پیروڈا کے تحت نااہلی کی سزا ملی تھی یا اب ان کے خلاف پیروڈا کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ گورنر جنرل نے اپنے اعلان میں کہا کہ اگر اسمبلی اس قانون کو غلط سمجھتی ہے یا یہ سمجھتی ہے کہ اس کا غلط استعمال ہو رہا ہے تو پھر سابقہ سزاؤں کو بحال رکھنا بھی غلط ہے۔ اس دوران میں ایک اور واقعہ بھی ہوا۔ کراچی کے ایک ممتاز صحافی (مسٹر زیڈ اے۔ سلیری) نے ہمت کی اور ہوائی جہاز کے ذریعے یورپ پہونچکر جہاں مسٹر سہروردی ایک ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ ان سے پاکستان کی سیاسی صورت حال اور مسائل کے متعلق ایک بیان لے لیا۔ اور کراچی واپس آکر اسے شائع کر دیا۔ اس بیان میں تین نکات اہم تھے (۱) موجودہ دستور ساز اسمبلی غیر نمائندہ ہو چکی ہے جمہوریت کا تقاضا ہے کہ اسے منسوخ کر کے نئی اسمبلی منتخب کرائی جائے (مشرقی پاکستان میں انتخابات کے بعد سہروردی نے یہ محکم موقف اختیار کر لیا تھا) (۲) نئے آئین میں صوبائی خودمختاری کے مطالبے کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے اور (۳) مغربی پاکستان کے آئینی اتحاد کی جس تجویز پر متعلقہ صوبائی یونٹ متفق ہوں۔ مشرقی پاکستان کو اس کی پوری حمایت کرنی چاہیئے (اس موقف پر بھی سہروردی شروع سے آخر تک صاف ذہن اور ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہے)

پھر ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل نے فیصلہ کن قدم اٹھایا اور اپنے اختیارات خصوصی کا نام لے کر دستور ساز اسمبلی کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان میں آپ نے منسوخ شدہ اسمبلی کو غیر نمائندہ۔ نااہل وغیرہ قرار دیتے ہوئے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ نئی اسمبلی کے انتخاب کا بندوبست کیا جائے گا۔ فی الحال اسمبلی کے بغیر حکومت کا کام چلانے کے لئے آپ نے ایک "اہل افراد" کی کابینہ نامزد کر دی۔ جس میں بعض پرانے وزیروں کے ساتھ نئے وزیر مقرر کر دیئے گئے۔ نئے وزیروں میں جنرل سکندر مرزا۔ ڈاکٹر خان صاحب اور اس زمانے کے کمانڈر ان چیف جنرل

(حال صدر پاکستان فیلڈ مارشل) محمد ایوب خاں بھی شامل تھے۔ دو تین مہینے کے بعد جب سہروردی پاکستان پہنچے تو انھوں نے بھی اس کابینہ میں شامل ہونا منظور کر لیا۔ ان کے بالمقابل سرائک پارٹی کے (اس وقت تک مشرقی پاکستان میں کرشک پارٹی اور عوامی لیگ کے درمیان شدید سیاسی رقابت شروع ہو چکی تھی) ابوحسین سرکار کو بھی وزارت میں لے لیا گیا۔ اس کابینہ میں مسٹر محمد علی بوگرہ کا عہدہ "وزیر اعظم" کے نام سے قائم رکھا گیا۔

دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین خاں نے گورنر جنرل کے حکم کی آئینی حیثیت کو تسلیم نہ کیا اور جرأت سے کام لے کر آئینی طریقوں سے اس کی مزاحمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسمبلی کا اجلاس ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو ختم ہو چکا تھا لیکن اسمبلی کی بعض کمیٹیوں کے اجلاس ہونے والے تھے۔ ۲۴ اکتوبر کے اعلان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مولوی تمیز الدین خاں نے ان کمیٹیوں کے اجلاس اسمبلی کی عمارت میں منعقد کرنے کی کوشش کی۔ نئے وزیر داخلہ جنرل سکندر مرزا نے اسمبلی کے واچ اینڈ وارڈ کے عملے کو حکم بھیج دیا کہ منسوخ شدہ اسمبلی کے کسی ممبر کو اسمبلی کی عمارت میں داخل نہ ہونے دیا جائے اور اس کے بعد عمارت کو مقفل کر دیا۔

مولوی تمیز الدین خاں نے صدر کی حیثیت سے سندھ چیف کورٹ کے سامنے یہ درخواست پیش کر دی کہ حکومت اور اس کے کارندوں کو اسمبلی کی کارروائی میں رکاوٹ ڈالنے سے روکا جائے۔ اس درخواست پر چیف کورٹ نے فریقین کے قانونی دلائل سنے۔ مولوی صاحب کے نقطہ نگاہ کی وکالت کرنے کے لئے انگلستان کا ایک مشہور وکیل مسٹر پرٹ آیا۔ مقدمہ کی طویل سماعت کے بعد چیف کورٹ نے فیصلہ مولوی صاحب کے حق میں دیا۔ حکومت نے اس کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل کی۔ اس عدالت نے بہت دانائی کے ساتھ فریقین کو اپنے مقاصد کے ایک مشترک نکتے پر راضی کر لیا۔ گورنر جنرل نے اسمبلی کو منسوخ کرتے وقت اعلان کیا تھا کہ نئی اسمبلی منتخب کرانے کے لئے قدم اٹھایا جائے گا۔ مولوی تمیز الدین کا مقصد بھی ایک نمائندہ اسمبلی کے احیاء سے پورا ہو جاتا تھا۔ عدالت نے نئی اسمبلی کے انتخاب کے ضابطوں کے متعلق فریقین کی رہنمائی کی، اور ان ضابطوں کے مطابق نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

یہ عدالتی کارروائی ہوتی رہی۔ اس دوران میں گورنر جنرل غلام محمد اور ان کی حکومت نے مغربی پاکستان کے صوبائی یونٹوں کے اتحاد کی جانب بہت تیزی کے ساتھ قدم اٹھایا۔ اب ڈھیلی فیڈریشن کے تکلف کو غیر ضروری سمجھا گیا اور مکمل ادغام کا مقصد سامنے رکھا گیا۔ مرکزی اور صوبائی لیڈروں کی ایک کانفرنس کراچی میں بلائی گئی اور اس کانفرنس کا فیصلہ حاصل کرنے کے بعد وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء کو ریڈیو پر اعلان کر دیا کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک واحد صوبے کی شکل میں اکٹھا کیا جائے گا۔ اس کے بعد یہ تجویز صوبوں کی اسمبلیوں کے سامنے پیش کی گئی۔

صوبہ سرحد کی اسمبلی میں ادغام کے حق میں تجویز صوبائی وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید نے ۲۵ نومبر کو پیش کی۔ اس صوبے میں حزب مخالف نے اسمبلی کے جلسوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا لہٰذا وہاں یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہو گئی۔ صوبہ سرحد کے بعد پنجاب کی اسمبلی نے ۳۰ نومبر کو یہ تجویز منظور کر لی۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ پیرزادہ عبدالستار اس تجویز کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ انہیں ۸ نومبر کو عہدے سے برطرف کر کے ان کی جگہ مسٹر کھوڑو کو نئی وزارت بنانے کا موقعہ دے دیا گیا تھا۔ پیرزادہ صاحب نے اپنی برطرفی کے بعد ایک بیان میں کہا کہ مجھے صرف اس لئے برخاست کیا گیا ہے کہ میں ایک یونٹ کی تجویز کا مخالف تھا اور اظہار مخالفت کے لئے صوبائی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اور کھوڑو صاحب نے وزارت حاصل کرنے کے لئے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ صوبائی اسمبلی سے اس تجویز کو پاس کرا دیں گے۔

اگر مسٹر کھوڑو نے یہ وعدہ کیا تھا تو انہوں نے اسے نمایاں کامیابی کے ساتھ پورا کر دیا۔ ان کی صوبائی اسمبلی میں یہ تجویز ۱۱ دسمبر کو پیش ہوئی اور اسمبلی نے چار کے مقابلے میں ایک سو ووٹوں کی اکثریت سے اسے منظور کر لیا۔ ۱۸ دسمبر کو کراچی میں ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مرکزی وزراء کے علاوہ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کے گورنروں، وزرائے اعلیٰ، والیان ریاست اور ان کے وزراء وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے بھی "ایک یونٹ" کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ ۱۹ دسمبر کو یہی فیصلہ پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے کیا۔ اسی دن گورنر جنرل نے ادغام کے منصوبے کی تفاصیل پر غور کرنے کے لئے ایک

کونسل مقرر کر دی۔ جس کے صدر پنجاب کے گورنر نواب مشتاق احمد گورمانی تھے۔ اس کونسل نے اپنی رپورٹ فروری ۱۹۵۵ء میں پیش کر دی۔ مارچ میں گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس کے ذریعے پاکستان کے آئین میں ترمیم کر کے صوبہ مغربی پاکستان قائم کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ اسی دن اس اختیار کی رو سے صوبۂ مغربی پاکستان کے قیام کے لئے ضروری انتظامات عمل میں لانے کی غرض سے ایک انتظامیہ کونسل مقرر کر دی۔ اس حکم کے تقریباً ایک ہفتے بعد یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ نئے صوبے کے گورنر مشتاق احمد گورمانی اور اس کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب ہوں گے۔ لیکن اس مرحلے پر فیڈرل کورٹ نے اس مقدمے کے نکات کے سلسلے میں جو زیر سماعت تھا یہ فیصلہ دے دیا کہ گورنر جنرل اپنے حکم سے پاکستان کے آئین میں اس قسم کی ترمیم کرنے کا مجاز نہ تھا۔ لہٰذا ایک یونٹ کی سکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب اور اس کی منظوری کا انتظار کرنا پڑا۔

۵۸۔ نئی دستور ساز اسمبلی اور محلاتی جوڑ توڑ

جب فیڈرل کورٹ کی ہدایت کے بموجب یہ طے ہو گیا کہ منسوخ شدہ دستور ساز اسمبلی کی جگہ نئی اسمبلی منتخب کی جائے تو مرکزی کابینہ کے ارکان اپنے آپ کو آنے والی اسمبلی کا ممبر منتخب کرانے کی فکر کرنے لگے۔ ان میں بعض افراد ایسے تھے جو آئندہ وزیر رہنا نہ چاہتے تھے (مثلاً جنرل محمد ایوب خاں) اور اپنے آپ کو منتخب کرانے کے لئے فکر مند نہ تھے۔ بعض افراد ایسے تھے (مثلاً سہروردی اور وزیر اعظم محمد علی بوگرہ) جو اپنے اثر و رسوخ سے نئی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو سکتے تھے لیکن کئی ایسے تھے جن کا صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً سکندر مرزا یا چودھری محمد علی۔ نئی دستور ساز اسمبلی کے لئے انتخابی ادارہ صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں پر مشتمل تھا۔ ہر صوبائی اسمبلی کو اپنے اپنے کوٹے کے مطابق دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔

مشرقی پاکستان اسمبلی کی مسلم نشستوں پر متحدہ محاذ کے دو دھڑے قابض تھے۔ کرشک سرامک پارٹی اور عوامی لیگ۔ ان دونوں دھڑوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مشرقی پاکستان کی طرف سے کسی ایسے امیدوار کی حمایت نہ کی جائے جو اس صوبے کا باشندہ نہ ہو۔ پنجاب اسمبلی میں بھی دو دھڑے تھے۔ ایک وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون کے ساتھ سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا دولتانہ کے ساتھ تھا۔ مرکزی حکومت نے یہ خواہش ظاہر کی کہ پنجاب اسمبلی کی جانب سے سات یا کم از کم چھ مرکزی وزیروں کو منتخب کرانے کا بندوبست کر دیا جائے۔ اس سوال پر مرکزی وزراء کی ایک ٹیم لاہور میں صوبائی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کرتی رہی۔ نون اپنا سارا زور اپنے دھڑے کے آدمیوں کو مرکزی اسمبلی میں بھیجنے کے لئے صرف کرنا چاہتے تھے۔ اور دولتانہ اپنے دھڑے کے لئے زور لگانا چاہتے تھے۔ ووٹنگ کا جو قاعدہ مقرر تھا اس کی رو سے ہر گروپ اپنی اپنی عددی طاقت کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن

اگر نون صاحب اپنے دھڑے کے ووٹ مرکزی وزیروں کی کیمپ کو منتخب کرانے کے لئے صرف کر دیں تو مرکزی اسمبلی میں ان کے دھڑے کو بہت ہی کم نمائندگی مل سکتی تھی۔ ان کے ساتھی مرکزی وزیروں کو ووٹ دینے سے گریزاں تھے۔ دولتانہ کے پاس یہ آسان جواب موجود تھا کہ میں مرکزی حکومت کا مقرب ہوں۔ وزارت سے الگ ہوں۔ مرکزی وزراء صاحبان مجھ سے کیا توقع کر سکتے ہیں۔ مرکزی وزیروں کو منتخب کرانے کی ذمہ داری ان لوگوں کو لینی چاہئیے۔ جنہیں مرکزی حکومت نے مسند اقتدار پر بٹھا رکھا ہے۔

فیروز خان نون اس حد تک تیار ہوئے کہ مرکزی وزراء کو منتخب کرانے کی ذمہ داری دونوں دھڑوں کے درمیان تقسیم کر دی جائے۔ لیکن دولتانہ اسی بات پر مصر رہے کہ مرکزی وزیراعلیٰ صوبائی وزیر اپنا معاملہ خود ہی طے کریں۔

آخر گورنر گورمانی نے اس مسئلے کو دلچسپ طریق پر حل کر دیا۔ انہوں نے دولتانہ کو ساتھ ملا کر ملک فیروز خان کو عہدے سے برطرف کیا اور ایک نئی وزارت بنا دی جس میں کچھ ان کے اپنے معتمد وزیر تھے کچھ دولتانہ کے نامزد وزیر لے لئے گئے۔ دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کا نقشہ ان دونوں "بادشاہ گروں" کے باہمی سمجھوتے میں شامل تھا۔ دونوں (گورنر گورمانی اور دولتانہ) خود بھی منتخب ہو گئے۔ ان کے علاوہ مرکزی وزیر بھی منتخب ہو گئے اور دونوں کے نامزد کئے ہوئے دوسرے امیدوار بھی منتخب ہو گئے۔ نون صاحب کو وزارت سے محروم ہونا پڑا۔ لیکن باقی تمام فریقوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ بندوبست اطمینان بخش ثابت ہوا۔

نئی دستور ساز اسمبلی کے لئے مسلم لیگی ممبروں کی سب سے بڑی کیمپ (مرکزی وزیروں سمیت ۱۶) پنجاب اسمبلی ہی نے مہیا کی۔ مشرقی پاکستان کے دوٹوں سے منتخب شدہ بیشتر ممبر کرشک سرامک پارٹی اور عوامی لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔ نئی اسمبلی میں مسلم لیگی ممبروں کی کل تعداد مل ملا کر ۲۶ تک پہنچ گئی۔ مسلم لیگ پارٹی اب بھی ایوان میں سب سے بڑی پارٹی تھی لیکن پہلے کی طرح قطعی اکثریت نہ رکھتی تھی بلکہ وزارت سازی کے لئے کسی دوسری پارٹی کو اپنے ساتھ ملانے کی محتاج ہو گئی تھی۔ جب نئی اسمبلی نے کام شروع کیا تو مختلف پارٹیوں کی پوزیشن یہ تھی۔ مسلم لیگ ۲۶۔ کرشک پارٹی ۱۶ عوامی لیگ ۱۳۔ کانگریس ۴۔ یونائیٹڈ پروگریسیو پارٹی (یہ بھی مشرقی

پاکستان کی نیم کانگریسی پارٹی تھی) ۲- اچھوت فیڈریشن ۳- آزاد امیدوار ۱۶- نئی اسمبلی کا پہلا سیشن مری میں ۷ جولائی ۱۹۵۵ء کو شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مختلف پارٹیوں اور افراد کے درمیان آئندہ کولیشن کے ذریعے نئی وزارت میں حصہ دار بننے کے لئے جوڑ توڑ شروع ہو گئے۔ کولیشن کا ایک منصوبہ مسٹر محمد علی بوگرہ کا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ خود ان کی سربراہی میں مسلم لیگ اور کرشک پارٹی کی کولیشن وزارت بن جائے۔ ایک مہینہ پہلے مسٹر بوگرہ گورنر جنرل غلام محمد کے بااختیار نمائندے کی حیثیت سے مشرقی پاکستان گئے تھے اور اس صوبے میں گورنری راج کو ختم کرنے اور صوبائی وزارت پر (عوامی لیگ کے مقابلے میں) کرشک پارٹی کو قبضہ دلانے کا اعلان کر آئے تھے اور اس اعلان کے مطابق عملدرآمد ہو گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کرشک پارٹی کے ساتھ مسٹر بوگرہ کی سیاسی مفاہمت میں گورنر جنرل غلام محمد کی اجازت اور مرضی شامل تھی۔ لیکن کولیشن کے اس منصوبے کو اسی صورت میں آگے بڑھایا جا سکتا تھا کہ مسٹر بوگرہ اپنے آپ کو مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر منتخب کرا لیں۔ یہ ان کے اپنے بس کی بات نہ تھی تا وقتیکہ گورنر جنرل ان کے لئے زور نہ لگائیں۔

مسلم لیگ پارٹی کی اندرونی کیفیت یہ تھی کہ اسکی اکثریت "گورمانی۔ دولتانہ محاذ" کے زیر اثر تھی اور اس محاذ میں بالادستی کی حیثیت گورمانی صاحب کو حاصل تھی۔ ان کا سیاسی گٹھ جوڑ مشرقی پاکستان کی دوسری پارٹی (عوامی لیگ) کے لیڈر مسٹر سہروردی کے ساتھ تھا انھوں نے مسلم لیگ پارٹی کے عملی کرتا دھرتا کی حیثیت سے مری میں پس پردہ بات چیت کے ذریعے یہ طے کر لیا کہ مسلم لیگ۔ عوامی لیگ کولیشن وزارت قائم کی جائے اور وزیراعظم کا عہدہ سہروردی کو دیا جائے۔ ظاہر تھا کہ اگر اسطرح وزارت عظمیٰ سہروردی کے حصہ میں آئے تو گورنر گورمانی توقع کر سکتے تھے کہ وقت آنے پر وہ خود سہروردی کی مدد سے گورنر جنرل (یا صدر) کا منصب حاصل کر سکیں گے۔ مری میں مسلم لیگ۔ عوامی لیگ کولیشن کی بات پختہ ہو گئی۔ لیکن اس کا اعلان کرنے اور اسے عملی شکل دینے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ گورنر جنرل کو سمجھا بجھا کر ان سے بھی اس منصوبے پر ہاں کرا لی جائے۔ اس زمانے میں گورنر جنرل غلام محمد کی دماغی کیفیت اور ان کے "موڈ" سخت غیر یقینی ہو گئے تھے گر ابھی تک اس بات کا علم ان سے قریبی تعلق رکھنے والے صرف چند افراد کو تھا۔ لہذا گورمانی مناسب موقعہ کے منتظر رہے اور مری کا سیشن ختم ہو گیا۔

اسمبلی کے اس سیشن کے بعد کراچی واپس پہونچ کر چوہدری محمد علی نے پیش قدمی کی اور حالات کا نقشہ ہی بدل دیا۔ چوہدری محمد علی گورنر جنرل غلام محمد کے شاید سب سے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح نیم مخبوط الحواس گورنر جنرل کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دو ماہ کی چھٹی لے لیں اور اس غرض کے لئے ایک چٹھی پر دستخط کر دیں۔ چھٹی کی یہ درخواست چوہدری صاحب نے کابینہ کے ایک اجلاس میں یکایک اس تجویز کے ساتھ پیش کر دی کہ ملکہ معظمہ سے سفارش کی جائے کہ وہ گورنر جنرل کی چھٹی کی درخواست منظور کرتے ہوئے جنرل سکندر مرزا کو قائم مقام گورنر جنرل مقرر کر دیں۔ کابینہ نے اس تجویز پر ہاں کر دی۔ اس فیصلے کا فوری اعلان کر دیا گیا۔ ملکہ معظمہ کی خدمت میں تار بھیج دیئے گئے۔ اگلے دن ان منظوری آ گئی۔ اور سکندر مرزا نے اپنے نئے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ اب وزارت سازی کا معاملہ نہ گورمانی صاحب کے ہاتھ میں رہا۔ نہ بوگرہ صاحب کے۔ بلکہ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آ گیا جو دوسروں سے بڑھ کر جوڑ توڑ کر سکتا تھا۔

جنرل سکندر مرزا نے ۷ اگست ۱۹۵۵ء کو قائم مقام گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا اور فوراً ہی چوہدری محمد علی کے احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کی۔ اس وقت مرکزی اسمبلی کا اگلا اجلاس کراچی میں ہونے والا تھا اور اکثر ممبر وہاں پہنچ چکے تھے۔ سکندر مرزا نے ایک ملاقات میں دولتانہ سے اشارتاً پوچھا کہ آپ کی پارٹی کا لیڈر کون منتخب ہونے والا ہے۔ کیا گورمانی صاحب؟ دولتانہ نے کہا کہ اگر آنجناب کوئی ہدایت فرمائیں تو اس کی تعمیل کی بسر و چشم کوشش کی جائے گی۔ قائم مقام گورنر جنرل نے فرمایا کہ یہ آپ صاحبان کا اپنا مسئلہ ہے لیکن اگر چوہدری محمد علی کو منتخب کر لیا جائے تو میں پنجاب کے لئے نیا گورنر ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ جاؤں گا۔ ظاہر ہے کہ سکندر مرزا صاحب نہ صرف چوہدری محمد علی کی بلکہ خود اپنی مدد کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ وہ گورمانی سہروردی گٹھ جوڑ سے خائف تھے۔ اس گٹھ جوڑ کے آئندہ معنی انہیں صاف نظر آتے تھے۔

راتوں رات بھاگ دوڑ اور خفیہ بات چیت کے بعد اگلے ہی دن ۸ اگست کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس منعقد ہو گیا۔ جس میں سب سے پہلے کولیشن کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا۔ اجلاس

نے بالاتفاق یہ فیصلہ کر دیا کہ مسلم لیگ کو عوامی لیگ کے ساتھ کولیشن کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ کہامی نمائندہ کہامی "ٹوخنہ" والا معاملہ تھا۔ اس فیصلے کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسٹر محمد علی بوگرہ کو جو کرشک پارٹی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر چکے تھے۔ قائد منتخب کرنا خارج از بحث کر دیا جائے۔ اگلا سوال پارٹی کا لیڈر منتخب کرنے کا تھا۔ بوگرہ صاحب جن کا سارا پروگرام مسترد کر دیا گیا تھا۔ مقابلے سے دست بردار ہو گئے۔ وہ نشانہ بات کو کنویسنگ کر چکے تھے۔ چودھری محمد علی کا نام تجویز ہوا اور اتفاق رائے سے انہیں لیڈر چن لیا گیا۔ گورمانی صاحب کے عزائم اگر کوئی تھے تو ان کے دل ہی میں رہ گئے۔

چودھری محمد علی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر منتخب ہو گئے۔ تو سکندر مرزا نے وزارت سازی کے سلسلے میں تینوں پارٹی لیڈروں (چودھری محمد علی۔ مسٹر سہروردی اور مولوی فضل الحق) کو گفتگو کے لئے بلایا۔ ان سے اکٹھے بھی ملاقات کی۔ اور الگ الگ بھی۔ عوامی لیگ مسلم لیگ کولیشن کے متعلق جو بحث و تمحیص ہوئی تھی۔ وہ اس بنیاد پر تھی کہ مسٹر سہروردی وزیر اعظم بنیں گے۔ سکندر مرزا نے کرشک پارٹی کے لیڈروں کو یہ نکتہ بہ آسانی سمجھا دیا کہ وہ عوامی لیگ کے مقابلے میں بہتر شرائط پیش کر کے مسلم لیگ کے ساتھ خود اپنی کولیشن قائم کر سکتے ہیں۔

کرشک پارٹی کے لیڈروں کو یہ نظر آیا کہ اگر مسلم لیگ۔ عوامی لیگ کے سربراہ کی حیثیت سے سہروردی مرکز میں وزیر اعظم بن گئے۔ تو مشرقی پاکستان میں کرشک پارٹی کی وزارت قائم نہ رہ سکے گی۔ وہاں بھی عوامی لیگ برسر اقتدار آ جائے گی۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور جھٹ چودھری محمد علی کو یہ پیشکش کر دی کہ اگر مسلم لیگ کرشک پارٹی کے ساتھ کولیشن کرنا چاہے تو ہم مسلم لیگی لیڈر کو وزیر اعظم کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار ہیں۔ جب یہ گفت و شنید ہو رہی تھی تو مشرقی پاکستان کے ایک ممبر مسٹر فضل الرحمن عوامی لیگ اور کرشک پارٹی دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کے پاس بھاگے پھر رہے تھے اور انہیں کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ مسلم لیگ پارٹی کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف بولیاں کیوں دے رہے ہیں۔ آپس میں سمجھوتہ کر کے اپنے صوبے کے لئے صحیح مقام حاصل کیوں نہیں کرتے؟ لیکن مشرقی پاکستان کی دونوں پارٹیوں میں مقامی رقابت ایسی سخت تھی کہ یہ اپیل صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

مسلم لیگ پارٹی نے کرشک سرامک پارٹی کے ساتھ کولیشن کا فیصلہ کر لیا۔ اور کولیشن

نے چوہدری محمد علی کو مشترکہ لیڈر چن لیا۔ سکندر مرزا نے چوہدری محمد علی کو وزارت سازی کی دعوت دیدی۔ یہ سب کچھ ۱۰ اگست تک مکمل ہوگیا۔ مری میں دستور ساز اسمبلی کا جو پہلا اجلاس ہوا تھا۔ اس میں عوامی لیگ مسلم لیگ کے ساتھ ووٹ کرتی رہی تھی۔ اور کرشک پارٹی اس غیر رسمی گٹھ جوڑ کے خلاف ووٹ کرتی تھی۔ کراچی کے اجلاس میں نئی کولیشن وزارت کے قیام کے ساتھ صورت حال اس کے برعکس ہوگئی۔ سہروردی وزارت سے مستعفی ہوگئے۔ اور عوامی لیگ نے ان کے زیر قیادت مخالف بنچوں پر جگہ سنبھال لی۔ اس مرحلے پر عوامی لیگ کے بارہ ممبروں نے ایک مشترکہ اخباری بیان میں مسلم لیگ پارٹی کی بدعہدی پر افسوس ظاہر کیا۔ اور سب سے زیادہ افسوس اس بات پہ کیا کہ مسلم لیگ پارٹی نے اس صحت مند روایت کی خلاف ورزی کی ہے کہ جب گورنر جنرل مغربی پاکستان کا نمائندہ ہو تو وزیر اعظم مشرقی پاکستان کا نمائندہ ہونا چاہیئے۔ ان کے قول کے مطابق مسلم لیگ پارٹی کے اس رویہ سے مساوات کے اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے باہمی اعتماد کو سخت دھکا لگا ہے۔ لیکن کیا سکندر مرزا مغربی پاکستان کے نمائندہ تھے؟ یہ سوال بعد میں بحث کا موضوع بنا رہا۔

گورنر جنرل غلام محمد ۷ اگست ۱۹۵۵ء کے بعد اپنی دو ماہ کی رخصت کے زمانے میں گورنر جنرل ہاؤس ہی میں مقیم رہے جہاں سرکاری طور پر ان کا علاج معالجہ اور تیمارداری ہوتی رہی۔ ۱۹ ستمبر کو ان سے استعفے کے کاغذ پہ دستخط حاصل کر لئے گئے اور ملکہ معظمہ کو ان کا استعفا اس شرط کے ساتھ منظور کرنے کی سفارش کر دی گئی کہ اس پہ عملدر آمد ان کی رخصت کی میعاد کے بعد ہوگا۔ ساتھ ہی ملکہ سے یہ بھی سفارش کر دی گئی۔ کہ قائم مقام گورنر جنرل سکندر مرزا کو مستقل گورنر جنرل مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ ۷ ستمبر کو سکندر مرزا نے اپنے نئے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔

۵۹- آئین کی تکمیل میں تیز رفتاری

چودھری محمد علی نے وزارتِ عظمیٰ کا چارج سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے "ایک یونٹ بل" کو پاس کرانے پر توجہ مرکوز کی۔ اس بل کا مسودہ نئی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس میں جو مری میں منعقد ہوا، پیش ہو چکا تھا۔ اس اجلاس نے بل کے مسودے کو سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ یہ بل اسمبلی کے اگلے اجلاس میں زیرِ غور آیا۔ "ایک یونٹ" کی ساخت کے متعلق سب سے اہم سوال یہ تھا کہ جب تک ایک یونٹ کی اسمبلی باضابطہ طریق پر عوام کے ووٹ سے منتخب ہو، اس وقت تک کے لیے عبوری بندوبست کی نوعیت کیا ہو؟ نئی اسمبلی کے انتخاب کے لیے بہت لمبا عرصہ درکار تھا۔ نئے صوبے میں حلقہ ہائے انتخاب کی حد بندی اور ووٹروں کی فہرست کی تیاری ایسے کام تھے جو سال ڈیڑھ سال سے پہلے مکمل نہ ہو سکتے تھے۔ کیا اس درمیانی عرصے میں "ایک یونٹ" کی وزارت اسمبلی کے بغیر کام کرتی رہے؟ یا مختلف یونٹوں کی اسمبلیوں کے تمام ممبروں کو "ایک یونٹ" کی عارضی اسمبلی میں جمع کر دیا جائے؟ اس صورت میں تعداد کی عملی دقت کے علاوہ ایک اصولی دقت پیدا ہوتی تھی۔ "ایک یونٹ" کے منصوبے پر چھوٹے یونٹوں کو راضی کرنے کے لیے پنجاب نے یہ قربانی دینا منظور کر لیا تھا کہ اس کی نمائندگی جو آبادی کے تناسب سے چھپن فیصد کے قریب بنتی تھی، کم کر کے چالیس فیصد کر دی جائے اور اس کے حصے کا ۱۶ فیصد چھوٹے یونٹوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ موجودہ اسمبلیوں کو ایک جامع اسمبلی کی صورت میں مدغم کرنے سے یہ مقصد پورا نہ ہو سکتا تھا۔

اس مسئلے کا حل بالآخر یہ سوچا گیا کہ عبوری دور کے لیے عارضی اسمبلی ضرور قائم کی جائے۔ لیکن اس کے فوری قیام کی خاطر صوبوں کی موجودہ اسمبلیوں کے ممبروں کے ووٹ سے ہر صوبے کے کوٹے کے مطابق نمائندے منتخب کرا لیے جائیں۔ اس انتخاب کی بھی کئی صورتیں

ہو سکتی تھیں۔ لیکن جو صورت اختیار کی گئی وہ بہت عجیب تھی۔ صوبے وار کوٹا ضلع وار کوٹے میں تقسیم کیا گیا اور ہر ضلع کے ایم ایل اے صاحبان سے کہا گیا وہ اپنے ضلع کے کوٹے کے مطابق نمائندے منتخب کریں۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ مثلاً ضلع لائلپور کے سترہ ایم ایل اے ووٹروں کو بارہ نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔ فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا تھا۔ لہٰذا عملاً نو ووٹروں کو یہ حق مل گیا کہ وہ باقی ماندہ آٹھ ووٹروں کو شکست دے کر اپنی مرضی کے بارہ نمائندے منتخب کر لیں۔ یعنی خود اپنے آپ کو بھی منتخب کر لیں اور اپنے علاوہ اپنی پسند کے تین اور افراد کو منتخب کر لیں۔ یہ ضروری نہ تھا کہ انتخاب کا امیدوار خود بھی ایم۔ ایل اے ہو۔ جب انتخاب کا یہ ضابطہ عمل میں آیا تو اس میں جو آپادھاپی ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔

دستور ساز اسمبلی میں ”ایک یونٹ بل“ پر بحث کافی طویل ہوئی۔ مخالفت کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن انہوں نے تاخیری حربے استعمال کرنے سے دریغ نہ کیا۔ صوبہ سرحد کے سردار عبدالرشید جنہوں نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی صوبائی اسمبلی سے ایک یونٹ کا منصوبہ منظور کرایا تھا۔ اب دستور ساز اسمبلی میں ”ایک یونٹ بل“ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے بہت ڈرامائی انداز سے ایک ”خفیہ دستاویز“ سے اقتباسات پڑھ کر ایوان کو سنائے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ایک یونٹ کا منصوبہ پورے مغربی پاکستان پر پنجابیوں کی لیڈری مسلط کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے اور اس کے لیے مرکز اور صوبے کے پنجابی لیڈروں نے ملی بھگت کر رکھی ہے۔ فی الحقیقت اس ”خفیہ دستاویز“ میں ایسی کوئی خوفناک بات نہ تھی۔ جس سے ”ایک یونٹ“ کی مخالفت کا جواز پیدا ہو سکے۔

یہ ”دستاویز“ ایک نوٹ تھا جو مسٹر دولتانہ نے تیار کیا تھا۔ اور اس کی ایک نقل چودھری محمد علی نے مری میں سردار عبدالرشید کو دی تھی۔ اس نوٹ کے جن اقتباسات کو سردار عبدالرشید اچھال رہے تھے۔ ان کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ”ایک یونٹ“ کے منصوبے میں بالآخر پنجاب کے لوگ اپنے قدرتی مقام سے محروم نہ رہیں گے۔ شروع

میں انہیں عہدوں پر اس طرح ہاتھ مارنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ جس سے چھوٹے بھائیوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہو۔ کیونکہ ایک یونٹ کا منصوبہ باہمی اعتماد اور بھائی چارے کی فضا ہی میں مضبوطی اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد کسی قدر صاف گوئی سے اس نوٹ میں ایک بات یہ بھی کہی گئی تھی کہ اگر ایک یونٹ کا منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ تو اس ناکامی کا نقصان پنجاب کو اس طرح پہنچے گا کہ مشرقی پاکستان ہمیشہ "چھوٹے بھائیوں کے بڑے بھائی" کا کردار ادا کرتا رہے گا۔ ممکن ہے کہ یہ انداز بیان ڈپلومیٹک نہ ہو۔ لیکن ایک یونٹ کے منصوبے کا ایک مقصد یہی تھا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان مساوات کے اصول کی حقیقی صورت پیدا ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک کے دونوں حصوں کے لیے صوبائی خود مختاری کے دائرے کو وسیع کرنا بھی ممکن ہو جائے۔ جو مشرقی پاکستان کا خاص مطالبہ تھا۔

جب اس بل کی آخری خواندگی پر رائے شماری ہوئی تو بل کی منظوری کے حق میں ۴۳ اور اس کی مخالفت ۱۳ ووٹ دیئے گئے۔ مخالفت میں ووٹ دینے والوں میں پانچ ووٹ مغربی پاکستان کے نمائندوں کے اور آٹھ ووٹ مشرقی پاکستان کے تھے۔ دستور ساز اسمبلی نے یہ بل ۳۰ ستمبر کو پاس کیا اور اس کے دو ہفتوں کے بعد یعنی ۱۴ اکتوبر کو "ایک یونٹ" معرضِ وجود میں آگیا۔ مختلف صوبوں کی صوبائی حکومتیں ختم ہو گئیں۔ اور پورے مغربی پاکستان کے لیے میاں مشتاق احمد گورمانی نے گورنری کا حلف اٹھایا۔ نئے صوبے کی حکومت کا وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کو نامزد کر دیا گیا تھا۔ یہ انتخاب بظاہر سکندر مرزا کی کوششوں کا مرہونِ منت تھا جو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ذاتی دوستی کے گہرے تعلقات رکھتے تھے۔ اور اپنی ذاتی سیاست کے لیے ان کی دوستانہ وفاداری پر بطور خاص بھروسہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر خانصاحب نے بھی اپنے عہدے کا حلف ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو اٹھالیا۔ صوبائی اسمبلی کے قیام تک (جو تین چار مہینے کے بعد عمل میں آیا) ڈاکٹر خانصاحب کی نگران وزارت میں مختلف صوبوں کے وزرائے اعظم کے ساتھ مسٹر دولتانہ کو بھی شامل کر لیا گیا۔

دستور ساز اسمبلی سے ایک یونٹ بل منظور کرانے کے بعد چودھری محمد علی نے اپنے ساتھیوں کو دم نہ لینے دیا۔ اور فوراً نئے آئین کا مسودہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ پرانی دستور ساز اسمبلی نے آئین سازی کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ آئینی تجاویز اسمبلی ہی کی سب کمیٹی کی جانب سے پیش کی جاتی تھیں۔ انہیں پاس کرانے کی ذمہ داری کسی پارٹی پر نہ تھی۔ بلکہ مفروضہ یہ تھا کہ جب یہ اسمبلی دستور ساز ادارے کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ تو اس کے ممبروں میں سرکاری اور غیر سرکاری یا اکثریتی اور اقلیتی پارٹی کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب تک پورے مسودے کو پاس کرانے کے لیئے ایک مستقل اکثریتی پارٹی ذمہ دار نہ ہو تو قدم قدم پر رکاوٹ اور ادھورے سفارش پر شکست کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

چودھری محمد علی نے گزشتہ تجربے سے فائدہ اٹھا کر اس سے بالکل مختلف طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے پہلے ایک مسودہ تیار کیا۔ پھر اسے برسر اقتدار کولیشن پارٹی سے پاس کرایا۔ اور اس کے بعد کولیشن پارٹی کی اکثریت کے بل پر دستور ساز اسمبلی سے پاس کرایا۔ مسودہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں تیار ہو گیا تھا۔ نومبر اور تقریباً پورا دسمبر اس مسودے کی ایک ایک شق کو کولیشن پارٹی سے پاس کرانے میں گزر گیا۔ بعض شقوں پر سخت اختلافات پیدا ہوئے ان سے متعلق مفاہمت کی راہ نکالی گئی پھر بھی بعض ایسے نکات رہ گئے جن پر کولیشن کے دونوں بازو (مسلم لیگ پارٹی اور کرشک پارٹی) متفق نہ ہو سکے ان پر بحث آئندہ مراحل کے لیئے ملتوی کر کے باقی شقوں پر بحث جاری رکھی گئی۔ چودھری محمد علی نے جو ٹائم ٹیبل اپنے سامنے رکھا تھا۔ جس کا انہوں نے اعلان بھی کر دیا تھا یہ تھا کہ پارٹی پورے مسودے کی حمایت کرنے کا فیصلہ لازماً دسمبر کے آخر تک کر لے۔ تاکہ مسودے کو ۵ جنوری ۱۹۵۶ء تک دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا جائے جہاں کولیشن پارٹی کی اکثریت اسے پاس کرانے کی ضامن بن جائے گی۔

پارٹی کے اندر دو نکات پر سخت اختلاف رونما ہوا۔ اور ڈیڈ لاک کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ ایک نکتہ مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے متعلق تھا۔ دوسرا نکتہ اس سوال سے تعلق رکھتا تھا۔ کہ انتخاب کی بنیاد مخلوط حلقہ ہائے انتخاب پر ہو یا

مسلم اور غیر مسلم ووٹروں کے الگ الگ حلقوں پر۔ تقسیم اختیارات کے سوال پر بالآخر کولیشن پارٹی کے اندر مفاہمت ہوگئی۔ لیکن مخلوط اور جداگانہ انتخاب کی بحث طول پکڑتی رہی۔ اس پر کوئی مفاہمت نہ ہوسکی اور آخر کولیشن پارٹی نے اس کا فیصلہ اسمبلی کے کھلے اجلاس پر چھوڑ دیا۔ اپنی پارٹی کے ممبروں سے دن رات کام لے کر چودھری محمد علی نے ۲۳ دسمبر تک پورے مسودے کو پارٹی سے پاس کرا لیا۔ وہ اپنے پروگرام کے مطابق ۵ جنوری تک یہ مسودہ اسمبلی کے سامنے پیش نہ کر سکے۔ طباعت وغیرہ میں کچھ تاخیر ہوئی۔ لیکن ۹ جنوری کو نئے آئین کا بل ایوان کے سامنے پیش ہوگیا۔ چند دن ممبروں کو اس کے مطالعے کے لیئے دیئے گئے۔ اس کے بعد مسودے پر شق وار بحث شروع ہو گئی۔ اب صورت یہ تھی کہ عام قانون سازی کے پارلیمانی دستور کے مطابق کولیشن پارٹی کی مستقل اکثریت ہر تجویز اور تحریک کی حمایت کے لیئے موجود تھی۔ یہ بات چودھری محمد علی کے کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کہ انہوں نے ۲۹ فروری تک نئے آئین کے بل کو آخری صورت میں پاس کرا لیا۔ مخالف پارٹیوں نے تاخیری حربوں سے کام لینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے جواب میں بار بار بحث کو ختم کرنے اور رائے شماری کرانے کی تحریکیں کامیابی کے ساتھ کی جاتی رہیں۔ ایک موقعہ پر حزب مخالف نے نادانستہ طور پر چودھری محمد علی کی مدد کی۔ حزب مخالف صدر کی ایک رولنگ کے خلاف احتجاجاً واک آوٹ کر گئی۔ وزیر اعظم نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اس دن آئین کی پچاس دفعات پاس کرا لیں۔

وزیر اعظم چودھری محمد علی ایک پبلک تقریر میں اعلان کر چکے تھے کہ نیا آئین پاس کرانے کا مرحلہ فروری میں طے ہو جائے گا۔ چودھری صاحب نے یہ وعدہ بہت ڈرامائی حالات میں پورا کیا۔ حسن اتفاق سے ۱۹۵۶ء کی فروری ۲۹ دن کی تھی۔ بل پر بحث ۲۹ فروری کو بھی ہو رہی تھی۔ وزیر اعظم کا وعدہ نبھانے کے لیئے اس دن اسمبلی نے اپنی نشست آدھی رات تک جاری رکھی۔ آدھی رات یعنی فروری کا مہینہ ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے کہ بل کے متعلق آخری تحریک منظور ہو گئی۔ اور سپیکر نے یہ اعلان کیا کہ بل پاس ہو گیا ہے۔ ممبروں نے تالیوں اور اللہ اکبر کے نعروں سے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اس ظاہرے

میں صرف برسرِ اقتدار کولیشن پارٹی (مسلم لیگ اور کرشک سرامک پارٹی) کے ممبر شریک تھے عوامی لیگ اور اس کی متابعت میں کانگریس پارٹی اور مخالف بنچوں پر بیٹھنے والے دوسرے گروپ یکے بعد دیگرے ایوان سے واک آؤٹ کر گئے تھے۔ مسٹر سہروردی کا موقف یہ تھا کہ برسرِ اقتدار کولیشن پارٹی نے کئی اختلافی دفعات اپنی اکثریت کے بل پر حزبِ مخالف کے نقطہ نگاہ کی پرواہ کئے بغیر پاس کرالی ہیں۔ جب بل کی تیسری خواندگی کا موقعہ آیا۔ تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ مزید بحث ملتوی کر کے تمام پارٹیوں کی ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے اور اس کے فیصلوں کے مطابق بل میں ترمیم کی جائے۔ یہ مطالبہ نہ مانا گیا لہٰذا جب پورے بل کو منظور یا نامنظور کرنے کا مرحلہ آیا تو پہلے مسٹر سہروردی اور ان کی پارٹی نے "واک آؤٹ" کیا۔ اس کے بعد دوسرے مخالف گروپ بھی ایوان سے اٹھ کر چلے گئے۔

بل کے تین نکات کے خلاف مسٹر سہروردی نے سب سے زیادہ جنگ کی۔ ایک مملکت پاکستان کے سرکاری نام میں "اسلامی" کے لفظ کیخلاف۔ دوسرے اس بات کے خلاف کہ بل کی رو سے صدرِ پاکستان کا عہدہ "مسلمان" کے لیئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اس عہدے کے لیئے کوئی غیر مسلم امیدوار نہ بن سکتا تھا۔ تیسرے اس بات کے خلاف کہ بل میں مخلوط انتخاب کا اصول منظور نہ کیا گیا۔ بلکہ طرزِ انتخاب کا سوال آئندہ پارلیمنٹ کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ مسٹر سہروردی کے خیال کے مطابق ان تینوں نکات کے متعلق بل کی دفعات ان وعدوں کے منافی تھیں جو پاکستان میں اقلیتوں کو مسلمانوں کے ساتھ مساوی سیاسی اور شہری حقوق دینے کے متعلق کئے گئے تھے۔ یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ اس جنگ میں اقلیتی فرقوں کے نمائندے مسٹر سہروردی کی پوری ہمنوائی کر رہے تھے۔

طرزِ انتخاب کے سوال پر برسرِ اقتدار کولیشن پارٹی کے اندر بھی اتفاق رائے نہ تھا کرشک سرامک پارٹی کے ممبر مخلوط طرزِ انتخاب پر اصرار کرتے تھے۔ اور مسلم لیگ پارٹی کی اکثریت جداگانہ انتخاب کی پرانی روایت کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس سوال پر ڈیڈ لاک کی صورت پیدا ہو گئی۔ آخر کولیشن پارٹی نے ڈیڈ لاک سے بچنے اور آئین کے راستے سے رکاوٹ دور کرنے کے لیئے آئین میں یہ درج کر دیا کہ آئین کے نفاذ کے بعد قومی پارلیمنٹ صوبائی اسمبلیوں کی

رائے معلوم کرنے کے بعد اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ انتخاب مخلوط حلقوں کی بناء پر ہوں گے۔ یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے الگ الگ حلقہ ہائے انتخاب کی بنا پر۔ بعد میں جب پارلیمنٹ کے لیے اس سوال کا فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو اس کے متعلق عجیب ہنگامے اور معرکے ہوئے۔

۲۹ر فروری کی شب کو جو آئین پاس ہوا۔ اس پر گورنر جنرل سکندر مرزا کی توثیق ۲ر مارچ کو ہوئی۔ یہ مرحلہ بھی ایک باضابطہ رسم کی صورت میں طے ہوا۔ ۲ر مارچ کو دن کے گیارہ بجے اسمبلی کے ایوان سے سپیکر عبدالوہاب کے زیر قیادت ممبروں کا ایک جلوس پاس شدہ آئین کی ایک کاپی لے کر روانہ ہوا۔ یہ جلوس گورنر جنرل ہاؤس میں پہنچا۔ جہاں سپیکر نے یہ کاپی گورنر جنرل کے سامنے پیش کی۔ اور انہوں نے اس پر اپنی توثیق کے رسمی الفاظ لکھ کر اپنے دستخط ثبت کیے۔ مخالف پارٹیوں نے اس رسم کا بھی بائیکاٹ کیا۔ اس کے تین دن بعد یعنی ۵ر مارچ ۱۹۵۶ء کو نئے آئین میں درج شدہ ضابطے کے مطابق سکندر مرزا پاکستان کے پہلے صدر منتخب ہو گئے۔

۶۰- ری پبلکن پارٹی

چودھری محمد علی پاکستان میں پہلے مسلم لیگی وزیر اعظم تھے جنہوں نے وزارت اور مسلم لیگ کی صدارت کو یکجا کرنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ وزارت عظمیٰ اور صدارت کے عہدوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا چاہا۔ مسٹر محمد علی بوگرہ اپنی وزارت عظمیٰ کے خاتمے کے بعد مسلم لیگ کی صدارت سے ۲۲ اگست ۱۹۵۵ء کو مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کی کرسی صدارت کئی مہینے تک اگلے صدر کا انتظار کرتی رہی۔ اس زمانے میں نائب صدر میر غلام علی تالپور قائم مقام صدر کے طور پر کام کرتے رہے۔ بالآخر پانچ مہینے کے بعد ۲۹ جنوری کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس کراچی میں طلب کیا گیا۔ اس میں قائد اعظم کے دیرینہ ساتھی سردار عبدالرب نشتر کو اتفاق رائے سے لیگ کا صدر چن لیا گیا۔

اس سے پہلے مغربی پاکستان کی نئی اسمبلی کا انتخاب ہو چکا تھا۔ اس انتخاب کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کے لئے امیدواروں کو کسی پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑا کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن یہ بات معلوم تھی کہ وہی لوگ بھاری اکثریت میں نئی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ جو شروع ہی اپنی اپنی صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہو چکے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ایک یونٹ کی نئی صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کی جائے یا نہ کی جائے۔ سردار عبدالرب نشتر کی رائے بلا تامل یہ تھی۔ کہ ضرور قائم کی جائے۔ مشرقی پاکستان اسمبلی سے مسلم لیگ پارٹی فی الوقت تقریباً خارج ہو چکی تھی۔ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قطعی اکثریت کا مقام کھو چکی تھی۔ اور اب وزارت قائم کرنے کے لئے دوسری پارٹیوں کے ساتھ کولیشن کی محتاج تھی۔ اگر مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں بھی مسلم لیگ پارٹی کا وجود قائم نہ رہے۔ تو مجموعی طور پر لیگ کی تنظیم اور اس کے سیاسی وقار کو سخت نقصان پہنچتا تھا۔ ان دلائل کے پیش نظر سردار عبدالرب نشتر نے اپنے انتخاب سے اگلے ہی دن یہ ہدایت جاری کر دی کہ

مغربی پاکستان کی نئی اسمبلی کے جو ممبر مسلم لیگی تنظیم سے وابستہ ہیں ۔ انہیں چاہیئے کہ جتنی جلدی ممکن ہو اپنا اجلاس منعقد کریں ۔ اور اپنے آپ کو مسلم لیگ پارٹی کی صورت میں منظم کریں۔ یہ ہدایت اپنے ساتھ بعض لازمی نتائج لاتی تھی ۔ صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم ہوگی تو لازماً اس پارٹی کا لیڈر بھی ہوگا ۔ اور اگر مسلم لیگ پارٹی کی اکثریت ہوئی ۔ جیسا کہ صاف نظر آتا تھا تو وزارت سازی کا حق عام پارلیمانی آداب کے مطابق اسی پارٹی کے لیڈر کو حاصل ہوگا ۔ پھر ڈاکٹر خان صاحب کی پوزیشن کیا ہوگی ؟ یہ سوال چودھری محمد علی کے لیئے پریشان کن تھا ۔ لیکن مسلم لیگ کے مقاصد کے اعتبار سے سردار عبدالرب نشتر کی ہدایات پر کسی مسلم لیگی کے لیئے اعتراض کی گنجائش نہ تھی ۔ بلکہ عوامی سطح پر مسلم لیگی حلقوں میں نشتر صاحب کے فیصلے کا عام خیر مقدم کیا گیا ۔ اور یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ مسلم لیگ کی باگ ڈور ایسے شخص کے ہاتھ میں آگئی ہے جو لیگ کو محلاتی سازشوں کی آلہ کار نہ بننے دے گا ۔ بلکہ ایک باوقار جماعت کی حیثیت سے اس کا مستقبل محفوظ کرنے کی کوشش کرے گا ۔

چودھری محمد علی اور گورنر جنرل سکندر مرزا اس بات کے بعد خواہشمند تھے کہ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ ڈاکٹر خانصاحب ہی کے پاس رہے ۔ وہ اس بات کے حق میں یہ دلیل دیتے تھے کہ جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اسی طرح عبدالغفار خاں کی جانب سے "ایک یونٹ" کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیئے خان موصوف کے برادر بزرگ اور سرخپوش جماعت کے سابق لیڈر نمبر دو ڈاکٹر خانصاحب سب سے زیادہ موزوں رہیں گے ۔ لیکن اصل وجہ خواہ یہ تھی یا سکندر مرزا صاحب کی ذاتی سیاست تھی یا دونوں تھیں ۔ سردار نشتر نے جو ہدایات جاری کیں ۔ ان کے بعد وزیر اعظم اور گورنر جنرل دونوں نے اس بات کے لیئے کوشش شروع کر دی کہ مغربی پاکستان اسمبلی کے اندر قائم ہونے والی مسلم لیگ پارٹی اپنا لیڈر جسے چاہے ۔ چن لے (لامحالہ وہ کوئی مسلم لیگی ہی ہو سکتا تھا) لیکن یہ بات قبول کر لے کہ وزیر اعلیٰ کا عہدہ ڈاکٹر خانصاحب ہی کے پاس رہے ۔ چودھری محمد علی نے مفاہمت کی غرض سے یہ پروگرام بنایا کہ ڈاکٹر خان صاحب اپنی کوئی پارٹی نہ بنائیں ۔ مسلم لیگ پارٹی ان کی شخصی افادیت کے پیش نظر انہیں وزیر اعلیٰ کی حیثیت میں قبول کرے اور ڈاکٹر خانصاحب

اپنی وزارت مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کے مشورے کے مطابق بنائیں۔ یعنی برائے نام وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب ہوں اور اصل وزیرِ اعظم مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر ہو۔

اسی پروگرام کی بنیاد پر چودھری صاحب نے صوبائی اسمبلی کے سرکردہ مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ گفت و شنید کی اور انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ نئی وزارت میں ڈاکٹر خان صاحب کو وزیرِ اعلیٰ کے طور پر قبول کر لیں۔ جن لوگوں کے ساتھ چودھری صاحب نے یہ بات چیت کی ان میں مولانا، سردار بہادر خاں، عبدالحمید دستی اور کھوڑو شامل تھے۔ لیکن ایک طرف چودھری محمد علی اپنے ساتھیوں کو اس انتظام پر راضی کر رہے تھے اور دوسری طرف جنرل سکندر مرزا کا ذہن بالکل مختلف سمت میں کام کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو پوری سیاسی قوت اور اثر و رسوخ کا حامل وزیرِ اعلیٰ بنانا چاہتے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب سکندر مرزا کی حمایت کے بل پر اپنا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔

گورنر جنرل (جو جلد ہی صدر بن گئے) اور وزیرِ اعظم کے ان متضاد مقاصد کا نتیجہ فوراً ہی سامنے آ گیا۔ ایک طرف سردار عبدالرب نشتر کی ہدایت کے مطابق اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں کو مسلم لیگ کے حلف نامے بھیجے گئے۔ اور ان سے کہا گیا کہ وہ ان فارموں پر دستخط کر کے بھیج دیں اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے تیار رہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر خان صاحب نے صوبہ سرحد کے ممبروں سے اپنے ہاتھ پر بیعت لینا شروع کر دیا۔ یعنی خود اپنی ایک پارٹی کی بنا ڈال دی۔ انہوں نے ظاہر یہ کیا کہ وہ اپنے خاص پروگرام (ایک یونٹ کی حمایت) کے لئے ممبروں کی تائید حاصل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد کے دورے پر تھے کہ اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ ساٹھ ممبروں نے ڈاکٹر خان صاحب پر اظہارِ اعتماد کر دیا ہے۔ پھر خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب کی "ون یونٹ پارٹی" میں بہتّر ممبر شریک ہو گئے ہیں۔ دولتانہ اور سردار بہادر خاں کو ڈاکٹر خان صاحب کے رویّہ کے متعلق پریشانی لاحق ہوئی وہ بھاگے بھاگے کراچی پہنچے اور چودھری محمد علی سے پوچھنے لگے۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ڈاکٹر صاحب مسلم لیگ پارٹی کے مقابلے میں اپنی الگ پارٹی بنا رہے ہیں؟

چودھری صاحب نے ڈاکٹر خان صاحب اور مسٹر گورمانی کو بلایا۔ اور ان کے ساتھ

گفتگو کے بعد مسلم لیگی لیڈروں کو اطمینان دلایا کہ ڈاکٹر صاحب کا ارادہ کوئی الگ پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کا نہیں۔ جو افواہیں اخباروں میں چھپی ہیں۔ وہ غلط فہمی پیدا کرنے والی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بارے میں اپنی طرف سے وضاحتی بیان بھی دیئے۔ لیکن یہ وضاحتی بیان اصل معاملے کو زیادہ پیچیدہ کرنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک طرف کہتے تھے کہ "ون یونٹ پارٹی کوئی الگ پارلیمانی پارٹی نہیں ہے۔ اس کا وزارت سازی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلم لیگی ممبر اگر "ون یونٹ" پارٹی کی تائید میں دستخط کر دیں تو اس کے معنی یہ کہاں ہیں کہ وہ مسلم لیگ پارٹی کے ممبر نہ رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اور باتیں بھی کہہ جاتے تھے۔ "باقی وزیر میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق منتخب کروں گا۔ کسی کی ہدایت کے مطابق نہیں۔ میں صدر اور وزیر اعظم کے ساتھ وزارت کی توسیع کے متعلق گفتگو کر چکا ہوں اور توسیع کا اعلان وقت آنے پر کیا جائے گا۔" ڈاکٹر صاحب کا یہ انداز سخن اس سمجھوتے کے منافی تھا۔ جس پر چوہدری محمد علی نے اپنے مسلم لیگی ساتھیوں کو راضی کیا تھا۔ اصل بات یہی تھی کہ چوہدری صاحب صوبائی مسلم لیگی لیڈروں کو کچھ اور تاثر دے رہے تھے۔ اور ڈاکٹر خانصاحب سکندر مرزا کے بھروسے پر کسی اور طرف چل رہے تھے۔

ڈاکٹر خانصاحب کے انداز سخن کا سب سے عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ اس بنیادی حقیقت کو بالکل فراموش کر رہے تھے کہ وہ صرف ایک نگران وزارت کے سربراہ تھے وزارت سازی اور وزارت میں توسیع کی باتیں وہ کس حیثیت سے کرتے تھے؟ صحیح جمہوری روایت کا صاف تقاضا یہ تھا۔ کہ انتخاب کے بعد نگران وزارت اپنے استعفے پیش کر کے گورنر کو اس بات کا موقعہ دے کہ وہ نئی اسمبلی میں پارٹیوں کی طاقت معلوم کر کے اکثریت والی پارٹی کے لیڈر کو وزارت سازی کے مشورے کے لئے طلب کرے۔ ایک پریس کانفرنس میں ڈاکٹر صاحب نے یہ دعویٰ بھی کیا جسے سن کر لوگوں کو بہت ہی تعجب ہوا۔ کہ اگر نئی اسمبلی کی اکثریت نے میرا ساتھ نہ دیا تو مجھے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے یہ حق حاصل ہے کہ میں گورنر کو اس اسمبلی کے توڑ دینے کا مشورہ دوں۔ عام پارلیمانی قاعدے

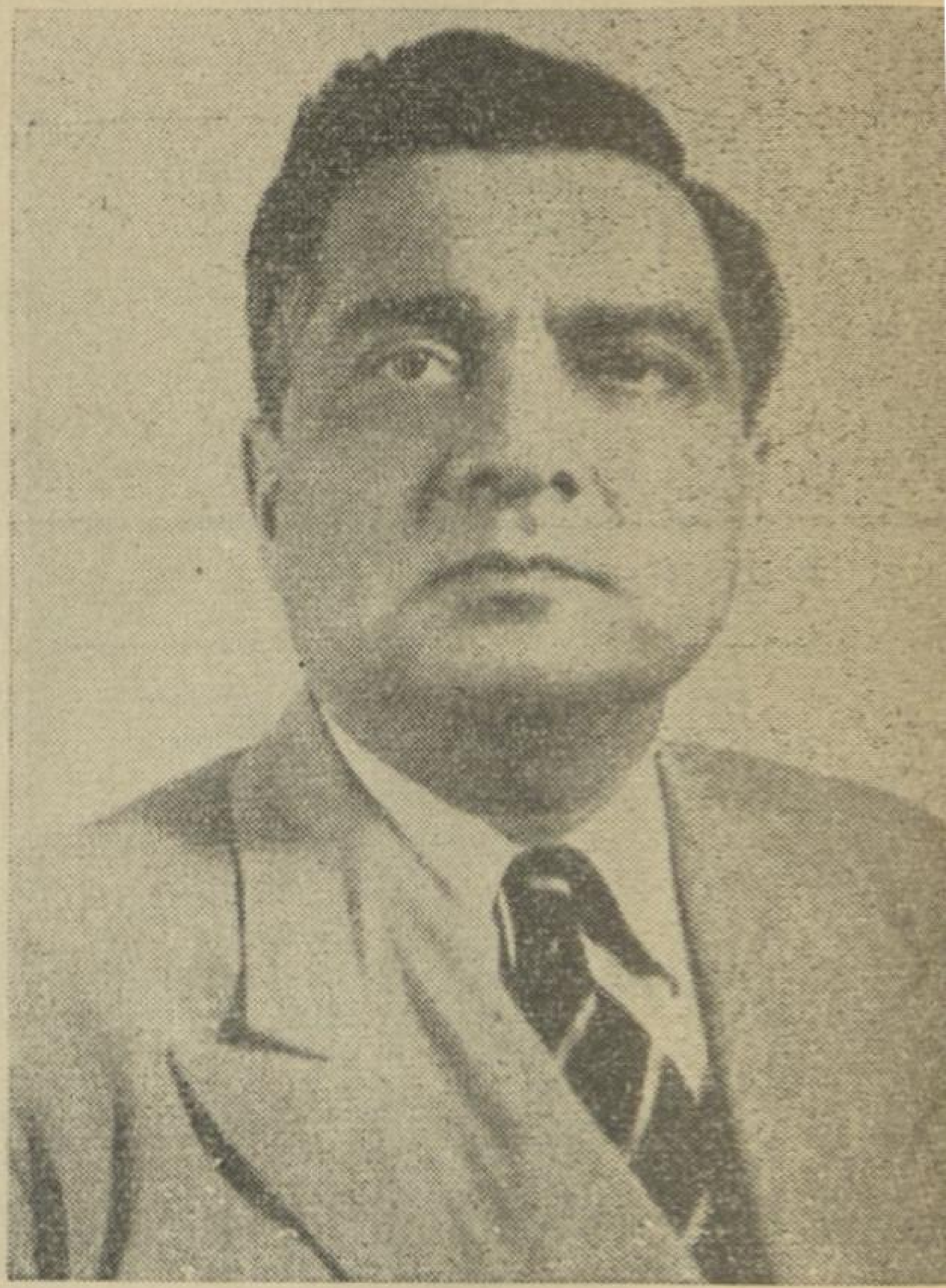
کے مطابق ہر عام انتخاب کے وقت ایک نگران وزارت موجود ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کسی نگران وزیر اعلیٰ نے بہ قائمی ہوش وحواس یہ دعوے نہیں کیا۔ جو ڈاکٹر خانصاحب کر رہے تھے۔

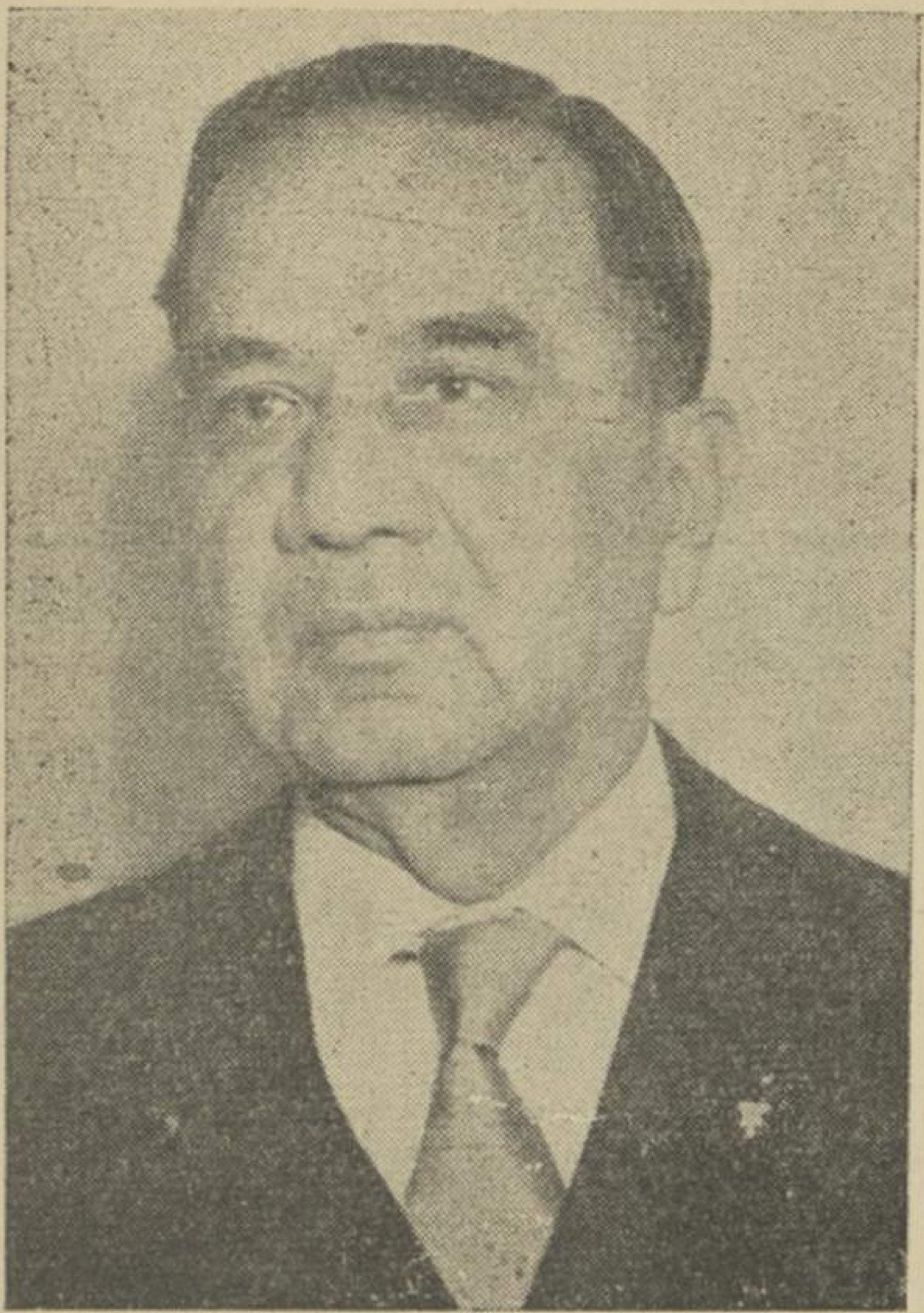
ان حالات میں مغربی پاکستان اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کا اجلاس لاہور میں ۲؍اپریل ۱۹۵۶ء کو سردار عبدالرب نشتر کے زیر صدارت منعقد ہوا اسمبلی کے کل ممبروں کی تعداد ۳۱۰ تھی۔ ان میں ۲۴۵ ممبروں نے مسلم لیگ کے صدر کی ہدایت کے موجب لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے انہیں واپس بھیج دیئے تھے۔ پارٹی کے اجلاس میں ۲۲۷ ممبر موجود تھے۔

۲۹ مارچ کو چودھری محمد علی نے لیپا پوتی کی آخری کوشش کی اور ایک اخباری بیان میں کہا کہ صوبائی اسمبلی کے متعدد ممتاز مسلم لیگی ممبر میرے اس خیال کے ساتھ اتفاق کر چکے ہیں۔ کہ ڈاکٹر خانصاحب وزیر اعلیٰ کے عہدے کے لیئے موزوں رہیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ان کی اپنی کوئی پارٹی نہیں ہے۔ اس بارے میں اخباروں میں جو خبریں چھپی ہیں۔ وہ غلط ہیں۔ وزارت میں توسیع کے متعلق مسلم لیگ پارٹی کے اجلاس کے بعد غور کرنا مناسب ہو گا۔ بلاشبہ مسلم لیگ پارٹی کو ایوان میں قطعی اکثریت ہے۔ تاہم ڈاکٹر خان صاحب کو وزیر اعلیٰ بنانے کی تجویز صوبے کے لیئے مفید ثابت ہوگی۔

صدر سکندر مرزا مسلم لیگ پارٹی کے مجوزہ اجلاس سے دو دن پہلے یعنی ۳۰ مارچ کو لاہور میں آکر بیٹھ گئے اور تاریں ہلانے لگے۔ ۲؍اپریل کو پارٹی کا اجلاس مغرب کے بعد ہونا تھا۔ اس سے دو گھنٹے پہلے صدر نے لاہور کے قلعہ میں ایک استقبالیہ دعوت میں خیر مقدم کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے آئینی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر صاف الفاظ میں صوبہ مغربی پاکستان کو یہ مشورہ دے دیا کہ وہ ڈاکٹر خان صاحب پر اعتماد کرے۔

آٹھ بجے شام کو مسلم لیگ پارٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ اور پہلے اسی سوال پر بحث ہوئی کہ پارٹی کسی غیر مسلم لیگی کو وزیر اعلیٰ بنانے کی تجویز سے اتفاق کرتی ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب کی نگران وزارت میں جو مسلم لیگی وزیر شامل تھے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے


جنرل سکندر مرزا

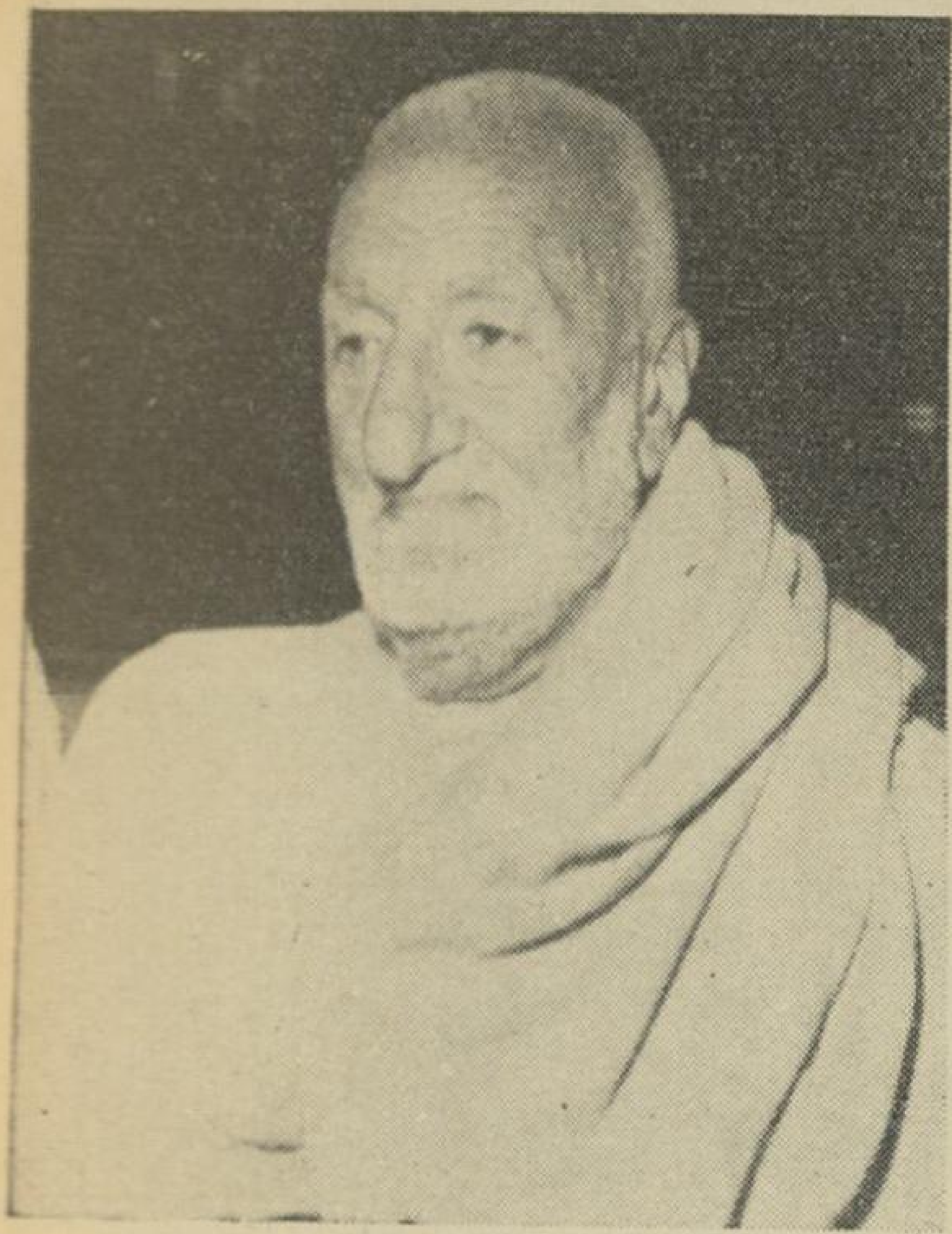

مسٹر حسین شہید سہروردی


مسٹر آئی ۔ آئی چندریگر


ملک فیروز خاں نون



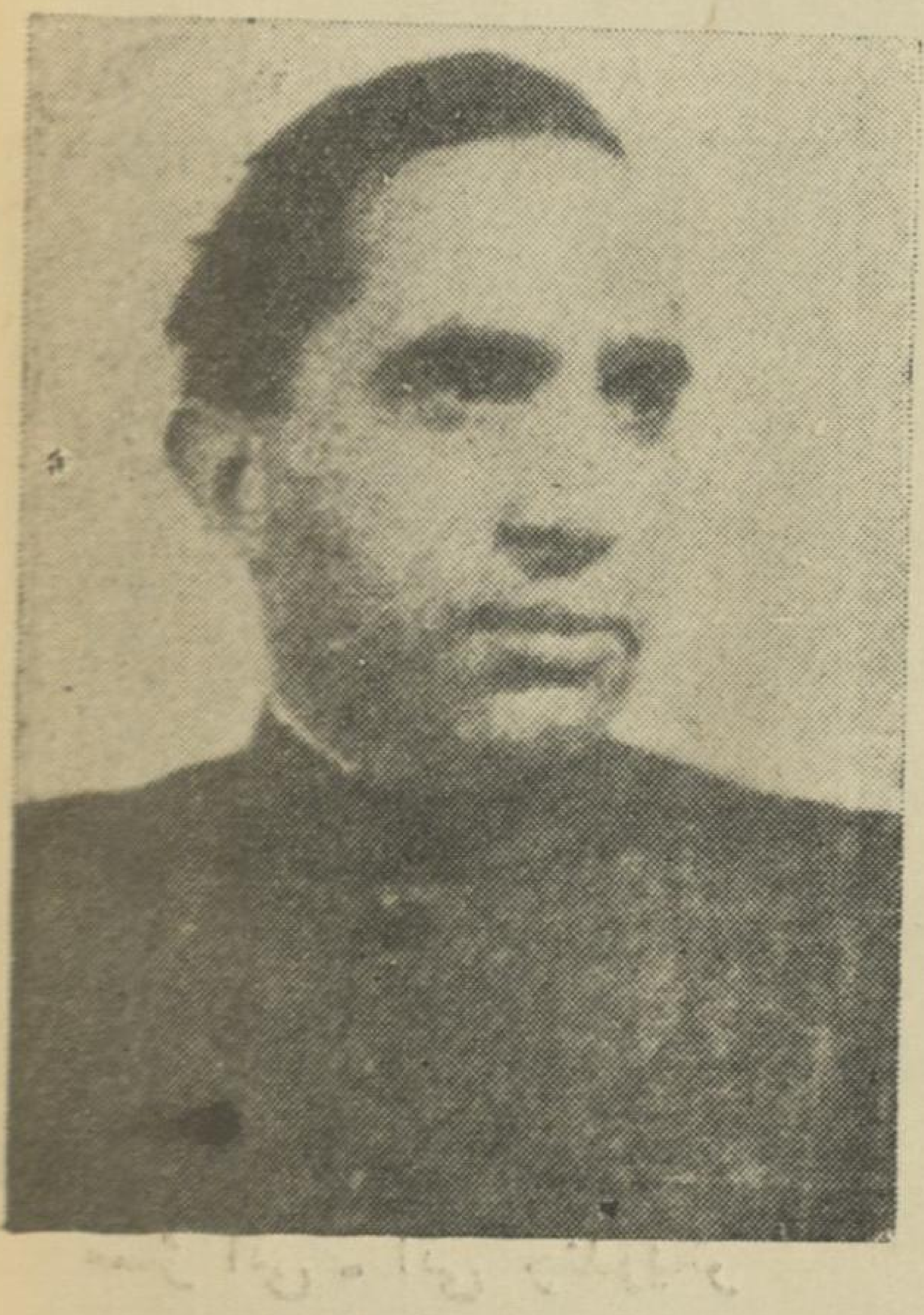
ڈاکٹر خان صاحب



خان عبدالغفار خاں



خان عبد القیوم خاں



میاں افتخار الدین

اپنی تقریروں میں کہا کہ تین شرائط کی بنا پر ڈاکٹر خان صاحب کو وزیر اعلیٰ بنانا اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا صوبہ کے لیئے مفید رہے گا۔ وہ تین شرائط یہ تھیں۔ (۱) ڈاکٹر خانصاحب اپنی کوئی پارٹی نہ بنائیں گے (۲) وہ وزیروں کا انتخاب مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کے مشورے سے کریں گے۔ اور (۳) وہ مسلم لیگ کے پروگرام کو چلائیں گے۔

صدر عبدالرب نشتر نے بحث میں حصہ نہ لیا لیکن انہیں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی تھی کہ مسلم لیگ پارٹی کی بھاری اکثریت کے باوجود اس پارٹی کا لیڈر خود براہ راست وزارت کی ذمہ داری نہ سنبھالے اور ایک غیر لیگی فرد کو مسند اقتدار پر بٹھانے کی کوشش کرے۔ آخر کیوں؟ حاضرین کی اکثریت کے ذہن میں بھی یہی سوال پیدا ہوتا تھا۔ دو گھنٹے کی بحث کے بعد اجلاس کسی فیصلے کے بغیر اگلے دن کے لیئے ملتوی ہو گیا۔ اگلے دن اجلاس میں دو سو ایک ممبروں نے رائے شماری میں حصہ لیا کچھ ممبر غیر جانبدار رہے۔ رائے شماری خفیہ پرچیوں کے ذریعے ہوئی۔ ستر ووٹوں کے مقابلے میں ایک سو اکتیس ووٹوں سے یہ فیصلہ ہوا کہ پارٹی کو کسی ایسے وزیر اعلیٰ کی حمایت نہ کرنی چاہیئے جو مسلم لیگی نہ ہو۔ اس کے بعد پارٹی کا لیڈر منتخب کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ اس پر پارٹی نے اتفاق رائے سے سردار بہادر خاں کو اپنا لیڈر چن لیا۔

ادھر یہ فیصلے ہوئے۔ ادھر مسلم لیگ پارٹی کے وہ ممبر جو کسی نہ کسی وجہ سے ڈاکٹر خانصاحب کو وزیر اعلیٰ بنانے کے حامی تھے۔ راتوں رات ڈاکٹر خان صاحب کے گرد ایک نئی پارٹی کی صورت میں جمع ہو گئے۔ اور اس نئی پارٹی کا نام ری پبلکن پارٹی رکھ لیا گیا۔

عبوری نگران وزارت کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ نئے انتخاب کے ذریعے جو اسمبلی معرض وجود میں آئی تھی اس میں ایک پارٹی نے اپنی بھاری اکثریت کا عملی ثبوت مہیا کر دیا تھا۔ وزیر اعظم خود اپنے اخباری بیان میں یہ تسلیم کر چکے تھے۔ کہ مسلم لیگ پارٹی کو ایوان میں قطعی اکثریت حاصل تھی۔ دو سو ستائیس ممبروں نے متفقہ ووٹ سے سردار بہادر خاں کو لیڈر چن لیا تھا۔ اور سردار بہادر خاں نے گورنر جنرل کو ایک چٹھی بھیج کر اس صورت حال سے مطلع کر دیا تھا۔ لیکن گورنر

نے آئینی پوزیشن کی یہ عجیب تعبیر پیش کر دی کہ ڈاکٹر خانصاحب چونکہ وزیر اعلیٰ ہیں (حالانکہ وہ محض عارضی نگران وزارت کے وزیر اعلیٰ تھے) لہٰذا جب تک نئی اسمبلی میں انہیں شکست نہ ہو گورنر ان کا ہر مشورہ ماننے کا پابند ہے۔ گویا انہیں نئی اسمبلی کے منتخب شدہ لیڈر کی حیثیت بخش دی گئی۔ اور پھر اسمبلی کا فوری اجلاس بلانے سے پہلو تہی کی گئی

ری پبلکن پارٹی کے ممبروں کی پہلی کھیپ زیادہ تر ان صاحبان پر مشتمل تھی جو کسی ایسی پارٹی میں رہنے کو تیار نہ تھے جس کے رسمی یا عملی سربراہ دولتانہ ہوں۔ ان کے لیے ڈاکٹر خانصاحب کے کیمپ کی سب سے بڑی کشش یہی تھی کہ اس کیمپ کی کامیابی دولتانہ کی ناکامی کے مترادف تھی۔ اس گروہ کی سب سے نمایاں مثال نواب ممدوٹ تھے۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو گورنر گورمانی اور سکندر مرزا کے اشارے پر چلنے والے تھے۔ باقی ایسے طالع آزما تھے۔ جنہیں وعدہ فردا نہیں۔ بلکہ نقد وزارتیں پیش کی جا رہی تھیں۔ انہوں نے نو نقد نہ تیرہ ادھار کا حساب لگایا تھا۔ اس کے بعد اسمبلی کا اجلاس بلانے کی تجویز ملتوی رہی اور دونوں کیمپوں کے درمیان ممبروں کو توڑنے اور ممبروں کو روکنے کی دوڑ ہوتی رہی۔ ری پبلکن پارٹی کے حق میں کئی عوامل کام کر رہے تھے۔ گورنر اور صدر مملکت کی حمایت، عہدوں اور سیاسی رشوتیں نقد پیش کرنے کے مواقع۔ ایک خاصے بڑے گروہ کی دولتانہ کے خلاف ذاتی جنگ۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے تک صوبے کے اندر رسہ کشی ہوتی رہی۔ اس دوران میں مسلم لیگی وزیر اعظم چودھری محمد علی کی پوزیشن خاصی خراب ہو گئی۔ صدر اور گورنر ان کی پارٹی کو توڑ پھوڑ رہے تھے۔ اور وہ چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ گویا اس سیاسی بازدھاڑ سے وہ بے نیاز اور بے تعلق تھے۔ ۲۵ اپریل کو مرکزی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد کے ذریعے گورمانی صاحب کی جانبداری کے خلاف احتجاج کیا۔ چودھری محمد علی مجلس عاملہ کے ممبر تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی پوزیشن کو اس طرح بچانے کی کوشش کی کہ مجلس عاملہ کے اجلاس سے غیر حاضر ہو گئے۔

آخر ری پبلکن پارٹی اور مسلم لیگ پارٹی کو باہمی زور آزمائی کا موقعہ مہیا کرنے کے لیے ۱۹ مئی ۱۹۵۶ء کو مغربی پاکستان اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس کشیدگی

کی فضا میں یہ اجلاس منعقد ہوا۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ ڈیڑھ ماہ تک دونوں پارٹیاں ہر قسم کے حربوں سے کام لے کر اپنی اپنی طاقت بڑھانے (مسلم لیگ پارٹی کے لیئے اپنی طاقت بڑھانے کا نہیں بلکہ قائم رکھنے کا سوال تھا) کی کوشش کرتی رہی تھیں لیکن مسلم لیگ کو بہر حال وہ حربے میسر نہ تھے جو برسر حکومت پارٹی کی حیثیت سے ری پبلکن وزارت استعمال کر سکتی تھی۔

پہلا معرکہ نئی اسمبلی کے صدر کے انتخاب پر ہوا۔ یہ معرکہ فیصلہ کن خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ پہلے دن کی فتح و شکست کے بعد فتحیاب کیمپ میں ممبروں کا سیلاب آنے کی توقع تھی۔ نئے صدر کے انتخاب تک اسمبلی کی صدارت کرنے کے لیئے گورنر گورمانی نے ریاست خیرپور کے ممتاز حسن قزلباش کو صدر نامزد کر دیا۔

۱۹ مئی کا دن ممبروں سے حلف لینے میں گزر گیا۔ دونوں کی جنگ اس سے اگلے دن ہوئی۔ مسلم لیگ پارٹی نے میر غلام علی تالپور کو اور ری پبلکن پارٹی نے چودھری فضل الٰہی کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا تھا۔ رائے شماری کے وقت ممبروں کے درمیان کھینچا تانی اور رہا تھا پائی بھی ہوئی۔ مسلم لیگی ممبر چیخ پکار کرتے رہے۔ لیکن صدر نے یہ فیصلہ دے دیا کہ دونوں طرف ووٹ برابر ہیں۔ اور پھر اپنا کاسٹنگ ووٹ ری پبلکن امیدوار کے حق میں دیکر اسے کامیاب کرا دیا۔

اگلے دن بعض مسلم لیگی لیڈروں نے ہائی کورٹ میں اسمبلی کی کارروائی کو چیلنج کرنے کے لیئے درخواست دی۔ لیکن یہ بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ ادھر اسمبلی میں رائے شماری کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ممبر جنہوں نے مسلم لیگ کے ساتھ امیدیں وابستہ کی تھیں۔ ری پبلکن لیڈروں کے ساتھ سودے چکانے میں مصروف ہو گئے۔ ان ممبروں کے سرخیل سندھ کے ایک سیاستدان تھے۔ اسمبلی کی رائے شماری کے وقت وہ مسلم لیگی امیدوار کے حق میں پورا زور لگا رہے تھے۔ اگلی صبح کو وہ ہائیکورٹ میں درخواست کے سلسلے میں مسلم لیگی نمائندوں کے ساتھ پھر رہے تھے۔ اسی سہ پہر کو آپ نے ری پبلکن پارٹی کے وزیر کی حیثیت سے حلف اٹھا لیا۔

۶۱- مشرقی پاکستان میں نئے بحران

جب مغربی پاکستان میں ڈاکٹر خان صاحب کے سیاسی اقتدار کے لئے ری پبلکن پارٹی کا انتظام کیا جا رہا تھا تو اسی زمانے میں مشرقی پاکستان میں ایک عجیب سیاسی بحران رونما ہو رہا تھا۔ وہاں دو بڑی پارٹیاں (مولوی فضل الحق کی کرشک سرامک پارٹی اور مہروردی اور مولانا بھاشانی کی عوامی لیگ) ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا تھیں۔ لیکن ان دونوں پارٹیوں کے درمیان طاقت کا توازن فی الحقیقت اقلیتی فرقوں کے نمائندوں کے ہاتھ میں تھا۔ جو ان دونوں پارٹیوں سے باہر تھے۔ یہ نمائندے بھی کئی گروپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ مشرقی پاکستان اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے زیر اثر آ گئے تھے۔ جداگانہ انتخاب کے سسٹم کے پیش نظر اس قسم کی صورت حال غیر متوقع نہ تھی۔ اس پورے گروپ کی کمان کانگریس پارٹی کے ایک سرکردہ ممبر مسٹر بسنت کمار داس کے ہاتھ میں تھی جو خود پاکستان میں مقیم تھے۔ اور ان کا پورا خاندان کلکتہ میں تھا اور بھارتی شہریت کے حقوق رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اسمبلی کے اندر کسی نے اس صورت حال کی جانب اشارہ کیا تو مسٹر داس نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ ہندو نوجوانوں کو پاکستان میں اپنا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ لہٰذا ان کے بیٹوں نے بجا طور پر بھارت کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔

جون ۱۹۵۵ء میں جب مشرقی پاکستان میں گورنری راج (جو ۱۹۵۴ء کے انتخابات اور فسادات کے بعد نافذ کر دیا گیا تھا) ختم کیا گیا تو (مسٹر محمد علی بوگرہ کی سفارش پر) وزارت سازی کا موقعہ کرشک پارٹی کو دیا گیا تھا۔ اور اقلیتی فرقہ کے نمائندوں نے اسی پارٹی کے ساتھ تعاون کو منظور کر لیا تھا۔ چنانچہ کرشک پارٹی کی جانب سے مسٹر ابو حسین سرکار نے جو وزارت مرتب کی اس میں بسنت کمار داس اور اقلیتی فرقے کے دو اور نمائندے شامل تھے۔ جنوری یا فروری ۱۹۵۶ء میں جب چوہدری محمد علی نیا آئین پاس کرا رہے تھے۔

اور دستور ساز اسمبلی میں اقلیتی فرقے کے نمائندے آئین کی بعض تجاویز کے خلاف لڑ رہے تھے۔ تو مسٹر بی کے داس نے مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ پر سیاسی دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ آئین میں ان کے منشا کے مطابق تبدیلیاں کرائی جائیں۔ ورنہ وہ صوبائی کولیشن سے الگ ہو جائیں گے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ بجٹ پاس کرانے کے لئے اسمبلی کا اجلاس بلانا ضروری تھا اور اگر بی کے داس اور ان کا گروپ وزارت کا ساتھ نہ دیں تو وزارت کو اسمبلی میں شکست کے خطرے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مسٹر ابو حسین سرکار نے کراچی پہنچ کر چوہدری محمد علی سے کہا کہ اگر اقلیتی نمائندوں کو مطمئن نہ کیا گیا تو میری وزارت یقینی طور پر شکست کھا جائے گی۔

چوہدری محمد علی اقلیتی نمائندوں کے نقطہ نگاہ کے مطابق آئین میں ترمیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن انہوں نے سرکار وزارت کو بچانے کے لئے دوسری طرح جتن کئے۔ عارضی آئین میں ایک خاص ترمیم کے ذریعے صوبائی بجٹ کی میعاد ۳۱ مارچ کے بجائے ۳۱ مئی تک بڑھا دی۔ یعنی اس بات کا انتظام کر دیا کہ مسٹر سرکار اگر چاہیں تو اسمبلی کا بجٹ سیشن ابھی دو تین مہینے تک نہ بلائیں اور فی الحال اسمبلی کا سامنا نہ کریں پھر مارچ کے شروع میں انہوں نے کرشک پارٹی کے لیڈر مولوی فضل الحق کو مرکزی کابینہ سے اٹھا کر مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔ اس خیال سے کہ ان کی گورنری ابو حسین سرکار کی وزارت کو سہارا دے سکے گی۔ اور آنے والے خطرات سے بچا سکے گی۔ گورنر اور وزیر اعلیٰ نے کانگریس پارٹی کو منانے اور اس کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بات چیت کی۔ دوسری طرف عوامی لیگ نے بھی کانگریس پارٹی کے ساتھ سمجھوتے کی بات چیت شروع کر دی۔ مئی تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور بجٹ پاس کرانے کے لئے اسمبلی کا اجلاس بلانے کا وقت آ گیا۔

اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے بر سر عہدہ حضرات نے ایک عجیب تدبیر سوچ لی۔ اسمبلی کا اجلاس ۲۱ مئی کو طلب کیا گیا اور ایجنڈا یہ تجویز کیا گیا کہ بجٹ پیش کرنے کے بعد تین دن کا وقفہ ہو گا۔ تاکہ ممبر بجٹ کا مطالعہ کر سکیں۔ پھر دو دن بجٹ پر عام بحث کے لئے رکھے گئے اور صرف تین دن پورا بجٹ پاس کرنے کے لئے۔ ۳۱ مئی تک بجٹ پاس

کرنا ضروری تھا۔

طے شدہ منصوبہ کے مطابق اس ایجنڈے پر اعتراض کیا گیا کہ بجٹ پر بحث کیلئے وقت قطعاً کافی نہیں ہے جو اسمبلی کی حق تلفی کے مترادف ہے۔ سپیکر نے اس اعتراض کو درست تسلیم کر لیا اور جب مسٹر سرکار بجٹ پیش کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو سپیکر نے اس بنا پر انہیں بجٹ پیش کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور اسمبلی کا سیشن غیر معینہ تاریخ کے لئے ملتوی کر دیا۔ اب چونکہ بجٹ پاس کرانا ضروری تھا۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ عارضی طور پر آئین کو دفعہ ۹۲۔الف کے تحت معطل کر کے گورنر اپنے حکم سے بجٹ پاس کر دے۔ یہ ڈرامہ اس خوبصورتی کے ساتھ کھیلا گیا کہ بجٹ بھی پاس ہو گیا اور سرکار وزارت فوری طور پر اسمبلی کا سامنا کرنے سے بھی بچ گئی۔

یکم جون ۱۹۵۸ء کو دفعہ ۹۲۔الف کا حکم واپس لے لیا گیا تو سرکار وزارت پھر اپنے عہدے پر بحال ہو گئی۔ عوامی لیگ کے لیڈر شور مچاتے رہے کہ یہ کیا دھاندلی ہو رہی ہے اسمبلی کا اجلاس کیوں نہیں بلایا جاتا؟ سرکار وزارت کو مسلسل اسمبلی سے منہ چھپانے کا موقع کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس کے ساتھ ہی دونوں پارٹیاں دکرشک پارٹی اور عوامی لیگ مسٹر پی کے داس کو اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی تھیں اور مسٹر داس دونوں کے سامنے شرائط پیش کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں یہ دلچسپ الزام زیر بحث آیا کہ مسٹر پی کے داس یہ سب کچھ بھارتی ڈپٹی ہائی کمشنر کے مشورے سے کر رہے تھے۔ ۲۴ر مئی ۱۹۵۶ء کی شب کو ڈپٹی ہائی کمشنر بلائے چودھری کے مکان پر کانگریس پارٹی کے ممبروں کا اجتماع ہوا۔ جہاں یہ فیصلہ ہوا کہ ابوحسین سرکار کے ساتھ بات چیت ختم کر کے عوامی لیگ کے ساتھ سودا کر لیا جائے۔ جب مسٹر سرکار نے ایک اخباری بیان میں ان حالات کا انکشاف کیا تو بھارتی ہائی کمشنر نے یہ وضاحت کی کہ یہ اجتماع سیاسی نوعیت کا نہ تھا اور وہاں کوئی سیاسی گفت گو نہیں ہوئی۔ یہ اجتماع محض ایک ڈنر کی سوشل تقریب تھی۔ ابوحسین سرکار نے جواب میں پوچھا کہ جس ڈنر میں صرف ایک خاص سیاسی پارٹی کے ممبروں کو مدعو کیا جائے کیا اس کے متعلق کوئی شخص باور

کہنے لگا کہ وہ غیر سیاسی اجتماع تھا؟

بہرحال اس سیاسی ڈرامے سے اگلی صبح کانگریس پارٹی نے مسٹر سرکار کو آخری اور قطعی جواب دے دیا۔ لیکن گورنر فضل الحق اور ابو حسین سرکار نے ابھی ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے ایک اور ڈراما کھیلا۔ ۱۲ اگست سنہ ۱۹۵۶ء کے لئے اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ اجلاس کا وقت سہ پہر چار بجے مقرر تھا۔ اجلاس کے وقت سے چند گھنٹے پہلے گورنر نے اسمبلی کا سیشن ملتوی کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اور جب ممبر اجلاس میں شرکت کے لئے آئے تو اسپیکر نے انھیں یہ حکم پڑھ کر سنا دیا۔ عوامی لیگ کے ممبروں نے اپنا اجلاس منعقد کر کے گورنر کے اس فعل کے خلاف سخت احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ مولوی فضل الحق کو گورنری کے عہدے سے ہٹایا جائے۔

آخر مرکزی حکومت کو یہ ہدایت جاری کرنی پڑی کہ صوبائی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے۔ مسٹر سرکار نے چھ مہینے اسمبلی کا سامنا کئے بغیر گزار دیئے تھے۔ اب ان کے لئے کوئی چارہ کار نہ رہا اور وہ اسمبلی میں شکست کھانے سے پہلے ہی ۳۰ اگست سنہ ۱۹۵۶ء کو مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ عوامی لیگ کے لیڈر مسٹر عطاء الرحمٰن کو وزارت مرتب کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ اب عوامی لیگ وزارت مسٹر پی۔ کے داس کے گروپ کو راضی رکھنے پر مجبور تھی۔

۶۲- چوہدری محمد علی کا استعفا - اُنکی جگہ مسٹر سہروردی

وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے اپنی پالیسی کی وجہ سے خود اپنے لئے سخت پیچیدگیاں پیدا کر لی تھیں۔ انہوں نے بظاہر سکندر مرزا کے سیاسی مقاصد میں ہاتھ بٹانے کے لئے اس بات کی کوشش کی تھی کہ مغربی پاکستان میں ڈاکٹر خان صاحب مسلم لیگی وزارت کے "نان پارٹی" وزیر اعلیٰ بن جائیں اور اس بے جوڑ وزارت کو بیک وقت سکندر مرزا اور مسلم لیگ دونوں کی خوشنودی حاصل رہے لیکن وہ مغربی پاکستان کی مسلم لیگ پارٹی کو محض مشورہ دے سکتے تھے۔ اپنی خواہش اس پر مسلط نہ کر سکتے تھے۔ جب مسلم لیگ پارٹی نے اس مشورے کے خلاف فیصلہ کیا اور ڈاکٹر خان صاحب کو اپنی وزارت کا وزیر اعلیٰ بنانے کی تجویز نامنظور کر دی تو چوہدری صاحب مرکز میں مسلم لیگ پارٹی کے وزیر اعظم بنے رہے۔ لیکن مسلم لیگ کی سیاست سے بے تعلق ہو کر مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی جنگ کا تماشا دیکھتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ اس جنگ سے میری وزارت کو متاثر ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ صوبائی سطح پر آپس میں لڑنے کے باوجود دونوں پارٹیاں مجھ پر اعتماد کرتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دونوں پارٹیوں کے درمیان غیر جانب دار ظاہر کرتے تھے۔ لیکن ان کی غیر جانب داری فی الحقیقت ری پبلکن پارٹی کی جانب داری کے مترادف تھی۔ کیونکہ سکندر مرزا صدر کی حیثیت سے اپنے اثر و رسوخ اور قانونی اختیارات کو ری پبلکن پارٹی کے حق میں استعمال کر رہے تھے اور چوہدری صاحب اس بات کو گوارا کر رہے تھے۔ پھر مرکزی اسمبلی میں بھی سابق مسلم لیگ پارٹی کے دس ممبروں نے اپنے آپ کو مسلم لیگ سے علیحدہ کر کے ری پبلکن پارٹی بنا لی۔ لہٰذا مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ کرشک پارٹی کولیشن جس کے سربراہ چوہدری محمد علی تھے۔ تین پارٹیوں کی کولیشن بن گئی۔ مسلم لیگ۔ کرشک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی کی تکونی کولیشن ہے

مغربی پاکستان اسمبلی میں ری پبلکن پارٹی اور مسلم لیگ کو باہم دست و گریبان دیکھ کر

عوامی لیگ کے لیڈر مسٹر سہروردی نے ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے گٹھ جوڑ کے لئے کوشش کی۔ لیکن ری پبلکن پارٹی سیاسی سمجھوتے کرنے کے لئے آزاد نہ تھی۔ وہ صدر سکندر مرزا کے اشارے پر چلتی تھی۔ اور سکندر مرزا مرکزی وزارت عظمیٰ کی مسند پر چوہدری محمد علی کو بجائے رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ڈاکٹر خان صاحب نے سہروردی صاحب کو اپنے قریب نہ آنے دیا اور عوامی لیگ کے لیڈر کی کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ لیکن چوہدری محمد علی کی سیاسی پوزیشن روز بروز خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اسے مسلم لیگ ہائی کمان کب تک گوارا کرتا اور مرکز میں اس حکومت کے ساتھ تعاون کب تک کرتا۔ جو پارلیمانی سیاست کے سب سے اہم مورچے پر یعنی مغربی پاکستان اسمبلی میں مسلم لیگ کو ری پبلکن پارٹی کے ہاتھوں پچھاڑ رہی تھی؟ چوہدری صاحب بیک وقت کئی مشکل مسائل کے نرغے میں آ چکے تھے۔ مرکزی اسمبلی میں ان کی وزارت عظمیٰ کا تخت ایک تپائی بن گیا تھا۔ جس تپائی کا ایک پایہ (کرشک سرامک پارٹی) نیم شکستہ ہو چکا تھا۔ کرشک پارٹی اپنے صوبے میں شکست کھا چکی تھی وہاں عوامی لیگ اسمبلی کی اکثریت اور وزارت کی مسند پر قبضہ کر چکی تھی۔ کرشک پارٹی کی صوبائی وزارت ۳۰ اگست ۱۹۵۶ء کو مستعفی ہوئی۔ اسی دوران میں مسلم لیگ پارٹی نے چوہدری محمد علی کی حمایت سے دست کش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یعنی تپائی کا دوسرا پایہ بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ اسی زمانے میں خارجہ پالیسی کے معاملے میں چوہدری محمد علی اپنے آپ کو ایسی دلدل میں پھنسا ہوا محسوس کرتے تھے جس سے نکلنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کشمیر کا مسئلہ ان کی اور ان کے پیش رو کی مسلسل بے توجہی کے باعث عملاً ختم ہو چکا تھا۔ یہ مسئلہ رسمی طور پر سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر موجود تھا۔ لیکن وہاں اس کی پیروی کی جانب دیر سے کوئی توجہ نہ دی گئی تھی۔ امریکہ اور برطانیہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حکومت پاکستان سلامتی کونسل کے سامنے نئی درخواست پیش کرنے کی تجویز کو بار بار ملتوی کرتی رہی تھی۔ اسی زمانے میں ایک نیا اور بہت اہم بین الاقوامی مسئلہ پیدا ہو چکا تھا۔ جس نے عالمی سیاست کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ یہ مصر کے صدر ناصر کا نہر سویز کو قومی ملکیت اور کنٹرول میں لینے کا اقدام تھا۔ اس مسئلے کے متعلق چوہدری محمد علی کے نائب وزیر خارجہ مسٹر حمید الحق چوہدری کی حرکات دنیا سے

اسلام اور افریقی۔ایشیائی ممالک کی نگاہ میں پاکستان کے وقار کو سخت نقصان پہنچا چکی تھیں جس کی تلافی بہت مدت تک نہ ہو سکی۔

جب مسلم لیگ پارٹی نے چودھری محمد علی کی حمایت سے دست کش ہونے کا فیصلہ کیا تو چودھری صاحب کے لئے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں دوسرا یہ کہ پیر زادہ عبدالستار اور اس قماش کے دوسرے صاحبان کی پیروی کرتے ہوئے ایک پارٹی کو لات مار کر دوسری پارٹی کا دامن تھام لیں اور مشکلات کے باوجود کرسی وزارت سے چمٹے رہیں۔ ری پبلکن پارٹی اور کوئی چھوٹی کرشک پارٹی مرکزی اسمبلی میں ان کی وزارت کی تائید کے لئے موجود تھیں اور اس زمانے کے سیاست دانوں کے عام معیار کے مطابق وہ اپنی کرسی کی حفاظت کے لئے آئینی اور غیر آئینی حربے بھی استعمال کر سکتے تھے۔ صدر سکندر مرزا بھی ان کی پشت پناہی کے لئے تیار تھے۔ لیکن چودھری محمد علی نے اس حد تک جانا مناسب نہ سمجھا انہوں نے وزارت عظمیٰ سے اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سکندر مرزا نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ لیکن چودھری صاحب نہ مانے اور ۸ ستمبر ۱۹۵۶ء کو مستعفی ہو گئے۔ سکندر مرزا ذاتی طور پر مسٹر سہروردی کو اپنے لئے زیادہ مفید نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اس وقت انہیں اپنی پارٹی (ری پبلکن) کو برسر عہدہ رکھنے کی اور کوئی صورت اس کے سوا نظر نہ آتی تھی کہ اس کا کولیشن عوامی لیگ کے ساتھ کرا دیں اور مسٹر سہروردی کو بطور وزیر اعظم قبول کر لیں۔ لہٰذا آپ نے وزارت عظمیٰ کی پیشکش سہروردی کو کر دی اور ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کو سہروردی وزارت نے جو عوامی لیگ۔ ری پبلکن کولیشن وزارت تھی۔ عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ اس وزارت میں وزیر خارجہ کے عہدے پر ری پبلکن پارٹی کے ملک فیروز خان نون کو مامور کیا گیا۔ اس وقت لیاقت علی کے قتل کے بعد تقریباً پانچ برس گذر رہے تھے اور ان پانچ برسوں میں پاکستان کی چار وزارتیں بدل چکی تھیں۔

۶۳۔ مغربی پاکستان اسمبلی کے سالانہ جوڑ توڑ سیشن

مغربی پاکستان اسمبلی میں ری پبلکن پارٹی اور مسلم لیگ۔ پارٹی کے علاوہ ایک تیسری پارٹی بھی موجود تھی جو سندھ کے مسٹر جی۔ ایم سید کے زیر قیادت کام کرتی تھی۔ اس کا سرکاری نام وقتاً فوقتاً بدلتا رہا۔ لہٰذا یہ جی۔ ایم سید گروپ ہی کے نام سے مشہور رہی۔ اس پارٹی نے ایک یونٹ کو تڑوانا اپنا اول اور واحد مقصد قرار دے رکھا تھا۔ لیکن جب مغربی پاکستان اسمبلی نے کام شروع کیا تو اس مقصد کے لئے وہاں بظاہر کوئی گنجائش نظر نہ آتی تھی۔ ایک یونٹ کا منصوبہ مسلم لیگی لیڈروں ہی کی کوشش اور پشت پناہی کے طفیل معرض وجود میں آیا تھا اور ڈاکٹر خان صاحب کو بھی اس نئے صوبے کا وزیر اعلیٰ مقرر کرنے کا مقصد یہی ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ سرخ پوش جماعت کی مخالفت کے مقابلے میں اس منصوبے کی موثر حفاظت کر سکیں گے۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب کے گرد ری پبلکن پارٹی کی صورت میں جو ممبر جمع ہوئے ان میں ایک یونٹ کے مخالفوں کی کافی تعداد تھی۔

۱۹۵۷ء کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو مغربی پاکستان اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈروں نے مغربی پاکستان اسمبلی میں ری پبلکن وزارت کے قلعہ کے نیچے ایک دو بلکہ دو خفیہ بم رکھ دیئے۔ ایک بم یہ تھا کہ انہوں نے جی۔ ایم سید کو پیشکش کر دی کہ ہم ایک یونٹ کو توڑنے کے لئے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ آپ ری پبلکن وزارت کو توڑنے میں ہماری مدد کریں (اس سے پہلے سید گروپ مسلم لیگ کے مقابلے میں ری پبلکن پارٹی کا ساتھ دیتا رہا تھا)۔ دوسرا بم یہ تھا کہ مسلم لیگ لیڈروں نے ری پبلکن پارٹی سے بھی ایسے ممبروں کو اغوا کرنے کی کوشش شروع کر دی جو دل سے ایک یونٹ کے مخالف تھے۔

مسٹر جی۔ ایم سید مسلم لیگی لیڈروں کی پیشکش کا اصولاً خیر مقدم کرتے تھے۔ لیکن

پوچھتے تھے کہ کیا یہ پیشکش مسلم لیگ کے ہائی کمان کی مرضی اور اجازت سے کی جا رہی تھی؟ بعد میں مسلم لیگ اس وعدے سے منحرف تو نہ ہو جائے گی؟ سردار بہادر خان نے اس بارے میں جی۔ ایم سید کو مطمئن کرنے کے لئے انہیں پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری قاضی محمد عیسیٰ کی دستخطی چٹھی دی جس کا مفہوم یہ تھا کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۱۷ مارچ کو ہوا جہاں ذیل کی قرارداد منظور کی گئی اور ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسے ابھی شائع نہ کیا جائے "مغربی پاکستان کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی قطعی رائے یہ ہے کہ "ایک یونٹ" کا منصوبہ بالکل ناکام ثابت ہوا ہے۔ اور مسلم لیگ اس کی حمایت نہیں کر سکتی۔ عوام کی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ "ایک یونٹ" کے منصوبے کو بدلوا کر ایسا انتظام نافذ کرانے کے سوال پر غور کرے جو تمام علاقوں کے عوام کے لئے قابل قبول ہو" اس کے ساتھ ہی سردار بہادر خان نے اسمبلی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے ایک تحریری وعدہ مسٹر سید کو دے دیا کہ "ایک یونٹ" کو منسوخ کرنے کے لئے جو غیر سرکاری قرارداد اسمبلی کے ایجنڈے پر موجود ہے۔ اس پر جب آئندہ بحث ہوگی تو مسلم لیگ پارٹی اس کی حمایت کرے گی۔

کیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے واقعی اس مضمون کی قرارداد پاس کی تھی۔ جو مسٹر سید کو دکھائی گئی؟ یا قاضی محمد عیسیٰ نے سردار بہادر خان اور مسٹر جی۔ ایم سید کے درمیان سمجھوتے کی بات چیت کو کامیاب کرانے کے لئے سفید جھوٹ بول دیا تھا؟ یہ بات آج تک طے نہیں ہو سکی۔ قاضی محمد عیسیٰ کی چٹھی کچھ عرصہ صیغۂ راز میں رہی اور یہ راز اس وقت طشت از بام ہوا جب مسٹر جی۔ ایم سید نے مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ توڑ کر ری پبلکن پارٹی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ اور ری پبلکن پارٹی کو پبلک کے سامنے اپنی صفائی کی ضرورت پیش آئی۔ اس وقت بھی مسلم لیگ کے ذمہ دار حلقوں نے اس چٹھی کے متعلق خاموشی اختیار کی اور کسی نے حتمی طور پر پبلک کو یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ قاضی محمد عیسیٰ نے واقعی وہ چٹھی لکھی تھی یا نہیں اور اگر لکھی تھی تو کیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے واقعی ایک یونٹ کے خلاف قرارداد پاس کی تھی۔

بہرصورت مسلم لیگ پارٹی کے لیڈروں اور مسٹر سید کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا۔ ۱۹ر مارچ کی شب کو ایک بہت خفیہ اجتماع میں بعض دوسرے مذبذب ممبروں کے ساتھ بھی پخت وپز ہوگئی اور ۲۰ر مارچ کو سردار بہادر خاں نے اسمبلی میں ری پبلکن وزارت کو چیلنج دے دیا کہ آپ لوگ اکثریت کی حمایت سے محروم ہوچکے ہیں۔ اس کا ثبوت آپ زیر بحث مطالبہ زر کو اعتماد کا سوال بنا کر اور اس پر رائے شماری کرا کر حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جمہوری روایات کا یہی تقاضا یہ ہے کہ آپ مستعفی ہو جائیں۔ وزیروں کو بھی صاف نظر آگیا کہ ایوان میں صورت حال واقعی یہی تھی۔ انھوں نے تقریروں کو طول دے کر ایک دن کے لئے رائے شماری کے مرحلے کو ٹالنے کی کوشش کی۔ سپیکر نے ان کی مدد کی۔ اور انھوں نے تقریروں کا سلسلہ جاری رکھا۔ تاآنکہ اجلاس کا وقت ختم ہوگیا اور رائے شماری نہ ہوسکی۔ اجلاس سے اٹھ کر تمام وزیر ڈاکٹر خان صاحب کی کوٹھی میں جمع ہوئے۔ اب کیا کیا جائے؟ ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کیا کہ اب سیدھا راستہ یہ ہے کہ گورنر اور سکندر مرزا سے کہا جائے کہ اس اسمبلی کو توڑ دیں۔ اور ہمیں اسمبلی کے بغیر صوبے پر حکومت کرنے دیں۔ یہ مطالبہ لے کر ڈاکٹر خان صاحب اپنے وزیروں سمیت رات کے نو دس بجے گورنر گورمانی کے پاس پہنچے۔ گورنر نے مناسب کارروائی کا وعدہ کر لیا۔ اگلی صبح کو ڈاکٹر خان صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں عجیب سنجیدگی کے ساتھ اپنے مطالبے کے جواز میں کہا کہ اس اسمبلی نے اپنے آپ کو بے ایمانوں کا ٹولہ ثابت کر دیا ہے۔ ایک دن پہلے اکثریت ہمارے ساتھ تھی۔ راتوں رات کچھ ممبر حزب مخالف سے جا ملے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق اس اسمبلی کو توڑنا ہی مناسب تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ ان کی وزارت قائم کرنے کے لئے ممبروں کا راتوں رات اپنی پارٹی کو چھوڑ دینا جائز تھا۔ لیکن وزارت کے خلاف یہی حرکت ناجائز اور قابل سزا تھی۔ گورمانی صاحب کو ان حالات میں سب سے مناسب صورت یہ نظر آئی کہ اسمبلی اور وزارت دونوں معطل ہو جائیں اور حکومتی اختیارات گورنر کے ہاتھ میں آجائیں۔ چنانچہ انھوں نے صدر سکندر مرزا اور وزیر اعظم سہروردی کو بھی مشورہ دیا کہ وہ آئین کی دفعہ ۱۹۳ سے کام لیں اور اسمبلی اور وزارت دونوں کو معطل کر دیں۔ صدر سکندر مرزا اپنی جگہ گورمانی۔ سہروردی گٹھ جوڑ سے ڈرتے تھے۔

لیکن گورمانی صاحب کی تجویز ایسی تھی جو سکندر مرزا کو بھی خود اپنے نقطۂ نگاہ سے مناسب معلوم ہوتی تھی۔ اگر صرف اسمبلی کو توڑا جائے (ایک قانونی نکتہ یہ بھی تھا کہ کیا اس اسمبلی کو توڑا جا سکتا تھا؟) تو ایک خاص میعاد کے اندر نئے انتخاب کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ جس سے سکندر مرزا گھبراتے تھے۔ اس کے برعکس دفعہ ۱۹۳ کے تحت صوبائی آئین کو معطل کر کے کچھ عرصے کے بعد ری پبلکن وزارت کو دوبارہ مسند اقتدار پر بٹھانے کی گنجائش موجود تھی۔ لہذا سکندر مرزا نے صوبائی آئین معطل کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن حکومتی اختیارات مکمل طور پر گورنر کے سپرد نہ کئے۔ انہیں صرف جزوی اختیارات سونپے۔ باقی اپنے ہاتھ میں رکھے۔

اس اعلان کے بعد ڈاکٹر خان صاحب اپنے وزیروں کی کھیپ لے کر کراچی پہنچے اور سکندر مرزا سے پوچھنے لگے کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ ہم نے اسمبلی کی تنسیخ کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ نے اسمبلی اور وزارت دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا۔ سکندر مرزا نے ڈاکٹر خان صاحب کو سمجھایا کہ آپ کا فائدہ اسی بات میں ہے کہ اسمبلی کا نیا انتخاب نہ کرایا جائے بلکہ عارضی تعطل کے بعد آپ کی وزارت کو پھر برسر عہدہ آنے کا موقع دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ وہ اور ان کے ساتھی وزیر لاہور واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں ہدایت کر دی کہ ہم صرف معطل ہوئے ہیں ہم اب بھی وزیر ہیں گو وزارت کا کام نہیں کر سکتے۔ لہذا اپنی کاروں پر جھنڈے لگے رہنے دو۔ بعض وزیروں نے اس کا یہ مطلب لیا کہ اپنے سرکاری پی۔ اے صاحبان سے بھی نجی کام لیتے رہے اور سرکاری کوٹھیوں میں بلا تکلف سرکاری بجلی، ٹیلیفون وغیرہ استعمال کرتے رہے۔ تا آنکہ اکاؤنٹنٹ جنرل نے اس صورت حال پر اعتراض کیا اور وزراء صاحبان کو ان سہولتوں سے دست بردار کرا دیا۔

مسلم لیگی لیڈر سردار بہادر خان نے آئین کے تعطل کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ یہ مفروضہ بالکل غلط ہے کہ صوبۂ مغربی پاکستان کا کام آئین کے منشا کے مطابق نہیں چلایا جا سکتا۔ مسلم لیگ پارٹی ایوان کی اکثریت کی مدد سے وزارت کا کام چلانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ لہذا دفعہ ۱۹۳ کے نفاذ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ری پبلکن وزارت کی ناکامی کے بعد حزب مخالف کو وزارت مرتب کرنے کی دعوت ملنی چاہیے۔ لیکن سکندر مرزا مسلم لیگ کو

برسرِ اقتدار لانے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ جو لوگ "ایک یونٹ" کو توڑنے کے عزائم رکھتے ہیں۔ انہیں وزارت کیسے سپرد کی جا سکتی ہے؟ ایک یونٹ کو توڑنے کے عملی معنی یہ ہیں کہ ملک کے پورے آئین کو منسوخ کر کے از سرِ نو مرتب کیا جائے اور انتخابات کو غیر معین عرصے کے لئے ملتوی رکھا جائے۔ اس قسم کی صورتِ حال پیدا کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دی جا سکتی۔"

صوبہ مغربی پاکستان میں دفعہ ۱۹۳ کا حکم ۲۱ مارچ ۱۹۵۷ء کو دو ماہ کے لئے نافذ کیا گیا تھا۔ بعد میں مرکزی اسمبلی کی منظوری سے اس کی میعاد ۳۰ ستمبر تک بڑھا دی گئی۔ لیکن آئینی تعطل کا مقصد اس سے پہلے ہی پورا ہو گیا اور جب صدر سکندر مرزا کو اطمینان ہو گیا کہ ری پبلکن پارٹی نے اپنی کھوئی ہوئی اکثریت پھر حاصل کر لی ہے تو وہ دفعہ ۱۹۳ کا حکم منسوخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ری پبلکن پارٹی کے کیمپ سے بھاگے ہوئے ممبروں کو واپس لانے کے لئے یہی بات کافی تھی کہ ان پر واضح کر دیا گیا تھا کہ مرکزی حکومت مسلم لیگ پارٹی کو صوبائی وزارت سونپنے کے لئے کسی صورت میں تیار نہیں ہے۔ لہٰذا جو ممبر اس امید پر ری پبلکن پارٹی کو چھوڑ گئے تھے کہ مسلم لیگ کی وزارت بنے گی تو انہیں انعام و اکرام میں حصہ ملے گا۔ اُلٹے پاؤں واپس ہو گئے۔ صدر سکندر مرزا نے اپنا حکم واپس لینے کا فیصلہ اس شرط پر کیا کہ ری پبلکن پارٹی اپنی اکثریت کا ثبوت بہم پہنچا دے۔ یہ بھی محض تکلف تھا۔ بہرحال جولائی ۱۹۵۷ء کے شروع میں ری پبلکن پارٹی نے لاہور میں اپنے ممبروں کو جمع کیا۔ حاضر ممبروں کی تعداد ۱۴۳ تھی (ایوان کے کل ممبروں کی تعداد ۳۰۵ تھی جن میں پانچ نشستیں خالی تھیں) تاہم بعض ممبروں کی چٹھیاں ان کی حاضری کے مترادف سمجھ لی گئیں۔ اور اس اجلاس کے متعلق اپنی رپورٹ صدر کو پیش کرنے کے لئے گورنر گورمانی نتھیا گلی روانہ ہو گئے اور وہاں یہ فیصلہ ہو گیا کہ تعطل کا حکم ختم کر کے ری پبلکن پارٹی کی وزارت کو فوراً بحال کر دیا جائے۔ لیکن یہاں ایک اور اہم فیصلہ بھی ہوا۔ فی الحقیقت یہ فیصلہ اس سے کچھ عرصہ پہلے ہی ہو چکا تھا یہاں صرف اس کی تفصیل طے ہوئی۔ فیصلہ یہ تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب وزیرِ اعلیٰ کے عہدے سے دست بردار ہو جائیں اور اپنی جگہ کسی اور کو اس عہدے پر بٹھا کر خود پارٹی کے سرپرست

اور غیر رسمی سربراہ بنے رہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب کا اتنے عرصے تک تجربہ کرنے کے بعد سکندر مرزا کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی ان کے ساتھ ذاتی وفاداری بے شک بہت استوار تھی۔ لیکن ایک اہم سیاسی اور انتظامی عہدے کی ذمہ داریوں کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بہرہ ور نہ تھے۔ لہٰذا سکندر مرزا نے پہلے ڈاکٹر صاحب کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ مرکزی اسمبلی میں ری پبلکن پارٹی کی رسمی قیادت کا عہدہ چھوڑ دیں۔ پھر انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مغربی پاکستان کی وزارت عظمیٰ سے بھی دست کش ہو جائیں۔ نتھیاگلی میں یہ تفصیل طے ہو گئی کہ ڈاکٹر صاحب وزیر اعلیٰ کے عہدے پر بحال ہونے کے فوراً بعد استعفا دیدیں گے اور اپنی جگہ سابق صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید کو پارٹی لیڈر منتخب کرا دیں گے اور سردار عبدالرشید اپنی وزارت میں نواب مظفر علی قزلباش کو (جو سکندر مرزا کی نگاہ میں آ گئے تھے) شامل کر لیں گے۔ گورنر اور دوسرے صاحبان لاہور واپس پہنچے تو ان سب فیصلوں کی تعمیل ہو گئی اور سردار عبدالرشید کی وزارت نے ۱۸ جولائی ۱۹۵۷ء کو عہدے کا حلف اٹھا لیا اور اسمبلی کا اجلاس ۱۸ ستمبر کے لئے طلب کر لیا۔

اب اصولوں کی سودے بازی کے ڈرامے کا دوسرا ایکٹ شروع ہوا اور یہ ایکٹ خفیہ یا پس پردہ نہ تھا بلکہ سٹیج پر تماشائیوں کی نگاہوں کے سامنے کھیلا گیا۔ اسمبلی کے سیشن سے ایک دن پہلے ۱۷ ستمبر کو جی ایم سید گروپ نے (اب بعض تنظیمی تبدیلیوں کی وجہ سے اس کا سرکاری نام "پاکستان نیشنل پارٹی" کی جگہ "نیشنل عوامی پارٹی" ہو گیا تھا) اپنا ایک اجلاس منعقد کیا۔ اس میں مسٹر سید نے بتایا کہ "ایک یونٹ" کو توڑنے میں مدد دینے کے لئے مسلم لیگ پارٹی اور ری پبلکن پارٹی دونوں ہمیں اپنی اپنی خدمات پیش کر رہی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ہمارے تعاون کی خواہاں ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ ہم کون سی پارٹی کی بولی منظور کریں۔

ظاہر تھا کہ ایسی صورت میں جب انہیں دونوں طرف سے مساوی پیش کش کی جا رہی تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ارکان کا (جن کی سابقہ روایت مسلم لیگ کے خلاف دشمنی کی تھی) رجحان ری پبلکن پارٹی کی جانب ہونا ناگزیر تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے صوبائی صدر خان عبدالغفار

خان تھے۔ اور ری پبلکن پارٹی کے لیڈر نہ سہی برائے نام "سپر لیڈر" ڈاکٹر خان صاحب تھے۔ انگریزی محاورے کے مطابق خون پانی کی نسبت زیادہ گاڑھا ہوتا ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی نے ری پبلکن پارٹی کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ معاہدہ کا مفہوم یہ تھا کہ دونوں پارٹیاں ایک یونٹ کو توڑ کر اس کی جگہ مغربی پاکستان کے چار خود مختار صوبوں کی ذیلی فیڈریشن قائم کرانے کے لئے ضروری قدم اٹھائیں گی۔

اس معاہدے پر ری پبلکن پارٹی کی طرف سے صوبائی اسمبلی کے پارٹی لیڈر سردار عبدالرشید اور مرکزی اسمبلی کے پارٹی لیڈر ملک فیروز خان نون نے دستخط کئے۔ نیشنل عوامی پارٹی کی طرف سے دستخط کرنے والوں میں مسٹر جی ایم سید۔ خان عبدالغفار خان اور میاں افتخار الدین شامل تھے

اس معاہدے کا اعلان ہو گیا۔ اور ۱۴ اگست کو صوبائی اسمبلی کے اجلاس کے بعد اسمبلی کی ری پبلکن پارٹی کے ایک اجلاس نے اس معاہدے کی توثیق کر دی۔ ری پبلکن لیڈر اپنے اس کردار کی صفائی میں جو کچھ کہتے ہیں اس کا ماحصل یہ تھا کہ کیا عہدے کی خاطر سیاسی بے ایمانی اور بے اصولی کرنے کا حق صرف مسلم لیگ پارٹی کو حاصل ہے؟ اگر مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر عہدے کے لالچ میں ایک یونٹ کے خلاف جی ایم سید کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ اور اپنے سابقہ موقف سے انحراف کر سکتے ہیں۔ تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

دو دن کے بعد یعنی ۱۷ اگست کو مغربی پاکستان اسمبلی نے اس معاہدے کے مطابق ایک باضابطہ قرارداد پاس کر دی۔ جس میں صوبائی حکومت کے ذریعے مرکزی حکومت سے یہ سفارش کی گئی تھی کہ وہ ایک یونٹ کے بجائے مغربی پاکستان میں چار خود مختار صوبوں کی ذیلی فیڈریشن کے قیام کے لئے ضروری قدم اٹھائیں۔

اس قرارداد کے حق میں ری پبلکن پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے مشترکہ ایک سو سات ووٹ پڑے۔ چار آزاد ممبروں نے اس کے خلاف ووٹ دیئے۔ مسلم لیگ پارٹی نے نہ بحث میں حصہ لیا۔ نہ رائے شماری میں۔ اس کے سوا اور چارہ بھی کیا رہ گیا تھا؟

ری پبلکن پارٹی نے اس حد تک اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ لیکن "ایک یونٹ" پھر بھی موجود رہا۔ مرکزی حکومت آئین میں تبدیلی کے لئے کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہ ہوئی۔ اب مسٹر

یہ مطالبہ کرتے تھے۔ کہ ری پبلکن پارٹی معاہدے کی پابندی کے طور پر اس سے آگے قدم
اٹھائے اور اگر مرکزی حکومت نہیں مانتی تو وزارت چھوڑنے اور تعطل پیدا کرنے کی دھمکی
دے۔ لیکن وزارت چھوڑنا ری پبلکن پارٹی کے لئے امرِ محال تھا۔ وہ اپنے مختلف ممبروں کی
زبان سے مختلف جواب دیتی رہی۔ تا آنکہ اسمبلی کا ۱۹۵۸ء کا بجٹ سیشن (جو اپنی طوالت
کی وجہ سے جوڑ توڑ سیشن بن جاتا تھا) آگیا اب مسٹر سید نے انتقام کی خاطر پھر مسلم لیگ سے
رجوع کیا۔ اس سے پہلے مسلم لیگ کونسل نے اکتوبر ۱۹۵۷ء کے اجلاس ڈھاکہ میں لیگ کا
جماعتی موقف ایک یونٹ کے حق میں متعین کر لیا تھا۔ لہٰذا مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ساتھ
ایک یونٹ کو توڑنے کے سوال پر تو سمجھوتہ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن مسٹر سید کے پیش نظر محض
انتقام تھا۔ انہوں نے بعض دوسرے امور کی بنا پر جو زیادہ تر سابق صوبۂ سندھ کے مقامی
مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ مسلم لیگ پارٹی سے سمجھوتہ کر لیا۔ جب یہ افواہ پھیلی کہ سید گروپ
ری پبلکن وزارت کی حمایت سے دست کش ہو کر مسلم لیگ پارٹی کا ساتھ دینے والا ہے
تو ری پبلکن پارٹی کے اندر پھر انتشار کے آثار پیدا ہوئے اور وزارت کا جہاز ڈگمگانے لگا۔ اس
مرحلے پر پارٹی کے بعض سرکردہ ممبر سردار عبدالرشید خاں کو پارٹی کی قیادت سے ہٹانے اور
کسی زیادہ فعال شخص کو ان کی جگہ دینے پر اصرار کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ سابق انسپکٹر
جنرل پولیس عبدالرشید خاں ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ناکام ثابت ہوئے ہیں کیوں کہ
وہ ممبروں کو راضی رکھنے اور سیاسی جوڑ توڑ کے گُر نہیں جانتے۔ لہٰذا پارٹی نے وزارت کے جہاز
کو آنے والے تلاطم سے بچانے کے لئے ایک نیا کپتان منتخب کر لیا۔ یہ نواب مظفر علی قزلباش
تھے۔ مسلم لیگ۔ جی۔ ایم سید معاہدے اور ری پبلکن پارٹی کے نئے فیصلے کے اعلان تقریباً
ایک ہی وقت ہوئے۔ ۷ مارچ ۱۹۵۸ء کو معاہدے کا اعلان ہوا۔ ۱۸ مارچ کو ری پبلکن
پارٹی کے ایک اجلاس نے قیادت کے منصب سے سردار عبدالرشید کا رسمی استعفیٰ منظور
کرتے ہوئے نواب قزلباش کو اپنا قائد منتخب کر لیا۔

مغربی پاکستان کا بجٹ سیشن جاری تھا مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان چھوٹی
چھوٹی جھڑپیں ہو رہی تھیں اور مسلم لیگ پارٹی فیصلہ کُن حملے کے لئے اپنی صفیں درست کر

رہی تھی۔ یہ حملہ اس نے ۲۰ مارچ کو کیا۔ کچھ دیر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وزارت رائے شماری سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور اسے اپنی شکست کا یقین ہو چکا ہے۔ اس دن اسمبلی کی پبلک گیلریاں تماشائیوں سے بھری ہوئی تھیں جو ری پبلکن وزارت کی شکست کا تماشا دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ مسلم لیگ پارٹی کو یقین تھا کہ وزارتی پارٹی کے جن ممبروں کے ساتھ اس کی خفیہ پخت و پز ہو چکی تھی۔ ان میں کم از کم اتنے ممبر اپنے وعدے پورا کریں گے کہ وزارت کو یقینی طور پر شکست ہو جائے گی۔ لیکن نواب قزلباش کے جاسوس بھی مصروف کار تھے۔ اور ممبروں سے وعدے وعید کر رہے تھے۔ بجٹ کا ایک مطالبہ زیر بحث تھا۔ مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر سردار بہادر خاں نے وزارت کو چیلنج دیا کہ مزید بحث غیر ضروری تکلف ہے۔ وزارت ایوان کی اکثریت کے اعتماد سے محروم ہو چکی ہے۔ اس بات کا ثبوت فوری رائے شماری سے مل سکتا ہے۔ وزیر خاموشی سے ہوئے اپنی نشستوں پر بیٹھے رہے۔ ری پبلکن پارٹی کے بعض دوسرے ممبر نیم دلی کے ساتھ فوری رائے شماری کے مطالبے کی مخالفت کرتے رہے۔

اتنے میں تماشائیوں نے دیکھا کہ قزلباش ایوان سے اٹھ کر لابی میں گئے۔ کیا وہ میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے؟ مسلم لیگی بنچوں سے جو آوازے کسے گئے۔ ان سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن دو منٹ کے بعد وہ اپنی نشست پر واپس آ گئے۔ غالباً لابی میں انہیں وہ اشارہ مل گیا تھا جس کے وہ منتظر تھے۔ انہوں نے اٹھ کر کہا: "میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔ زیر بحث مطالبہ زر پر فوری رائے شماری کرائی جائے۔ اگر اکثریت نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم اسے اپنے خلاف عدم اعتماد کا اظہار سمجھیں گے۔"

رائے شماری ہوئی تو وزارتی پارٹی ۲۶ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئی۔ اس کے حق میں ۱۶۳ ووٹ تھے۔ اور خلاف ۱۳۷ ووٹ تھے۔ یہ بجٹ سیشن گذر گیا تو آئندہ بجٹ سیشن تک مغربی پاکستان اسمبلی کا کوئی اجلاس بلانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن اس دوران میں اکتوبر ۱۹۵۸ء کا فوجی انقلاب آ گیا۔

٦۴۔ خارجہ پالیسی کے سات سال تاریخی واقعات کے آئینے میں

کمیونزم کی روک تھام کے لئے مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کا منصوبہ امریکہ نے ۱۹۵۱ء ہی میں مختلف ممالک کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اس وقت یہ منصوبہ مڈل ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن (یا مختصراً "میڈو") کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کے متعلق مصر کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ اول سویز کے علاقے میں برطانیہ کا فوجی اڈہ ختم ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر مصر کی آزادی مکمل نہیں ہوتی اور جب تک مصر آزاد ہی نہ ہو اس وقت تک اس کے لئے کمیونزم کے خطرے سے اپنی آزادی کو محفوظ کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان میں لیاقت علی خان کا ردعمل بھی یہی تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ممالک کے لئے دوسرے مسائل (کشمیر، فلسطین، ایران کے تیل کا قضیہ اور سویز کے علاقے میں برطانوی فوجی اڈے کے متعلق تنازعہ) کمیونزم کے خطرے کی نسبت زیادہ اور فوری اہمیت رکھتے ہیں۔

خواجہ ناظم الدین کے زمانے میں (اس وقت خارجہ پالیسی مرتب کرنے میں وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں کو زیادہ موثر عمل دخل حاصل ہو گیا تھا) حکومت پاکستان کے اندازِ فکر میں دور رس تبدیلی آگئی اور پاکستان کے پالیسی بنانے والے اس طرح سوچنے لگے کہ دوسرے مسائل سے قطع نظر پاکستان کے لئے اپنے دفاع اور اپنی اقتصادی ضروریات (قلت خوراک کا مسئلہ اس وقت سنگین صورت اختیار کر رہا تھا) کا مسئلہ سب سے اہم ہے اور اسے حل کرنے کا بہترین بلکہ ناگزیر طریقہ یہ ہے کہ امریکہ کی حفاظت اور اس کی فوجی اور اقتصادی امداد پر بھروسہ کیا جائے۔ لہٰذا پاکستان کو امریکہ کا منصوبہ مشرقِ وسطیٰ کی

حفاظت سے زیادہ خود اپنی حفاظت کی خاطر منظور کر لینا چاہئے۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ اس منصوبے کو عملی شکل دینے میں تاخیر ہوتی رہی۔ اس کی بڑی وجہ امریکہ کی یہ خواہش تھی کہ مجوزہ دفاعی تنظیم میں دو چار ملکوں کو (بالخصوص مصر کو) شامل کر کے اسے عملی شکل دی جائے جولائی ۱۹۵۲ء میں مصر کی حکومت ایک انقلابی کونسل کے ہاتھ میں آگئی جس کے سربراہ جنرل نجیب تھے۔ پاکستان کی وزارت خارجہ نے اور امریکہ کے دفتر خارجہ نے جنرل نجیب کے ساتھ قریبی رابطہ قائم رکھا اور دونوں ملک اپنے اپنے انداز میں مصر کے سربراہ سے بات چیت کرتے رہے ۱۹۵۳ء کے آخر تک یہی کیفیت رہی۔

اس دوران میں پاکستان اور مصر کے سرکاری نمائندوں کے درمیان جو بات چیت ہوتی رہی۔ اس سے مصر کی حکومت نے ایک عجیب نتیجہ لیا۔ جس کا اظہار ۱۱ جنوری ۱۹۵۴ء کو عبدالوہاب عظام نے کیا جو اس وقت پاکستان میں مصر کے سفیر تھے۔ مصری سفیر نے قاہرہ میں (جہاں وہ اپنی حکومت کی طلبی پر صلاح و مشورہ کے لئے گئے تھے) ایک بیان دیتے ہوئے مصر کے متعلق پاکستان کے دوستانہ رویہ کی تعریف کی اور کہا کہ پاکستان نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کے کسی معاہدے پر اس وقت تک دستخط نہ کرے گا جب تک عرب ممالک۔ بالخصوص مصر۔ اس معاہدے میں شرکت منظور نہ کریں۔ اس بیان کی کوئی تردید نہ کی گئی۔ لیکن فی الحقیقت پاکستان کا موقف وہ نہ تھا جو مصری سفیر نے بیان کیا۔ پاکستان مصر کو "میڈو" میں لانے کا بے حد خواہشمند ضرور تھا۔ لیکن خود اپنے قومی نقطۂ نظر کے لحاظ سے یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مصر مانے یا نہ مانے پاکستان کے لئے امریکہ کی دفاعی تجویز میں شرکت بہر صورت مفید ہوگی۔ فروری ۱۹۵۴ء میں مصر میں ایک انقلاب در انقلاب آگیا اور جنرل نجیب کی جگہ حکومت کی باگ ڈور ایک نوجوان فوجی افسر کرنل جمال ناصر کے ہاتھ میں آگئی۔ مصر کا نیا لیڈر "عرب نیشنلزم" کے مقاصد اور پروگرام کے متعلق بہت محکم اور مضبوط پالیسی اپنے ساتھ لایا۔ اس نے "میڈو" کی تجویز کے مقابلے میں ایسی جوابی تجاویز پیش کیں کہ مصر کی "میڈو" میں شمولیت کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ امریکہ نے اس طرف سے

مایوس ہو کر صرف دو ملکوں (پاکستان اور ترکی) کے ساتھ "میڈو" کا آغاز کر دیا۔ پاکستان اور ترکی نے ۲ر اپریل ۱۹۵۴ء کو باہمی دفاعی معاہدے پر دستخط کئے۔ یہ پاکستان میں اس وزارت کا زمانہ تھا جو گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے فوراً بعد بنائی تھی۔ اس میں وزیر اعظم مسٹر محمد علی بوگرہ اور وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں تھے۔

ابھی سویز کے علاقے سے برطانوی افواج کے انخلاء کے متعلق مصر کا مطالبہ اپنی جگہ موجود تھا۔ بھارت دو سال سے اس مطالبے کی مثبت حمایت کر رہا تھا۔ پاکستان اس حد تک مصر کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوا تھا گو پاکستان کے نمائندے مصر کے لیڈروں کے ساتھ بھی گفت گو میں ان کے مطالبے کے ساتھ دلی ہمدردی ظاہر کرتے رہتے تھے اور یہ کہتے رہتے تھے کہ ہم ہمدردانہ غیر جانب داری کا رویہ قائم رکھتے ہوئے ہم برطانیہ کو سمجھانے بجھانے کا کام بہتر طریق پر انجام دے سکتے ہیں۔ اور مصر کے لئے مفید نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بھارت نے مصر کے مطالبے کی (جو فی الحقیقت تمام عرب ممالک کے قوم پرست حلقوں کا مطالبہ تھا) دوٹوک حمایت کر کے اپنے آپ کو مصر سے ایک درجہ قریب تر کر لیا تھا۔ تاہم ابھی تک پاکستان اور مصر کے باہمی تعلقات میں کسی ایسے عنصر کا شائبہ پیدا نہ ہوا تھا جسے کشیدگی کا نام دیا جا سکے۔ پاکستان اور ترکی کے باہمی دفاعی معاہدے پر مصر کے بعض اخباروں میں خفیف نکتہ چینی ہوئی۔ لیکن خود کرنل ناصر نے اس بارے میں بہت محتاط اور رواداری کا رویہ اختیار کیا۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۵۴ء کو ایک پریس کانفرنس میں آپ نے اس معاہدے کے متعلق اپنا ردعمل بیان کیا۔ آپ نے کہا کہ پاکستان اور ترکی کا باہمی دفاعی معاہدہ یا ان ملکوں کا امریکہ کی فوجی امداد قبول کرنا ان ملکوں کا اپنا قومی مسئلہ ہے مشرق وسطی کے دفاع کے نقطۂ نگاہ سے یہ معاہدہ ایک غیر متعلق شے ہے۔ مشرق وسطی کی موثر دفاعی تنظیم وہی ہو سکتی ہے جس کی ذمہ داری عرب ممالک قبول کریں۔ اس کے بعد ۸ر ستمبر ۱۹۵۴ء کو پاکستان نے امریکہ۔ برطانیہ۔ فرانس۔ تھائی لینڈ اور فلپائن وغیرہ کے ساتھ جنوب مشرقی ایشیا کے دفاعی تنظیم (سیٹو) کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ عرب ممالک میں اس کے خلاف بھی کوئی خاص ردعمل نہ ہوا۔ واضح رہے کہ ان معاہدوں

کی بنا پر بھارت پاکستان کو بدنام کرنے کی مہم چلا رہا تھا اور پاکستان کو عرب ممالک کی آزادی کے خلاف مغربی ممالک کے منصوبوں کا ایجنٹ ظاہر کر رہا تھا۔ یہی پراپیگنڈہ روس نے شروع کر دیا تھا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ان معاہدوں کے باوجود ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے عالمی عدالت کے ایک خالی عہدے کے لئے ایک جج کا انتخاب کیا تو مصر اور دوسرے عرب ممالک نے بھارتی امیدوار کے مقابلے میں پاکستان کے چوہدری ظفراللہ خاں کو ووٹ دیئے۔

پھر جب عراق کو باقی عرب ممالک سے الگ "میڈو" کے منصوبے میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ تو عرب ممالک میں سخت ہنگامہ ہو گیا۔ اس بارے میں کرنل ناصر کے خیالات بہت سخت اور بے لچک تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ عرب لیگ کے منشور کی رو سے تمام عرب ممالک (جو عرب لیگ کے ممبر تھے) اپنے دفاع اور اہم بین الاقوامی مسائل کے متعلق باہم مشورے اور یک جہتی کے ساتھ عمل کرنے کے پابند تھے۔ اور اگر کوئی عرب ملک عرب لیگ سے بالا بالا اپنے طور پر دوسرے ملکوں کے ساتھ دفاعی تنظیم کے معاہدے کرتا ہے تو وہ لیگ کے منشور اور عرب نیشنلزم کے مقاصد سے غداری کرتا ہے۔ عراق کا وزیر اعظم نوری السعید برطانوی حکومت کے ساتھ خاص ذاتی تعلقات رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ "میڈو" میں شرکت کے متعلق خفیہ بات چیت ہوتی رہی اور جب کچھ پخت وپز ہو گئی تو ترکی کا وزیر اعظم عدنان مندریس جنوری ۱۹۵۵ء میں نوری السعید کے ساتھ باضابطہ بات چیت کرنے کے لئے بغداد پہنچا۔ اس بات چیت کے متعلق عربوں کے قوم پرست حلقوں نے شکوک و شبہات ظاہر کئے جن کی تصدیق ۱۳ جنوری ۱۹۵۵ء کو ایک سرکاری بیان سے ہو گئی جو نوری السعید اور عدنان مندریس کے مشترکہ دستخطوں سے جاری ہوا۔ اس بیان میں دونوں ملکوں ترکی اور عراق کے درمیان دفاعی معاہدے کے فوائد پر زور دیا گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہم نے فی الحال دو ملکوں کے درمیان معاہدے کی تجویز کی ہے۔ لیکن ہم ایسے معاہدے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں جس پر کئی ملکوں کے دستخط ہوں گے۔ جب

یہ بیان چھپا تو بغداد میں اور اس کے بعد دمشق میں (عدنان مندریس وہاں بھی شام کی حکومت سے بات چیت کرنے گئے) عرب طلبہ نے ترکی وزیر اعظم کے خلاف مظاہرے کئے۔ بغداد میں ترکی سفارت خانے پر بم پھینکا گیا کرنل ناصر نے عرب لیگ کا ہنگامی اجلاس بلایا۔ عراق کے وزیر اعظم نے بیماری کا بہانہ کر کے اس کی تاریخ کو ملتوی کرانا چاہا۔ لیکن یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ لیگ کے اجلاس نے چار عرب ملکوں کے وزرائے اعظم پر مشتمل ایک وفد نوری السعید کو سمجھانے کے لئے بھیجا۔ وہ نہ مانا اور ۲۴ فروری ۱۹۵۵ء کو عراق اور ترکی کے درمیان دفاعی معاہدے پر دستخط ہو گئے جس کے بعد ناصر اور نوری السعید کے درمیان "سرد جنگ" بہت شدت کے ساتھ شروع ہو گئی۔ عرب ممالک کی رائے عامہ اس جنگ میں ناصر کے ساتھ تھی۔ لیکن ابھی تک عرب ممالک کی خفگی کا نشانہ نوری السعید کے علاوہ صرف ترکی، برطانیہ اور امریکہ تھے۔ جن کے خلاف کرنل ناصر اور ان کے ہم نوا عرب قوم پرست حلقوں کا الزام یہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ جان بوجھ کر عرب نیشنلزم کے مقاصد کو شکست دینے اور عربوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کر رہے ہیں اور عدنان مندریس اور نوری السعید ان کے ایجنٹ بن گئے ہیں۔ پاکستان ابھی اس تصویر کے پیش منظر میں نہ تھا۔ ابھی تک پاکستان کا ایک دفاعی معاہدہ براہ راست ترکی کے ساتھ تھا اور فوجی امداد کا ایک معاہدہ امریکہ کے ساتھ تھا۔ عراق کے ساتھ پاکستان کا براہ راست کوئی معاہدہ نہ تھا۔ لہٰذا ابھی تک کرنل ناصر کو پاکستان کے خلاف عرب ممالک میں پھوٹ ڈلوانے کی شکایت کی کوئی وجہ پیدا نہ ہوئی تھی۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں بنڈونگ کی پہلی افریقی۔ ایشیائی کانفرنس میں جاتے ہوئے صدر ناصر نے پاکستان کی دعوت پر یہاں تین دن قیام کیا اور پاکستان کے لئے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن پاکستان کے مدبروں نے اس ہنگامے سے جو عراق اور ترکی کے باہمی دفاعی معاہدے پر ہو چکا تھا کوئی سبق نہ سیکھا۔ وہ "میڈو" کو "معاہدۂ بغداد" کی شکل دینے پر راضی ہو گئے۔ جس پر عرب ممالک کے علاوہ پاکستان۔ ایران۔ ترکی اور عراق نے دستخط کئے۔ یہ دستخط ۲۳ ستمبر ۱۹۵۵ء کو ہوئے۔ اس سے چند دن پہلے پاکستان کی وزارت عظمیٰ کا چارج چوہدری

محمد علی سنبھال چکے تھے۔ مسٹر حمید الحق چوہدری ان کے وزیر خارجہ تھے۔ عراق کو باقی عرب ممالک سے علیحدہ کر کے "عرب نیشنلزم" کے مقاصد کو شکست دینے کا جو الزام عرب قوم پرست حلقے مغربی ممالک کے خلاف پاشا کی کے خلاف لگا رہے تھے۔ اب پاکستان بھی اسی الزام کی زد میں آگیا۔ اور عرب ممالک میں بھارتی سفارت خانوں کو یہ نعرہ بلند کرنے کا موقع مل گیا "دیکھو ہم نہ کہتے تھے" اس کے بعد اور بھی زیادہ عجیب نوعیت کے واقعات پیش آئے۔

اکتوبر ۱۹۵۴ء میں صدر ناصر نے سویز کے علاقے سے برطانوی افواج کے انخلا کا مطالبہ منوا لیا تھا اور ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو برطانیہ اور مصر کے درمیان پرانے معاہدے کی جگہ ایک نیا معاہدہ ہو گیا تھا۔ جس کے تحت برطانیہ نے اپنا فوجی اڈہ ختم کرنا اور اپنی فوجوں کے انخلاء کا پروگرام منظور کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی معاہدے میں درج کر لی گئی کہ نہر سویز کو آئندہ کسی بیرونی فوجی حملے سے خطرہ پیدا ہونے کی صورت میں برطانیہ اپنی فوج اس علاقے میں رکھ سکے گا۔ بظاہر اس شرط کا مقصد کمیونزم کی جارحیت کے خطرے کی روک تھام تھا۔ اس کے بعد بعض اور واقعات پیش آئے جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ پھر جولائی ۱۹۵۶ء میں صدر ناصر نے ایک ایسا قدم اٹھایا جس نے برطانیہ اور فرانس میں تہلکہ مچا دیا۔ آپ نے اس بین الاقوامی کمپنی کو جسے نہر سویز کی اجارہ داری کے حقوق حاصل تھے۔ قومی ملکیت میں لے لیا اور اس کمپنی کی تمام املاک، حقوق اور ذمہ داریاں مصر کے ایک قومی ادارے کو منتقل کرنے کا قانون نافذ کر دیا۔ اس بنیادی حقیقت سے کوئی انکار نہ کر سکتا تھا کہ نہر سویز مصر کی سرزمین کا حصہ اور مصر کی آئینی حاکمیت کے دائرے میں شامل تھی۔ تاہم برطانیہ نے مصر کے اقدام پر سخت پیچ و تاب کھایا اور اسے ناکام کرنے کے لئے برطانیہ اور فرانس نے مل کر مصر پر بین الاقوامی دباؤ ڈالنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی بنیاد یہ دلیل تھی کہ بین الاقوامی تجارت کے مفاد میں، نہر سویز پر کسی بین الاقوامی ادارے کا کنٹرول قائم رکھنا ضروری ہے۔ اگر اس نہر میں جہازوں کی آمد و رفت کا انتظام اکیلے مصر کے کنٹرول میں رہا تو اس بات کی کوئی

ضمانت نہ ہو گی کہ تمام ملکوں کے جہازوں کو بلا رو رعایت اس نہر کے استعمال کی آزادی حاصل رہے۔ اگر کسی ملک کے ساتھ مصر کے تعلقات کشیدہ ہوئے تو ممکن ہے کہ اسے نہر کی سہولت سے محروم کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک دلیل یہ بھی تھی کہ مصر اس قابل ہی نہیں کہ وہ نہر کے متعلق سرمایہ اور فنی انتظامات کی ذمہ داری سے بخوبی عہدہ برا ہو سکے۔

اپنے منصوبے کے لئے بین الاقوامی تائید حاصل کرنے کی غرض سے برطانیہ اور فرانس نے چوبیس ملکوں کی (جنہیں اپنی اپنی تجارت کی خاطر اس بات سے دلچسپی تھی۔ کہ نہر سویز کے انتظامات میں کوئی خلل واقع نہ ہو) ایک کانفرنس بلائی۔ جن ملکوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ ان میں پاکستان، بھارت اور خود مصر بھی شامل تھے۔ یہ کانفرنس لندن میں ۱۶ر اگست کو ہوئی۔ مصر نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اس کا موقف یہ تھا۔ کہ بین الاقوامی کنٹرول کی تجویز اسے قطعاً نامنظور ہے۔ نہر کے انتظامات وہ خود کرے گا۔ باقی ملکوں کی حیثیت ایک دکان کے گاہکوں کی مانند ہے جو دام خرچ کر کے نہر کی سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ہر دکاندار اپنے گاہکوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر نہر کی سہولتوں کے گاہک اس بنیاد پر اپنے اطمینان کی خاطر مصر کے ساتھ بات چیت کرنا چاہیں تو مصر اس کے لئے بخوشی تیار ہو گا۔ لیکن بات چیت اسی بنیاد پر ہو گی۔

پاکستان کی طرف سے وزیر خارجہ حمید الحق چوہدری لندن کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ راستے میں انہوں نے قاہرہ میں ٹھہر کر صدر ناصر سے ملاقات اور تفصیلی گفتگو کی۔ صدر ناصر کے قول کے مطابق حمید الحق چوہدری نے مصر کے موقف کو درست قرار دیا اور لندن کانفرنس میں اس موقف کی حمایت کرنے کا وعدہ کیا۔ صدر ناصر نے یہ بات ۳ر ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت کے اخبار ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر فرینک مورائس کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کی: "پاکستان کا وزیر خارجہ اسی کرسی پر بیٹھا تھا جس پر آپ بیٹھے ہیں۔ اسی جگہ بیٹھ کر اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مصر کے نقطہ نگاہ

کو درست سمجھتا ہے اور لندن جاکر اس کی حمایت کرے گا۔ اس لئے یہ وعدہ کس طرح نبھایا یہ تمام دنیا کو معلوم ہے۔" لندن کانفرنس کی مختصر روداد یہ تھی کہ اس میں شرکت کرنے والے ملک دو گروہوں میں بٹ گئے۔ اقلیتی گروہ (جس میں بھارت نے قائد کی حیثیت اختیار کر لی) مصر کے نقطۂ نگاہ کی حمایت کرتا تھا۔ پاکستان اس اکثریت میں نہ صرف شامل ہو گیا جو بین الاقوامی کنٹرول کی حامی تھی۔ بلکہ جو قرارداد اکثریت کے ووٹوں سے منظور کی گئی۔ وہ حمید الحق چودھری ہی نے پیش کی۔ اس قرارداد کے تین نکات تھے:- (۱) یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ مصر سویز کمپنی کو قومی ملکیت میں لینے کا قانونی حق رکھتا تھا۔ (۲) لیکن بین الاقوامی تجارت کے مفاد میں نہر کے انتظامات پر موثر کنٹرول کسی بین الاقوامی ادارے کے سپرد کیا جائے۔ (۳) کانفرنس کی جانب سے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو اس غرض کے لئے مصر سے بات چیت کرے۔

چنانچہ "نہر سویز کو استعمال کرنے والے ملکوں کی اکثریت" کی تجاویز لے کر ایک کمیٹی صدر ناصر کے ساتھ بات چیت کے لئے قاہرہ پہنچ گئی۔ یہ بات چیت بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب صدر ناصر سے فرینک مورایس نے محولہ بالا انٹرویو حاصل کیا تھا۔ واضح رہے کہ جب حمید الحق چودھری لندن میں برطانیہ اور فرانس کی ہم نوائی کر رہے تھے تو پاکستان کے عوام مصر کے نقطۂ نگاہ کے حق میں مظاہرے کر رہے تھے۔

قاہرہ کی بات چیت کی ناکامی کے بعد برطانیہ اور فرانس نے نئی تجویزیں پیش کیں۔ (۱) "نہر سویز کو استعمال کرنے والے ملکوں کی انجمن" قائم کی جائے تاکہ یہ انجمن اپنے تجارتی مفاد کی خاطر ضروری کارروائی کرے اور (۲) اس انجمن کی جانب سے فوری طور پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مقدمہ پیش کیا جائے۔ جب ان تجاویز پر غور کرنے کے لئے لندن میں دوبارہ کانفرنس منعقد ہوئی تو پاکستان میں وزارت بدل گئی تھی۔ چودھری محمد علی کی جگہ سہروردی وزیر اعظم بن گئے تھے اور حمید الحق چودھری کی جگہ ملک فیروز خاں نون نے وزیر خارجہ کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ بھارت نے اور بعض دوسرے ملکوں نے مجوزہ انجمن کا بائیکاٹ کر دیا۔ پاکستان نے نیم دروں نیم بروں کی پالیسی اختیار کی۔ وزیر خارجہ ملک

فیروز خاں نون نے ایک بیان میں کہا کہ ایسی انجمن بنانے کا کیا فائدہ ہے جس کے ساتھ مصر بات چیت کرنے کو تیار ہی نہیں۔ لہٰذا وہ انجمن کے ممبر نہ بنے لیکن "مبصر" کی حیثیت سے انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ سلامتی کونسل میں اس انجمن کے مقدمے کا راستہ روس نے ویٹو استعمال کرکے فوراً روک دیا۔ برطانیہ اور فرانس نے دیکھا کہ ان کا مقصد فوت ہوتا جا رہا ہے۔ مصر نہر کا انتظام دوسرے ملکوں کے فنی ماہروں کی خدمات حاصل کرکے کامیابی کے ساتھ کر رہا تھا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ مصر کی پوزیشن مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں برطانیہ اور فرانس کو اپنا مقصد حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا یعنی فوجی طاقت کا استعمال۔

فوجی طاقت کے استعمال کے لئے بہت دلچسپ بہانہ گھڑا گیا۔ ۱۹؍اکتوبر ۱۹۵۴ء کو سویز کے علاقے میں برطانوی فوجی اڈے کو ختم کرنے کے لئے جو معاہدہ برطانیہ اور مصر کے درمیان ہوا تھا اس میں یہ شرط درج تھی کہ آئندہ نہر سویز کو بیرونی فوجی حملے سے خطرہ پیدا ہونے کی صورت میں برطانیہ اس علاقے میں اپنی فوجیں بھیج سکے گا۔ برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل کے ساتھ (جسے ستمبر اور اکتوبر میں جنگی سامان بہت تیزی کے ساتھ بھیجا جا رہا تھا) ملی بھگت کرکے مشترکہ حملے کا یہ پروگرام بنایا کہ اسرائیل کی فوجیں سویز کی جانب پیش قدمی شروع کریں جس پر برطانیہ فوراً نہر سویز کی "حفاظت" کے لئے اپنی فوجیں اس علاقے میں بھیج کر نہر پر اور آس پاس کے علاقے پر جہاں تک چاہے گا فوجی قبضہ کر لے گا۔

۲۹؍اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل کی فوجوں نے مصر کے علاقے میں پیش قدمی شروع کی اور چوبیس گھنٹوں کے اندر برطانوی بحری اور بری فوجوں نے پروگرام کے مطابق نقل و حرکت شروع کر دی اور ایک الٹی میٹم دینے کے بعد (جو بظاہر مصر اور اسرائیل دونوں کو دیا گیا تھا) ۳۱؍اکتوبر کو برطانوی افواج نے بھی مصر پر حملہ کر دیا۔ گو برطانیہ نے دنیا کے سامنے یہ موقف اختیار کیا کہ اس نے حملہ نہیں کیا بلکہ اسرائیل اور مصر کی باہمی جنگ میں "مداخلت" (INTERVENTION) کی ہے اور "مداخلت" اس وجہ سے ناگزیر

تھی کہ اس جنگ سے نہر سویز کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ برطانوی حکومت نے اپنے اقدام سے چوبیس گھنٹے پہلے ہی "دوست" ملکوں (جن میں "بغداد پیکٹ" کے ممبر ملک شامل تھے) کو اپنے اس موقف سے آگاہ کر دیا تھا۔ اکتوبر میں پاکستان کے وزیر اعظم سہروردی چین کے سرکاری دورے پر گئے ہوئے تھے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء جو مصر پر اسرائیل کے حملے کا پہلا دن تھا۔ چین میں سہروردی کے پروگرام کا آخری دن تھا۔ وہ اسی دن وہاں سے پاکستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ ۳۱ اکتوبر کو (جب برطانوی حملہ شروع ہو چکا تھا) اخبار نویسوں نے سہروردی کو کراچی میں گھیر لیا۔ ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے سہروردی نے کہا کہ اسرائیل کا اقدام کھلی جارحیت ہے۔ جس کی ہم مذمت کرتے ہیں۔ لیکن اس قضیہ کے دوسرے پہلو مزید غور کے محتاج ہیں۔

جہاں تک پاکستان کے عوام کا تعلق تھا وہ نہ صرف اسرائیل اور برطانیہ کے اقدامات کو مصر کے خلاف مشترکہ جارحیت سمجھتے تھے بلکہ اس بارے میں ایسے شدید جذبات کا اظہار کر رہے تھے گویا حملہ ان کے اپنے ملک پر ہوا ہے۔ لیکن مسٹر سہروردی اور ان کے سرکاری ترجمان "اسرائیل کی جارحیت" اور برطانیہ کی "مداخلت" کے درمیان محتاط طریق پر امتیاز کرتے رہے۔ وہ اسرائیل کی جارحیت کی مذمت کرتے تھے اور برطانیہ کی مداخلت پر صرف "اظہار افسوس" کرتے تھے اور رسمی طور پر یہ مزید فقرہ بھی کہہ دیتے تھے کہ بین الاقوامی منازعات کو طاقت کے ذریعے نہیں بلکہ پر امن طریقوں سے حل کرنا چاہیے۔ "بغداد پیکٹ" کے چار مسلمان ممبر ملکوں کے ہنگامی اجلاس کے بعد جو مشترکہ اعلان جاری کیا گیا۔ اس کا لہجہ بھی یہی تھا۔

برطانیہ کو غالباً یہ توقع نہ تھی کہ امریکہ اس کے اقدام کی بہت سخت مخالفت کرے گا۔ لیکن امریکہ نے اس خطرے کو فوراً بھانپ لیا کہ اگر روس اس جنگ میں کود پڑا تو خود امریکہ کے لئے انتہائی مشکل مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ ایک طرف امریکہ نے برطانیہ پر بھرپور ڈپلومیٹک اور اقتصادی دباؤ ڈالا۔ دوسری طرف روس نے اسے للکارا اور اپنے راکٹوں کی جانب بہت واضح اشارہ کیا۔ اس دوگونہ دباؤ کے تحت برطانیہ جنگ بندی کا

مطالبہ مان گیا اور مصر کی سرزمین سے اقوام متحدہ کے زیر انتظام برطانیہ اور اسرائیل کی فوجوں کے بتدریج انخلا کا پروگرام بن گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ جو علاقہ حملہ آور فوجیں خالی کرتی رہیں گی۔ اس کا چارج ایک عارضی بین الاقوامی فوج سنبھالتی رہے گی۔ اقوام متحدہ کے نمائندوں نے اس بین الاقوامی فوج کے لئے غیر جانبدار ملکوں سے فوجی دستے حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔ لیکن جب یہ تفصیلی پروگرام صدر ناصر کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے قلم اٹھایا اور فوجی دستے مہیا کرنے والے ملکوں کی فہرست سے پاکستان کا نام کاٹ دیا۔ یہ زمانہ پاکستان کے خلاف صدر ناصر کی انتہائی ناراضی کا تھا۔ چند دنوں کے بعد وزیر اعظم سہروردی نے جو مشرق وسطیٰ کے مختلف ملکوں کا دورہ کر رہے تھے۔ صدر ناصر کے ساتھ بات چیت کی خاطر قاہرہ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ناصر نے نرم الفاظ میں ان کا میزبان بننے اور ان کے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حکومتی سطح پر پاکستان اور مصر کے درمیان سخت کشیدگی کی یہ کیفیت اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب تک قائم رہی۔

۱۰ر نومبر ۱۹۵۶ء کو پاکستان کے وزیر خارجہ ملک فیروز خاں نون نے ایک اور عجیب بیان دے دیا۔ جس کا نتیجہ عرب ممالک کی مزید ناراضی مول لینے کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ آپ نے اسرائیل کے متعلق عرب ممالک کے موقف اور ان کے شدید جذبات کو بالکل نظر انداز کر کے اپنے بیان میں کہا "اسرائیل ایک مستقل حقیقت بن چکا ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ اس کے لاکھوں انسانوں کو سمندر میں دھکیل دیا جائے۔ مسئلے کا صحیح حل یہی ہے کہ اسرائیل اور عرب ممالک کی سرحدوں کا تعین کر کے اقوام متحدہ ان سرحدوں کی ضامن بن جائے۔"

نہر سویز کے جھگڑے نے راجہ غضنفر علی خاں کی ذاتی زندگی کو بھی متاثر کیا۔ جب صدر ناصر نے نہر سویز کو قومی کنٹرول میں لینے کا قدم اٹھایا تو راجہ صاحب روم میں تھے (انہیں کچھ عرصہ پہلے بھارت سے تبدیل کر کے اٹلی میں پاکستان کا سفیر مقرر کر دیا گیا تھا) صدر ناصر کے اقدام پر بین الاقوامی ہلچل ہوئی تو راجہ صاحب نے اپنی حکومت کو لکھا کہ نہ صرف

دنیائے عرب بلکہ ایشیا اور افریقہ کی ابھرتی ہوئی قومی طاقتیں صدر ناصر کے اقدام کی پرزور حامی ہیں۔ اگر پاکستان نے اس جھگڑے میں مغربی ممالک کا ساتھ دیا تو وہ دنیائے اسلام اور ایشائی اور افریقی ملکوں کی ہمدردی قطعی طور پر کھو بیٹھے گا۔ پاکستان کے دفتر خارجہ نے انھیں لکھا کہ پالیسی مرتب کرنے والے اپنی ذمہ داری کو خوب سمجھتے ہیں۔ سفیروں کا کام یہ ہے کہ جو پالیسی انھیں بتائی جائے اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کی کوشش کریں۔ اس پر [illegible] صاحب نے چھٹی کی درخواست اور چھٹی ختم ہونے پر عہدے سے ریٹائر کئے جانے کی درخواست بھیج دی۔ جو منظور کر لی گئی۔ اس کے بعد آپ نے اپنی عمر کا باقی حصہ پاکستان کے آزاد شہری کی حیثیت سے گزارا۔

۶۵- سہروردی کے استعفے کا پس منظر۔

چندریگر آئے اور گئے

پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی کا قیام واقعات کے اس سلسلے کی کڑی بن گیا۔ جو بالآخر مسٹر سہروردی کی وزارت عظمیٰ کے خاتمے پر منتج ہوئے۔ لیکن ان واقعات سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ خود سکندر مرزا سہروردی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے لیے مناسب موقع کی انتظار میں تھے۔

مسٹر سہروردی نے وزیراعظم بننے کے بعد حکومت پاکستان کی پالیسیوں میں جو تبدیلیاں کیں۔ ان میں دو سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ ایک تبدیلی یہ تھی کہ چودھری محمد علی کے زمانے تک دوسرے ملکوں پر فنانس ڈیپارٹمنٹ کا جس حد تک کنٹرول تھا۔ اسے بہت کمزور کر دیا۔ مسٹر سہروردی زبردست اور مضبوط شخصیت رکھتے تھے اور محکمہ خزانہ ان کے مقابلے میں کمزور تھا۔ انہوں نے بیرونی زرمبادلہ کی سہولتوں کی تقسیم من مانے طریقوں پر شروع کی۔ محکمہ خزانہ شروع میں بعض فیصلوں پر اعتراض اور احتجاج کرتا رہا۔ لیکن آخر زبردست وزیراعظم کے مقابلے میں بے بس ہو گیا۔ پاکستان کو مسٹر سہروردی کی پالیسی کا یہ پہلو بہت مہنگا پڑا۔ لیکن اس ملک کو (اور خود سہروردی صاحب کو) ان کی ایک اور پالیسی اس سے بھی زیادہ مہنگی پڑی۔ خارجہ پالیسی کے معاملے میں لیاقت علی خان کے زمانے ہی سے پاکستان کا جھکاؤ مغربی ممالک کی جانب تھا۔ ان کے بعد یہ رجحان زیادہ نمایاں ہو گیا۔ لیکن مغربی ممالک سے ہم رکاب چلنے کی پالیسی کو عروج پر پہنچانے کا کام سہروردی نے انجام دیا۔ مسٹر سہروردی کی خارجہ پالیسی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ خود ان کی اپنی پارٹی (عوامی

لیگ) میں پھوٹ پڑ گئی۔ مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے صوبائی صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی اس پالیسی کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ اور بالآخر اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ عوامی لیگ کے بعض ارکان جو اپنی پارٹی کے دونوں دھڑوں کے نیازمند تھے۔ مولانا کو منانے اور بیچ بچاؤ کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن سہروردی صاحب نے بے نیازی سے کام لیا۔ اور اپنی پارٹی کو بحران کی حالت میں چھوڑ کر وہ جون ۱۹۵۷ء کے آخر کے قریب لندن گئے۔ جہاں انہوں نے دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں سے امریکہ کے طویل دورے پر چلے گئے۔

ان کی غیر حاضری میں مشرقی پاکستان عوامی لیگ کا ایک اجلاس ڈھاکہ میں ۲۴ر جولائی کو ہوا۔ اس اجلاس میں یہ بات نوٹ کی گئی کہ مولانا بھاشانی اپنا استعفےٰ واپس لینے سے قطعی طور پر انکاری تھے۔ لاہور کے میاں افتخار الدین ان حالات کا خاص دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہے تھے۔

میاں صاحب کچھ عرصہ پہلے مغربی پاکستان میں حکومت کی مخالف پارٹیوں کو یکجا کرنے کا ایک اہم قدم اٹھا چکے تھے۔ یہ پانچ پارٹیاں تھیں۔ (۱) خان عبدالغفار خان کی سرخپوش جماعت۔ (۲) مسٹر جی ایم سید کا قائم کردہ سندھ عوامی محاذ (۳) بلوچستان کے خان عبدالصمد کی "ورور پشتون" (۴) سندھ کی ہاری کمیٹی۔ اور (۵) خود میاں افتخار الدین کی قائم کردہ آزاد پاکستان پارٹی۔ میاں افتخار الدین کی دعوت پر اور انہی کی کوششوں سے ان پانچوں پارٹیوں کا ایک مشترکہ اجلاس ۱۷ر دسمبر ۱۹۵۶ء کو برکت علی محمڈن ہال لاہور میں منعقد ہوا جہاں ان سب کو ملا کر "پاکستان نیشنل پارٹی" کے نام سے ایک پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب میاں افتخار الدین کو اس سے اگلا قدم اٹھانے اور ملک کے دونوں بازوؤں میں کام کرنے والی پارٹی بنانے کا امکان نظر آیا۔ انہوں نے فوراً ڈھاکہ پہنچ کر مولانا بھاشانی سے گفتگو کی اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ملک کے دونوں حصوں سے آزاد خیال لوگوں کو ایک "آل پاکستان ڈیموکریٹک ورکرز کنونشن" میں جمع ہونے کی دعوت دی جائے۔ یہ کنونشن ۲۵، ۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ اس میں مغربی پاکستان کی "پاکستان نیشنل پارٹی" کے لیڈر اور

کارکن کافی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں ایک وسیع تر سیاسی پلیٹ فارم کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور اس کے لیے نیا نام اس طرح وضع کیا گیا کہ "پاکستان نیشنل پارٹی" کے نام سے "نیشنل" کا لفظ اور مولانا بھاشانی کی سابق پارٹی عوامی لیگ کے نام سے "عوامی" کا لفظ لے کر کنونشن میں حصہ لینے والی تمام پارٹیوں کو "نیشنل عوامی پارٹی" کے نام کے تحت ایک نئی پارٹی کی صورت دے دی گئی۔

مولانا بھاشانی کے ساتھ عوامی لیگ کا کافی بڑا عنصر نئی پارٹی میں چلا آیا۔ مشرقی پاکستان اسمبلی میں اور مرکزی اسمبلی میں عوامی لیگ پارٹی کے ممبروں کی تعداد میں کمی آ گئی اور دونوں جگہ نیشنل عوامی پارٹی کے نمائندوں کے نئے گروپ قائم ہو گئے۔ مغربی پاکستان اسمبلی میں تعداد کا کوئی رد و بدل نہ ہوا۔ البتہ جو پارٹی مسٹر جی ایم سید کی قیادت میں اس سے پہلے پاکستان نیشنل پارٹی کے نام سے کام کرتی تھی۔ اب نیشنل عوامی پارٹی کے نام سے کام کرنے لگی۔

جب مسٹر سہروردی یورپ اور امریکہ کے دورے سے اگست ۱۹۵۷ء کے شروع میں واپس آئے تو اسمبلیوں کے اندر پارٹیوں کی طاقت کا نقشہ بدل چکا تھا۔ اس دوران میں مشرقی پاکستان کی کرشک سرامک پارٹی کے نمائندے صدر سکندر مرزا سے بات چیت کرتے رہے تھے۔ اب مرکزی اسمبلی میں ان کی طاقت سہروردی کی باقی ماندہ عوامی لیگ پارٹی سے کم نہ تھی۔ لہٰذا ری پبلکن پارٹی کرشک پارٹی کے ساتھ کوکیشن کی امید پر وزیراعظم کو آنکھیں دکھانے کے قابل ہو گئی تھی۔ ری پبلکن لیڈروں نے سہروردی سے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ گورمانی صاحب کو مغربی پاکستان کی گورنری کے عہدے سے ہٹاؤ ورنہ ہم آپ کی حمایت سے دست کش ہوتے ہیں۔ سہروردی کو کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ انہوں نے اس مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور مرکزی حکومت کی جانب سے گورنر گورمانی کا استعفےٰ طلب کر لیا گیا جو انہوں نے ۱۷ اگست ۱۹۵۷ء کو پیش کر دیا۔ گویا سہروردی۔ گورمانی محاذ" کا بایاں بازو ٹوٹ گیا۔ کیا ری پبلکن لیڈروں کے اس مطالبے میں دوسرے امور کے علاوہ صدر سکندر مرزا کا اشارہ بھی شامل تھا۔ بعد میں جو واقعات

پلیش آتے ہے۔ ان سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ مغربی پاکستان اسمبلی (ری پبلکن پارٹی اور جی ایم سید کے باہمی معاہدے کے مطابق) ایک قرارداد پاس کر چکی تھی۔ جس میں مرکزی حکومت سے ایک یونٹ کو توڑنے کی سفارش کی گئی تھی۔ صدر سکندر مرزا نے اس قرارداد کا سرکاری نوٹس لیا اور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۷ء کو ایک بیان میں کہا کہ مغربی پاکستان اسمبلی نے حال ہی میں صوبہ مغربی پاکستان کی ساخت میں ردّوبدل کے متعلق جو سفارشی قرارداد پاس کی ہے۔ اس سے لوگوں کو اور سرکاری افسروں کو تشویش لاحق ہوئی ہے۔ میں نے اس مسئلے کے متعلق وزیراعظم سہروردی کے ساتھ مشورہ کیا ہے اور ہم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ مرحلے پر آئین میں کوئی ردّوبدل کرنا ممکن نہیں۔ پاکستان کے سیاسی استحکام کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے انتخاب جلد از جلد کرائے جائیں۔ جو اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ انتخاب موجودہ آئین کے تحت ہوں۔

اسی رات سہروردی نے ریڈیو پر ایک پیغام انہیں خطوط پر نشر کیا۔ آپ نے اپنی رائے ایک یونٹ کے حق میں ظاہر کی۔ لیکن زور اس بات پر دیا کہ انتخابات میں تاخیر سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ انتخاب موجودہ آئین کے تحت منعقد ہوں۔ اگر نئی منتخب شدہ اسمبلی آئین میں کوئی ردّوبدل کرنا چاہے تو اسے ایسا کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

صدر کا بیان ۲۴ ستمبر کی صبح کو چھپا۔ وزیراعظم کی تقریر ۲۳ ستمبر کی شام کو ہوئی۔ دو دن کے بعد یعنی ۲۵ ستمبر کو مرکزی کابینہ کے ایک ری پبلکن وزیر میر غلام علی تالپور نے ایک جوابی بیان میں کہا کہ وزیراعظم کے دلائل بالکل غلط اور ناقابل قبول ہیں۔ اوّل تو مغربی پاکستان اسمبلی کی سفارش کے مطابق فوری عمل کرنے سے انتخابات میں کوئی خاص تاخیر نہ ہوگی۔ اور اگر تاخیر ہو تب بھی ری پبلکن پارٹی اس بارے میں قول دے چکی ہے۔ اور اس سمجھوتے کی پابند ہے کہ ایک یونٹ کو چار خود مختار صوبوں کی ڈھیلی فیڈریشن میں تبدیل کرنے کے لیے فوری قدم اٹھایا جائے۔ یہ بیان صدر اور وزیراعظم کی مشترکہ پالیسی کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ اگر اس پر باغی وزیر کے خلاف ضروری تادیبی کارروائی کی جاتی تو کابینہ کے

اندریں حالات وہیں ختم ہو جاتا۔ وزیروں کی برطرفی کے اختیارات صرف صدر کو حاصل تھے۔ انہوں نے اس بیان کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

اس مرحلے پر دولتانہ صاحب نے پیش قدمی کی۔ آپ نے یہ دیکھ کر کہ سہروردی اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی ہے۔ سہروردی کو ایک اہم خفیہ چٹھی لکھ بھیجی۔ جس میں انہیں یہ یقین دلایا گیا کہ اگر ری پبلکن پارٹی ان کی (سہروردی کی) حمایت سے دستکش ہو گئی تو مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کی پوری حمایت سہروردی صاحب کو حاصل ہو گی۔ چٹھی کے آخر میں کہا گیا تھا کہ اسے فی الحال صیغہ راز میں رکھا جائے اور اس کی اشاعت صرف اس صورت میں کی جائے کہ ری پبلکن پارٹی سہروردی کی حمایت سے دستکش ہو جائے۔ معلوم نہیں دولتانہ صاحب نے یہ چٹھی اپنی پارٹی کے ساتھ مشورہ کر کے لکھی تھی۔ یا از خود بھیجی تھی۔ بہرحال اس چٹھی نے سہروردی کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ اور انہوں نے ری پبلکن پارٹی کے خلاف خم ٹھونک لیا۔ سہروردی صاحب پبلک سٹیج کے مرد میدان تھے۔ ۴، اکتوبر ۱۹۵۷ء کو انہوں نے ایبٹ آباد میں ون یونٹ کے متعلق اپنے نقطۂ نگاہ کے حق میں ایک زوردار تقریر کی۔ ۶، اکتوبر کو لاہور کے موچی گیٹ کے باہر اس سے بھی زیادہ زوردار تقریر کی۔ جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی ری پبلکن لیڈر بھاگے بھاگے سکندر مرزا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور یہ اجازت مانگی کہ ہم سہروردی کی حمایت سے دستکش ہونا چاہتے ہیں۔ سکندر مرزا نے بظاہر ثالث بالخیر کا پارٹ ادا کیا۔ سہروردی اور ری پبلکن پارٹی کے لیڈروں کو اکٹھا کر کے ان سے بات چیت کی۔ سہروردی نے بالکل صحیح موقف اختیار کیا۔ اور کہا کہ ان صاحبان کو اپنا رویہ طے کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ آپ پندرہ دن کے رسمی نوٹس پر ۲۴، اکتوبر کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیں۔ اگر اسمبلی کی اکثریت میرا ساتھ نہ دے۔ تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔

سکندر مرزا نے سہروردی کے ساتھ کھلی بے ایمانی کی جس کی سہروردی غالباً توقع نہ کرتے تھے۔ انہوں نے سہروردی کو اسمبلی کا سامنا کرنے کا موقع دینے سے صاف انکار کر دیا

اور ایک دو دن ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہیں صاف کہہ دیا کہ آپ دو صورتوں میں ایک کو منتخب کر لیں۔ استعفیٰ دے دیں۔ یا برطرفی کا حکم سننے کو تیار ہو جائیں۔ اس ہیکڑی کا جواب سہروردی کے پاس کیا ہو سکتا تھا؟ انہوں نے استعفیٰ لکھ کر دے دیا۔ جسے فوراً منظور کر لیا گیا۔ گویا سکندر مرزا نے اپنی دانست میں اس "سہروردی۔ گورمانی محاذ" کا قلع قمع کر دیا۔ جس نے ۱۹۵۵ء میں وزارت عظمیٰ اور صدارت دونوں عہدوں کے لیے اپنا راستہ تقریباً صاف کر لیا تھا۔

سہروردی کا استعفیٰ منظور کرتے وقت صدر سکندر مرزا کے ذہن میں آئندہ وزارت سے متعلق کیا نقشہ تھا؟ اس کا جواب پبلک کے سامنے جلد ہی آگیا۔ اس مرتبہ انہوں نے دو یتیم پارٹیوں (مسلم لیگ اور کرشک سرامک پارٹی) کے سر پر دست شفقت رکھا۔ اور ان کا ری پبلکن پارٹی کے ساتھ گٹھ جوڑ کرانے کی کوشش کی۔ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر چندریگر اگلی نجی محفلوں کے حاضر باش رکن تھے۔ اور اکثر شامیں ان کے بالمقابل برج کے میز پر بیٹھ کر گزارتے تھے۔ ان کی سربراہی میں مسلم لیگ۔ کرشک ری پبلکن کولیشن وزارت صدر سکندر مرزا کے نقطۂ نگاہ سے غیر خوش آئند نہ تھی۔ بلکہ ان کے لیے آئندہ صدارت کا عہدہ محفوظ کرنے کا اچھا ذریعہ بن سکتی تھی۔ چندریگر خود وزارتی عہدے کے بہت زیادہ خواہشمند نہ تھے۔ انہیں اس امل بے جوڑ کولیشن کے راستے میں مشکلات نظر آتی تھیں۔ لیکن صدر سکندر مرزا نے انہیں سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ اس سے بھی زیادہ انہیں مسلم لیگ پارٹی کے دوسرے ممبروں نے مجبور کیا کہ وہ پارٹی کے مفاد میں وزارت کی پیش کش کو قبول کر لیں۔

مسٹر دولتانہ کے نقطۂ نگاہ سے بھی حالات بدل گئے تھے۔ انہوں نے ری پبلکن پارٹی کے مقابلے میں سہروردی کی پشت پناہی کا وعدہ کیا تھا۔ اب وزارت خود ان کی پارٹی کو پیش کی جا رہی تھی۔ اور اس وزارت میں وہ خود حصہ دار بننے کی توقع کرتے تھے۔ لہٰذا سہروردی۔ ری پبلکن جنگ اب ایک غیر متعلق شے بن گئی تھی۔ لیکن اس نئے منصوبے کے متعلق صدر سکندر مرزا کے کئی اندازے غلط ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ری پبلکن

پارٹی ان کی جیب میں ہے۔ ری پبلکن پارٹی اب تک ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح ہر اس شخص سے حبالۂ عقد میں آنا منظور کرتی رہی تھی۔ جسے سکندر مرزا برسر عہدہ لانا چاہتے تھے۔ اور ہر اس شخص سے اپنا سیاسی نکاح فسخ کرتی رہی تھی۔ جسے وہ عہدے سے برطرف کرنا چاہیں۔ لیکن فرمانبردار بیٹی کی بھی ذاتی پسند اور ناپسند ہوتی ہے۔ اس مرتبہ اس نے سکندر مرزا صاحب کے سامنے "ہاں" تو کر دی۔ لیکن ان کے تجویز کئے ہوئے انتظام کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ مغربی پاکستان اسمبلی میں ری پبلکن لیڈروں کی مسلم لیگ پارٹی کے خلاف سخت جنگ ہو رہی تھی۔ وہ مرکز میں اپنے مخالفوں کو موقعہ دینا نہ چاہتے تھے۔ سکندر مرزا کا یہ اندازہ بھی درست ثابت نہ ہوا۔ کہ عہدے کے لالچ میں کولیشن کی باقی پارٹیاں باہمی اختلافی نکات کو اہمیت نہ دیں گی۔

چندریگر وزارت نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو عہدے کا حلف اٹھایا۔ لیکن اگلے ہی دن وزیر اعظم اور ان کے ساتھیوں کے درمیان اختلاف رونما ہو گیا۔ اس سے پہلے مسلم لیگ جداگانہ انتخاب کے حق میں ایسا مبالغہ آمیز پراپیگنڈہ کرتی رہی تھی۔ گویا اس کے نزدیک پاکستان کے لیے اصل اہمیت کا سوال یہی تھا۔ لہٰذا مسٹر چندریگر کو اپنے پروگرام میں اس مسئلے کو خاص اہمیت دینی پڑی۔ آپ نے ایک بیان میں کہا کہ میں نے وزیر اعظم کا عہدہ اس لیئے قبول کیا کہ مجھے یہ امید دلائی گئی تھی کہ ری پبلکن پارٹی اس سوال پر میری پارٹی کا ساتھ دے گی۔ کرشک پارٹی جداگانہ انتخاب کی سخت مخالف تھی اور اپنے صوبے کی رائے عامہ کو نظر انداز کرنے کو تیار نہ تھی۔ کرشک پارٹی کے لیڈر مسٹر حمید الحق چودھری نے ایک بیان میں یہ کہا کہ انہوں نے کولیشن میں شرکت سے پہلے ری پبلکن لیڈروں سے اس بات کا یقین حاصل کر لیا تھا۔ کہ مخلوط طرز انتخاب کے طے شدہ اصول کو نہ بدلا جائے گا۔ مسلم لیگ اور کرشک پارٹی کے لیڈروں نے پبلک بیانوں میں یہ باتیں کہیں۔ اور ری پبلکن پارٹی کوئی فیصلہ کن بات کہنے سے اجتناب کرتی رہی اور اپنے دونوں ساتھیوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھتی رہی۔

مسٹر چندریگر نے عہدہ سنبھالتے ہی یہ حکم دے دیا۔ کہ ایک ترمیمی بل کا مسودہ تیار

کیا جاتا ہے۔ جس کے ذریعے مخلوط انتخاب کی جگہ جداگانہ انتخاب کا اصول نافذ کیا جا سکے اور انتخاب کی تیاری کا جو کام سابقہ اصول کی بنا پر ہو رہا تھا۔ اسے روک دیا جائے۔ ترمیمی بل کا مسوّدہ کابینہ میں ۱۲ نومبر کو پیش ہوا اور کابینہ میں شریک پارٹیوں کا اس سوال پر آمنا سامنا ہوا تو ری پبلکن پارٹی کے وزیروں نے معصومیت کے ساتھ کہہ دیا کہ ہم نے اس سوال پر اپنا کوئی مؤقف قائم ہی نہیں کیا۔ ہم ایک وفد مشرقی پاکستان کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجنا چاہتے ہیں۔ اور اس کی رپورٹ موصول ہونے پر اپنا رویہ متعین کر سکیں گے۔ لہٰذا کابینہ میں اس مسوّدے پر غور ملتوی کر دیا گیا۔ ری پبلکن پارٹی کا ایک وفد مشرقی پاکستان گیا۔ لیکن یہ صرف وقت گزارنے کی تدبیر تھی۔ وہ اس مسئلے پر ٹال مٹول صرف یہ دیکھنے کے لئے کر رہی تھی کہ مسلم لیگ کے ساتھ کولیشن توڑ کر اس کے لیے برسر عہدہ رہنے کی کوئی متبادل صورت بن سکتی ہے۔ یا نہیں۔ اگر کوئی ایسی صورت نہ بن سکتی تو شاید ری پبلکن پارٹی مسلم لیگ اور جداگانہ انتخاب کی کڑوی گولی نگلنے پر آمادہ ہو جاتی۔ لیکن مسلم لیگ کو شکست دینے کے لیے دوسری پارٹیاں ری پبلکن لیڈروں کی دستگیری کرنے کو تیار تھیں۔ نیشنل عوامی پارٹی اپنے نقطہ نگاہ سے مسلم لیگ کو اپنا سیاسی مخالف نمبر ایک سمجھتی تھی۔ عوامی لیگ کو نہ صرف جداگانہ انتخاب سے اصولی اختلاف تھا بلکہ دولتانہ کے خلاف سہروردی کو جو تازہ شکایت پیدا ہوئی تھی۔ وہ بھی حالات پر اثر انداز ہوئی۔ عوامی لیگ نے یہ بات تو گوارا نہ کی کہ ری پبلکن پارٹی کے ساتھ کسی نئی کولیشن وزارت میں شریک ہو جائے۔ لیکن اس نے ری پبلکن لیڈروں کو یہ یقین دلا دیا کہ اگر آپ مسلم لیگ سے ناطہ توڑ کر اپنی وزارت بنانا چاہیں تو ہم مسلم لیگ کے ہاتھوں آپ کی شکست کی نوبت نہ آنے دیں گے۔ ری پبلکن لیڈروں کے لیے یہ سہارا کافی تھا۔ اگر ان کے برسرِ عہدہ رہنے کا کوئی متبادل بندوبست ہو سکے۔ (کیونکہ عہدے کے بغیر ان کی پارٹی زندہ نہ رہ سکتی تھی) تو وہ مسلم لیگ کو عہدے سے خارج کرنے کے لیے فوراً تیار تھے۔ چنانچہ ری پبلکن لیڈروں نے اپنے وفد کی رپورٹ کا بہانہ کر کے مسلم لیگی وزیر اعظم کو صاف جواب دیا کہ ہم جداگانہ طرز انتخاب کی حمایت نہیں

کر سکتے۔ اور مسٹر چندریگر نے ۱۱ دسمبر ۱۹۵۷ء کو (دو مہینے سے بھی کم عرصہ برسرِ عہدہ رہنے کے بعد) استعفیٰ دے دیا۔

سکندر مرزا نے ان کی وزارت کا استعفیٰ منظور کر کے دوبارہ چندریگر کو دعوت دی کہ اگر وہ کوئی اور گٹھ جوڑ کر سکیں۔ تو نئی وزارت بنا لیں۔ چندریگر نے یہ دعوت قبول کر لی۔ لیکن ایک دو دن کے بعد یہ رپورٹ پیش کر دی کہ میں اسمبلی کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لہٰذا میں وزارت بنانے کی ذمہ داری سے دستبردار ہوتا ہوں۔ ان حالات میں ری پبلکن پارٹی کے لیڈر ملک فیروز خاں نون کو نئی وزارت مرتب کرنے کا موقعہ ملا۔

اس دوران میں اخباروں کے ذریعے جو بیان بازی ہوتی رہی —— اس میں ڈاکٹر خاں صاحب نے جو کسی وزارتی عہدے کے حامل نہ تھے۔ لیکن ری پبلکن پارٹی میں خاص مقام رکھتے تھے۔ دو بیان بہت عجیب دیئے۔ ۹ نومبر ۱۹۵۷ء کو آپ نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ پاکستان کے حالات کا صحیح تقاضا یہ ہے کہ یہاں آئین معطل کر کے حکومت کا کام چلانے کے ایک "انقلابی کونسل" مقرر کی جائے۔ دو دن کے بعد یعنی ۱۴ نومبر کو ڈاکٹر خان صاحب نے پشاور میں اخباری انٹرویو کی صورت میں ایک اور بیان دیا۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ پاکستان میں نظم و نسق کو صحیح طور پر چلانے کا اہل صرف ایک شخص ہے۔ وہ سکندر مرزا ہے۔ آپ نے سکندر مرزا کے حبِ وطن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ وہی ایسا شخص ہے جو عہدے کو صرف ملک کی خدمت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ کیا ملک کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کی زبان سے صدر سکندر مرزا بول رہے تھے؟ کون کہہ سکتا ہے؟

۲۲۔ پارلیمانی دور کی آخری وزارت

دسمبر ۱۹۵۷ء میں ملک فیروز خان نون نے جو وزارت ترتیب دی وہ پاکستان کے پارلیمانی دور کی آخری اور سب سے کمزور وزارت تھی۔

جب یہ وزارت بنی تو ملک کے سیاسی حالات میں ابتری اپنی انتہا کے قریب پہنچ چکی تھی۔ عوام کی نمائندگی کے نام پر جو سیاستدان مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں پر قابض تھے ان کی نگاہوں سے ملک کی تعمیر و ترقی، استحکام اور عوام کی فلاح و بہبود کا ہر مسئلہ قطعاً اوجھل ہو چکا تھا۔ ان کے نزدیک اہمیت صرف ایک سوال کو حاصل تھی۔ کون سے گٹھ جوڑ کے ذریعے اکثریت قائم کی جا سکتی ہے یا قائم شدہ اکثریت کو توڑا جا سکتا ہے؟ برسرِ عہدہ پارٹیوں کا تمام وقت اپنی اکثریت کو بچانے اور مخالف پارٹیوں کا تمام وقت ان کی اکثریت کو توڑ کر متبادل اکثریت قائم کرنے کی کوشش میں صرف ہوتا تھا اور اس شطرنج کے کھیل میں کسی پارٹی کو کسی قسم کی بے اصولی اور بدعنوانی سے عار نہ تھا۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی اقتصادی اور معاشی زندگی تیزی کے ساتھ تباہی کے راستے پر جا رہی تھی۔ ملک اقتصادی دیوالیہ پن کی دہلیز تک پہنچ چکا تھا۔ پیداوار اور برآمدات کی مقدار روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلا پنجسالہ تعمیری منصوبہ کس مپرسی کی حالت میں چل رہا تھا۔ سونے وغیرہ کے محفوظ ذخائر کم ہوتے ہوتے خطرے کے نشان سے بھی نیچے چلے گئے تھے۔

ان حالات میں نون وزارت نے مرکزی حکومت کی ذمہ داری سنبھالی اور اس وزارت کی کیفیت یہ تھی کہ اس میں حصہ دار پارٹیوں کی مجموعی طاقت بھی ایوان کے اندر قطعی اکثریت نہ رکھتی تھی۔ لہٰذا برسرِ عہدہ رہنے کے لیئے وزارت کا انحصار مسٹر سہروردی کے اس وعدے پر تھا کہ عوامی لیگ (جو مخالف بنچوں پر بیٹھی تھی) اپنے ووٹوں کی مدد سے وزارت کا بچاؤ کرتی رہے گی۔ سہروردی صاحب نے نون وزارت کو یہ سہارا دے کر مسلم لیگ پارٹی

کو بھی عہدے سے خارج کرا دیا تھا۔ وزیرِ اعظم نون سے یہ نیم وعدہ بھی حاصل کر لیا تھا کہ وہ کرشک سرامک پارٹی کو (جو مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی اصل مخالف تھی) اپنی کابینہ میں جگہ نہ دیں گے۔ اور وزیرِ اعظم کو اپنے رحم و کرم کا محتاج بھی بنا لیا تھا۔ وہ حزبِ مخالف کے بنچوں پر بیٹھ کر وزیرِ اعظم پر حکم چلا سکتے تھے، اور وزیرِ اعظم ان کا ہر حکم ماننے پر مجبور رہتے تھے۔

یہ بات عجیب تھی کہ وزیرِ اعظم نون اس پوزیشن کو قبول کرتے تھے۔ حالانکہ کرشک سرامک پارٹی ان کی وزارت میں شریک ہونے کو تیار تھی اور کرشک پارٹی اس وقت مرکزی اسمبلی میں عوامی لیگ کے تقریباً مساوی عددی قوت رکھتی تھی۔ اور انہیں سہروردی کی حمایت سے بے نیاز کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ بڑی وجہ غالباً یہی تھی کہ اب ری پبلکن لیڈر صرف صدر سکندر مرزا کے بے دام کے آلۂ کار بنے رہنے کے بجائے کچھ اپنے مستقبل کا فکر بھی کرنے لگے تھے۔ اس زمانے میں اکثر مبصروں کا اندازہ یہی تھا کہ عام انتخابات میں کرشک پارٹی زیادہ ووٹ حاصل نہ کر سکے گی اور مشرقی پاکستان میں اصل مقابلہ عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے درمیان ہوگا۔ بائیں بازو کی نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ ری پبلکن لیڈروں کا گٹھ جوڑ خارج از بحث تھا۔ لہٰذا انہیں اپنے مستقبل کے ساتھی جن کی مدد سے وہ مسلم لیگ کے مقابلے میں آئندہ برسرِ عہدہ آنے کی امید کر سکتے تھے سہروردی ہی نظر آتے تھے۔ بعض مبصرین یہ خیال ظاہر کرتے تھے کہ بیرونی ممالک جن کا حکومتِ پاکستان پر بہت زیادہ اثر تھا، وزیرِ اعظم اور صدر سکندر مرزا کو یہ مشورے دے رہے تھے کہ نیشنل عوامی پارٹی کے خطرے سے پاکستان کو محفوظ رکھنے کے لیے سہروردی کو مضبوط رکھنا ضروری ہے۔ بہرصورت وجہ خواہ کچھ تھی، حقیقت یہ تھی کہ وزیرِ اعظم نون سہروردی کو راضی رکھنے کی فکر میں لگے رہے۔ اور کرشک پارٹی سے اس کے نمائندوں کو کسی آئندہ مناسب موقع پر وزارت میں لینے کا مبہم وعدہ کرتے رہے۔ جس کا یہ فائدہ ہوا کہ کرشک پارٹی بھی اسمبلی میں اکثر وزارت کا ساتھ دیتی رہی۔ آخری وقت یہ وعدہ کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ حالات کا ایک پہلو تھا۔ لیکن ان حالات کا ایک اور خوفناک پہلو فوراً پبلک کے سامنے آگیا۔ مسٹر چندریگر اپنی چند روزہ وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں ایک بہت مفید اور جرأت مندانہ قدم اٹھا گئے تھے۔ یعنی ایک خاص آرڈیننس کے ذریعے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر سمگلنگ

کورو کنے کے لئے فوج کو خاص اختیارات سپرد کر گئے تھے۔ اس آرڈیننس کے تحت فوج نے فوری طور پر ایک مہم شروع کر دی جسے سمگلنگ کا "دروازہ بند کرنے کی مہم" کا نام دیا گیا۔ جب یہ مہم شروع ہوئی تو مشرقی پاکستان میں سمگلنگ کے وسیع اور منظم کاروبار کے متعلق ہولناک انکشافات ہوئے۔ اس کاروبار کے ذریعے پاکستان سے جو دولت بھارت کو منتقل ہو رہی تھی۔ اس کا اندازہ چالیس کروڑ سے ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ تھا۔ تقریباً دس لاکھ انسان کسی نہ کسی حیثیت سے اس کاروبار میں شریک تھے۔ ان میں صوبائی حکومت کے وزیر بھی شامل تھے۔ مشرقی پاکستان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل امراؤ خاں نے جو "دروازہ بند کرنے کی مہم" کے سربراہ تھے۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۵۸ء کو اپنی ایک نشری تقریر میں کہا کہ تین ہفتوں کے اندر جو باتیں میرے علم میں آئی ہیں۔ میں ان کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہ بات میرے نزدیک ایک معجزے سے کم نہیں ہے کہ پاکستان کی دولت کو اتنے عرصہ تک اس بیدردی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے لوٹا جاتا رہا۔ اور اس ملک کا اقتصادی نظام پھر بھی منہدم نہیں ہوا۔ آپ نے ایک خطرے کی نشاندہی بھی کی۔ اور فرمایا اب ہمارا ہاتھ ان مگرمچھوں تک پہنچنے والا ہے۔ جو سمگلنگ کے اصل مجرم ہیں جو ڈھاکہ اور نرائن گنج میں بیٹھ کر تار ہلاتے ہیں۔ اور جن کے اشاروں پر یہ وسیع تنظیم حرکت کرتی ہے۔ یہ لوگ غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لئے شور مچائیں گے اور اپنے سیاسی اثرات سے کام لے کر فوج کے خلاف الٹا سیدھا پروپیگنڈہ کریں گے۔ ان کے ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

جنرل امراؤ خاں کے بیان کے مطابق سمگل ہونے والے سامان کو سرحد پار کرنے کے کام پر جو لوگ مامور تھے ان میں بھولے بھالے مزدور بھی تھے اور دس نمبری جرائم پیشہ افراد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ یہ سب سمگلروں کی تنظیم کے سب سے نچلے درجے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا کام صرف مال کی نقل و حرکت تک محدود تھا۔ جس کے عوض انہیں مزدوری یا تنخواہ ملتی تھی۔ انہیں یہ سہولت حاصل تھی کہ کسٹم کا عملہ عام طور پر ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا تھا اور اگر کوئی فرض شناس کسٹم افسر انہیں گرفتار بھی کرے تو انہیں قانونی امداد دینے والے وکیل موجود تھے اور سزا ہونے کی صورت میں ایک مقررہ تنخواہ ان کے

گھر والوں کو ملتی رہتی تھی۔ جو وہ طبقہ تھا جو پاکستانی سرحد کے قریب مال ان کے حوالے کرتا تھا۔ جنرل امراؤ خاں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ پاکستانی سرحد کے اندر دیہات میں بیشمار کارخانے قائم تھے۔ جو بظاہر چاول چھڑنے کا کام یا اسی قسم کا کوئی اور کام کرتے تھے۔ لیکن فی الحقیقت وہ سمگل ہونے والے مال کے لیئے گوداموں کا کام دیتے تھے۔ اندرونی مقامات سے مال اگر یہاں جمع ہوتا تھا۔ اور یہاں سے ان لوگوں کے حوالے کیا جاتا تھا جنہیں جنرل امراؤ خاں قلی یا حمال کا نام دیتے تھے۔ ان دیہات میں سناروں کی دکانیں بھی بڑی تعداد میں کھل گئی تھیں جنرل صاحب نے بتایا کہ ان کارخانوں اور دکانوں کے اکثر مالک اور منیجر فوج کی آمد سے پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ لیکن سمگلنگ کے اصل کرتا دھرتا یہ لوگ بھی نہ تھے۔ ان کے پس پردہ بڑے بڑے سیٹھ تھے جو اس وسیع تنظیم کو چلا رہے تھے۔ اور ان سیٹھوں کے ساتھ ان تمام افراد کا رابطہ تھا جو اپنی کمائی پاکستان سے بھارت منتقل کرنے کے خواہشمند تھے۔ ان میں مشرقی پاکستان کی "کانگریس پارٹی" کے لیڈر بھی شامل تھے۔ جو عوامی لیگ کے ساتھ وزارت میں شریک تھے۔ اور یہ جانتے تھے کہ عوامی لیگ اپنی وزارت کے لیئے ان کے ووٹوں کی محتاج تھی۔

اپنا عہدہ سنبھالنے کے صرف چند دن بعد وزیر اعظم ملک فیروز خاں نون دسمبر ۱۹۵۷ء کے آخر میں مرکزی اسمبلی کے ایک بہت مختصر اجلاس کے سلسلے میں ڈھاکہ گئے۔ اس وقت یہ مہم شروع ہو چکی تھی۔ جو حالات ان کے نوٹس میں آئے ان سے وہ بہت متاثر تھے۔ ۱۸ دسمبر کو آپ نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ جس پیمانے پر سمگلنگ ہو رہی ہے۔ اس سے ملک کو ہولناک نقصان پہنچ رہا ہے۔ میں اس مطالبے سے متفق ہوں کہ سمگلنگ کے جرم کے لیئے موت کی سزا مقرر کی جائے۔ سمگلنگ کی تنظیم کے مگرمچھوں کو پکڑنے کے لیئے ہر ممکن قدم اٹھانا چاہیئے۔ لیکن چند دنوں کے بعد وزیر اعظم نون کا یہ جوش و خروش ختم ہو گیا۔ اور انہوں نے آگے قدم بڑھانے کے بجائے یک لخت قدم پیچھے ہٹا لیا۔ ضابطے کے مطابق اس آرڈیننس کو جو پچھلی وزارت جاری کر گئی تھی۔ اسمبلی کے اجلاس میں باقاعدہ قانون کی شکل دینا ضروری تھا۔ ورنہ وہ ختم ہو جاتا تھا۔

اس غرض کے لیے ایک بل (آرڈیننس کے خطوط پر) اسمبلی کے ایجنڈے پر موجود تھا۔ لیکن ملک فیروز خان نون نے جنوری ۱۹۵۸ء کو جو قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس بل کو واپس لے لیا اور اس کی جگہ پرانے بحری کسٹمز ایکٹ میں چند ترامیم کرنے پر اکتفا کیا۔ بحث کی خاطر وزارت کی جانب سے یہ کہا گیا کہ جو قدم اٹھایا گیا ہے اس سے وہی مقصد حاصل ہو جائے گا جس کے لیے سمگلنگ کی روک تھام کی خاص مہم شروع کی گئی تھی۔ لیکن اصل نکتہ یہ تھا کہ اس قانونی ردوبدل کے ذریعے وہ اختیارات جو فوج کو دیئے گئے تھے پھر کسٹمز کے افسروں کے حوالے ہو گئے۔ اور فوج کے ذمے صرف یہ کام رہ گیا کہ وہ سول حکام کے منشا کے مطابق ان کا ہاتھ بٹاتی رہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ پکڑ دھکڑ اور تلاشی وغیرہ کے خاص اختیارات کا استعمال سرحد سے پانچ میل کے علاقے تک محدود کر دیا گیا۔ یعنی وہ لوگ جو ڈھاکہ اور نرائن گنج میں مقیم تھے۔ جن کے اشاروں پر سمگلنگ کا تمام کاروبار چلتا تھا۔ قانون کی ان دفعات کے اثر سے محفوظ ہو گئے۔ اور اطمینان کے ساتھ پھر اپنا کاروبار چلانے لگ گئے۔ سرحدوں پر روک تھام اور چیکنگ کا کام پھر کسٹم کا وہی عملہ کرنے لگا۔ جس کی نااہلی اور بدعنوانیوں کی وجہ سے پوری مہم کی ذمہ داری فوج کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اور یہ اس وقت ہوا۔ جب فوجی مہم کا گھیرا آہستہ آہستہ ان بڑے سیٹھوں کے قریب آ رہا تھا۔ جو سمگلنگ کے کاروبار کے کرتا دھرتا تھے۔ اس کے بعد گرفتاریوں، تلاشیوں اور ضبطیوں کا سلسلہ جس طرح یکایک شروع ہوا تھا اسی طرح ختم ہو گیا۔

ظاہر تھا اور اس وقت بھی خیال عام طور پر ظاہر کیا گیا کہ سمگلنگ کے "مگرمچھوں" نے کانگریس پارٹی کے ذریعے مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ وزارت پر سیاسی دباؤ ڈالا۔ عوامی لیگ وزارت کانگریس پارٹی کے تعاون کے بغیر اکثریت سے محروم ہو جاتی تھی۔ عوامی لیگ کے لیڈر نے ملک فیروز خان نون کو آنکھیں دکھائیں اور وزیر اعظم کو ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ سب سے ہولناک بات یہ تھی کہ اس پیچ در پیچ سیاسی گٹھ جوڑ اور محتاجی کے ذریعے حکومت پاکستان اس مٹھی بھر طبقے کے کنٹرول میں آ گئی تھی جو پاکستان

میں بھارت کے ففتھ کالم کا کام کر رہا تھا۔

چند مہینوں کے بعد نون وزارت کے زمانے کا ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ پاکستان کے متعلق بھارتی حکومت کے رویہ میں کئی اتار چڑھاؤ آتے رہتے تھے۔ ۱۹۵۸ء کے موسم گرما میں بھارتی حکومت نے پاکستان کو ہراساں کرنے کے بعض اقدامات کئے۔ مثلاً جون کے شروع میں ستلج ویلی پراجیکٹ کی نہروں میں پانی کی سپلائی روک دی۔ پاکستان کے بعض لیڈروں (چوہدری محمد علی اور خان عبدالقیوم خان) نے اس زمانے میں سخت بیان دیئے اور کہا کہ بھارت کی یہی پالیسی رہی تو دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ پاکستانی وزیراعظم نے ان بیانوں کی تلافی کے طور پر ۵ جولائی ۱۹۵۸ء کو لاہور گورنمنٹ ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ پاکستان کسی مسئلے پر اور کسی بھی حالت میں ہندوستان سے جنگ نہیں کرے گا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ میں تنازعہ کشمیر کے حل کے لئے جنگ کے سوا تمام پرامن ذرائع اختیار کروں گا۔ اس اعلان کا مطلب کیا تھا؟ کیا حکومت پاکستان اس موقف سے ہٹ رہی تھی۔ جو لیاقت علی خاں نے قائم کیا تھا۔ اور جس کی پابندی ان کے بعد آنے والی حکومتیں اب تک کرتی رہی تھیں؟

اس نکتے کے متعلق اخبار نویسوں نے کئی دلچسپ سوال پوچھے۔

سوال:۔ اگر آپ کسی مسئلے اور کسی بھی حالت میں بھارت سے جنگ نہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں تو آپ بھارت کے وزیراعظم پنڈت نہرو کی طرف سے چند سال قبل پیش کردہ تجویز کے مطابق بھارت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کو تیار ہیں؟

جواب:۔ میری پیشرو حکومت نے اس وقت پنڈت نہرو کی یہ تجویز منظور کرنے سے انکار کیا تھا۔ میں اب بھی اس پالیسی کی پابندی کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اگر ہم کسی حالت میں بھی بھارت سے جنگ نہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں لازمی طور پر بھارت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لینا چاہیئے۔

سوال:۔ لیکن اب آپ غیر مشروط طور پر کسی مسئلے کے متعلق اور کسی بھی حالت میں ہندوستان سے جنگ نہ کرنے کا اعلان کر رہے ہیں۔ کیا آپ کا بحیثیت وزیراعظم یہ اعلان

جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی حیثیت نہیں رکھتا؟

جواب مجھے معلوم نہیں کہ میرا یہ اعلان کیا حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن میں اس اعلان پر ہمیشہ قائم رہوں گا کہ ہم کسی حالت میں بھی ہندوستان سے جنگ نہیں کریں گے اور تمام متنازعہ مسائل کو پرامن طریقے سے حل کریں گے۔

سوال: جنگ نہ کرنے کے تحریری معاہدے اور جنگ نہ کرنے کے زبانی معاہدے میں کیا فرق ہے؟

جواب: میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرا اعلان بالکل واضح ہے۔ کہ ہم کسی مسئلے پر اور کسی صورت میں بھی بھارت سے جنگ نہ کریں گے۔ البتہ اگر بھارت ہم پر حملہ کرے تو ہم ہر ممکن ذریعے سے اپنی حفاظت کریں گے۔ اور حملہ آکو دندان شکن جواب دیں گے۔ جنگ نہ کرنے کے تحریری معاہدے اور زبانی اعلان میں کیا فرق تھا؟ اس کا جواب وزیراعظم نے دینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن محض منطقی اعتبار سے ایک فرق ظاہر تھا۔ تحریری معاہدہ جس کی پیشکش پنڈت نہرو کرتے رہے تھے۔ دو فریقوں کے درمیان ہوتا اور دونوں فریق اس کی پابندی قبول کرتے زبانی اعلان کے ذریعے پاکستانی وزیراعظم فریق ثانی کو کسی شرط کا پابند کئے بغیر خود اپنے لیے یک طرفہ پابندی قبول کر رہے تھے۔

یہ اعلان کئی دن پاکستان میں اخباری تبصروں اور سیاسی بحثوں کا موضوع بنا رہا۔ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ وزیراعظم نے یہ اعلان ضروری کیوں سمجھا۔ اس کی توضیح آپ نے ۷ اگست کو مرکزی اسمبلی میں خارجہ پالیسی پر ایک بحث کے دوران میں کی۔ آپ نے فرمایا کہ جب ہمارے ملک کے بعض ذمہ دار لیڈر جنگ کی باتیں کرتے ہیں تو اس فوجی امداد کے راستے میں جو پاکستان کو مل رہی ہے۔ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ کیا وزیراعظم کو اس بارے میں کوئی تنبیہ موصول ہوئی تھی؟ یہ سوال تشنہ جواب رہا۔

۸ ستمبر ۱۹۵۸ء کو پاکستان کے رقبے میں تقریباً تین سو مربع میل کا اضافہ اس طرح ہو گیا کہ بندرگاہ گوادر اور اس کے آس پاس کا علاقہ جو اس سے پہلے سلطان مسقط کے قبضے میں تھا پاکستان میں شامل ہو گیا۔ گوادر کی بندرگاہ اور اس کا نواحی علاقہ جو جغرافیائی اور آبادی

کی زبان اور نسل کے اعتبار سے بھی اکثریت مغربی پاکستان کے علاقہ مکران کا حصہ ہے۔ سلطان مسقط کے قبضے میں عجیب طرح گیا تھا۔ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے یہ علاقہ خان قلات نے مکران کے مقامی بلوچ نواب سے چھین لیا تھا۔ پھر ۱۷۸۳ء میں مسقط کا شہزادہ سید سلطان اپنے والد سے لڑ جھگڑ کر عرب کو چھوڑ کر خان قلات کے پاس پناہ گزین ہوا۔ خان قلات نے مسقط کے شہزادے کو اپنے پاس مہمان رکھا اور گوادر کی نصف آمدنی کا حق اسے بطور عطیہ منتقل کر دیا۔ مسقطی شہزادہ تین سال یہاں رہا۔ پھر اپنے والد کی وفات پر مسقط میں جا کر سلطان بن گیا۔ لیکن اس نے گوادر پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ جب حکومت برطانیہ نے سلطان مسقط کو دوسرے عرب شیوخ کی طرح اپنی حفاظت میں لیا تو گوادر کو اس کی ریاست کا جزو تسلیم کر لیا اور گوادر مسقط کی عملداری میں رہا۔ یہاں کی آبادی کی بھاری اکثریت مکران کی بلوچ نسل سے تعلق رکھتی تھی اور مکران کی بلوچ آبادی کا جزو تھی لیکن سلطان مسقط کی حکومت کے زمانے میں کچھ عرب اور ہندو بھی یہاں تجارت کی غرض سے آباد ہو گئے اور تجارت پر انہی کا قبضہ ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں مسٹر لیاقت علی خان نے برطانوی حکومت سے مطالبہ یہ علاقہ جغرافیائی طور پر پاکستان کا حصہ ہے اور اس پر سلطان مسقط کا قبضہ دور تاریخ کی بے انصافیوں کی یادگار ہے جن کا اب ازالہ ہونا چاہئے۔ مسٹر لیاقت علی کی زندگی میں اس مسئلے کے متعلق گفت و شنید مکمل نہ ہو سکی۔ حکومت برطانیہ نے سلطان مسقط کو راضی کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ لیکن اختلاف اس بات پر رہا کہ برطانوی حکومت سلطان کو کچھ معاوضہ دلا کر گوادر سے دست بردار کرانا چاہتی تھی۔ اور پاکستان کی حکومت گوادر اور اس کی آبادی کو تجارتی عمل تسلیم نہ کرتی تھی۔ بلکہ پاکستان کے ایک قدرتی حصے کے طور پر بیرونی تسلط سے آزاد کرانا چاہتی تھی۔ مسٹر لیاقت علی کے بعد یہ مسئلہ بے توجہی کا شکار ہو رہا۔ بالآخر ۱۹۵۸ء میں برطانوی حکومت نے حکومت پاکستان کو راضی کر لیا کہ سلطان کو مناسب معاوضہ دیکر اس مسئلے کو ختم کر دیا جائے چنانچہ چالیس لاکھ پونڈ پر سودا طے ہو گیا۔ اور ۸ ستمبر کو اس علاقے کی رسمی منتقلی کا اعلان کر دیا گیا۔

۶۷۔ ۱۹۵۸ء۔ مشرقی پاکستان میں جنگ اقتدار

۱۹۵۸ء مشرقی پاکستان کے لئے نئے سیاسی بحران اپنے ساتھ لایا۔ مارچ ۱۹۵۸ء کے آخر میں وہاں صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں برسر اقتدار عوامی لیگ پارٹی کے چند ممبر اپنی پارٹی کے اس کردار سے ناراض تھے جو اس نے مشرقی پاکستان میں سمگلنگ کے خلاف فوجی مہم کو رکوانے کے سلسلے میں ادا کیا تھا۔ چنانچہ وسط مارچ میں گیارہ ممبروں کا ایک گروپ عوامی لیگ پارٹی سے علٰحدہ اور وزارت کا مخالف ہو گیا۔ اس کی وجہ سے اسمبلی کے اندر توازن اقتدار بہت واضح طور پر نیشنل عوامی پارٹی کے ہاتھ میں آگیا جو عوامی لیگ اور کرشک پارٹی کے درمیان جنگ اقتدار میں اپنے آپ کو غیر جانبدار ظاہر کرتی تھی۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۸ء کو صوبائی اسمبلی میں فنانس بل زیر بحث تھا۔ کرشک سرامک پارٹی وزارت کو شکست دینے کے لئے اس بل کی مخالفت کر رہی تھی۔ اور نیشنل عوامی پارٹی اپنے نقطۂ نگاہ سے اس بل میں بعض ترامیم کرانا چاہتی تھی۔ دونوں پارٹیوں کی طرف سے دو الگ الگ ترامیم پیش کی گئیں۔ کرشک سرامک پارٹی کی ترمیم یہ تھی کہ فنانس بل کو فوراً پاس کرنے کے بجائے رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر کیا جائے۔ نیشنل عوامی پارٹی کی ترمیم یہ تھی کہ فنانس بل کو ایک مجلس منتخبہ کے سپرد کیا جائے اور ۳۰، ۳۱ اپریل تک مجلس منتخبہ کی رپورٹ حاصل کی جائے۔ وزارت کو اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ نیشنل عوامی پارٹی کی ترمیم مان لے اور اس کی مدد سے کرشک پارٹی کی ترمیم مسترد کرا دے۔ اس نے یہی طریق کار اختیار کیا۔ کرشک سرامک پارٹی کی ترمیم ۱۲۱ کے مقابلے میں ۱۳۶ ووٹوں سے یعنی صرف ۱۵ ووٹوں کے فرق سے مسترد ہوئی لیکن اصل نکتہ یہ تھا کہ مالی سال ۳۱ مارچ کو ختم ہوتا تھا اور وزارت کو فنانس بل کی منظوری

کا سوال ۳۰ را پریل تک ملتوی کرنا پڑا تھا۔ کیا یہ وزارت کی ناکامی اور شکست کے مترادف تھا؟ وزیر اعلیٰ عطاء الرحمن خاں کے خیال کے مطابق ایسا نہیں تھا۔ بے شک فنانس بل کی منظوری کے بغیر اس بل میں درج شدہ ٹیکس وصول کرنے کی قانونی بنیاد قائم نہ ہوتی تھی۔ لیکن ان کا موقف یہ تھا کہ اگر اس بنیاد کو قائم کرنے میں کسی قدر تاخیر ہو جائے تو اس وجہ سے وزارت کے لئے مستعفی ہونا ہرگز لازم نہ آتا تھا۔

اسی شام (۳۰ مارچ) کو فنانس بل پر بحث ملتوی کرانے کے بعد وزیر اعلیٰ عطاء الرحمن نے گورنر کو رسمی طور پر یہ مشورہ لکھ بھیجا کہ اسمبلی کا اجلاس فوری طور پر برخاست کر دیا جائے۔ اس کا گورنر نے نہ کوئی جواب دیا۔ نہ اس پر عمل کیا۔ رات کے وقت عطاء الرحمن ذاتی طور پر گورنر کے پاس گئے اور ان سے اسمبلی کی برخاستگی کے حکم پر دستخط کرانے کی کوشش کی۔ وزیر اعلیٰ کا موقف یہ تھا کہ گورنر آئینی لحاظ سے ان کا مشورہ ماننے کا پابند ہے۔ مولوی فضل الحق نے عطاء الرحمن کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اب رات کا وقت ہے۔ اور رات کے وقت میں لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ اب جو کچھ ہو گا کل صبح ہو گا۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ وہ سکرٹریٹ کے افسروں سے مشورہ لینا پسند کریں گے۔ اصل ڈراما اگلی صبح کو شروع ہوا۔

گورنر فضل الحق کرشک سرامک پارٹی کے بانی اور سرپرست تھے۔ انہیں نظر آتا تھا کہ عطاء الرحمن وزارت کا تیا پانچہ کر کے کرشک پارٹی کو برسر عہدہ لانے کا بہانہ پیدا ہو گیا ہے۔ ۳۱ مارچ کی صبح کو گورنر نے اپنے مشیروں کو جمع کیا۔ اور ایک چٹھی کا مسودہ تیار کیا۔ جس میں پارلیمانی طور طریقوں کی کتابوں کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا تھا کہ جو وزارت مالی سال کے اختتام سے پہلے فنانس بل پاس نہ کروا سکے۔ اسے شکست خوردہ وزارت سمجھنا چاہیئے۔ لہٰذا عطاء الرحمن صاحب کی یہ حیثیت نہیں رہی کہ گورنر ان کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند ہو۔ بلکہ گورنر ان سے استعفا طلب کرنے میں حق بجانب ہے۔ انہیں چاہیئے کہ اپنا استعفا پیش کر دیں۔ یہ چٹھی عطاء الرحمن کو دس گیارہ بجے ملی۔ انہوں نے فوراً کراچی میں سہروردی سے رابطہ قائم کیا۔ اور ٹیلی فون پر وزیر اعظم ملک فیروز خاں نون کو بھی اطلاع

دے دی۔ سہروردی کے کہنے پر وزیر اعظم نے اسی شام کے لئے کابینہ کا ایک ہنگامی اجلاس بلا لیا۔

ادھر گورنر فضل الحق نے عطاء الرحمان کو زیادہ مہلت نہ دی۔ دس گیارہ بجے قبل از دوپہر انہوں نے وزیر اعلیٰ کو وہ چٹھی بھیجی جس میں ان سے استعفے کا مطالبہ کیا تھا۔ چند گھنٹے کا انتظار کر کے گورنر نے سہ پہر کے چار بجے کے قریب ایک حکم پر دستخط کر دیئے جس کی رو سے عطاء الرحمٰن کو وزیر اعلیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک اور حکم پر بھی دستخط کر دیئے جس کی رو سے کرشک سرامک پارٹی کے لیڈر ابو حسین سرکار کو وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔

عطاء الرحمٰن ٹیلیفون پر اپنے لیڈر سہروردی کو ان واقعات کی خبر دیتے رہے۔ اور سہروردی نے ملک فیروز خان پر پورا دباؤ ڈالا کہ جو صورت پیدا ہو چکی ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ گورنر فضل الحق کو ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ اور نئے گورنر سے کہا جائے کہ ان کے سب احکام منسوخ کر دے۔ نیا گورنر کون ہو؟ سہروردی اس عہدے پر مسٹر اے۔ ایم ملک کو لانا چاہتے تھے جو اس وقت ایک سفارتی عہدے پر تھے۔ مسٹر ملک چند دن سے پہلے ڈھاکہ نہ پہنچ سکتے تھے اور سہروردی کے خیال کے مطابق حالات اتنی تاخیر کی اجازت نہ دیتے تھے۔ لہذا انہوں نے یہ طے کرا لیا کہ فوری طور پر صوبے کے چیف سیکرٹری کو عارضی وقفے کے لئے گورنر مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ گورنر فضل الحق کے احکام کو فوری طور پر منسوخ کر سکے۔

۳۱ مارچ کو شام کے سات بجے کراچی میں مرکزی کابینہ کا اجلاس ہوا۔ جہاں سہروردی کے مطالبات کے مطابق فیصلے کر دیئے گئے۔ ڈھاکہ میں گورنر فضل الحق کو یہ اطلاع ملی کہ کابینہ نے انہیں عہدے سے برطرف کر دیا ہے۔ فضل الحق صاحب نے اپنے نامزد کردہ وزیر اعلیٰ ابو حسین سرکار کو بلایا اور کہا کہ بہر حال جب تک نیا گورنر عہدے کا باقاعدہ حلف نہیں اٹھاتا اس وقت تک میں گورنر ہوں۔ میں اپنی گورنری کے خاتمے سے پہلے آپ کی حلف اٹھانے کی رسم مکمل کر سکتا ہوں۔ رات کے دس بجے مسٹر سرکار سے عہدے کا حلف اٹھوانے

کی رسم پوری کی گئی۔ مسٹر سرکار ابھی اپنے ساتھی وزیروں کا انتخاب نہ کر سکے تھے۔ صرف ایک نام ان کے ذہن میں تھا۔ اس ایک وزیر کو بھی مسٹر سرکار کے ساتھ عہدے کا حلف اٹھوا دیا گیا۔ اس کے بعد گورنر نے نئے وزیر اعلیٰ کے مشورے کے مطابق اسمبلی کا اجلاس تاحکم ثانی برخاست کر دیا۔

مرکزی کابینہ کے فیصلے کے مطابق نئے گورنر کے تقرر کا پروانہ ڈھاکہ میں یکم اپریل کی صبح سے پہلے نہ پہنچ سکا۔ جب یہ پروانہ پہنچا تو چیف سیکرٹری نے ساڑھے نو بجے صبح گورنر کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس تقریب میں چیف سیکرٹری کا پارٹ معاون چیف سیکرٹری کو ادا کرنا پڑا۔ اس کے بعد گورنر فضل الحق کے احکام کا توڑ کرنے کے لئے ڈھاکہ گورنمنٹ ہاؤس سے نئے احکام صادر ہوئے۔ دس بجے صبح ابو حسین سرکار وزارت کو عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ ساڑھے دس بجے صبح عطاء الرحمن کو وزیر اعلیٰ مقرر کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد ساڑھے گیارہ بجے عطاء الرحمن اور ان کے ساتھی وزیروں نے اپنے عہدوں کا حلف اٹھا لیا۔ ایک بجے بعد دوپہر وزیر اعلیٰ عطاء الرحمن کے مشورے کے مطابق گورنر کے حکم سے ۲ر اپریل کے لئے اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔

کیا یہ سب اقدامات قانونی لحاظ سے درست تھے؟ اس سلسلے میں ایک اقدام کے متعلق قانون دان شبہ ظاہر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ابو حسین سرکار کی برطرفی کا حکم ایسا تھا جس کے لئے کوئی قانونی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک گورنر نے انہیں وزیر اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد اگلے گورنر نے انہیں کس قصور کی بنا پر برخاست کیا؟

۲ر اپریل کو اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا تو دونوں پارٹیوں کی سیاسی جنگ کا اگلا راؤنڈ شروع ہو گیا۔ اس دن اسمبلی کے اندر عطاء الرحمان وزارت کا پلہ واضح طور پر بھاری تھا۔ عوامی لیگ پارٹی کے سیکرٹری شیخ مجیب الرحمان نے وزارت کے حق میں اظہار اعتماد کے لئے ایک قرارداد پیش کی۔ حزب مخالف نے اس پر رائے شماری میں حصہ

لینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ صرف یہ آئینی اعتراض کرتی رہی کہ دو دن کے نوٹس پر بلایا ہوا اجلاس اور اس کی تمام کارروائی ضابطے کے خلاف ہے۔ سپیکر نے اس اعتراض کو مسترد کر دیا۔ اور قرارداد پر رائے شماری کرائی تو قرارداد بلا مخالفت، ۵۱ ووٹوں کی حمایت سے پاس ہو گئی۔ لیکن جو گروپ عطاء الرحمان وزارت کی حمایت کر رہے تھے۔ ان میں انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے بعض ممبر اپنی پارٹی کے رویہ سے ناخوش تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹی کی باہمی جنگ میں نیشنل عوامی پارٹی کو غیر جانبدار رہنا چاہیئے۔ اور وزارت کی مثبت امداد نہ کرنی چاہیئے۔ تاوقتیکہ وزارت نیشنل عوامی پارٹی کے پروگرام کے بنیادی اصولوں سے اتفاق نہ کرے۔ نیشنل عوامی پارٹی کے پارلیمانی بورڈ میں بھی اکثریت اسی خیال کی حامی تھی۔ گو بورڈ میں ایک عنصر تھا جو عوامی لیگ وزارت کی بہرصورت امداد کرنا چاہتا تھا۔

اسمبلی کے پچھلے اجلاس میں اس کشمکش کا کوئی مظاہرہ نہ ہوا۔ لیکن اگلے ہی دن اس کشمکش کی وجہ سے وزارت کو اپنی اکثریت کے متعلق خطرہ محسوس ہونے لگا اور وزیر اعلیٰ نے گورنر کو اسمبلی کا سیشن برخاست کرنے کا مشورہ دے دیا۔

۵ر اپریل کو جب اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو حزب مخالف کو معلوم ہو چکا تھا کہ سیشن برخاست کیا جانے والا ہے۔ حالانکہ اس سیشن کے لئے کئی دن کا ایجنڈا جاری ہو چکا تھا حزب مخالف وزارت کے ساتھ طاقت آزمائی کی تیاری کر رہی تھی۔ جب اسے طاقت آزمائی کا آئینی راستہ مسدود ہوتا نظر آیا تو وہ ہلڑ بازی پر اتر آئی۔ حزب مخالف کے ممبروں نے سپیکر پر الزام لگایا کہ وہ حکومت کے ساتھ خلاف آئین سازش میں شریک ہے۔ وہ سپیکر سے مطالبہ کر رہے تھے کہ جو اجلاس شروع ہو چکا ہے کم از کم اسے شام تک جاری رکھا جائے۔ سپیکر کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ گورنر کا حکم موصول ہونے کے بعد وہ اجلاس کو فی الفور برخاست کرنے کا پابند ہے۔

حزب مخالف کے ایک ممبر نے اپنے آپ کو ایک دوسری قسم کی دلیل سے مسلح کر رکھا تھا وہ اپنے رومال میں گندے انڈوں کا ذخیرہ لے آیا تھا سپیکر نے حزب مخالف

کی بات نہ مانی تو وہ سپیکر کو سخت سست کہہ کر اس پر گندے انڈے پھینکنے لگ گیا۔ ایک انڈا سپیکر کی کرسی پر لگ کر ٹوٹ گیا۔ دوسرا ایک چپراسی کی آنکھ میں لگا جو سپیکر کے سامنے آگیا تھا۔ سپیکر اس بوچھاڑ سے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کرتے ہوئے گورنر کے حکم کے مطابق سیشن کو برخاست کر کے ایوان سے چلے گئے۔ لیکن ایوان کے اندر غل غپاڑہ۔ اور ایک دوسرے کے خلاف نعرے کچھ دیر تک جاری رہے۔ مخالف پارٹیوں کے دو ممبروں کے درمیان ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ اس کے بعد کرشک سرامک پارٹی کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس نے اسمبلی کے سیشن کی یکایک برخاستگی کے کے خلاف احتجاج کیا اور اسے وزارت کی جانب سے اعتراف شکست قرار دیتے ہوئے وزارت سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا اور ایک وفد کراچی صدر مملکت کی خدمت میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس وفد کو صدر سکندر مرزا نے خاصی اہمیت دی۔ وفد کے ارکان ایک ہفتے کے قریب کراچی میں صدر کے ساتھ اور ری پبلکن اور مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ ملاقاتیں کرتے رہے۔ کراچی سے رخصت ہوتے وقت وفد کے ارکان نے یہ اعلان کیا کہ ان کا مقصد صدر سے یہ وعدہ حاصل کرنا تھا کہ (۱) صوبائی اسمبلی کا اجلاس جلد منعقد کیا جائے گا۔ اور (۲) اگر اسمبلی میں عطاء الرحمان وزارت کو شکست ہوگئی تو آئین کی دفعہ ۱۹۳ کا استعمال نہ کیا جائے گا۔ بلکہ عام جمہوری دستور کے مطابق حزب مخالف کو وزارت مرتب کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لہٰذا ان ارکان وفد کے قول کے مطابق وہ اپنا مقصد حاصل کر کے ڈھاکہ واپس جا رہے تھے۔

صدر سکندر مرزا سہروردی کو زخمی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان پر علانیہ وار کرنے سے گھبراتے تھے۔ انہیں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور سہروردی کا زور توڑنے کا امکان نظر آیا۔ تو اس کی جانب انہوں نے خاص توجہ دی۔ کراچی میں کرشک پارٹی کے نمائندوں کے ساتھ گفتگو کے بعد وہ ڈھاکہ پہنچے اور کرشک پارٹی کے لیڈر مولوی فضل الحق کے مکان پر تشریف لے گئے۔ وہاں جو گفتگو ہوئی اس میں کرشک پارٹی کے دو تین اور سرکردہ ممبر بھی شامل تھے۔ سکندر مرزا کے ہمدردانہ رویہ سے کرشک پارٹی کو اتنا

فائدہ پہونچا کہ اس کے ممبروں کے حوصلے قائم رہے۔ ان میں انتشار پیدا نہ ہوا اور انہیں پھر عوامی لیگ۔ وزارت کے ساتھ طاقت آزمائی کا موقعہ دے دیا گیا۔ یعنی ۱۲ر جون ۱۹۵۵ء کے لئے گورنر کے حکم سے مشرقی پاکستان اسمبلی کا اگلا اجلاس طلب کر لیا گیا۔

یہ اجلاس انتہائی تذبذب اور قیاس آرائیوں کی فضا میں شروع ہوا۔ صوبائی اسمبلی میں طاقت کا اصل توازن نیشنل عوامی پارٹی کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس پارٹی کے ممبرں میں وزارت کی مدد کرنے یا نہ کرنے کے سوال پر اختلاف تھا۔ اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ پارٹی جماعتی حیثیت سے کیا رویہ اختیار کرے گی۔ ۳ر جون ۱۹۵۵ء کو نیشنل عوامی پارٹی کے پارلیمانی بورڈ کا ایک اجلاس اسی سوال کو طے کرنے کے لئے کراچی میں منعقد ہوا تھا لیکن طویل بحث کے بعد اس نے اپنا فیصلہ آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا تھا۔ اس فیصلے کے لئے ۱۴ر جون کی تاریخ مقرر تھی۔ اور ۱۲ر جون کو اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گیا تھا۔

اس موقعہ پر مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی تاریخ دہرائی گئی۔ مغربی پاکستان میں ایک مرحلہ پر مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی دونوں نیشنل عوامی پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اس کے نمائندوں کے ساتھ گفت و شنید کرتی رہی تھیں۔ اب مشرقی پاکستان میں بھی یہ سماں تھا یعنی عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹی دونوں نیشنل عوامی پارٹی کی امداد کی طالب تھیں اور یہ پارٹی دونوں کے سامنے اپنے تعاون کی پانچ نکاتی شرط پیش کر رہی تھی۔

اس شرط کے پانچ نکات یہ تھے۔ (۱) مخلوط طریق انتخاب پر انتخابات جلد از جلد کرائے جائیں۔ (۲) صوبوں کے لئے علاقائی خود مختاری کی حمایت کی جائے (۳) غیر جانب دار خارجہ پالیسی کا اصول منظور کیا جائے۔ (۴) مغربی پاکستان کے ایک یونٹ کو توڑنے کا پروگرام منظور کیا جائے اور (۵) مشرقی پاکستان کے سابقہ متحدہ محاذ کے باقی ماندہ اکیس نکاتی پروگرام کو پورا کرنے کا وعدہ کیا جائے۔

۱۴ر جون کو نیشنل عوامی اسمبلی پارٹی کے ایک اجلاس نے کثرت رائے سے عوامی لیگ کولیشن وزارت کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اسی دن اس پارٹی کے پارلیمانی بورڈ نے اس کے خلاف یہ فیصلہ کر دیا کہ وزارت اور حزب مخالف کے درمیان رسہ کشی

میں نیشنل عوامی پارٹی غیر جانب دار رہے گی۔ اس وقت تک عوامی لیگ کے نمائندوں کے ساتھ پارلیمانی بورڈ کے ارکان کی گفت و شنید کامیاب نہ ہوئی تھی۔ دوسری طرف کرشک سرامک پارٹی کے نمائندوں نے پارلیمانی بورڈ کی پنج نکاتی شرط کو بلا تامل منظور کر لیا تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی کی غیر جانب داری کے صاف معنی یہ تھے کہ عوامی لیگ کولیشن وزارت شکست کھا جائے گی۔ چنانچہ بجٹ کے ایک مطالبے پر ۱۸ر جون کو حزب مخالف نے رائے شماری کا مطالبہ کیا اور وزارت ۱۲۶ کے مقابلے میں ۱۳۸ ووٹوں سے شکست کھا گئی۔ اس دن کرشک سرامک پارٹی کے بانی اور لیڈر مولوی فضل الحق سابق گورنر بھی لابی میں موجود تھے۔

عوامی لیگ کولیشن وزارت کے وزیر اعلیٰ مسٹر عطاء الرحمان نے فوراً ہی گورنر کو اپنا استعفا پیش کر دیا۔ اور گورنر نے کرشک سرامک پارٹی کے لیڈر مسٹر ابوحسین سرکار کو وزارت مرتب کرنے کی دعوت دے دی۔ مسٹر سرکار کی وزارت نے ۲۰ر جون ۱۹۵۸ء کو عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ لیکن مسٹر سرکار اور ان کی پارٹی کی کامیابی بہت عارضی ثابت ہوئی۔ عوامی لیگ کے ارکان بالخصوص شیخ مجیب الرحمٰن ۱۸ر جون کو اسمبلی میں شکست کھانے کے بعد بھی نیشنل عوامی پارٹی کے پارلیمانی بورڈ کو منانے کی کوشش میں لگے رہے اور بالآخر کامیاب ہو گئے۔ ۲۰ر جون کو ایک طرف ابوحسین سرکار اور ان کے ساتھی وزیر عہدے کا حلف اٹھا رہے تھے اور دوسری طرف شیخ مجیب الرحمٰن اور نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکرٹری مسٹر محمود علی ایک مشترکہ اعلان پر دستخط کر رہے تھے۔ یہ اعلان مختصر اور بہت مبہم تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے "ہم نے نیشنل عوامی پارٹی کے پیش کردہ پانچ نکات پر غور کیا ہے۔ ہمارے درمیان ان نکات پر مفاہمت ہو گئی ہے جس سے دونوں فریق مطمئن ہیں۔" کیا سہروردی کی پارٹی نے "غیر جانب دار خارجہ پالیسی" کا اصول مان لیا تھا؟ سہروردی سے جب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس اعلان کے الفاظ میں یہ کہاں لکھا ہے؟

اس سمجھوتے کی بنا پر شیخ مجیب الرحمٰن نے فوراً ہی ابوحسین سرکار کی منارت

کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد کا نوٹس اسمبلی کے دفتر میں بھیج دیا۔ اس پر بحث کے لئے ۲۲؍جون کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ اور جب اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو سرکار وزارت جو صرف تین دن پہلے برسرعہدہ آئی تھی۔ ۱۴۲ کے مقابلے میں ۱۵۶ ووٹوں سے شکست کھا گئی جس کے معنی یہ تھے کہ کرشک پارٹی نے اپنی عددی طاقت میں چار کا اضافہ کر لیا تھا لیکن نیشنل عوامی پارٹی نے جو ۱۸؍جون کی رائے شماری میں غیر جانب دار رہی تھی اپنے ۲۸ ووٹ عوامی لیگ پارٹی کو دے کر وزارت کو شکست دلادی۔

ابوحسین وزارت کو اس شکست کے بعد مستعفی ہونا پڑا۔ عوامی لیگ پارٹی یہ دعوے کرتی رہی کہ ہم وزارت بنا کر بجٹ کا باقی ماندہ حصہ پاس کرانے کے قابل ہیں۔ لیکن مرکزی وزارت نے گورنر کی رپورٹ ملنے کے بعد عارضی طور پر صوبے میں آئین کی دفعہ ۱۹۳ کے تحت گورنر راج قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور صوبائی اسمبلی کو معطل کر دیا۔

دو مہینے کے گورنری راج کے بعد صوبائی آئین بحال کر دیا گیا۔ اور عوامی لیگ وزارت نے ۲۵؍اگست ۱۹۵۸ء کو پھر عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ گورنری راج کے زمانے میں بجٹ صرف ۳۰؍ستمبر تک کے لئے منظور کیا گیا تھا۔ لہٰذا مالی سال کے باقی ماندہ حصہ کا بجٹ پاس کرانے کے لئے اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ ۲۰؍ستمبر مقرر کر دی گئی۔ اس تاریخ سے چند دن پہلے مرکزی حکومت نے وزارت کو سہارا دینے کے لئے ایک عجیب قدم اٹھایا۔ مشرقی پاکستان اسمبلی کی عوامی لیگ پارٹی کے چھ ممبروں کے متعلق انتخابی کمیشن نے کچھ عرصہ پہلے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ حکومت کے تحت منفعت بخش عہدے قبول کرنے کی وجہ سے اسمبلی کی رکنیت سے محروم ہو گئے ہیں اور اسمبلی کے ممبر نہیں رہے۔ چھ ووٹوں کی کمی عوامی لیگ وزارت کے لئے مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ لہٰذا جب اسمبلی کے اجلاس کا وقت (۲۰؍ستمبر) قریب آیا تو مرکزی حکومت نے عوامی لیگ وزارت کو چھ ووٹوں کی محرومی سے بچانے کے لئے ایک آرڈی نینس جاری کر دیا۔ جس میں صدر کے خاص اختیارات سے کام لیتے ہوئے خاص خاص قسم کے منفعت بخش عہدوں کو (جو ان ممبروں نے قبول کئے تھے) نا اہلی کی متعلقہ دفعہ کے اثر سے مستثنیٰ کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس حکم کا

اطلاق موثر بہ ماضی کر دیا۔

یہ بہت عجیب حکم تھا۔ اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ جو لوگ اسمبلی کے ممبر نہ رہے تھے۔ انہیں ایک آرڈی ننیس کے ذریعے از سر نو اسمبلی کی نشستوں پر قابض کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کیا کسی غیر ممبر کو صدر کے آرڈی نینس کے ذریعے اسمبلی کا ممبر بنایا جا سکتا تھا؟ اس قانونی نکتے کی چھان بین کا وقت آہی نہ سکا۔ کیونکہ اس کے بعد جلد ہی ایسے واقعات پیش آئے کہ پاکستان میں سیاست کی پوری بساط لپیٹ دی گئی۔ تاہم اس وقت قانونی ماہرین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس قسم کے آرڈی نینس کو موثر بہ ماضی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مرکزی حکومت کو سہروردی کی بات بہر صورت ماننی پڑتی تھی۔

ایک مرتبہ یہ بات پھر سخت مشتبہ ہوگئی کہ اس اجلاس میں نیشنل عوامی پارٹی عوامی لیگ کا ساتھ دے گی یا غیر جانب دار ہو جائے گی۔ اس اجلاس کی تاریخ سے پہلے نیشنل عوامی پارٹی کے پٹھان لیڈر خان عبدالغفار خاں نے ایک اور ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ سہروردی ایک یونٹ کا حامی ہے۔ جب تک وہ ایک یونٹ کو توڑ دانے کا اقرار نہ کرے اس وقت تک نیشنل عوامی پارٹی کو سہروردی کی پارٹی کی مدد ہرگز نہ کرنی چاہیئے ورنہ وہ خود (خان عبدالغفار خاں) پارٹی سے علحدہ ہو جائیں گے۔ خان موصوف نے یہ شکایت کی کہ ہر پارٹی اور کئی لیڈر وقتاً فوقتاً ایک یونٹ کو توڑنے کا وعدہ کرتے رہے ہیں اور اپنا کام نکالنے کے بعد انہیں (خان موصوف کو) دھوکا دیتے رہے ہیں۔ کیا اب انہیں ان کی اپنی پارٹی (نیشنل عوامی پارٹی) بھی دھوکا دینا چاہتی ہے؟ اس نکتے پر خان صاحب نے اتنا سخت رویہ اختیار کیا کہ مولانا بھاشانی اور نیشنل عوامی پارٹی کے دوسرے لیڈر کشمکش و پنج میں پڑ گئے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ فیصلہ کر سکتے ۲۰ ستمبر کو مشرقی پاکستان اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں عوامی لیگ وزارت اسمبلی کے سپیکر عبدالحکیم کو اپنا سیاسی مخالف اور کرشک پارٹی کا جانب دار سمجھتی تھی لہذا عوامی لیگ کی جانب سے سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد کا نوٹس دیا گیا تھا۔ پہلے ہی دن سپیکر نے اس قرارداد کو بے ضابطہ

قرار دے دیا۔ وہ اس بارے میں اپنا رولنگ پڑھ رہے تھے کہ عوامی لیگ کے ممبروں نے اس آئینی بحث کو اپنے طریق پر ختم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اٹھ کر سپیکر کو گالیاں دیتے ہوئے ڈائس کی طرف بڑھے۔ حزب اختلاف کے ممبروں نے احتجاج کیا اور ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ دونوں طرف کے ممبر آپس میں گتھ گئے۔ غنڈوں کی ایک فوج جو ایوان سے باہر اشارے کی منتظر تھی۔ ایوان میں گھس آئی۔ سپیکر کو ان کا عملہ کسی نہ کسی طرح عقبی دروازے سے بچا لے گیا۔ ان کے چوٹیں آئیں۔ لیکن وہ اسمبلی کے اجلاس کی برخاستگی کا اعلان کر کے (جسے کسی نے سنا کسی نے نہ سنا) اپنے کمرے میں پہونچ گئے۔ اس اثنا میں غنڈوں نے حزب اختلاف کے ارکان کو مار پیٹ کر بھگا دیا اور عوامی لیگ کے طرف دار ڈپٹی سپیکر نے کھڑے ہو کر اعلان کر دیا کہ سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی قرار داد صفر کے مقابلے میں ایک سو ستاون ووٹوں سے منظور ہو گئی ہے۔ اسمبلی کا ایوان اس وقت میدان کارزار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کرسیاں جو ممبروں پر پھینکی گئی تھیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ سکرٹری کی میز الٹی پڑی تھی اور ان کے کاغذ پنکھوں کی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ سپیکر کی کرسی کے عقب میں صوبائی اسمبلی کا نشان اتار کر پھینک دیا گیا تھا۔ سپیکر کی کرسی ایوان کے بیچ میں اوندھے منہ پڑی تھی اور ڈپٹی سپیکر وزیر اعلیٰ کے ڈیسک پر کھڑے ہو کر قرار داد عدم اعتماد کی منظوری کا اعلان کر رہے تھے۔

یہ سب کچھ تو ہو گیا۔ لیکن اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ جس ایوان نے سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی قرار داد پاس کی اس کی آئینی حیثیت کیا تھی؟ سپیکر عبدالحکیم کا دعوےٰ تھا کہ جب ایوان میں ہلڑ بازی شروع ہوئی اور انہیں جان بچا کر اپنے عملے کی حفاظت میں بھاگنا پڑا۔ تو انہوں نے اجلاس کے التوا کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد اجلاس کی کوئی کارروائی نہ ہو سکتی تھی۔ حزب مخالف سپیکر کے نقطۂ نگاہ کی تائید کرتی تھی۔ عوامی لیگ پارٹی کے لیڈروں کو خود بھی اپنے موقف کے متعلق شبہ تھا۔ کیا سپیکر عبدالحکیم ابھی تک اسمبلی کے سپیکر تھے یا نہیں؟ اور اگر تھے تو کیا سیشن کا آئندہ اجلاس انہی کی صدارت میں کرانا پڑے گا؟

مشکل یہ تھی کہ سال کے باقی ماندہ مہینوں کے لئے بجٹ پاس کرانا ضروری تھا۔ اگر بجٹ پاس نہ ہو تو نظم ونسق کو تعطل سے بچانے کے لئے لامحالہ صوبے پر پھر گورنری راج ناگزیر تھا۔ لیکن کیا سپیکر عبدالحکیم بجٹ پاس کرانے میں وزارت کی امداد کریں گے یا وزارت کو شکست دلانے کے لئے اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالیں گے؟ وزیر اعلیٰ عطاء الرحمن خاصی مشکل صورت حال سے دوچار تھے۔ انہوں نے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حزب مخالف کے ساتھ سمجھوتہ کی کوشش کی۔ حزب مخالف کے لیڈر مسٹر ابوحسین سرکار بھی صوبے میں دفعہ ۱۹۳ کے نفاذ کے امکان کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ قرارداد عدم اعتماد پر عوامی لیگ وزارت کو شکست دے کر اپنی وزارت مرتب کرنے کی امید باندھ رہے تھے اور صوبے کو گورنری راج کے حوالے نہ کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا وہ اس مفاہمت پر راضی ہو گئے کہ (۱) سپیکر کے عہدے کے متعلق جو بحران پیدا ہو گیا ہے۔ اسے اسمبلی کے سیشن کے راستے میں رکاوٹ نہ بننے دیا جائے (۲) فی الحال سپیکر عبدالحکیم از خود اسمبلی کے جلسوں میں شریک نہ ہوں۔ ان کی جگہ لینے کے لئے ڈپٹی سپیکر شاہد علی بھی اجلاس میں نہ آئیں۔ کیونکہ جس طرح حزب اقتدار سپیکر عبدالحکیم کو اپنا مخالف سمجھتی تھی اور ان کی غیر جانب داری پر اعتماد نہ کرتی تھی۔ بالکل یہی رویہ حزب مخالف کا ڈپٹی سپیکر کے متعلق تھا۔ (۳) اگر یہ دونوں حضرات ایوان میں تشریف نہ لائیں تو ان کی غیر حاضری میں کسی بے قاعدگی کے بغیر "پینل آف چیئرمین" (سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کی غیر حاضری میں صدارت کرنے والے ممبروں کی منظور شدہ فہرست) کا سب سے سینئر ممبر اجلاس کی صدارت کرے گا۔ اتفاق سے یہ منصب سید عزیز الحق کو حاصل تھا جو کرشک سرامک پارٹی کے ممتاز ممبر تھے۔ (۴) بجٹ کو ایک غیر اختلافی مسئلہ قرار دے کر پاس کر دیا جائے اور پھر سید عزیز الحق کی صدارت میں سیشن کی باقی ماندہ کارروائی مکمل کی جائے۔ (۵) سپیکر عبدالحکیم کے عہدے کے متعلق بحران کو ختم کرنے کے لئے مناسب طریق پر مزید گفتگو اور غور وخوض کیا جائے۔

یہ "جنگ بندی" کرتے وقت حزب مخالف کے لیڈر نہ معلوم کس طرح یہ بات

نظر انداز کر گئے کہ اگر بجٹ پاس ہو گیا تو پھر وزارت کو معاہدے کی پابندی کرنے یا حزب مخالف کی کوئی بات ماننے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ بہرحال سمجھوتے کے مطابق اسمبلی کا ایک مختصر اجلاس ۲۱؍ستمبر کو منعقد ہوا۔ جس سے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر دونوں غیر حاضر رہے اور ان کی غیر حاضری میں اجلاس کی صدارت مسٹر عزیز الحق نے کی۔ اس اجلاس نے دس منٹ کے اندر وزیر اعلیٰ کا پیش کردہ بجٹ اور "تصرفاتی بل" پاس کر دئے اور پھر اجلاس ۲۳؍ستمبر کے لئے ملتوی ہو گیا۔

اس کے بعد برسر حکومت عوامی لیگ پارٹی کے لیڈروں نے معاہدے کا کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا اور من مانی کی۔ ایک طرف انہوں نے لا اینڈ آرڈر کے نام پر شناختی کارڈوں کے بغیر اسمبلی کی عمارت میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ دوسری طرف پاس جاری کرنے کا اختیار سپیکر کے عملے کے بجائے پولیس افسروں کو دے دیا جو بہرحال ان کے ماتحت تھے۔ تیسری طرف پولیس کے سخت انتظامات نافذ کرنے کے بعد انہوں نے ڈپٹی سپیکر شاہد علی کو اشارہ کر دیا کہ وہ اجلاس کی صدارت کرنے کے لئے پہنچ جائیں۔ ۲۳؍ستمبر کو اسمبلی کی عمارت میں پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ سپیکر عبدالحکیم کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ معاہدے کے خلاف ڈپٹی سپیکر کو اجلاس کی صدارت کا موقعہ دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے بھی اجلاس میں شریک ہونے کی کوشش کی۔ لیکن پولیس نے انہیں ایوان میں داخل ہی نہ ہونے دیا۔ اجلاس شروع ہوا تو سپیکر کی غیر حاضری میں ڈپٹی سپیکر شاہد علی نے کرسئ صدارت سنبھالنے کی کوشش کی۔ حزب مخالف نے اس پر احتجاج کیا۔ اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ مفاہمت کے مطابق ایوان سے چلے جائیں۔ وہ نہ مانے تو احتجاج نے ہنگامہ کی صورت اختیار کر لی۔ کسی نے ایک سخت چیز اٹھا کر ڈپٹی سپیکر پر پھینکی۔ جو ان کے سر پر لگی۔ وہ لہولہان اور بے ہوش ہو گئے اس مرحلے پر پولیس فوراً ایوان میں داخل ہو کر حزب مخالف کے ممبروں کے ساتھ دست و گریبان ہو گئی۔ اس دھکا پیل میں کئی ممبروں کو چوٹیں آئیں۔ ڈپٹی سپیکر شاہد علی کے علاوہ مسٹر عزیز الحق کو بھی بے ہوشی کی حالت میں ایوان سے باہر لے جایا گیا۔ ان کے علاوہ زخمی ہونے والوں

میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر پنیر الدین بھی شامل تھے۔ مسٹر شاہد علی کے علاوہ دوسرے مجروحین کی چوٹیں تشویشناک ثابت نہ ہوئیں۔ لیکن شاہد علی کو ہوش میں نہ لایا جاسکا۔ مقامی ڈاکٹروں کے علاوہ ایک ماہر سرجن کو کلکتے سے بلایا گیا۔ ان سب کوششوں کے باوجود وہ دو دن کی بے ہوشی کے بعد انتقال کر گئے۔ اس کے بعد پولیس کی تفتیش اور عدالتی کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر ملک میں فوجی انقلاب آگیا اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں تمام سیاسی جنگیں یکایک ختم ہو گئیں۔

۶۸۔ ۱۹۵۸ء ۔ مسلم لیگ کا آخری صدر

۲۵ جنوری ۱۹۵۸ء کو کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ سردار عبدالرب نشتر اس وقت بیمار تھے۔ ان کی غیر حاضری میں اجلاس کی صدارت مولانا اکرم خان نے کی اس وقت مسلم لیگ اپنے زوال کی انتہا کے قریب پہونچ چکی تھی۔ یہ بات خاص طور پر عبرت انگیز تھی کہ اس وقت اگر کوئی پارٹی ایسی تھی جس کا پاکستان کے حکومتی کاروبار میں کوئی عمل دخل نہ تھا تو وہ مسلم لیگ تھی۔ باقی تمام پارٹیوں کا مرکزی وزارت میں یا صوبائی وزارتوں میں کسی نہ کسی طرح کا گٹھ جوڑ موجود تھا۔ صرف مسلم لیگ ایک ایسی پارٹی تھی جسے اس پیچ در پیچ گٹھ جوڑ نے سیاسی اچھوت بنا دیا تھا۔

۲۵ جنوری کے اجلاس میں مسلم لیگ کی عاملہ کے سامنے چوہدری خلیق الزمان نے دو ہنگامہ خیز تجاویز پیش کیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ مسلم لیگ کو آنے والے عام انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ انتخابات مخلوط حلقوں کی بنا پر ہونے والے تھے۔ اور مخلوط طرزِ انتخاب کے خلاف ایک زبردست عوامی تحریک چلانی چاہیئے۔ مجلس عاملہ کے باقی ممبروں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ مسٹر دولتانہ نے پوچھا کہ مسلم لیگ کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے عوام کی تائید سے پارلیمنٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے یا انتخاب کا میدان صرف ان پارٹیوں کے لئے کھلا چھوڑ دینا چاہیئے جو مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے متفق نہیں؟ چوہدری خلیق الزمان کی دوسری تجویز یہ تھی کہ سردار عبدالرب نشتر کو صدارت سے برطرف کر کے کسی اور کو صدر منتخب کرنا چاہیئے۔ کسے؟ چوہدری صاحب نے یہ نہیں بتایا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ سردار نشتر خرابیٔ صحت کی وجہ سے اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے لہٰذا وہ لیگ کی تنظیم کی مہم کے راستے میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ اس تجویز کی بھی دولتانہ نے سخت مخالفت کی اور کہا کہ سردار نشتر کو عوام

کی نگاہ میں جو وقار حاصل ہے وہ اس وقت لیگ کا قابل قدر سرمایہ ہے۔ صدارت سے ان کی علیحدگی لیگ کے لئے ایک عظیم نقصان ثابت ہوگی۔ چوہدری صاحب کی دونوں تجاویز نامنظور ہو گئیں۔

جب لیگ کی مجلس عاملہ میں یہ بحث ہو رہی تھی۔ تو کسے معلوم تھا کہ سردار عبدالرب نشتر چند دنوں کے اندر ہمیشہ کے لئے مسلم لیگ سے جدا اور دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ وہ دل کی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہی بیماری ۱۴ر فروری ۱۹۵۸ء کو ان کی موت کا بہانہ بن گئی اور مسلم لیگ کو چار و ناچار نئے صدر کی تلاش کرنی پڑی۔ مارچ ۱۹۵۸ء کے آخری ہفتے میں مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس نے ایک وفد محترمہ فاطمہ جناح کی خدمت میں بھیجا اور انہیں لیگ کی صدارت پیش کی۔ وفد کی عرض معروض اور اصرار کے باوجود وہ اس کے لئے تیار نہ ہوئیں تو کونسل نے خان عبدالقیوم کو صدر چن لیا۔ یہ انتخاب ۲۹ر مارچ کو عمل میں آیا۔ اور لیگ کی سرگرمی کے ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز بن گیا جو بہت مختصر لیکن خاصا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔

۱۴ر اپریل کو مسلم لیگ کے نئے صدر کی حیثیت میں خان عبدالقیوم خاں کے اعزاز میں کراچی کے ایک صنعت کار حاجی ولی محمد نے ایک پارٹی دی۔ یہاں ان کی خدمت میں خیر مقدم کا ایڈریس پیش کیا گیا۔ خان عبدالقیوم خاں اپنی آئندہ سیاست کے خطوط غالباً اپنے ذہن میں متعین کر چکے تھے۔ انہوں نے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ کر اپنا زور کلام سکندر مرزا کے خلاف تنقید پر صرف کیا۔ آپ نے کہا کہ سکندر مرزا ایک آئینی عہدے پر فائز ہیں۔ لیکن وہ دن رات سیاست میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی کے کرتا دھرتا وہی ہیں۔ وزارتوں کو بنانے اور توڑنے میں ہمیشہ سب سے زیادہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے آئینی عہدے کے آداب سے تجاوز کر کے آئین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ لہٰذا ملک کے بنیادی مفاد کا تقاضا ہے کہ انہیں اس عہدے سے برطرف کیا جائے۔ جو لوگ پاکستان کی ترقی اور استحکام کے خواہشمند ہیں۔ ان کے لئے سب سے پہلا مسئلہ سکندر مرزا سے ملک کو نجات دلانا ہے۔

جن کے ہاتھوں آئین تباہ و برباد ہو رہا ہے۔

اس تقریر کے بعد اخبار نویسوں نے خان عبدالقیوم خاں کو گھیر لیا اور پوچھا کہ صدر کو عہدے سے ہٹانے کے لئے آپ کے ذہن میں کوئی عملی تدبیر ہے؟ خان موصوف نے کہا کہ میری کوشش یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کے ذریعے رائے عامہ کو بیدار کروں۔ بیدار رائے عامہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کے بعد خان عبدالقیوم خاں نے صدر سکندر مرزا کے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ کی مہم شروع کر دی۔ اس مہم سے کوئی اور نتیجہ برآمد ہوا یا نہ ہوا لیکن خان عبدالقیوم خاں کے جلسے عوام کے لئے بے حد پُرکشش بن گئے۔ اور مسلم لیگ کے گرتے ہوئے سیاسی وقار کو وقتی طور پر عجیب سہارا ملا۔ یہ بات دلچسپ تھی کہ سکندر مرزا کے خلاف عبدالقیوم خاں کے پراپیگنڈہ کا جواب دینے کے لئے قابل توجہ سیاست دانوں میں صرف ایک ہی شخص سامنے آیا۔ یہ ڈاکٹر خانصاحب تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کے یہ آخری دن تھے۔ کیونکہ ۹ مئی ۱۹۵۸ء کو وہ لاہور میں ایک نیم دیوانہ شخص کے قاتلانہ حملے کا شکار ہو گئے۔ پولیس نے اصل قاتل کے علاوہ خاکسار لیڈر علامہ مشرقی اور ان کے چند ساتھیوں کو گرفتار کر کے سازش قتل کے الزام میں ان کا چالان عدالت میں پیش کیا لیکن عدالت کے سامنے ایسی کوئی سازش ثابت نہ ہو سکی اور علامہ مشرقی سیشن کورٹ سے بری ہو گئے۔

چند مہینوں کے اندر خان عبدالقیوم خاں کی سرگرمیوں نے مغربی پاکستان میں مسلم لیگ کے حق میں خاصا جوش و خروش پیدا کر دیا۔ اس کا مقابلہ برسرِ اقتدار ری پبلکن پارٹی سرکاری اختیارات کے ڈنڈے اور "لا اینڈ آرڈر" کی مشینری سے کرنا چاہتی تھی۔ اس کا ایک دلچسپ نمونہ کراچی کے ایک واقعہ کی صورت میں پبلک کے سامنے آیا۔

ستمبر ۱۹۵۸ء کے شروع میں یہ خبریں شائع ہوئیں کہ مرکزی حکومت ایک آرڈیننس جاری کرنے والی ہے جس کے تحت باوردی رضاکاروں کی تنظیم کو خلاف قانون قرار دے دیا جائے گا۔ اس حکم کی زد صرف مسلم لیگ نیشنل گارڈ پر پڑتی تھی کیونکہ علامہ مشرقی کی "خاکسار مسلم لیگ" کو پہلے ہی (ڈاکٹر خانصاحب کے قتل کے سلسلے میں علامہ مشرقی کی گرفتاری کے بعد) خلاف قانون جماعت قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت کسی اور

سیاسی جماعت کے ساتھ تعلق رکھنے والی باوردی رضاکاروں کی کوئی اور تنظیم موجود نہ تھی۔ اس خبر نے مسلم لیگیوں کے دلوں میں اس سول نافرمانی کی تحریک کی یاد تازہ کر دی جو ۱۹۴۷ء میں اسی قسم کے سوال پر یونینسٹ وزارت کے خلاف چلائی گئی تھی۔ کیا انہیں اپنی تاریخی روایت کے پیش نظر اس آرڈی ننس کی مزاحمت کرنی چاہیئے اور کس طرح؟ اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے مسلم لیگ کے صدر خان عبدالقیوم خاں نے مجلس عاملہ کا اجلاس کراچی میں ۲۴ر ستمبر کے لئے طلب کر لیا اور ارکان مجلس کے علاوہ کئی دوسرے مسلم لیگیوں کو اس جلسے میں شرکت کی خاص دعوت بھیج دی۔ جن میں راجہ غضنفر علی خاں بھی شامل تھے۔ لیکن اس اجلاس کا انتظار کئے بغیر عبدالقیوم خاں نے اپنی ذمہ داری پر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر اس قسم کا آرڈی ننس نافذ کیا گیا تو مسلم لیگ یقیناً اس کے خلاف سول نافرمانی کرے گی۔ ۲۰ر ستمبر کو صدر مملکت نے اس آرڈی ننس کے مسودے پر دستخط کر دیئے اور اس کا نفاذ فوری طور پر پورے ملک میں ہو گیا۔

اس آرڈی ننس اور اس کے خلاف خان عبدالقیوم کے اعلان نے مغربی پاکستان میں ڈرامائی فضا پیدا کر دی۔ خان موصوف نے اپنے لئے نیشنل گارڈ کی وردی کا آرڈر دے دیا اور یہ پروگرام بنایا کہ کراچی کے اجلاس کے بعد وہ خود باوردی رضاکاروں کی ایک جمعیت کی قیادت کریں گے۔ کراچی جاتے ہوئے خان موصوف نے راستے میں کئی جگہ مختصر قیام اور پبلک جلسوں سے خطاب کیا۔ بہاولپور کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے اعلان کیا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کے لئے مسلم لیگ دس لاکھ رضاکار بھرتی کرے گی۔ اس جلسے میں راجہ غضنفر علی خاں نے بھی تقریر کی۔ آپ نے حاضرین سے کہا "ممکن ہے کہ چند دنوں کے بعد ہمارا اور آپ صاحبان کا آزادانہ میل ملاپ ممکن نہ رہے اور آپ لوگ یہ خبر سن لیں کہ ہمیں گرفتار کر کے جیلوں میں بھیج دیا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ سول نافرمانی کی کامیابی کی دو شرطیں ہیں۔ ایک عزم محکم اور دوسرے عدم تشدد۔ انہی چیزوں کی بدولت وہ سول نافرمانی کامیاب ہوئی تھی جو گیارہ برس پہلے اسی مسئلے کے متعلق شروع کی گئی تھی۔ اس وقت مسلم لیگ کے سامنے پاکستان قائم کرنے کا سوال تھا۔ آج اس کے سامنے پاکستان کی

حفاظت کا سوال ہے"

کراچی میں حکومت کے کارندوں نے مسلم لیگی لیڈروں کا استقبال عجیب طریق پر کیا۔ خان عبدالقیوم خاں اور ان کے ساتھی تیز گام سے آنے والے تھے۔ ان کی آمد کا اعلان پہلے سے ہو چکا تھا۔ کراچی چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن پر تیز گام کے پہنچنے کا صحیح وقت دوپہر کے بارہ بجے کے قریب تھا۔ ان کے استقبال کے لئے نو دس بجے ہی سے ریلوے سٹیشن کے باہر لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے سرکاری بیان کے مطابق اسی صبح کو دفعہ ۱۴۴ کے تحت جلوس اور جلسوں کو ایک ماہ کے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس حکم پر دستخط سرکاری دفاتر کھلنے کے بعد کئے اور پھر اس کے اعلان کا انتظام کرنے میں کچھ دیر لگی اور پولیس کی لاریوں پر لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے یہ اعلان اس وقت شروع ہوا جب ریلوے سٹیشن پر کافی ہجوم جمع ہو چکا تھا۔

اب صورت یہ تھی کہ ریلوے سٹیشن پر تقریباً بیس ہزار لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور شہر میں پولیس کی گاڑیاں دفعہ ۱۴۴ کے حکم کا اعلان کرتی پھر رہی تھیں۔ پھر ریلوے سٹیشن کی طرف آنے والی سڑکوں پر ناکہ بندی کے لئے پولیس کی پارٹیاں بٹھا دی گئیں۔ لیکن اب ان کی ناکہ بندی بے مقصد تھی۔ لوگ پہلے ہی ریلوے سٹیشن پر جمع ہو چکے تھے۔ ان میں لیگ نیشنل گارڈ کے ممبر بھی شامل تھے۔ جنہوں نے وردی نہ پہنی تھی۔ صرف سبز بلّے اپنے بازوؤں پر لگا رکھے تھے۔

ریلوے سٹیشن پر موجود ہجوم کے لیڈروں اور حکام کے درمیان گفتگو ہوئی اور افہام و تفہیم کے ذریعے یہ قرار پایا کہ کوئی جلوس نہ نکالا جائے گا۔ ایک جیپ کار خان عبدالقیوم کے لئے آئی ہوئی تھی۔ قرار یہ پایا کہ خان جیپ میں کھڑے ہو کر عوام کو ہدایت کریں گے کہ وہ پُرامن طور پر منتشر ہو جائیں اور اس مرحلے پر قانون کی خلاف ورزی نہ کریں۔ جیپ میں کوئی لاؤڈ سپیکر نہ تھا۔ پولیس افسروں نے کہا کہ لاؤڈ سپیکر ہم مہیا کر دیں گے اور اگر مجمع خان عبدالقیوم خاں کے کہنے کے مطابق منتشر ہو جائے اور خان موصوف اپنے ساتھیوں سمیت اپنی جیپ کار میں بیٹھ کر اپنی قیام گاہ کو روانہ ہو جائیں تو ما بغیر و شمابہ سلامت دفعہ ۱۴۴ کے حکم کا منشاء پورا ہو

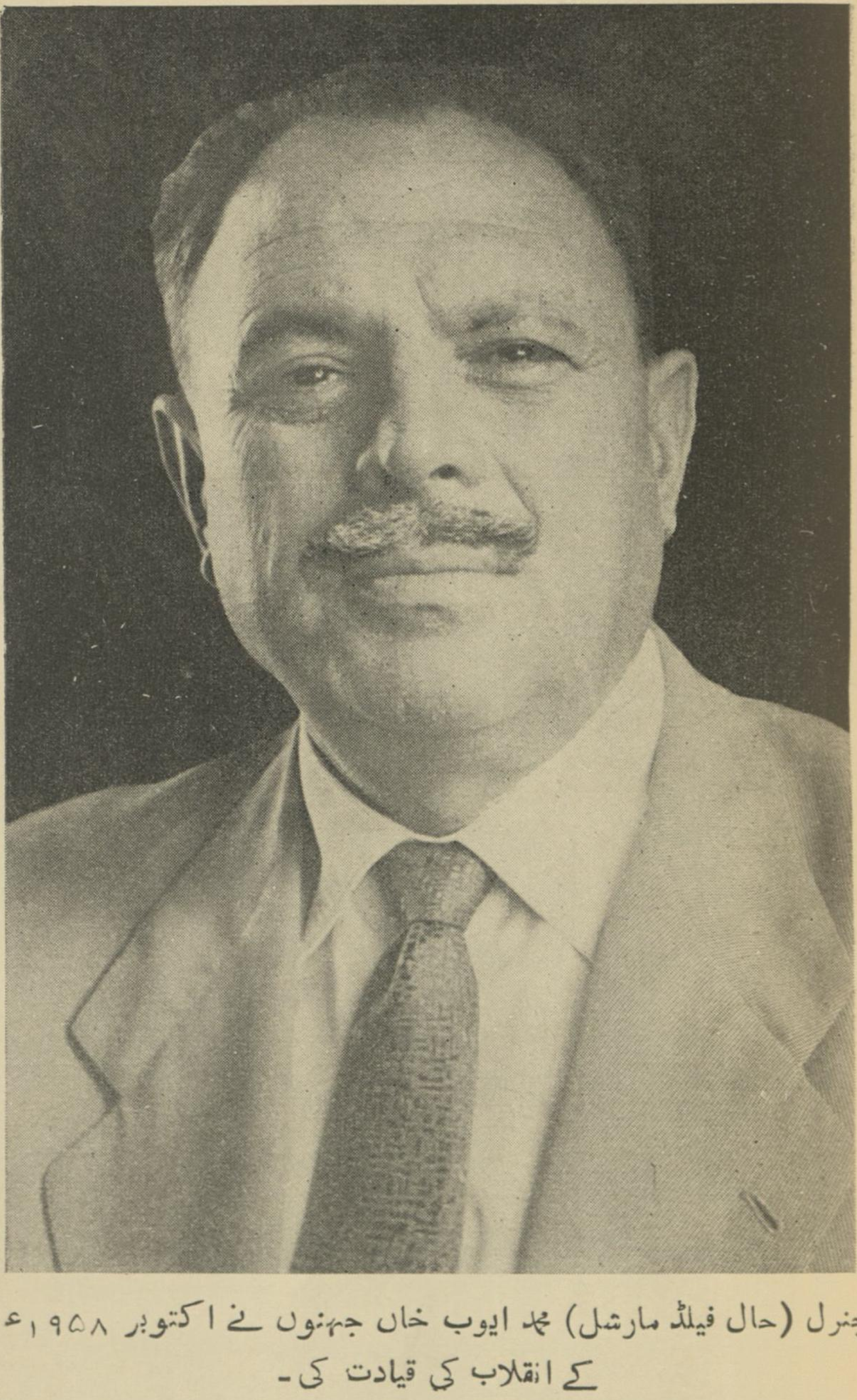
جائے گا۔

جب گاڑی پلیٹ فارم پہنچی تو وہاں عوام کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سبز بلے والے رضاکاروں نے خان عبدالقیوم خاں کے ڈبے کے آس پاس گھیرا ڈال لیا۔ خان موصوف نے ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہو کر عوام کے نعروں اور تالیوں کا نذرانہ قبول کیا اور انہیں پر امن رہنے کی تلقین کی۔ لیکن لاؤڈ سپیکر کے بغیر اس پورے مجمع تک ان کی آواز نہ پہنچ سکتی تھی۔ راجہ غضنفر علی خاں اور لیگ نیشنل گارڈ کے سالار قاضی محمد اکبر رضاکاروں کی مدد سے ہجوم کے درمیان سے گزر کر باہر نکل گئے۔ اور اس جیپ کار میں بیٹھ گئے جس کے قریب مسٹر یوسف ہارون۔ مسٹر لاری اور مسٹر گبن کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد خان عبدالقیوم خاں کے لئے بھی ہجوم کے درمیان راستہ بنایا گیا۔ اور وہ جیپ میں پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ اب مقامی مسلم لیگی لیڈر منتظر تھے کہ پولیس کا کوئی آدمی لاؤڈ سپیکر لائے تاکہ حسب قرارداد لیگ کے صدر مجمع سے منتشر ہونے اور پُر امن رہنے کی اپیل کریں۔ لاؤڈ سپیکر کی جگہ پولیس کی جانب سے اشک آور گیس کا گولہ آیا اور پھر مجمع پر ان گولوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ یوسف ہارون جیپ کے قریب زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ دوسرے لیڈروں پر بھی گیس کا اثر ہوا۔ رضاکاروں نے کمال ہمت کے ساتھ جیپ سے لیڈروں کو نکالا۔ یوسف ہارون کو بے ہوشی کی حالت میں اٹھایا اور جلدی جلدی سٹیشن کی عمارت کے اندر ویٹنگ روم میں پہنچا دیا۔ وہاں ان کا منہ دھلایا گیا۔ ان پر گیس کا اثر ختم ہوا تو خان عبدالقیوم خاں نے اخبار نویسوں کو جو ویٹنگ روم کے باہر انتظار کر رہے تھے۔ اندر بلایا اور ایک بیان دیا۔ انہوں نے حکام کے رویہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ لیکن پورے ملک کے مسلم لیگیوں سے اپیل کی کہ وہ ری پبلکن وزارت کے دام میں نہ آئیں اور سرکاری کارندوں کی اشتعال انگیزی کے باوجود پُر امن رہیں اور لیگ کی عاملہ اور لیگ کونسل کی رہنمائی کا انتظار کریں۔ لیگ کی عاملہ نے ایک طویل قرارداد پاس کی جس میں عملی ہدایت صرف "یوم احتجاج" منانے کے لئے تھی۔ اس کیلئے ایک تاریخ مقرر کر دی گئی۔ لیکن اس تاریخ سے پہلے ہی فوجی انقلاب آ گیا اور مارشل لا کے تحت تمام سیاسی سرگرمیاں معطل ہو گئیں۔

۶۹- ما درچہ خیالیم ....

ملک فیروز خاں نون کی کابینہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے کرشک سرامک پارٹی کی یا ذاتی طور پر اس کے لیڈر حمید الحق چوہدری کی لگاتار کوشش بالآخر اگست ۱۹۵۸ء میں اس حد تک بار آور ہوئی کہ وزیر اعظم نے مسٹر حمید الحق کو اپنی وزارت میں شامل کرنا منظور کر لیا۔ کرشک پارٹی مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی مدمقابل تھی۔ لہٰذا سہروردی کو اپنی مخالف پارٹی کا مرکزی کابینہ میں کوئی عہدہ حاصل کرنا پسند نہ تھا۔ لیکن مسٹر حمید الحق کے پاس بھی کوئی نہ کوئی ایسی دلیل تھی جس کے سامنے وزیر اعظم فیروز خاں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سہروردی کو راضی کرنے کے لئے ملک صاحب نے انہیں یہ پیشکش کردی کہ وہ ایک حمید الحق کے مقابلے میں دو یا تین عوامی لیگیوں کو کابینہ میں لینے کو تیار ہیں۔ اس سلسلے میں سہروردی سے بات چیت ہوتی رہی۔ آخر عوامی لیگ کے نمائندوں کے لئے کابینہ میں پانچ نشستوں کا فیصلہ ہو گیا۔ سہروردی نے کسی دوسرے وزیر اعظم کے ماتحت وزیر بننا پسند نہ کیا۔ لیکن اپنی پارٹی کے پانچ ارکان کو وزارت میں شامل کر دیا۔ ان میں تین وزیر تھے اور دو وزیر برائے مملکت۔ مسٹر حمید الحق چوہدری نے عہدے کا حلف ۸ر اگست ۱۹۵۸ء کو اٹھا لیا تھا۔ سہروردی اور ملک فیروز خاں کے درمیان بات چیت میں دیر لگی۔ لہٰذا عوامی لیگ کے پانچ وزیروں نے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو حلف اٹھایا۔ لیکن اس مرحلے پر ایک عجیب الجھن پیدا ہو گئی۔ جو محکمے ان نئے وزیروں کو دینا طے کیا گیا تھا۔ ان میں کئی اہم محکمے ری پبلکن وزیروں کے قبضے میں تھے۔ وہ ان محکموں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور وزیر اعظم اپنی پارٹی کے اندر پھوٹ اور انتشار کا خطرہ پیدا کئے بغیر انہیں مجبور نہ کر سکتے تھے۔ یہ خطرہ وزیر اعظم نون کے علاوہ خود سہروردی کو بھی پسند نہ تھا۔ نئے آئین کے تحت ملک میں عام انتخابات کے لئے ۱۵ر فروری ۱۹۵۹ء کی تاریخ حتمی خیال کی جاتی تھی اور سہروردی کو انتخاب

کے بعد اپنے وزیر اعظم بننے کی اتنی پختہ امید تھی کہ وہ کوئی ایسی صورت حال پیدا ہونے دینا نہ چاہتے تھے جو انتخابات کے پروگرام کو معرض تعویق یا معرض خطر میں ڈال دے۔ ری پبلکن پارٹی کا انتشار ان کے خیال کے مطابق انتخابات کے متوقع پروگرام میں گڑبڑ کا باعث بن سکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے وزیر اعظم کی الجھن دور کرنے کے لیے اپنی پارٹی کے وزیروں سے استعفا دلوا دیا۔ اور ساتھ ہی ملک فیروز خاں کو یہ یقین دلایا کہ نئے انتخاب تک ان کی پارٹی وزارت کی تائید اور حفاظت کرتی رہے گی۔ یہ استعفی ۷ اکتوبر کو دیئے گئے۔ ان استعفوں کے بعد پاکستان کی مرکزی وزارت جس کے ہاتھ سے چند گھنٹوں کے بعد مارشل لا نے حکومت چھین لی۔ مندرجہ ذیل وزرا پر مشتمل تھی :۔ ملک فیروز خاں نون وزیر اعظم۔ مسٹر ایوب کھوڑو۔ سید امجد علی۔ مسٹر حمید الحق چودھری۔ سردار عبد الرشید۔ میر غلام علی تالپور۔ میاں جعفر شاہ۔ مسٹر عبد العلیم۔ سردار امیر اعظم خاں۔ مسٹر ریض الدین احمد۔ مسٹر مخدوم زادہ الحق حاجی مولا بخش سومرو۔ مسٹر پی۔ کے دتہ اور مسٹر بسنت کمار داس۔



جنرل (حال فیلڈ مارشل) محمد ایوب خاں جنہوں نے اکتوبر ۱۹۵۸ء
کے انقلاب کی قیادت کی۔

۷۰۔ پاکستان میں فوجی انقلاب

پاکستان میں فوجی انقلاب کا منصوبہ ستمبر ۱۹۵۸ء کے وسط میں مکمل ہو چکا تھا۔ فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل (حال فیلڈ مارشل) محمد ایوب خاں نے جنہوں نے اس انقلاب کی قیادت کی، اپنے ذہن میں جو منصوبہ قائم کیا اس میں صدر سکندر مرزا کو صدارت کے عہدے پر قائم رکھنے کی تجویز شامل تھی بشرطیکہ وہ مجوزہ اقدامات کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ اس نکتے پر خود قائد انقلاب نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایک اخباری بیان میں روشنی ڈالی۔ ایک خبر رساں ایجنسی کے نمائندے کے ساتھ ملاقات میں آپ نے کہا: "انجام کار یہ ذمہ داری ہمیشہ فوج ہی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ عوام کے حقوق کی حفاظت کرے۔ میں نے صدر سے دریافت کیا کہ کیا آپ کوئی قدم اٹھانے کو تیار ہیں یا نہیں؟ حالات میں تبدیلی لانے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ خدانخواستہ آپ نے ایسا نہ کیا تو ہم حالات میں ایسی تبدیلی لے آئیں گے۔" صدر سکندر مرزا انقلاب کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے تو فوج کی نقل و حرکت ستمبر کے تیسرے ہفتے میں شروع ہو گئی۔ انقلاب کی تاریخ سے دو ہفتے قبل ایک بریگیڈ کراچی پہنچ چکی تھی۔ فوج کو آخری احکام ۷ اکتوبر کو دیئے گئے۔ اسی دن کمانڈر انچیف محمد ایوب خان کراچی پہنچے اور یہ طے کیا گیا کہ فوجی دستے شام کے ساڑھے نو بجے تک کراچی کے اہم مقامات۔ قصر صدارت۔ ریلوے سٹیشن۔ ریڈیو سٹیشن وغیرہ اپنی حفاظت میں لے لیں۔ یہی انتظامات دوسرے بڑے شہروں میں کئے گئے۔ مشرقی پاکستان میں فوج کے دستے سمگلنگ کی روک تھام کے سلسلے میں بکھرے ہوئے تھے۔ نئے مقصد کے لئے ان کی ترتیب اور نقل و حرکت اور اس اثناء میں مکمل رازداری کا انتظام خاصا مشکل مسئلہ تھا۔ اس مسئلے کی تفاصیل جنرل امراؤ خان کے حسن تدبر کے ذریعے طے ہوئیں۔

۷ اکتوبر کی شام کو چند مرکزی وزیر قصر صدارت میں جمع تھے اور وہسکی کے ساتھ

مشغل فرما رہے تھے۔ صدر سکندر مرزا ان کا ساتھ بھی دے رہے تھے اور بار بار گھڑی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں فوجی دستے اپنے اپنے مقام سنبھالنے کے لئے روانہ ہونے والے ہیں۔ خدا خدا کر کے یہ مہمان آٹھ بجے کے قریب رخصت ہوئے۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب فوجی دستوں کا مارچ شروع ہوا اور ایک گھنٹے کے اندر انہوں نے اپنے اپنے مقررہ مقام سنبھال لئے۔ بارہ بجے شب سے تھوڑی دیر بعد صدر سکندر مرزا کی جانب سے آئین کی منسوخی۔ مارشل لا کے نفاذ اور مارشل لا کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے جنرل محمد ایوب خان کے تقرر کا اعلان ہو گیا۔ اور وزارتیں اور اسمبلیاں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں۔

اگلی صبح کو سرکاری دفتروں عدالتوں، بازاروں اور پبلک اداروں میں معمول کے مطابق کام ہوتے رہے۔ عوام نے اس تبدیلی کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا۔ وہ وزارتوں اور ان کے ماتحت بڑھتی ہوئی ہر قسم کی بدعنوانیوں اور نااہلیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ انہیں بہتر حالات کی امید پیدا ہوئی۔ ایک دو دن کے اندر یہ بات واضح ہو گئی کہ مارشل لا کے ضوابط کے تحت سابقہ آئین میں ضروری ترامیم کے علاوہ عدالتی کام اسی آئین کے مطابق ہوتے رہیں گے۔ اور فوجی حکومت سول حکمروں ہی کے ذریعے حکومتی کاروبار چلائے گی۔ لیکن ایک بات اکثر لوگوں کو حیران کرتی رہی۔ اگر یہ انقلاب ملک کو سابقہ سیاسی سازشوں اور سیاسی لیڈروں کی بدعنوانیوں سے نجات دلانے آیا تھا۔ تو اس انقلاب کے بعد سکندر مرزا کی صحیح جگہ کہاں تھی؟ مسند صدارت پر یا ملزموں کے کٹہرے میں؟ کیا ری پبلکن پارٹی کے جنم داتا اور حقیقی لیڈر سکندر مرزا نہ تھے؟ کیا ملک کے سیاسی عدم استحکام اور وزارتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کے لئے سب سے زیادہ ذمہ داری انہی پر عائد نہ ہوتی تھی؟ کیا نئے انتظام کے تحت پالیسیاں مرتب کرنے میں انہیں پھر دخل حاصل ہو گیا تھا؟ بہ ظاہر نئی انقلابی حکومت کی صورت یہی تھی۔ یہ صدر سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خاں کی مشترکہ حکومت تھی۔ ۱۰ اکتوبر کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ایوب خان نے کہا کہ مارشل لا اب بھی صدر سکندر مرزا کے ماتحت ہے اور سکندر

مرزا آئین کی تنسیخ کے بعد بھی صدرِ مملکت ہیں۔ اس قانونی پوزیشن کے متعلق چیف جسٹس محمد منیر سے مشورہ لیا جا چکا تھا۔ ایک اور موقع پر جنرل ایوب نے کہا کہ "نئی حکومت کا طریق کار یہ ہے کہ صدر سکندر مرزا اور میں باہمی مشورے سے پالیسی مرتب کرتے ہیں۔ اور پھر اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانا میری ذمہ داری ہے"۔ لیکن یہ صورت حال پاکستان کے اکثر لوگوں کے نزدیک ادھورے انقلاب کے مترادف تھی۔ جلد ہی یہ بات بھی ظاہر ہونے لگی کہ اس دو عملی کے دونوں حاکموں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔

مارشل لاء کے نفاذ کے فوراً بعد صدر سکندر مرزا نے ایک مشاورتی کونسل نامزد کی تھی۔ جو سیکرٹریٹ کے اعلیٰ افسروں پر مشتمل تھی۔ یہ صدر کی مشاورتی کونسل کہلاتی تھی۔ اور اس کے جلسوں پر صدر یا مارشل لا کے ناظم اعلیٰ صدارت کرتے تھے۔ ۱۵ اکتوبر کو صدر سکندر مرزا نے ایک اور اعلان کیا جس میں انھوں نے انقلابی حکومت کو ایک "قومی کونسل" میں تبدیل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپ نے کہا کہ ملک میں مارشل لا کم سے کم مدت تک جاری رکھا جائے گا۔ اس کے بعد بارہ سے پندرہ ارکان پر مشتمل ایک قومی کونسل تشکیل کی جائے گی۔ جو نیا آئین بننے تک ملک کا نظم و نسق چلائے گی۔ جونہی قومی کونسل کی تشکیل عمل میں آئی موجودہ مشاورتی کونسل ختم کر دی جائے گی۔" صدر مرزا نے اپنے ذاتی دوستوں کو بتایا کہ وہ مارشل لاء ایک مہینے کے قریب جاری رکھنا چاہتے تھے۔ گویا ان کے ذہن میں یہ پروگرام تھا کہ ایک مہینے کے بعد مارشل لا ختم اور قومی کونسل کے صدر کی حیثیت سے ان کے اپنے ہاتھ میں عملاً مکمل اختیارات لیکن ان کے اعلان سے جو تاثر پیدا ہوتا تھا۔ اسے اگلے دن جنرل ایوب خاں کے ایک اعلان نے ختم کر دیا۔ مارشل لا کے ناظم اعلیٰ نے بتایا کہ ملک کو درست کرنے کے لئے چند اصلاحات نافذ کرنا ضروری ہے۔ یہ کام مارشل لا کے زیر سایہ مکمل کیا جائے گا۔ بے شک مارشل لا ضروری عرصے سے ایک دن بھی زیادہ قائم نہ رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ صدر کی مجوزہ "قومی کونسل" کے بجائے جو انتظام بروئے کار لایا گیا وہ یہ

تھا کہ جنرل محمد ایوب خاں کو افواج کے سپریم کمانڈر اور مارشل لا کے ناظم اعلیٰ کے عہدوں کے علاوہ ایک تیسرا عہدہ وزیر اعظم کا دے دیا گیا۔ جو اپنی کابینہ مرتب کرنے کے وہی اختیار رکھتا تھا۔ جو وزیر اعظم کو حاصل ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے جنرل ایوب نے بارہ ارکان کی ایک کابینہ کا اعلان کر دیا۔ جن میں خود ان کے علاوہ صرف تین فوجی جرنیل شامل تھے۔ باقی آٹھ ممبر غیر فوجی تھے۔ اس کابینہ کا اعلان ۲۴ اکتوبر کو ہوا۔

بہر صورت سکندر مرزا کو صدارت کے عہدے پر فائز رکھنے کا تجربہ بیس دن کے اندر ترک کرنا پڑا۔ ۲۷ اکتوبر کی شام کو آٹھ بجے کے قریب جنرل ایوب خاں نے اپنی کابینہ کے تین فوجی ارکان، جنرل اعظم، جنرل شیخ اور جنرل برکی کے ذریعے ایک مختصر پیغام صدر سکندر مرزا کو بھیجا۔ تینوں جرنیلوں نے قصر صدارت میں سکندر مرزا سے ملاقات کی۔ جنرل محمد ایوب خاں نے خود یہ تمام واقعہ ۳۰ اکتوبر کو چند غیر ملکی اخبار نویسوں کو بتایا۔ آپ نے بتایا کہ ”ہمیں ملک بھر سے یہ اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ لوگ اس بات پر مضطرب تھے کہ اگر تمام اختیارات دو افراد کے پاس رہے تو پالیسی میں ابہام کا امکان پیدا ہوتا رہے گا۔ اور اس امر کا احتمال بھی تھا کہ یہ پالیسی سمجھوتوں اور مفاہمتوں کی مظہر بن جائے گی۔ علاوہ ازیں جنرل مرزا نے ان سیاستدانوں سے بہت زیادہ ربط و ضبط بڑھا رکھا تھا جو ملک کو موجودہ حالات تک پہنچانے کے ذمہ دار تھے اور ملک میں یہ عام احساس تھا کہ جنرل مرزا سیاسی ابتری کے اسی طرح ذمہ دار تھے جس طرح کوئی دوسرا شخص۔ ان حالات میں یہ ضروری معلوم ہوتا تھا کہ ماضی سے قطع تعلق کر کے حالات کی نئی طرح ڈالی جائے۔“

ان اخبار نویسوں نے پوچھا ”کیا آپ نے کسی خاص اطلاع کی بناء پر کارروائی کی؟“ جنرل ایوب کا جواب یہ تھا ”بعض چیزیں میرے نوٹس میں لائی گئیں جنہیں بتانا میں پسند نہیں کرتا۔“

سکندر مرزا نے جنرل ایوب خاں کے نمائندوں کی گفتگو کا رجحان دیکھتے ہی استعفا دینے کی پیش کش کر دی۔ انہیں یہ بتایا گیا کہ استعفےٰ کے بعد ان کا دار الحکومت یا ملک میں رہنا مناسب نہ ہوگا۔ ملنے ملانے والے اور سوال پوچھنے والے خود ان کے لئے درد سر

بن جائیں گے۔ انہوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور انگلستان جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے لیے انتظامات کی تکمیل تک انہوں نے اپنا وقت کراچی کی بجائے کوئٹہ میں گذارنا منظور کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے استعفے کے اعلان پر دستخط کر دیئے اور ۲۸/اکتوبر کو علی الصباح اپنی بیگم ناہید مرزا کے ہمراہ ہوائی اڈے کو روانہ ہو گئے اور وہاں سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کوئٹہ پہنچ گئے۔ ان کے لیے بیرونی زر مبادلہ اور پنشن وغیرہ کی ادائیگی کے انتظامات مکمل ہوتے ہی سکندر مرزا کراچی کے راستے انگلستان روانہ ہو گئے۔

سکندر مرزا نے اپنے استعفے کا اعلان ان الفاظ میں کیا: "تین ہفتے ہوئے میں نے پاکستان میں مارشل لاء نافذ کیا اور جنرل محمد ایوب خاں کو مسلح افواج کا سپریم کمانڈر اور مارشل لاء کا ناظم مقرر کیا۔ خدا کے فضل سے میرے اس اقدام کی جو میں نے اپنے محبوب ملک کے مفاد میں کیا تھا۔ ملک کے عوام نے اور بیرون ملک ہمارے دوستوں نے بے انتہا تعریف وتحسین کی۔ میں نے مارشل لا کے نفاذ کے بعد جنرل ایوب خاں اور ان کی انتظامیہ کو مزید ابتری کو روکنے اور بدنظمی اور انتشار کو ختم کر کے نظم وضبط قائم کرنے میں پوری مدد دی۔ ہم نے ملک کے آئندہ نظم وضبط کے لیے موثر ڈھانچہ قائم کرنے کی جو مساعی کیں اور گذشتہ تین ہفتوں میں ہمیں جو تجربہ حاصل ہوا اس کی بنیاد پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ (۱) اس انتہائی اہم نوعیت کی مہم کی موثر تکمیل کے لیے دوہرے کنٹرول سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور (۲)، ملک کے اندر اور باہر بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ تاثر موجود ہے کہ میں اور جنرل ایوب خاں ہمیشہ باہم تعاون نہ کر سکیں گے۔ مجھے یہ شدید احساس ہے کہ اگر اس قسم کے تاثر کو باقی رہنے دیا گیا تو اس سے ہمارے مقصد کو انتہائی نقصان پہنچے گا۔ اس لیے میں نے الگ ہو جانے اور تمام اختیارات جنرل ایوب خاں کو سپرد کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں جنرل ایوب خاں اور ان کے ساتھیوں کی بہترین کامیابی کے لیے دعا مانگتا ہوں۔ پاکستان زندہ باد۔"

اسی رات کو جنرل ایوب خاں نے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور اگلے دن وزیر اعظم کی کابینہ کے ممبروں نے صدر ایوب کی وزارتی کونسل کے ارکان

کی حیثیت سے از سرِ نو عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد مارشل لاء کی میعاد تک صدر ایوب کی ذات میں تینوں عہدے جمع رہے۔ (۱) صدرِ مملکت کا عہدہ (۲) افواج کے سپریم کمانڈر کا عہدہ اور (۳) مارشل لا کے ناظمِ اعلیٰ کا عہدہ۔

محترمہ فاطمہ جناح نے جو اب تک ادھورے انقلاب کے متعلق خاموش رہی تھیں ۲۸ ؍ اکتوبر کو انقلاب کی تکمیل پر پہلی مرتبہ عوام کے جذبات کی ترجمانی کی اور ایک اخباری بیان میں فرمایا: "میجر جنرل سکندر مرزا تین سال تک اس مملکت کے سربراہ رہے۔ اس عرصے میں وہ ملک کا کوئی مسئلہ حل نہ کر سکے اور ملک سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے خطرے کے کنارے تک پہونچ گیا۔ عوام کو بے بس تماشائیوں کی حیثیت دے دی گئی اور انہیں زبردست مشکلات اور ہر قسم کے سماجی عوارض کا نشانہ بنایا گیا۔ اب جنرل ایوب خاں کے تحت ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ پاکستان کی فوجوں نے انتظامی بحران اور سماج دشمن کارروائیوں کا قلع قمع کر کے اور اعتماد، تحفظ اور سماجی استحکام کا احساس پیدا کر کے بالآخر ملک کے حالات کو پھر معمول پر لانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا ہماری افواج کو یہ مقصد حاصل کرنے کی فراست اور استطاعت عطا فرمائے۔"

اس طرح اپریل ۱۹۱۹ء کے مارشل لا سے اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لا تک تقریباً چالیس سال کا سیاسی ہنگاموں سے بھرپور دور ختم ہوا اور پاکستان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔
